



صفحہ 290
قیمت 100 روپے

سال نمبر بڑا

سگرگزشت

ماہنامہ

جنوری 2019

مکمل ماحول
معراج رسول



URDU TUBE
A HUB OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com



نا کردہ گناہ: شہنشاہ کے قتل کا انعام لگتے ہی اسے اس کی محبوبہ بل گئی
دوسری نور جہاں: بلا مقابلہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے والی مغنیہ کی سرگزشت
مارٹ: انوکھی حلیوں میں کیسے کیسے واقعات جنم لیتے ہیں، ایک سبق آموز دلچسپ سچی کہانی



انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ”آفیشل پیج“ کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر آپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

URDU TUBE
A WORD OF DOCUMENT

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سپینس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیہ II ایکسپریس ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

گفت و شنید

شہر خیال

ادارہ

سرگزشت

شاعر تاجدارِ حرم

ادارہ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

جرم و سزا

بڑے جرم

منظر امارا

مہم بھونی

امیر البحر

طارق عزیز خان

شخصیت

ناکرہ گناہ

الیاس سینا پوری

اس صلی کے بڑے اور اہم جبرائیم کا تذکرہ

سمندر کی نئی راہیں ڈھونڈنے والے

اس نے صرف 6 سال میں ملک کا نقشہ بدل دیا

معلومات

ایجادات

محمد یاسر اعوان

تذکرہ

دیو داس کی یاد

سید احتشام

غلم بخاری

دوسری نوب جہاں

انور فرہاد

مشہور ایجادات پر مختصری تحریر

اداکاری میں اس کو کمال حاصل تھا

منفرد انداز کی گلوکارہ کی مختصری داستان

معاشرت

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

واقعات

جنونی قاتل

سید جاد

تحریر خاص

شاخ نیتون

سلمیٰ اعوان

ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ ہو کر مائیں والی داستان

ایسے جبرائیم یورپ میں ہی ہوتے ہیں

ایک یہودی لڑکی اور مسلمان لڑکے کی داستانِ شوق

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق منسلک و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ تمام اشتہارات یکسب کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔



شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے منفرد سلسلہ

ذہن تارکین کے ذوق جستجو کی تسکین کا منفرد سلسلہ



ایک چھوٹی سے غلطی زندگی تباہ کر سکتی ہے



ایک عبرت اثر چھ بیانی



اوپنی حویلیوں میں کیلے گئے غوثی کھیل کا تذکرہ



شک کا زہر خاندانوں کو تباہ کر دیتا ہے



اے بروقت اپنی غلطی نظر آگئی تھی



وہ بیسیٹوں کی واپسی کا راستہ دیکھ رہی ہے



اپنی شہر بانی دے کر اس نے قربانی کی زندگی سنوار دی



ایک رئیس زادے کو اس نے سبق دیا



بالآخر اسے اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

مدیرِ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیر: پروین بگڑامی

نائب مدیر: نبیلہ ظہیر

نچراشہ ہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکوشن نیچر

سید منیر حسین

0333-3285269

قیمت فی پرچہ 100 روپے ♦ ذرا مالانہ 1200 روپے

پبلشر پروہرانتشر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63/11 ایکسٹنشن

پتہ: سیکٹر 11، نزد گریڈ 1

75500 کلونی

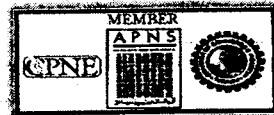
جیلان

پرنٹر: ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عہدہ کتبہ کا پتا ♦ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone : 35804200
E-mail: rdpgrp@a-b.com



لکھنے کی ابتدا کب ہوئی اس کا حتمی فیصلہ ممکن نہیں۔ غاروں میں رہنے والے دیواروں پر جو نقش و نگار بناتے تھے اسے ہی لکھائی کی ابتدا کہتے ہیں۔ تاریخ دانوں کے مطابق حروف کی ابتدا مسوپوٹیمیا میں 3100 قبل مسیح میں ہوئی، اسی دوران تصویری حروف کا استعمال سندھ کی تہذیب میں بھی شروع ہو گیا۔ گویا دماغ میں امنڈلتے خیالات کو محفوظ کرنے کی شروعات میسرین اور سندھ کی قدیم تہذیب نے کر دی تھی لیکن لکھنے کی روش عام جب ہوئی جب مطبع عام ہوا۔ چھاپا خانوں نے کتابوں کے ذخیرہ نگار دیئے لیکن کتابیں پڑھنے والے جب بھی تناسب میں کم رہے، پڑھنے کی رفتار جب تیز ہوئی جب اخبارات عام ہوئے، معلومات کی ترسیل کم قیمت میں ممکن ہوئی لیکن اوسطاً قارئین کی تعداد پھر بھی کم رہی۔ اب جب انٹرنیٹ، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ عام ہیں تو بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ کتب بینی کا شوق ماند پڑ رہا ہے۔ اگر آپ بڑھتی آبادی میں پڑھنے کے رجحان کا تناسب نکالیں گے تو حیرت کا جھٹکا لگے گا کہ کتب بینی کے شوق میں کمی نہیں آئی ہے۔ پہلے اگر ایک لاکھ کی آبادی میں دس افراد کتب بینی کرتے تھے تو آج ایک لاکھ میں ایک ہزار۔ اب ان ہزار افراد میں 1700 لیکچرر تک میڈیا کو پسند کرنے لگے ہیں تو بھی 300 پرنٹ میڈیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی تناسب اب بھی زیادہ ہے۔

معراج رسول

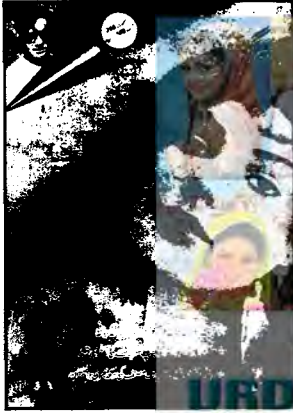
شاعر تاجدار حرم

دہلی اجڑ کر پھر بس گئی تھی اب حکومت لال تلکھن جی محمد دہلی، عثمان کھوسہ، انگلیچہ کے ہاتھ میں تھی۔ دہلی میں اب بھی مسلمانوں کا بول بالا تھا۔ اگر حکومت میں حکیم اجمل کا قوتی بول رہا تھا تو ڈاکٹری میں بھی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سائنسی ڈاکٹروں میں ڈاکٹر ناصر عباس بھی تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ وہ اگر مریض کی بغض پکڑ لیں تو مریض کی آڑی پیاری ختم ہو جاتی تھی۔ انہی ناصر عباس کے مگر 21 فروری 1917 کو ایک بیٹے نے جنم لیا۔ وہ کچھ بڑا ہوا تو کھروالوں کو گھر ہوئی۔ گھرنا تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل تھا اس لیے وقت کے ساتھ بڑھتے بیٹے کو بھی تعلیمی میدان میں آگے لانے کی کوشش ہونے لگی۔ مسم اللہ کے فوراً بعد اسے اجپور سے روشناسی کے لیے ایک استاد کو گھر بلا لیا جانے لگا۔ گھر کے ماحول کا اثر بچے پر پڑا ہے۔ بچے نے بھی انقبول کیا۔ اشعار سے روشناسی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہو چکی تھی کہ گھر میں میر انیس اور مرزا دہر کے مرثیے اور اعلیٰ اشعار سب کا دروڑاں تھا۔ وہ دور بھی کچھ ایسا تھا کہ شرقاء میں شاعری بہت زیادہ مقبول تھی تعلیم یافتہ گھرانوں کی پہچان بھی انہی وہ صرف نوسال کا تھا کہ اسے بھی عشق ہوا کہ وہ بھی کوئی شعر کہے۔ مگر اورادوں کی پہچان نہ تھی مگر شاعری سے اسے رعبت محسوس ہوئی اور اس نے زندگی کا پہلا شعر کہہ دیا۔ اس ایک شعر پر اسے وہ داد ملی کہ حوصلہ سوا ہو گیا۔ اسی حوصلہ افزائی سے اسے مزید کچھ کہنے پر اکسایا اور اس نے مسجد کی سے سوچا کہ کچھ کہنے کے لیے کسی کی شاکردنی اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن اتنی عمر میں اسے شاعری کے رموز کو سمجھنا اس لیے وہ مسلسل سنی میں مصروف رہا۔ ایک دو ایک دو اشعار کہتا اور جمع کرتا رہا۔ اب وہ کچھ حد تک بحر اور وزن سمجھنے لگا تھا اس لیے شاعری سے اب اور زیادہ آسان لگنے لگی تھی۔ اس نے 1926 میں ایک پوری غزل کہہ لی اور آقا شاعر تہذیب کش کے پاس اصلاح کے لیے جا پہنچا۔ آقا شاعر قرپاش کا شہر اساتذہ میں تھا۔ انہوں اس کی غزل دیکھی اور کہہ دیا کہ اگر کوئی سی محنت اور کڑھو آجی غزلیں کہنے لگے گا ستمے بڑے شاعر کا یہ کہنا ہی اس کے لیے بہت تھا۔ اس نے محنت کرنا شروع کر دیا۔ محنت اس کی شاعری میں بکھار لانے لگا۔ اب وہ صرف غزلیں کہتا بلکہ دوسری اصناف پر بھی توجہ دے لگا تھا۔ نعت، مہنت، مرثیہ، سلام، رباعی سب ہی پر بیج آزمائی کرنے لگا تھا۔ دیگر اصناف پیش کرنے کے لیے اساتذہ کے آگے پیچھے بھرتا پڑتا تھا لیکن مرثیہ اور سلام کے لیے کسی فاضل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی پہنچ جاتا اسے اتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ پہلے گھر میر انیس یا مرزا دہر کے مرثیے پڑے جاتے تھے لیکن اس نے خود اپنا کیا ہوا مرثیہ سنا شروع کیا تو اور بھی اس کی شہرت بڑھ گئی اسے جگہ جگہ سے دعوتیں آنے لگیں۔ اس وقت پندرہ شریف کی بارگاہ کوہِ نزہت حاصل تھی وہاں صرف مجھے ہوئے شاعری اپنا کام ناسکتے تھے لیکن اس کو عمر کو بھی وہاں پڑھنے کی دعوت ملنے لگی۔ اب وہ اسکول پاس کر کے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ دہلی میں کالج کی تھی جی پھر مکی والدین نے اسے لاہور بھیج دیا کیونکہ لاہور کا ماحول تعلیم کے لیے زیادہ سازگار تھا۔ اس نے ایف ای کالج میں داخلہ لیا اور آخر کرنے کے بعد مثنوی کالج حیدر آباد دکن سے ڈاکٹری پاس کی۔ ابھی اس نے میڈیکل پریکٹس شروع ہی کی تھی کہ سیاسی ماحول جو پہلے ہی گرم تھا اور گرم ہو گیا۔ 1944 میں عابدہ بیگم سے شادی ہوئی تھی۔ ابھی شادی کا شمارا تہی نہیں تھا کہ سیاسی ماحول نے مصیبت کا چلراؤ دیا۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے اپنا حصہ مانگ لیا تھا۔ مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ مطالبہ ہندوؤں کو گراں گزرا تھا اور اس کا بدلہ بیٹے مسلمانوں سے لیا جانے لگا تھا۔ آج اس صوبے سے تو کل اُس صوبے سے مسلمانوں کے کل عام کی خبریں آگئیں۔ بنگال سے شروع ہونے والا قیاد پور سے پشور میں پھیل گیا تھا۔ چھریا نگ دہلی میں بھرا، بھڑک اٹھا، دہلی میں اس کی شدت محنت سے زیادہ تھی کیونکہ مغربی پنجاب سے نقل مکانی کرنے والے ہندو دہلی آئیں۔ پھر اتر سے مسلمان بستیوں پر ٹوٹ پڑے۔ عجات، بھدوری اس کے گھرانے۔ انہی ہجرت کا کرب بھینچنے کا ارادہ کر لیا۔ مال لٹا کر جان بچا کر وہ سب کراچی آ گئے اور پھر ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ کراچی میں ہر صوبے سے لوگ آرہے تھے۔ ان میں خود اب پر رہتے انہوں نے یہاں بھی ادبی ماحول بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے وقت میں اس ڈاکٹر نے بھی اپنا ادبی کردار ادا کر لیا۔ اس کے گھر پر ادبی ماحول ہونے لگیں میر انیس اور مرزا دہر کی مرثیہ نگاری اس گھرانے کی اولین پندھی پھر اس نے بھی اپنا تہنیت مرثیہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح کراچی کے ادبی ماحول میں رہائی ادب کو اہمیت حاصل ہونے لگی۔ فخر گوتی پر توجہ ہو گئی اور مذہبی شاعری پر توجہ مرکوز ہو گئی۔ اسی دوران میں اس کے ایک نظیر رہائی کو بہت مقبول ملی جسے صابری برادران نے اپنی قوالی "تاجدار حرم" میں شامل کیا۔ "جنت بھی گارا ہے گھر میرے لیے..... اسے کا حقیقہ نقد میرے ہند لکھ دے"۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ 1965 کی جنگ پاکستان پر قیود دی گئی۔ ایسے وقت میں تمام شاعری فنون کی جانب توجہ ہو گئی۔ انہوں نے بھی کئی مشہور نئے لکھے لیکن سب سے زیادہ مقبول ان کا یہ نغمہ ہوا۔ "میری سرحدوں کی جانب بھی بھول کر نہ آنا"۔ ایسے بشار اشعار کے خالق کو ہم ڈاکٹر اور عباس کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



☆ منشی محمد عزیز مئے کا تجویز لندن سے۔ ”مرگوش“ کی سالانہ رپورٹ
ساتھ حاضر ہوں۔ ”معمر خیال“ کی صدارت ہمارے ہر محوز سفر نامہ نگارندیم اقبال
صاحب فرما رہے تھے اور 2018ء کے ساتھ ہی ”شمال سے ٹورنٹو“ بھی دل میں ایک
ہلکی سی کک چھوڑ کر اسے اہتمام کو پہنچا۔ یہ سفر نامہ اپنی طرز کا ایک منفرد سا تھا جس نے ہر
لحہ قاری کو گویا جکڑے رکھا تھا۔ دبیر کے شمارے میں مزید دو خوش خبریاں ”خود ساز فہرست“
کی اور دوسری علمی آزمائش ایک نئے روپ میں تھی۔ 2018ء کے شماروں کا تجزیہ ملاحظہ
کریں۔ سال بھر کے بارہ شمارے کل 3376 صفحات پر مشتمل تھے جن میں سے صرف
142 صفحات اشتہارات کے لیے مختص رہے گویا صرف 4.20 فیصد صفحات کا کونہ
اشتہارات کے لیے تھا۔ ”معمر خیال“ کے کل 94 صفحات پر 213 خطوط شائع ہوئے
جن میں سے 181 مرد تہرہ نگاروں کے اور محض 32 خطوط خواتین کے تھے۔ ان کی
تفصیل کچھ یوں ہے کہ مجموعی طور پر 77 حضرات کے 181 خطوط شائع ہوئے د:
دوست جو پورے سال میں صرف ایک ہی بار ”معمر خیال“ میں تشریف لائے ان کے
نام یہ ہیں۔ محمد ابراہیم درانی، گلپ خان سوگلی، خالد محمود، بلال رشوی، عظیم
آرشد محمد عامر، ڈاکٹر آراہم ای، محمود، ابو محمد، عبدالودود عامر، سید عثمان حیدر کاظمی، محمد عمران جوانی، احمد خان تو حیدی، ذابہ شیخ، آفتاب
احمد، مجاہد ترمذی، حاجی عبدالرحمن، محمد فضل طوطی، آصف علی لہڑی، شفیق عباس سرزا، رانا سجاد حسین، عبداللہ جاند، وکٹار احمد، اکبر انصاری، نادر
شاہ، ممتاز اشعر، انعام الحق عطاری، عمن آفاق، کوثر علی کوثر، عاتیت حسین بھی، خالد محمود، بلال رشوی، طارق خان، محمد یونس، ہارون ملک،
ابرار الحق، محمد ظفر اللہ ضیاء، دانش احمد، محمد اسماعیل اجاگر، عرفان فاروق، نذیر احمد راجپوت، عظیم احمد جعفری، محمد مبارک خان، اعلم اسلام
خان، طاہر کریم، رازقی بخش ڈی، ارشد ابرار، عمن علی طالب اور ایک نامعلوم خط شائع ہوا۔ و خطوط والے صاحبان میں محترم ایاز راسنی کے
علاوہ ہاویں تھیں۔ محمد احمد رضا انصاری، شاہدہ و الفکار سیف خان، وکیل الرحمن، سارا کٹوکر کے نام شامل ہیں۔ ناصر حسین رند، انجم فاروق
ساحلی، مرزا طاہر الدین بیگ، نصیر اللہ خان، برویسر کیو اے قاسمی اور کوثر اسلام کے تین تین خطوط شائع ہوئے۔ چار خطوط والے صاحبان
میں حفیظ ادیب، اعجاز حسین لدھیانہ اور ندیم ظفر وہرہ کے نام شامل ہیں۔ جن کے پانچ خطوط شائع ہوئے ان کے نام یہ ہیں: منشی محمد عزیز
مئے (راہم الحروف)، ندیم اقبال (منہ نامہ نگار)، ابو حمزہ اشرف، عبدالکیم شہر اور ادیس شیخ، عبدالجبار روی انصاری کے چھ خطوط شائع
ہوئے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، رضا احمد خان، عمران اور نصیر خان کے سات سات خطوط شائع ہوئے۔ آٹھ خطوط کے ساتھ شیری پوزیشن
حاصل کی سید امتیاز حسین بخاری نے اور دوسری پوزیشن پر رہے پرانے تہرہ نگار رانا محمد شاہ فرام پورے والا۔ رانا صاحب کے نو خطوط
”معمر خیال“ کی زینت بنے اور پہلی پوزیشن مشترکہ طور پر ہمارے دو تہرہ نگاروں نے حاصل کی۔ نزابت افشار اور اعجاز حسین سجادوں دس
خطوں کے ساتھ ٹاپ پر رہے اور اگر کسی صدارت کی بات کی جائے تو نزابت افشار سب سے اوپر ہیں کیونکہ انہوں نے سال 2018ء میں
دو بار کسی صدارت کا حوزہ چمکا۔ اپریل اور اگست کے شمارے میں نزابت افشار نے ”معمر خیال“ کی صدارت فرمائی تھی، دیگر ”یک ماہی
صدور“ کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ ناصر حسین رند، بہاد پور (جنوری)، اعجاز حسین لدھیانہ، خاندان (فروری)، سیف خان، کوئٹہ (مارچ)،
منشی محمد عزیز مئے، دوہاڑی (مئی)، رانا محمد شاہ، پورے والا (جون)، آفتاب احمد نصیر اشرفی، راجپوت (جولائی)، رضا احمد خان امان، بمبک
(ستمبر)، عظیم سیّد محمد رضا شانیوی (اکتوبر)، کوثر اسلام، صوابی (نومبر) اور سر ندیم اقبال، منشی مگن امریکا (دسمبر)۔ خواتین تہرہ نگاروں کی
تفصیل کچھ یوں ہے کہ 20 خواتین کے صرف 32 خواتین خطوط شامل ہیں خیال تھے۔ ایما نے رازا شاہ، شبنم بیگل، مشعل جہاں، نازی نازیہ،
سیدہ شاہدہ شاہ، رابعہ کوثر، بشری افضل، امیرج طاہرہ، انیلا طالب، ارم نازہ، نسیمہ بشیر، لکھی سیدہ حمیرہ، کوب، ماریشہ غزل اور رابعہ امجد نے محض

ایک باہری کی شرکت کی۔ کساہرا، صوبی شاہ، ڈاکٹر ودیش، نقیس انصاری اور فریدہ افتخار کے دو دھولو شاخ ہوئے اور خاتین میں سدرہ بانو کی شادی بھی مستقل حواشی سے ڈٹی ہوئی ہیں۔ سدرہ بانو کے دو دھولو ”معبر خیال“ کی زینت بنے۔ تو کبھی ”معبر خیال“ کی کارکردگی شکر مٹھریے ذرا یث کر دے تو کبھی ایک نغمہ دیکھ لیجیے۔ 196 کے بعد 110 حضرت اور اسی خاتین کے نام شامل ہیں۔ کل تعداد 148 رہی۔ بیت بازی میں 218 اشعار کیل چو اس جب کہ 96 اشعار فی میل چو اس کی۔ شاخ ہونے والے لاشعاری کل تعداد 314 تھی علاوہ بچ بیاباں سال ہجر کے بارہ شانوں میں شخصیت، خراج تحسین، خواہش، ناکام، تحریر، خاص، عزم، حوصلہ، مملوآت، تبادول، تذکرہ، نظم، غزل، دلچسپ، عجیب، غیر ملکی، بارہ وادو جب، تاریخی واقعہ، جنگ عظیم، حیرت انگیز، ایمان، افروز، مشکل راہ اور دشواریات، تجربہ کے موضوع پر کل 114 تحریریں شاخ ہوئیں، جن میں سے 87 تحریریں 41 مرد مصنفین کی کہیں ہوئیں جس جب کہ 27 تحریریں آٹھ خاتین لکھاریوں کے قلم سے تحریر ہوئیں۔ مرد مصنفین کی تفصیل کچھ اس طرح سے رہی، جن مصنفین کی سال بھر میں صرف ایک ہی تحریر سرگزشت میں چھپی ان کے نام یہ ہیں۔ شاہد لطیف، صدان اور محمد کبیر عباسی، یوسف وسم، ابو الفتح راہتویں، ولید جبریل الدین، عمر جٹ، شوکت رحمان، خٹک، اختر اسلم وکی، کوثر اسلام، زاہد شمس، شمس جعفری، مبارز باہی، یاسر احوان، کاشف زہرا، ان عفا، افتخار ساجد، چوہدری قمر جاوید علی پوری، سجاد، خان، انصاف عباس، وحید ریاست، سہیلی، شمیم الدین بخاری اور ان کی کثیر۔ جن مصنفین کی دو دو تحریریں شاخ ہوئیں ان کے نام یہ ہیں۔ شیراز خان، اقبال باہائی، عبداللہ احمد حسن، عاقب اشعر، سید غائب، اعظم فاروق ساحلی اور امجدو کبیر۔ جن میں تین تحریریں ہوئے والے مصنفین میں سحر امام، وسم بن اشرف، بخوبی ریاض، اے آر راجپوت، شکیل صدیقی کے نام شامل ہیں۔ ذہن مہدی کی بھی تین تحریریں شاخ ہوئیں اور طارق عزیز خان کی بھی تین ہی مضامین شاخ ہوئے۔ ڈاکٹر ساجد امجدو سات مضامین کے ساتھ تشریحی پوزیشن پر رہے اور دوسری پوزیشن حاصل کی سید اشتیاق نے۔ آپ کی تو تحریریں سرگزشت کا حصہ ہیں اور بڑا لکھاری اور فرہاد نے مسلسل بارہ مضامین لکھ کر پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 8 خواتین لکھاریوں کے 27 مضامین کی تفصیل کچھ یوں رہی کراحت، وفاراجپوت، مکران صدیقی، اوسینہ و اشتیاق کا ایک ایک مضمون شاخ ہوا۔ ضیاء تنیم بکری اور فرزانہ جت کے دو دو مضامین شاخ ہوئے۔ زیر قمر کے تین مضامین چھپے جب کہ کسلی احوان کی پانچ تحریریں سرگزشت میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہریں اور ان پ پر ہیں۔ محترمہ زویا امجدو صاحبہ جنہوں نے مسلسل بارہ ماگ تاراجی تحریر چھپوائی اور یوں خواتین لکھاریوں میں ٹاپ پر ہیں۔ سال ہجر کے بارہ شانوں میں کل 108 بچ بیاباں شاخ ہوئیں جنہیں لکھنے والوں میں سے پورے نو آموز و تجربہ کار مصنفین شامل کی۔ 70 کہانیاں مرد مصنفین نے لکھی تھیں جبکہ 38 خاتین لکھاریوں کی تھیں۔ قابل ذکر ناموں میں افتخار احوان، اعجاز احمد راہیل، محمد فاروق انجم، حبیب الرحمن، محمد سلیم، اختر اسلم وکی، رؤف، ارم آرا میں، فضل خان کی دو دو تحریریں شاخ ہوئیں۔ عاطف شاہ کی بھی دو کہانیاں شاخ ہوئیں۔ غلام رضا جعفری اور فضل عادل کی تین تھیں کہانیاں۔ دیگر نیشا معروف و تجربہ کار مصنفین میں نوشاد عادل، ساجد صدیقی، علی اختر، طارق عزیز، خان، عاقب اشعر، ذہن مہدی، سجاد خان، محمد سلیم اختر، کرن صدیقی، وائسہ صدیقی، شمیم طاہر، بٹ، افسانہ، آفتاب کاش، مہیر انجم، نسreen اختر، نیما، مارخ، رباب، نبی فردوس اور کثیر ذہرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ظفر احمد خان کے قلم سے بھی تین ہی کہانیاں شاخ ہوئیں۔“

ہا قاعدگی سے شامل ہو رہی ہیں۔ ان کا یہ ذوق اور شوق دیکھ کر مستقبل میں ان سے بہت توقعات وابستہ ہیں۔ ایک اچھی لکھاری، شاعرہ، ادیب کی صورت میں۔ ایسے دور میں جب کہ سارٹ موہاں ہماری زندگیوں میں حد سے زیادہ داخل ہو چکے ہیں اور مطالعہ کتب کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا یہ جذبہ قابل قدر رہے۔ دیکھ کر خاتون جن کے خطوط ”عمر خیال“ میں شامل ہوتے رہے وہ جیسے اربع قاطرہ، ایلا طالب، راجہ احمد ڈاکٹر دینہ انصاری۔“

☆ ناصر حسین رند نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ”خود ساز“ نمبر کا اشتہار دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اس سال پر اسرار خیر میں بہت کم شائع ہوئیں۔ حالانکہ کافی سارے قارئین شہت سے یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ ہر مہینے ایک پر اسرار خیر شائع کیا کریں۔ سب سے پہلے اس سال کی پہلی پر اسرار خیر ”دیالی“ جو بیٹیا اس سال کی سب سے زبردست اور خوفناک تحریر تھی۔ گلگت بلتستان سے ایک خوفناک چڈیل کا قصہ جس نے سردراتوں میں پورے علاقے کو دہشت میں مبتلا کر دیا تھا، ایک یادگار مرکز شہت جو مدتوں یاد رہے جانی ہے اور ”ٹیک“ مغرب سے ایک عجیب غریب کہانی۔ فردوسی میں ”آتش موت“ پر اسراریت تھری عجیب اموات کا تذکرہ۔ لوگ دہشت ناک طریقے سے خود بخود جل کر بھسم ہو جایا کرتے تھے۔ ایران کن واقعات۔ مارچ 2018ء ”انگوری“ ایک ماسرار کہانی انگوری کی بددعا نے ایک گمانے کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ ”مئی“ نا قابل یقین، کٹر اسلام کی لکھی کی حیرت انگیز واقعات تحریر پر ایسے واقعات جن کی توجیح ندی جا سکی۔ ”ہائیڈ“ ایک خوفناک آئیپ نے اسے جکڑ رکھا تھا ایک خوفناک بلا کا ذکر خاص، (جون) ”جہان ونگر“ اشیر از خان، ان مقامات کا تذکرہ جو آج بھی اسرار کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں (جولائی)۔ ”پر اسرار مخلوق“ کاشف زہیر کے قلم سے ایک خوفناک برہانی مخلوق کا ذکر جس نے پورے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی (اگست)۔ ”پارن عجیب“ چنڈا بھل واقعات عجیب و غریب بارش کا تذکرہ۔ ”انجام“ کا لا علم کرنے والوں کا عبرت انگیز انجام ایک عجیب کہانی (نومبر)۔ عظیم اقبال صاحب کی جدائی اداس کر گئی۔ ”آہ“ ششال سے ”نوٹو“ انوار عمنوہ باقی قلم کار، مدت سے تھا انتظار اچھی پڑتے ہیں میرے بار۔ دل میں فن۔ نازلی ناز یہ اور مشکل جہاں آپ کا بہت شکر ہے آپ نے ہمیں یاد رکھا۔ اسی طرح عظیم اقبال صاحب، امیر معزہ اشرف، سعید ڈیٹان حیدر کاظمی، قیصر خان، عامر ساحل، محمد شمس بڑے، سفید خان، رانا شاہد، عبدالجبار رونی، اعجاز حسین شمار، آفتاب احمد نصیر، ذابت افشار اور سردارہ نونا گوری کا بھی شکریہ۔“

☆ وزیرہ ظفر کاغلوں نامہ نگار نے لکھا ہے۔ ”مرکز شہت کے لیے میری پہلی تحریر ہے۔ میں نے اپنی طرف سے تو بہت اچھے طریقے سے لکھا ہے مگر یہ ذکر میری تحریر مرکز شہت کا حصہ بن سکتی میرے قلم میں عجیب سی تحریر آہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ بہت سارے سینئر مصنف اور انٹرنز کے مشورے پر میں آپ کی طرف تحریر بھیج رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں اسے سینئر انٹرنز جہاں پر لکھتے ہوں وہاں پر تحریر بھیجیں۔ لیکن سب بہت زیادہ کنٹرول کر رہے ہیں کہ آپ آزما کر تو دیکھیں، سوئس نے بہت ہمت کر کے آپ کی طرف تحریر بھیج دی ہے۔ اصلاح کر کے میری حوصلہ افزائی کریں۔ میری آپ سے بھی بات نہیں ہوئی مگر جن لوگوں سے بھی بات ہوئی انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بہت خوب صورت باتیں بتائیں۔ آپ کی تصویر میں نے بھی ڈائجسٹ میں دیکھی ہے، تصویر سے ہی آپ کے انداز کا پتا چل رہا تھا، باقی، اچھا دل، اچھا دماغ، اچھی سوچ (تحریر پڑھنے کے بعد ہی بتا سکوں گا کہ تحریر شامل اشاعت ہو گئی یا)۔“

☆ اعجاز حسین شمار نور پور قسمل سے لکھتے ہیں۔ ”نوٹوں کی محفل میں عدم اقبال، رانا محمد شاہد، عبدالجبار رونی، عبدالحمید شمر، اعجاز حسین لودھیانہ اور ذابت افشار نے یاد کیا، ہر لہرا اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان تمام مہربانوں کے لکھے تبصرے قلم و تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مشورے بھی قابل غور ہیں جن میں دلچسپی اور معلومات کے پہلو ہیں۔ ”ششال سے نوٹو“ کی آخری قسط پر نظر پڑی تو محسوس، خدشات اور دل کی دھڑکن بڑھ گئیں۔ میری پیش گوئی درست ثابت ہوئی وجہ جو بھی بنی، سرین سے بیٹھ کی جدائی سہنا پڑی، ساری ریاضت، وعدے، منصوبے اور خوشیاں ایک فون کال نے ریڑھ پر ریڑھ کر دیں بھلا رو گئے کا کوئی بہانہ، بندھن اور رشتہ تھا۔ ایران میں سرین پر کیا بیچ، معمولی اشارہ بھی نہیں دیا کیا کہ کسی ڈیجیٹر میں جس نے جکڑ لیا۔ میں ہم نے اپنے اندازوں سے ایک تصویر بنائی ہے کہ بھائی نے اپنے اعتبارات استعمال کر کے بہن کے پرکات دیئے۔ یوں اس کا شہنا، پھڑکنا اور گھس سے گھرا تا ہے جتنی ہو کر رہ گیا۔ مجبور یوں کی ایک لکھی فہرست میرے سامنے ہے کہ مجھے کتنے حالات، ماحول اور قریب رہنے والے لوگ بھی ماضی کی یادوں پر ٹپنی ڈالنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں جو بھی ہوا، برا ہوا اور اچھا ہوا کہ یہی بچے صدیوں سے جگے، اتحاد کا بھرم رہ گیا، عدم اقبال نے مختلف مقامات کی جیسے سٹریٹیجی، کہانی کے مرکزی کرداروں کے دلی جذبات، احساسات، مستقبل کے خدشات اور موقع بہ موقع سرین کے سراپا کی تصویر کھینچ کر پڑھنے والوں کے سامنے رکھی تو یہ ستر کہانی سے بڑھ کر دیوانی تحریر دکھائی دی۔ میں ایران کے متن شہروں زہانہ، تم اور شہدیں بسلسلہ زیارات دس دن قیام پڑے، براہ راست ایران کی جوان لڑکیوں کا حسن مہکوں اور ابرے مثال ہے ان کی انسان دوستی اور شہدیں پر بندہ شہر مند ہو جاتا ہے، مگر جو شہدہ موصوف نے کھینچا ہے خود ساز کہانی اعتبار کرنے والے لکھاری کی جاوید سید کی یاد تازہ کر دی۔ وہ لاہور کے ایک ماہانہ میں کہانی لکھتے ہوئے ایسا اعزاز پانے کا شاہکار محقق ہو جاتی تھی۔ عدم اقبال جیانی نہیں تو وہ دل کی آنکھوں سے پڑھی جائے گی میری طرف سے یہ ستر ملاحظہ،

سرگوشیوں میں بولنے لگا اور قارئین سے مجھے سمیٹا مبارک ہو۔ ”گوئلن کرل“ میں انور قرہا نے کس قاتل کا قصہ چھیڑ دیا، کیا حسن اداکاری اور تین ٹھن ٹھن دلوں پر راج کرتی تھی، قتلوں کی کامیابی، نا کامی، الگ بات ہے کیونکہ اس میں کسی دوسرے عمر کا ہوتا ہے جس لیکن باہر شریف کی صلاحیتوں پر کیے آگے بند کی جاسکتی ہے اب یہ سستی تفریح خراب و خیال بن گئی ہے۔ پہلے فلمیں دیکھنے والے جوانوں کو لوگ بلکہ والدین بھی آوارہ اور مشکوک کردار کا سمجھتے تھے۔ سنی حریت کی بات ہے فلمیں نہ دیکھنے والے جوان میں برائی، آوارگی اور ہراساں سرگرمیاں زیادہ ہیں، وقت کیسے کیسے گزرتا ہے میں دکھاتا ہے کہ وہ کون ہے سوچنے کی ساری صلاحیت ہاتھ بوجھ جاتی ہے۔ ”ناسور“ میں حسب توقع نعمان ایک مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہیں تو مسائل کے دوسرے کڑے میں جا کرتے ہیں۔ چکی کی بجائی ”فریجی“ دیکھی کر گئی ایک ڈیٹا بنی حکایت نہیں بلکہ حسرت کو موضوع میسر ہیں اور حالات اجازت دیتے ہیں تو وہ چند لاکھ رقم آستانے میں جاکر نہیں سمجھتا، اسے دوسروں کے حالات، جذبات اور مسائل سے کوئی غرض نہیں، تو کبھی اس کے چال سے بچ کر کل آئی ہے لیکن شادی اس کی ضرورت ہے، بھائی کا دوست، بھائی کی آنکھیں بدلے دہر نہیں لگے کی وجہ وہ کئی چنگ بین جاتے کی اور بھیجے، بولنے اور دوسرے میں لینے کے لیے ہراساں غیر ہاتھ بڑھاتا نظر آئے گا۔ ”حافظ“ میں تیمور نے ستار کی سولی خیرت چکا دی اور دوسری کا احساس دلا کر انھیں کھول دیں۔ کالے خان، باصول غلط تھا اس نے حالات ناموافق دیکھ کر ہسپتالی اعتبار کی لیکن اس فیصلے سے عزت بڑھائی اور قہر اوجھا ہوا لیکن ہر جگہ اور موقع پر ایسا نہیں ہوتا، یہ سفاک لوگ لاشیں بھی کر دیتے ہیں، آخر کار بوزدگی چلانا ہوتا ہے۔ یوں اخلاق دکھانے کے حقوق کی پاسداری کرنے لگے اور ہسپتالی دکھاتے رہے تو چل گیا اور باہر غلط کردی اور بدحاشی کو فروغ حاصل ہو چکا ہے۔ اگر حقائق، اختیارات اور وسائل ہیں تو کمر لینے کا رنگ لیا جاسکتا ہے ورنہ دوری اعتبار کر لیتا ہی آخری حل ہے۔ ”ایک خواب تھا“ کے ڈاکٹر احمد کی کوئی بڑا دیکھ کے بھی مجھے مظلوم اور بے قصور نظر آئے، سوچنے کی بات ہے اگر اس کی جگہ ہم ایسے حالات کا شکار ہوتے تو کیسے شے، کیا مل لگتا ہے اور سارے فریقین کو مطمئن کر کے سرخرو ٹھہرتے۔ دوسروں پر تنقید آسان ہے جب اپنی ذات کا مسئلہ ہو تو ہم خود غرض بن جاتے ہیں۔ یہاں سلطان کے سرسار اور شوہر اکرم کا کردار قابل گرفت، نا انصافی پر مبنی اور بددھرمی والا ہے۔ کیا مریم بھی شریف، وفادار اور شوہر ہے جو چاہی حد تک محبت کرنے والی بڑی کسی کا بھی انجام ہے؟ ہم اپنی دوسرا یوں کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں قابل عقیدہ معاشرہ ٹھیک بنا سکتا ہے۔ ”رم“ میں چھوٹے کی سلی کی توقع رکھتے بغیر کتے کے لیے کی زندگی بچائی جس کا انعام بھی پایا لیکن اس زمین پر ہتھی زیادہ تپاں، ظلم، نا انصافی اور تنگی کی جاری ہے۔ لوگ زمین پر دم کرنے کے امکانات تلاش کرتے ہیں۔ اگر آسان والا ہماری نافرمانی، بے پروائی اور کوتاہ دیکھ کر دیکھ کر بھی بے پروا کیا تو فریاد لے کر کس در پر جائیں گے۔ اگر آج ہی اپنا قتلہ دوس کر لیں تو ہزاروں گنا انعام کے حق دار ٹھہریں گے۔ دعا ہے نیا صیوی سال ہم پر، پاکستان اور عالم اسلام پر آسائیاں لائے۔“

☆ اولیس شیخ کا کھٹا شور پورہ ہے۔ ”تکبیر و شام صاحب اور اگلا حسین لدھیانہ کا تہ دل ہے شہر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے غلط کو پیند کیا۔“ ”معمبر خیال“ ”مدارت پر اس بار ہم اقبال برا بھلا تھے جو ہمیں اپنے ادبی سفر کی نگاہ سے تھے۔ ان کے سفر نامہ کی تکمیل پر بہت مبارکباد، رانا شاہد اور نزات افشار میں یہ بیان نہیں کر سکتا ہوں کہ کیا میرے لیے کیا تھے؟ ”اداریہ“ میں آپ اس دفعہ اہم موضوع لے کر آئے۔ ہم سب کو اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔ ”ہر فرد کے ملے کے مقدور کا ستارہ“ ”بس ہمیں یہ دعا کرتا ہے۔“ ”آزاد خیال“ کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ”پانچویں ٹکڑا“ کی کھپڑی، منٹو کے بھائی محمد جلال نے ”منٹو ماموں“ کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا جس میں انہوں نے لکھا تھا ”میں منٹو کا ماموں بھی اپنے نام کے ساتھ منٹو پر کڑ دکھاتا کیونکہ یہ اب کوئی خاندانی نام نہیں رہ گیا ہے، بلکہ ایک فرد واحد کی ملکیت بن چکا ہے۔“ اور منٹو کے اس جملے میں بھی جلا کا اضافہ تھا۔ جس میں میرا کوئی دانی پیدا ہوا تو میں لکھتا چھوڑ دوں گا۔ ”رکستے والا“ میں ایک ٹیک لی کے کردار نے بہت ستار کیا۔ عمر کے آخری حصے میں جا کر بھی بے آسرا لوگوں کی خدمت کا جذبہ لائق تحسین تھا۔ ”بوڑھا ماموں“ کی دواد حیات پڑھی۔ وہ پورٹریٹ پر تو رنگوں سے انجلیاں کرتا تھا لیکن اپنی بے لیک زندگی میں کوئی رنگ بھرنے میں ناکام رہا۔ ”لفٹ بکر“ محبت، بغاوت، بے کسی اور بے گیری کے احساسات و جذبات سے بھر پور داستان حیرت زدہ کر گئی اور راج کے فیصلے میں لفظ قربت و داری تو پوری انسانی نفسیات کو لکھ دی۔ اس طویل کھانی میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ پڑھتے ہوئے کسی بھی لمحے آہ تپ کا احساس نہیں ہوا۔ بچ بیانی ”فریجی“ پڑھی۔ ایک شوہر جو اس دنیا میں موجود نہیں ہے، ایک شوہر جس کے دیئے اور دے دے کی تکمیل کے لیے جسم صبر نے خود کو مضبوطی و اصحاب کی مالک ثابت کیا ہے۔ ایسی قربانی بھائی ایک ماں اور ایک عورت ہی دے سکتی ہے، شاید باپ بھی۔ جسم کی نیت فیک کئی گوارا ہم اس لیے دے دو کہ سے بچ گئی۔ ”حافظ“ پڑھ کر اعزاء ہوا ہے کہ مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، اس بچ بیانی پر تو کٹ۔ ”ایک خواب تھا“ جس کی تعبیر ایک مجھ سے تم نہیں تھی، لیکن وہ تعبیر مقدر کے ہاتھوں مات کھا گئی۔ احمد کا فیصلہ اچھا ہی بنا۔ لا نہ، احسان اور منافقت تھا۔ ایسے برصغیر کے ایک حصے میں جا کر ایسے فیصلوں پر بہت چھتا ہے ہیں اور پھر اپنی فیصلوں کا غم لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ”رم“ ابھی کہانی تھی لیکن ہم لوگ تو انسانوں پر دم نہیں کرتے ہیں، کیا جانور۔ ”بھرتھ“ مکمل لاتی سنی اور موثر پڑھی۔ ”ملاقات“ پڑھی۔ جہاں ایک جگہ زمین شاہ سے نفرت ہونے کی تھی لیکن آخر میں اس کے ساتھ جوہا اس پر

بہ حد ترس آیا۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے، کہیں بھی جھوٹا ہو سکتا ہے، بس انسان کو برے وقت کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔“

☆ رحمت اللہ اعوان ڈیرا اسماعیل خان سے رقمطراز ہیں۔ جاسوسی، سپینس اور سرگزشت باقاعدگی کے ساتھ آتے ہیں۔ سرگزشت نومبر 2018ء میں ”عظیم خیال“ والے صفحے پر ”معزز قارئین کے لیے“ کے عنوان سے قلم کاروں کے لیے ایک اشتہار دیا گیا۔ میں نے 42 سال تعلیم کے صفحے میں بحیثیت استاد، بحیثیت ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول، بحیثیت پرنسپل یکینڈری اسکول خدمات انجام دیں۔ عید الاضحیٰ کے بعد بحیثیت وائس پرنسپل پنجاب گروپ آف کالج ڈیرہ اسماعیل خان کیسپس سے فارغ ہوا ہوں۔ ریڈیو پاکستان ڈیرہ اشپن سے تقریباً 140 ناک نشر ہو چکی ہیں۔ شاعروں، شاعرات، مذہبی اسکالر، بشمول شاہ فیصل مرحوم، والی اردن، شاہ مصر، شاہ ایران کے انٹوگراف موجود ہیں۔ اب مکمل طور پر پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوں۔ اس سرگزشت کے اشتہار کو پڑھا، میں آپ کے ڈائجسٹ کے لیے کیسے مہم و معاون بن سکتا ہوں؟ (آپ سرگزشت کے لیے تحریر بھیجیں۔ پڑھنے کے بعد ہی مشورہ دے سکوں گا)“

☆ ڈاکٹر بشری عادل کا تجزیہ کیا جی ہے۔ ”کئی سالوں سے سرگزشت پڑھ رہی ہوں، یہ ایک ذہن رست و ڈائجسٹ ہے جس میں پڑھنے کے لیے بہترین مواد ہے میں آپ سب کو مبارکباد دیتی ہوں۔ ”عظیم خیال“ میں پہلی بار شامل ہو رہی ہوں۔ اس بار ”باقی قلم کار“ زیادہ اعجاز نے کمال کر دیا۔ منو کی زندگی کا احاطہ کرتی بہترین تحریر ہے۔ ان کی جدوجہد اور انسانک زندگی کے بارے میں خوب صورتی سے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ شاید کوئی اور ایسی تحریر نگاہ نہیں سکتا۔ ”نرسے والا“ میں خوب ریاض نے خاموشی زبان سے بہت عمدہ پیش کش کیا۔ ایک یوزر خاص شخص اس طرح سے مکمل طور پر قربانی دیتا رہتا۔ ایک قائل تقلید کام ہے۔ اتن کیری کی ”یوزر خاص مصور“ بھی ممتاز کیا۔ ایسی تحریریں آتی رہنا چاہیے۔ انور فرہان نے ہمارے زمانے کی سہرا شاہ بارہ شریف کے بارے میں لکھ کر وہ فائنٹ یا دولہا واجب ذوق و شوق سے سنیما گھر میں قلم دیکھنے چاہا کرتے تھے۔ کیا زمانہ تھا اور کیا زبردست فلمیں ہوتی تھیں۔ ندیم اقبال کا ستر نامہ ”شیشال“ سے زور تھا۔ ”انجام کوہ پیا پیا شندم اقبال“ نے سفر ناموں کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ بچے جانی، اڑتے پندے، تاریخی حکامرات اور خوشنما چہروں سے سجے شایک بال، وہ ہمدرد، ہر جگہ ساتھ رکھے اور جب نرسین کی نغمہ محفوں میں جھانک کر کچھ کہتے تو ایسا قاسمی کے حصار پر پیشگی کوئی معصوم صورت باور آجاتی۔ ان کے اگلے سفر نامے کا انتظار رہے گا۔ ”محافظ“ ہمارے معاشرے کی تصویر ہے جس میں صرف صحت والا ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ آخر میں کہوں گی کہ اتنی کم قیمت میں ادارہ ادب کی بہترین خدمت کر رہا ہے ورنہ ایسے وقت میں جب سب کے ہاتھوں میں موبائل ہے میں یہ ن بارے پڑھنے کا موقع دے رہا ہے۔“

☆ رانا محمد شاہد نے پورے والا سے لکھا ہے۔ ”مجموعی طور پر سرورق و گلش تھا۔ سرگزشت کی یہ انفرادیت ہے کہ کثرت سے موضوعات پر خصوصی نمبر نکالتا رہا ہے۔ ایک اور ”خود ساز نمبر“ کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ اس نمبر کے لیے تحریر تک تک بھیجی جاسکتی ہے (تحریر بھیج دو، تحریریں جمع ہو جائے گے بعد چھاپا جائے گا کہ یہ شمارہ کس مہینے آئے گا) ادارے میں صحرائے رسول صاحب نے درختوں کی کٹائی کی وجہ سے انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت آکسیجن کے کم ہونے کو موضوع بنایا۔ انسان قدرتی زندگی کے دور ہو کر مصنوعی زندگی کی رہا ہے۔ اقوام متحدہ نے کہا ہے کہ کسی بھی ملک کے لیے جنگلات کل رقبے کا کم از کم 12 فیصد ہو۔ بین الاقوامی معیار طے ہوا جب کہ ہمارے ہاں صرف تین فیصد ہے جو یقیناً آئندہ کٹاؤں کا مصروف ہے۔ کتنے درخت ہماری انفرادی غلطی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ انفرادی غلطیاں سدھارتا ہوں تو انفرادی عمل سے ہی انسان کا ہے۔ سدھار میں اجتماعیت خود بخود آجاتی ہے۔ ہمارے ہاں اہم شروع ہوئی ہے دس ارب درخت لگانے کی جب کہ ہمارا ایلہ یہ بھی ہے کہ جگر کا ری رسم رہی، جذبہ اور تحریک نہ بن سکی، درخت ہماری اور آنے والی نسلوں کی بھاء کے لیے بہت ضروری ہیں۔ سید اہاؤں مرزا کی ایک نئی سرگزشت بہت دلچسپ رہی۔ خصوصاً باب کی بیٹے سے محبت کے چلتی ٹرین سے چٹانک لگا دی۔ سید صاحب کی بہت کوئی سلام کہ ابتدائی عمر میں ہی والدین کے چھڑنے کے باوجود جدید مسئلے سے بلند مقام حاصل کیا اور ساج کو بہتر کرنے کی سعی بھی کرتے رہے۔ ”عظیم خیال“ کی صدارت پر ندیم اقبال کو لکھ کر خوشی ہوئی۔ اودھائی ملاقات یعنی آخری خط کے موقع پر یہ بھی سرگزشت کا انہیں اعزاز تھا۔ بھائی مینن ہوتا اپنے قارئین سے مکمل جوڑے رکھے گا، والد صاحب کے لیے دعا پر شکر گزار ہوں۔ سدرہ بانو ناگوری لکھائی بار ایک کی مجموعی پڑتو بہت اچھی ہے۔ عبدالحکیم شر آپ بھی اچھا لکھتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! ”عظیم خیال“ کے ساتھیوں کے تعارف کے لیے اولیت دینے پر تہجد سے شکر گزار ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔ طاہر کریم اور ادیس شیخ کے بھرے بھی اچھے رہے۔ رضا احمد اعوان کا خط 16 دسمبر 2014ء کے آری پبلک اسکول کے سامنے پڑھا۔ یہ دن یقیناً پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا کہ جب ڈیرہ سو کے قریب پھولوں کو سل دیا گیا۔ اعجاز حسین لدھیانوی، نوابت الشال اور اعجاز حسین سمار کے خطوط بھی روائی اعزاز کے تھے۔ یہی سچ ہے کہ سعادت حسن منٹو معاشرے میں پھیلے نند کو انعام کا روپ دے کر حقیقت آشکار کرنا رہا۔ منٹو پر کئی خدمات سنے گئے کہ وہ فاضی پھلپلانے والا افسانہ نگار ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ منٹو کو بھونے اخلاق، بھونے کردار اور بھونے جذبات سے نفرت تھی۔ اس کے فن کی بنیادی جہت حقیقت نگاری تھی۔ منٹو کو دہشتا تھا کہ ”ماحول کا زہر مجھے میں بھر گیا ہے“ اس لیے میں زہر اٹھا رہا ہوں۔ ”ڈیرا اعجاز کا نامہ انجمن انجمنی بہترین تھا۔ خوب ریاض نے ایک غریب رکھنے والے کی کہانی لکھی۔ کہتے ہیں کہ جرأت اور حوصلہ نہ کسی کی میراث ہوتا ہے اور نہ کسی عمر کا

محتاج ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ ہی تو ہے جو ایک مظلوم الحال 90 سالہ شخص کو بھی بڑا دل میں انقلاب لانے کی راہ دکھاتا ہے۔ بالی فنگ کا کردار اور قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ امیر رئیس کا مضمون "تاریخی مقابلے" مطبوعاتی تھا۔ انہوں نے مضمون میں کرکٹ کے ایک ٹچ کا ذکر کیا۔ سفر ناموں کی تاریخ میں عظیم اقبال ایک دلچسپ و منفرد سفر نامے کا اضافہ کر گئے۔ امید ہے وہ کمی نہ کی صورت سرگزشت میں آتے رہیں گے۔ ابن کبیر نے ملک کے نامور مصور اور افسانہ نگار قہدق کی سبیلی کی زندگی پر بہت خوب صورت تحریر لکھی۔ زندگی کے مختلف رنگ دکھائی یہ تحریر پھر پوری دیکھی لیے ہوئے تھی۔ انور فراہ اس دفعہ ماضی کی پاکستان قلم افسر شری کی مصروف اداکارہ ہادیہ شریف کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ ہادیہ شریف اپنے چھوٹے قد اور جانوروں سے محبت کی وجہ سے بھی شہرت رکھتی ہیں۔ البتہ اداکاری کے میدان میں ان کا قد ہمیشہ اونچا رہا۔ بی بی ڈی کے دنوں میں ہر ہفتے آنے والی فلموں میں بے شمار فلمیں ہادیہ شریف کی بھی دیکھیں۔ انسان کی ماضی کی ہونے لگیں کا بھی ہرگز ایک ماں کے جذبات و احساسات اسے بچ کے لیے ویسے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جس کی قربانیاں بے مثل اور جذباتی اصول ہوتے ہیں۔ سید احتشام کی "خفت جگر" بھی ایسے ہی جذبات و احساسات میں گندمی ایک دلچسپ تحریر تھی، مطبوعاتی سلسلہ کا آغاز بھی اچھا ہے کہ یہ بہت سے قارئین کی فرمائش بھی تھی۔

☆ محمد اشفاق نے سرائے کا شہر شعلہ کجرات سے لکھا ہے۔ "دسمبر 2018ء کا سرگزشت 20 نومبر کو ہی ال گیا۔ خط لکھنے کی وجہ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ تھا جس نے مجھے اطمینان دیا کہ ہم اپنی باریستا۔ میری نظر میں قہرور ان کے نہیں بلکہ ادارے کا ہے جس نے سلسلے دار کہانیوں کے اشتہار اپنے پڑچوں میں دیتے ہوئے کر دیے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ جس جس مصنف کی سلسلے دار تحریریں سنسن، جاسوی، سرگزشت میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اشتہار باقاعدگی سے پڑچوں میں شائع کیے جائیں تاکہ نئے پڑھنے والوں کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ "خود سرفراز" کا اشتہار دیکھا۔ سب سے پہلے 25 سال سے ہر کچھ عرصے بعد خط لکھتا ہوں میرا آخری خط مئی 2016ء کے سرگزشت میں شائع ہوا تھا۔ ہر بار میرا مطالبہ ہوتا ہے کہ سنسن، جاسوی، سرگزشت کے جنوری کے شمارے خاص شمارے ہوں۔ صفحات 360 سے زیادہ ہوں اور قیمت 50 روپے۔ سلسلے دار کہانیوں کے ادارہ دیکھیں زیادہ صفحات کا خاص شمارہ شائع کرنے سے خوفزدہ ہے۔ آپ سرگزشت کے قارئین سے پوچھ لیں اور خاص شمارے کو خاص نمبر کی صورت میں شائع کریں۔ صفحہ 375 اور قیمت 160 روپے پہلے پچھرا ہوا رسول سے پوچھ لیں، پھر سب سے مائے لیس کے عظیم اقبال صاحب کا سفر نامہ میں آپ نے ان کی آپ اپنی شائع کروائی۔ "ناسور" اچھی جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کمال کر رہے ہیں۔ ہاں محترم اطمینان کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہم کو ان سے "مفرد" اور "موت کے سوداگر" جیسی سلسلے دار کہانی چاہیے۔ چند صفحات کی کہانی نہیں چاہیے۔ سرگزشت ایسا پڑچا ہے جو میں مکمل پڑھتا ہوں۔ منٹو کے باپ نے اس سے بڑی زیادتی کی، اگر وہ میری شادی کر ہی نہ تھی تو اس کو طعنے دے دیتا۔ اسی طرح "نور سے مصور" سے بھی لوگوں نے بڑی زیادتی کی۔ نرہاد صاحب بھی ہر بار اچھا لکھتے ہیں۔ ہادیہ شریف پر خوب لکھا۔ گزارش ہے کہ بڑی ملک میں بھی بہت سارے مسلمان فنکار کام کر رہے ہیں۔ ان کی طرف بھی توجہ دیں۔ ویسے تو آفاقی صاحب "طبی الف لیلہ" میں ہر پاکستانی فنکار کے بارے میں خوب لکھ چکے ہیں۔ پھر حال سے پڑھنے والوں کے لیے اچھا سلسلہ ہے۔ آپ آخر میں ایک خصوصی گزارش ہے کہ جتنے مصنف سنسن، جاسوی، سرگزشت میں لکھ چکے ہیں ان کا تعارف اگر سرگزشت میں باری باری کر دیا جائے تو کیا ہی بات ہوگی۔ ہم چھ لوگ جو پچھلے تیس سالوں سے مسلسل پڑھ پڑھتے جا رہے ہیں، اپنے لکھنے والوں کو بھی جان لیں تو اچھا ہے۔

☆ سید امتیاز حسین بخاری نے سرگودھا سے لکھا ہے۔ "اداریہ نگار" لکھتے ہوئے کے ساتھ ساتھ ایک متحرک سوچ کا غماز تھا۔ ہمیں پاکستان کو سرسبز و شاداب بنانے کے زیادہ پورے اور درخت لگانے ہیں تاکہ ماحول کی آلودگی کم ہو، ہر صبح آسکین میں سانس لے سکیں جو زندگی کے لیے مقدم ہے۔ اس کے بعد "آزاد خیال" پڑھا۔ جو عرق ریزی اور سخت مشاق سے لکھا گیا تھا۔ حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد کے قابل غور و زائر ہیں۔ سید شاہ فریاد آج بھی پہلے آزاد خیال تھے اور فرد واریت کے بجائے اتفاق و اتحاد کے داعی تھے۔ اب تو ہر جگہ جموت کا بازار گرم ہے۔ ملک نہایت نازک دور سے گزر رہا ہے اور مسلمانوں کے درمیان سے باطنی محبت، احترام، خلوص، ہمدردی کا جذبہ اٹھ گیا ہے۔ پاکستان کی سلامتی و استحکام کے لیے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں اور اپنے درمیان کے کشیدہ اثرات و اختلافات کو طویل عرصہ پر ہرگز نہ پڑنے دیں۔ "معمبر خیال" میں داخل ہوا مسند صدارت پر مجرم ندیم اقبال جلوہ افروز تھے۔ پہلی بار ایک قلم کار نے یہ اعزاز حاصل کیا حالانکہ میں بھی قلم کار ہوں مگر اس اعزاز سے ابھی تک محروم ہوں۔ وہ اپنے افکار و روش کے موافق نکھیر رہے تھے۔ سب سے پہلے ستر کہانی "شش سال" دھڑکنے والے کے ساتھ پڑھنے کے لیے پیش کیا جو ایک ہی نشست میں خوش دم کے طے بلے جذبات کے ساتھ پڑھتا چلا گیا۔ ستر کہانی کا اختتام بہت ہی اچھے انداز میں ہوا۔ سرگزشت کے انمول ہیرے اور درخشندہ ستارے عظیم اقبال! آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔ پاکستانیوں کا کام انہیں آپ کے قدم چومیں۔ عید الجلیل کو گرامی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے "معمبر خیال" کے انمول ہیروں میں شمار کیا ہے۔ میں عالمی شہر یافتہ شاعر، ادیب، صحافی، نقاد، محقق ہوں اور عوامی غمخوار ہوں میرا کلام عطاء اللہ خان، بیٹی خیلوی، طاہر سانی، ایوب نیاز کی مگر تری خیلوی، عطاء اللہ خان، داؤد خیلوی، احمد خان، ملک، طالب حسین، درو، امیر عبداللہ خان، خانزی، امجد، نواز جمیہ، محمد عید اللہ خان، نیاز کی، بیٹی خیلوی کا مرن۔ بیٹی خیلوی اور بہت سے عوامی نوک گلؤ کا محفل موسیقی میں گاتے ہیں جو ماضی کے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔

میں سرگزشت کے ”عصمر خیال“ کے دوستوں کو پھر بھی وقت دیتا ہوں (یہ آپ کا بڑا اپن ہے)۔ ”باقی قلم کار“ زویا اعجاز کی زبردست مطلوباتی تحریر بھی دریا کو گزہ میں بند کر دیا ہے۔ سعادت حسن منٹو ایک عظیم ادیب اور باقی قلم کار تھے۔ حامد ادیب ان کی شہرت و مقبولیت برداشت نہ کر سکے اور ان کے خلاف محاذ بنالیا۔ وہ بے لوث اور مخلص قلم کار تھے۔ قلم نگری میں اس بار سحر ماہ نور فرہاد ”گولڈن کرل“ کے گرد قلم افروز ہوئے۔ قلم نگری کی اس خود ادا کارہ کی داستان جو مصوبیت کا بیکہ ہے باہرہ شریف جو محبت الوطن اور انسان دوست اصول پرست ادا کارہ ہے، ان کی سرگزشت کمال تحریر سے مزین کر کے پیش کیا جو مصلحتات کا نہیں، باہرہ خزانہ ہے۔ ”بیت بازی“ میں اشعار معیاری تھے۔ پہلی جگہ جیانی ”فرہنگی“ نادر روزگار تحریر بھی، پڑھ کر کلف اندوز ہوں۔ دوسری جگہ جیانی ایک خواب تھا جسے سحر ماہ فہد عادل نے سپرد قلم کیا تھا۔ اس کے ساتھ نیکو کے سرسرا والوں نے عجب ٹھیک ٹھاکا اور قلم کیا کہ وہ پیکر صبر و شاکر رہی۔ تیسری جگہ جیانی ”زخم“ غلام رضا حفصی کے زور قلم کا نتیجہ تھی۔ نیکی بھی بیکان نہیں جاتی۔ اقتباسات میں سید ابد حسین قرۃ العین افراسیابی کی شہت شیرازی مصلحت کا خزانہ تھے۔ باقی کہانیاں اور مضامین زیر مطالعہ ہیں۔ عہد ساز شخصیات کا عہد ساز، نمبر شدت سے انتظار ہے۔“

☆ نزابت افشال کا ڈول منہورہ تحصیل فتح جنگ ضلع ایک سے رقمطراز ہیں۔ ”ماد دیر کا شمار سعادت حسن منٹو کی تصویر کے ساتھ ملا۔ منوجس کو کافی سے نام پر باہر باقاعدہ موشوں میں الجھایا گیا وہ منٹو جس کا ایک ایک جملہ سچی باتوں کے بول کھول دیتا تھا، اہل اقتدار اور اپنے بعض ہم قلم احباب کی نظر اندازی کا شکار اور آخر کار کھانا کھانے کے لیے اجازت نہیں دیتا اور کھانا چلانے کی اجازت دے دیتا ہے۔“ منٹو بڑا افسانہ نگار بھی نہیں تھا بلکہ کسی بھی کیفیت کا مرقع کھینچنے میں بھی منٹو کو کمال حاصل تھا۔ ”مجھے فرشتے“ اور ”لاؤ ڈاچیکر“ یہ دونوں کتابیں منٹو کی بہتر کار نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ منٹو انتہا درجے کا غیر متنبہ طبیعت تھا جس نے حالات سے ٹک کر بڑی دلی ملک میں جانے کے بجائے عدم کاراست پسند کیا۔ ادارہ بھی زبردست اور ہمیشہ کی طرح نہیں ہوشیار باش کا پیغام دے رہا تھا۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ ایک شاہکار ہے انتہام کو پہنچا گو اسے مزید طول دیا جاسکتا تھا۔ قیہ قارن آخر کار عظیم صاحب کی دسترس سے نکل کر اپنے دیس پہنچ گیا، اب ہم بھی عظیم صاحب کے ساتھ نسرین کی واپسی کے خنجر ہیں۔ عظیم صاحب سے گزارش ہے کہ اپنی دوسری تحریر پیش کریں۔ ”یوڑھا مصور“ ایک داستان ہے عزم و حوصلے کی ایک ایسی ہستی کی جس نے اپنے فن کے ساتھ شوق کا ثبوت دیا۔ تصدیق کھیل جیسے لوگ ہمارے ملک کا اصل چہرہ ہیں۔ ابن کبیر بہت خوب۔ ”فرہنگی“ میں ذیشان نے مجھ کا سہارا لے کر تبسم کو چھانٹا جا کر فرہنگی کا فرہنگی بن جلدی سامنے آگیا۔ ”حافظہ“ بھی اچھی رہی۔ تیوڑھا متنازع کو بہت زبردست سبق دیا کہ اپنے کھر کی حفاظت خود کرنی چاہیے۔ ”وہ ایک خواب تھا“ زبردست تحریر تھی۔ بہر حال، عقیدہ اور مکافات بھی اچھی تحریر ہیں۔ ”نن کا اجالا“ بہت ہی شاندار اور قابل تقلید کہانی تھی۔ ”عصمر خیال“ میں عظیم صاحب کو صدارت پر دیکھ کر اچھا لگا۔ حرمت بھی ہوئی کہ ”عصمر خیال“ کے دوسرے دوستوں کی طرح عظیم صاحب بھی مجھے لڑکی سمجھتے تھے۔ حالانکہ میں کئی دفعہ اس کی تردید کر چکا ہوں۔ رانا محمد شاہد، بروہی بھائی اور عبدالحکیم شہر صاحب بہترین تہجدوں کے ساتھ موجود تھے۔ اویس شیخ اور آفتاب صبر اثرشی صاحب بھی زبردست انداز میں حاضر تھے۔ اعجاز آڈل اور اعجاز جانی دونوں صاحبان بھی معیاری تہجدوں کے ساتھ موجود تھے۔ سمدہ بانو ناگوری! آپ نے اپنے اس بھائی کو یاد نہیں کیا۔ مظلوم صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شہر ہے۔ ”ادب شناس“ کیا سلسلہ اچھا ہے ”بیت بازی“ کا معیاری پہلا نمونہ تھا۔ سرور پر موجود ”وجووزن“ کی تحریف میں شعر منتخب کا نمبر سے کسی بات نہیں۔ تمام دوست احباب کو سلام عقیدت اور سوسو بھڑکی افضل کو دعوت تہجد۔ اعجاز حسین خطاری تجویز کہ ”عصمر خیال“ کے دوستوں کے انٹرویو مع تصویر ہونے چاہیے۔ قائل اصل اور ابھی تجویز ہے۔“

☆ سرمد نے امریکا سے تجویز کیا ہے۔ ”کارنن سرگزشت کو دل سے سلام۔ آپ مجھ سے واقف ہوں گے۔ جولائی 2018ء میں میری جگہ جیانی سلسلہ عذاب شامل ہوئی تھی سرگزشت میرا بیچور رسالہ ہے میں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں لیکن تبصرہ پہلی بار رسالہ کر رہا ہوں۔ دبیر کے شمارے میں ڈروا کج، مادان، ہمدرد نین اور بے نشان بہت پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ لا جواب اور لائن حسین تھیں۔ ”عصمر خیال“ کے تبصرے بھی ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ ماشاء اللہ تمام نگار بہت صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ نیکی وجہ ہے کہ میں بڑے کا بے مبری سے منتظر رہتا ہوں۔ مجموعی طور پر سرگزشت کا معیار بہت اچھا ہے۔ دبیر میں انتہام پانے والا عظیم اقبال کا سفر نامہ ”شمشال سے ٹورنٹو“ شہکار تھا۔ ایسے سفر نامے بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ عظیم اقبال حالات و واقعات کا ایسا زبیر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جاوید کی کیفیت میں کھوجا پاتا ہے۔ میں نے عظیم صاحب کا ایک اور سفر نامہ ”ناگابہت کا کھاب“ پڑھا ہے۔ سرگزشت میں بھی اور کتابی صورت میں بھی یہ سفر نامہ اپنی مثال آپ تھا۔ پچھلے تین سالوں سے ”شمشال سے ٹورنٹو“ پڑھتا آیا ہوں۔ ہر کردار اور ہر منظر نامہ منفرد لگا۔ حراج، روداد، عشق یعنی نسرین سے جدا کا منظر بے حد شائق۔ یہ عظیم اقبال کا اٹھارہ انداز ہے۔ انہوں نے بالآخر نسرین سے محبت کر لی لیکن وہ ایک بادشاہ اور اشراف کے روپ میں بھی نظر آئے۔ نسرین ایک خوب صورت، باوقار عبت کرنے والی خاتون ہونے کے ناتے عظیم صاحب کی ازدواجی زندگی سے واقف حال بھی عظیم صاحب کی شخصیت کے آگے سرنگون رہی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید شہکار تخلیق کرنے کی توفیق دے۔“

☆ عبدالغنی شریف آوری کرچی سے۔ ”سرگزشت کا 2018ء کا الوداعی شمارہ اپنے قارئین کے لیے ایک دلنشین تحفہ دے گیا۔ ہمارے ذوق مطالعہ کی نگین کے لیے دو نئے ادبی ذائقوں کی سوغات ”ادب شناس“ اور ”چشمال“ امید ہے۔ اس ادب شناسی کی کسوٹی سے شائقین سرگزشت پوری طرح سے لطف اندوز ہوں گے۔ ”ششمال“ بے نور دتو“ آئے تو تھے خراماں خراماں لیکن مجھے تو دم سے ندیم صاحب نے خلاف توقع شارت کٹ لے لیا۔ بہر حال وہ مبارک باد کے حق ہیں۔ انور فرہاد ”گولڈن گرل“ کی رفاقت میں موجود ہیں۔ وہ فلم عمری کے جیتنے والے اور جاگتی راتوں کی رحمتا لیاں لٹاتے رہے۔ اپنے قارئین کے دلوں کی دھڑکن بابرہ شریف کی میزبانی سے سرگراں کر دیا۔ عزم و استقلال کا بیکر انسان دوستی کا بے مثال نمونہ غریب ریاض کا ”رکشا والا“ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیت میں کام کرتے حیرت دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا ہے سب نہایت غریب والدین کے بچے ہیں جن کے لیے اسکول کی فیس تو درکنار دو وقت کی روٹی بھی محال ہے۔ اسی لیے اس نے ایک ناقابل یقین عہد کیا۔ وہ گاؤں کے تمام بچوں کو اسکول کی فیس دے گا۔ دن رات محنت کر کے آخر وقت تک اپنا یہ عہد بھاتا رہا۔ وہ جو نہ کسی بازار میں بیکر نہ کسی دربار میں جیکر سا، چلا تو اپنی حسین کردہ ہار پر، جیتا تو اپنی شرائط پر خود کو جہنم کا بایں تصور کرنے والا کوئی اور نہیں ہے۔ ”ایسا عظیم کار“ سعادت حسن منٹو ہے۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے منگولی تمام خامیوں اور خوبوں کا احاطہ کیا ہے اور مستند دلائل اور ناقابل تردید حقائق کے جھرمٹ میں ان کا شایان شان استقبال کر کے ہمیں منگوشا سے بہرہ ور کیا۔ ”محافظ“ بے راداروی کے کلام معاشرے کی کھاسی کرتا ہے۔ ”عصر خیال“ کے مہمان خصوصی ندیم اقبال صاحب۔ مہمان خصوصی اسی لیے کہ موصوف بھولے جیسے بھی کھار ہی ”عصر خیال“ میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تو بنیادی طور پر نوکر فرستے چاکر نہ جانے ان کے دل میں کیا سہانی کہ انہوں نے یونین لے لیا۔ بیس اور گھبراؤ ایک طرف رکھا اور فلم سنہال کر رائٹر بن گئے وہ بھی ہر دھڑیر۔ ہمیں خبر ہے کہ ہم اس ”عصر خیال“ کے بایں ہیں آپ سمیت ہم سب کی پہچان ایک ٹیلی کی سی ہے۔ ہم بکھرے ہیں آپ کی جلد بک جاتی ہے۔“

☆ پروفسر کیو اے قاسمی کی آمد نور پور چل ہے۔ ”دسمبر کے شمارے کے سرورق پر نظر ڈالنے ہی ایک عجیب کیفیت سے سرشار ہوئے۔ ایک بال بھرائے دو شہرہ کے ساتھ کونے میں اپنے پسندیدہ مصنف منگوشا کی تصویر دیکھی تو بے اختیار مٹنے لگے اور سعادت حسن کی عمر کے بارے میں پڑھنے لگے۔ سعادت حسن منٹو نے زندگی کی تخیلوں کا بہت دلیری اور بھاری سے مقابلہ کیا۔ ”باقی فلم کا“ کے بعد فلم عمری کی ”گولڈن گرل“ بابرہ شریف کا مطالعہ کیا۔ خشکی سے بھرپور ہر دھڑیر اداکارہ کے بارے میں جاننے کا ایک مدت سے انتظار تھا لیکن مکمل حالات سے آگاہی نہ ہو سکی۔ ایک جھکی کا احساس برقرار رہا۔ بہر حال ندیم اقبال شریف کے حالات زندگی سے زیادہ ان کی قلموں کا تجزیہ تو کیا لیکن ان کے خاندانی پس منظر، بچپن، اور پہلی پس منظر کے ساتھ قلم اُچی نہیں دی۔ ”بڑا موصوف“ لیکن کبیر کی ایک اچھی اور مطلوبی تحریر بھی۔ کافی عرصے کے بعد احمد رضا کی تحریر ”تاریخی مقابلہ“ بڑی بہت دلچسپ اور مطلوبی تحریر بھی۔ ”عصر خیال“ کے ”فرہادی“ ایک مختصر اور منفرد موضوع پر مبنی تحریر بھی۔ ”محافظ“ بھی ایک اچھوتے اور منفرد انداز کی تحریر بھی۔ ایک خوب تھا، ہنرمند اور مکافات بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ”خود ساز“ بھر کا لکھ دیکھا تو دل چلنے لگا ہے۔ اس شمارے کا انتظار ابھی سے بے یقینی پیدا کرنے لگا ہے۔ ”عصر خیال“ میں منشی کن احمد کے برادر ندیم اقبال کا اظہار ہے پڑھا ان کے تیسرے سفر سے کاشت سے انتظار ہے۔ ”ششمال“ سے نور دتو ”سفر نامے کا مایاب اختتام پر واردہ اور تیسرے عہد رسول و حیرتوں مبارک باد کے حق ہیں۔ رانا شاہد اور سمدھو کا نو کا تبہ پسند آیا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے بھی ہمیشہ کی طرح بھرپور تجزیہ اور تبصرہ لکھا۔ ”ادب شناس“ کا نیا سلسلہ شروع کرنے پر ارادہ کو اس احسن قدم اٹھانے پر مبارک باد۔ امید ہے اس سے پڑھنے والوں کے ذوق و شوق اور تلاش و جستجو میں کافی تحریک ملے گی۔ بیت بازی میں زاہد خان، زبیدہ سلطان اور لوئیس صلح کے شعر بہت پسند آئے۔“

☆ رازقی بخش ڈکی امیر نے جلال پور پیر والا ضلع مٹمان سے لکھا ہے۔ ”معراج رسول صاحب کا اداریہ کہ کم سے کم ایک گلا اپنے کمر کی گیلی یا کورٹ یا راس میں رکھ کر لوڈی کو کم کیا جاسکتا ہے تاکہ گیل دی بج آسکین پیدا ہو۔ تجویز بہترین دی گئی ہے۔ ”ششمال“ سے نور دتو“ کی آخری قسط کا مطالعہ کیا۔ ندیم اقبال ”سیرت پر محبت“ کے ساتھ گئے اور پوری کے ساتھ واپس آئے۔ تہا نہرہ سے تہا تو نرسن ہو گئی۔ میرے خیال میں کہانی کو آگے جانا چاہیے تھا۔ بہر کیف اس سفر نامے سے ہمیں بھی پور نہ کیا۔ ایک قسط پڑھنے کے بعد اقل قسط کا شدت سے انتظار ہوتا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ”ناسور“ طویل ہونے کے باوجود ابھی جاری ہے۔ ”فرہادی“ میں جس میں ثابت قدم رہی تب ہی ایک چھوٹے فرہادی سے فحش گئی۔ ”ایک بیکٹر بہترین کہانی ہے۔ محافظ“ والا طریقہ کہ سب نہیں اپنا لیکن سب کو اپنی عزت اور غیرت کا محافظ ہونا چاہیے۔ ”ایک خواب تھا“ میں ڈاکٹر احمد نے محبت کو خون پر قربان کر دیا۔ آج سے دوسری شادی کر لی مگر مگلائی نہ دے کہ تو اچھا کیا لیکن مساوی سلوک کا ہوا ضروری ہے ورنہ لگے جہان میں پہلی بیوی کی حق تلفی کا حساب دینا پڑے گا۔“

تاخیر سے موصول خطوط: جہر فز، میر پور خاص، واجد حسن، دلاور خان، زاہد بخش، کرچی۔ انعام آفریدی، سمیل انجم، زرین اشرف، لیاقت علی، لاہور۔ زاہد خان، جبک آباد۔ اکبر علی سرگودھا۔ ذیشان احمد، سیالکوٹ۔ آصف علی، شہنشاہ پورہ۔ نیاز احمد، چنوب۔

تاریخ گنگا

الیاس سیتا پوری

وہ تابش آفتاب و تابیدہ ماہ کامل تھا۔ اس نے معمولی سے گہرائی میں جنم لیا تھا مگر عظمت کے مینار تعمیر کر گیا۔ وہ عظیم تھا، عظیم رہا، عظیم رہے اور عظیم رہے گا، اس نے برصغیر پہ صرف پانچ سال حکومت کی لیکن وہ پانچ سال برصغیر کی تاریخ ترقی کے سنہری دور کہلاتے ہیں۔ اس نے اپنے قلیل دور حکومت میں ایسے ایسے کام کر دکھائے جو اس سے قبل اور بعد کے حکمران سوچ بھی نہیں سکتے تھے انہی کاموں کی وجہ سے ہی اسے عظیم حکمران کہا جاتا ہے۔ اس نے قوت بازو سے حکمرانی کا تاج حاصل کیا تھا۔ اس کی جواں مردی کے آگے مغل حکمران کچھ بھی نہیں، یہ تو مغل دربار کے تاریخ نویسوں کا تعصب تھا کہ اسے شاہ کے لقب سے یاد کرنے میں ہچکچاتے رہے پھر بھی وہ عوام کے ذہنوں میں آج بھی عظیم تر ہے۔ اسی عظیم حکمران شیر شاہ سوری کے دور کی یہ داستانِ عشق ہے۔

تاریخی واقعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تو شہ خاص

سلطان بہار جس نے افراتفری، طوائف، السو کی کا فائدہ اٹھا کر سلطان محمد بہار کے لقب سے صوبہ بہار کا سلطان بن گیا۔ اس کا خاص شوق شکار رکھتا تھا اس وقت بھی وہ شکار کھیلنے کے ارادے سے نکلتا تھا۔ اس نے فرید خان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ راہ میں سلطان نے فرید کے چہرے پر فرحت و تازگی کے بجائے جبر اور بے چینی کی کیفیت محسوس کی۔ سلطان کو شہر گزرا، شاید فرید خان شکار سے بچنا چاہتا ہے، سلطان نے کہا۔ ”فرید خان ہم شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔“

فرید خان نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”اگر معلوم ہے تو خوش کیوں نہیں ہے؟ کیا تو شکار سے دلچسپی نہیں رکھتا؟“

فرید خان نے جواب دیا۔ ”حضور والا! فرمانہ کا باہر کڑو، تاک پور تک آچکا ہے۔ میری ناقص رائے میں حضور والا کو شکار سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دشمن ہماری تاک میں ہے اور ہم جانوروں کا چچا کریں، یہ کہاں کی تھنڈی ہے۔“

سلطان کے چہرے کا رنگ خستہ ہو گیا۔ ”اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا، ایک نے سلطان کی

دل جوئی کی۔“ حضور والا شکار پارشاہوں کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے، میرا خیال ہے فرید خان درندوں سے ڈرتا ہے بھی شکار سے گھبرا رہا ہے۔“

فرید خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”خوشامدی جوان! یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کس سے ڈرتا ہے۔“

سلطان نے ان کی ٹوک جھوٹک پر کوئی توجہ ہی نہ دی اور وہ دریائے گنگا کو عبور کر کے اس کے شمالی ساحل پر اتر گیا۔ یہاں سلطان کے بائیں طرف شمالی سمت سے گنگا کی معاون ندی گندک آ کر مل رہی تھی۔ سلطان کو نیپال کی ترائی میں شکار رکھتا تھا۔

ہنگوؤں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ سلطان ہاتھی پر اپنی عماری سے جنگلی جانوروں کے دوڑنے بھاگنے کا منظر دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ سلطان کے مصاحبین بھی ہاتھیوں پر سوار تھیں۔ اپنے شکار کو مار گرانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن فرید خان نے اپنے لیے ہاتھی کی بجائے گھوڑے کا انتخاب کیا تھا۔ فرید خان کے حاسد سے گھوڑے پر سوار دیکھ کر مزہ پھیر کر ہنس رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فرید خان نے جنگی میں گھوڑے کی سواری اختیار کر لی ہے۔



فرید خان نے جب یہ دیکھا کہ سلطانی مصائب کے نشانے خطا ہو رہے ہیں تو اس نے انہیں آواز دی۔
”صاحبان! ہاتھیوں سے بچنے آجائیں، شکار زمین پر ہے، آسانوں سے بچنے آجائیں۔“

کہیں قریب ہی سے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ پورا جنگل گونج گیا اور مصائب کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔

سلطان نے آواز دی۔ ”فرید خان! خطرہ اوپر آ جا شیر کہیں قریب ہی موجود ہے۔“

فرید نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ جھاڑی سے شیر نمودار ہو گیا، وہ آہستہ آہستہ فرید خان کی طرف بڑھا۔

فرید خان نے کھوڑے سے چلا نکلا گا دی۔ اس کے ہاتھ میں عریاں تلوار تھی۔

کئی مصاحبوں کی چیخیں نکلیں۔

سلطان نے کہا۔ ”فرید خان! یہ کیا حماقت ہے بچتے کی فکر کرو۔“

فرید خان نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اس وقت اس کی نظریں شیر پر جمی تھیں۔ وہ اپنی توجہ لہجہ بھر کے لیے بھی

کسی اور طرف نہیں کر سکتا تھا۔ شیر فرید خان کی طرف آتے آتے ٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ فرید خان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کچھ

ہونے والا ہے۔ شیر نے اچانک جست لگائی۔ وہ فرید خان کو پیچہ مار کر اس کا چہرہ نوح لیتا جا رہا تھا مگر فرید خان پھرتی

سے زمین پر لیٹ گیا۔ شیر اس کے اوپر سے گزر کر دور جا کر آ

لیکن اس دوران فرید خان کی تلوار کی نوک اس کا پیٹ چاک کر چکی تھی۔ فرید خان نے زمین پر لیٹتے ہی اپنی تلوار کو شیر

کے پیٹ کی طرف اٹھا دیا تھا۔ چنانچہ جب شیر اوپر سے گزرا تو تلوار کی نوک اس کے پیٹ سے رگڑ کھائی ہوئی شکاف

ڈال گئی۔ شیر ایک بار بھر دھاڑا۔ اتنی دیر میں فرید خان پھرتی سے اٹھا اور زخمی شیر پر بے درپے وار کر کے بے جان کر دیا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے آفاقا ہوا کہ سلطان کی کچھ

سمجھ میں نہ آیا۔ کئی مصائب ہاتھیوں پر بے ہوش ہو چکے تھے۔ کئی کی ٹھکیاں بندھ گئی تھیں اور کچکا پاہٹ سے ان کی آواز نہیں نکلتی رہی تھی۔

شیر کے خون کے چھنٹوں نے فرید خان کے سترے لباس کو کہیں کہیں سے سرخ کر دیا تھا۔ فرید خان نے اپنی

خون آلود تلوار کو مردہ شیر کی کھال سے رگڑ کر صاف کیا۔

سلطان نے قتل بان کو حکم دیا۔ ”ہاتھی کو بٹھایا

جائے۔“

قتل بان نے ہاتھی بٹھا دیا۔ سلطان عمارت سے باہر آیا اور تیز قدموں سے چل کر فرید خان کے دونوں شانے پکڑ

لیے۔ اس کا منہ اپنے سامنے کر لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے، سلطان کی نظروں میں داد و تحسین تھی اور

فرید خان کی نظروں میں عاجزی اور انکساری۔ سلطان نے پوری گرم جوشی سے فرید خان کو اپنے گلے لگا لیا، بولا۔ ”میں

تجھے اتنا بہادر نہیں سمجھتا تھا۔“

فرید خان نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! میں حیران

ہوں کہ یہ کیا ہو گیا۔“

سلطان نے اپنے مصائب کو بھی دہیں بلا لیا۔ ان میں برگندہ جو پندرہ کا حاکم محمد خان سوار بھی شامل تھا۔ یہ امیر فرید

خان کے سوتیلے بھائیوں کی بڑی طرف ندری کرتا تھا۔ محمد خان سوری فرید خان کی بہادری سے خوش نہیں ہوا۔ سلطان محمد

نے بطور خاص محمد خان کو مخاطب کیا۔ ”محمد خان تو نے فرید خان کی بہادری دیکھی؟“

محمد خان نے جواب دیا۔ ”دیکھی، حضور جس چیز کو بہادری قرار دیتے ہیں وہ محض حسن اتفاق تھا۔ فرید خان کی

جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ان حالت میں یہی کارنامہ انجام دے سکتا تھا۔“

سلطان نے فرید خان کی پشت تھپتھپائی۔ ”نہیں محمد خان! یہ ایک کارنامہ ہے، عظیم المثال کارنامہ۔ میں فرید

خان کو شیر خان کا خطاب دیتا ہوں۔“ فرید خان کا چہرہ اپنی طرف پھیر کر کہا۔ ”آج سے تو شیر خان ہے۔“

فرید خان نے سلطان کا شکر ادا کیا۔

محمد خان سوار نے ایک بار پھر سلطان کو درغلایا۔ ”سلطان معظم! فرید خان کا باپ حسن خان مر چکا ہے اور

سلطنت دہلی کی طرف سے فرید خان کو ناٹھ، خواص پورا اور سہرام کا حاکم تسلیم کیا جا چکا ہے، جب کہ دیانت اور

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فرید خان حکومت میں اپنے دونوں سوتیلے بھائیوں کو بھی شریک کر لے۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”محمد خان! یہ ان باتوں کا

وقت نہیں ہے، اب فرید خان شیر خان ہو چکا ہے۔“

فرید خان بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا لیکن جب بات ناقابل برداشت ہو گئی تو بول دیا۔ ”حضور والا!

حکومت کسی کی میراث نہیں ہوتی جو حکومت کرنے کا اہل ہوتا ہے حکومت اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ خدا کے فضل سے

قیام پاکستان

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب قیام پاکستان کے قائم ہوجانے کی خبر نے مجھے ایسی مسرت و انبساط سے ہلکانا کر دیا تھا کہ جس کی لذت اور کیف سے نہ صرف ہمارے قریبی میرا دل و دماغ سرشار ہے۔ یہ 3 جون 47ء کا دن تھا اور اس روز شام کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقریر کرنا مسمیٰ۔ اس تقریر کو سننے کے لیے سرشام ہی لوگوں کا جم فضیران جگہوں پر جمع ہو چکا تھا جہاں جہاں ریڈیو رکھے ہوئے تھے۔ تقریر سننے والوں میں ہر چھوٹی بڑی قوم کے لوگ شامل تھے۔ وائسرائے ہند کے بعد آل انڈیا کانگریس کی طرف سے پرنس جواہر لال نہرو نے تقریر کی اور آخر میں ”جے ہند“ کا نعرہ لگایا۔ نہرو کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے خطاب کیا۔ ان کا خطاب انگریزی میں تھا مگر میں نے عجیب منظر دیکھا کہ اُن پڑھ مسلمان بھی قائد کی تقریر پر ہجوم رہے تھے اور جب انہوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تو مسلمان اچھل اچھل کر دیوانہ وار نعرہ بکھیرے، اللہ اکبر کے نعرے بلند کرنے لگے۔ نعروں کا جوش و ارتعاش تو سب ایک دوسرے سے گلے مل کر مبارک باد دینے لگے۔

انتباس: فتح کا شام تم۔ از: رانا نذر الرحمن
مرسلہ: امین اکبر۔ کراچی

آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کالوں میں بس یہی الفاظ گونج رہے تھے۔
فرید خان نے اپنے دونوں کالوں پر ہاتھ رکھ لیے اور کھٹی کھٹی آواز میں بولا۔ ”اللہ العالمین! میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔“

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ فرید خان کو شبہ گزرا کہ شاید یہ اس کا واہجہ ہے لیکن دوسرے ہی لمحے پھر کسی نے دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا اس کا اپنا حقیقی چھوٹا بھائی نظام سائے کھڑا ہے۔

فرید خان نے نظام کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے عرض کیا۔ ”برادر محترم! آپ کو سلطان نے اسی وقت

میں اس کا اہل ہوں پھر ایک اہل آدمی اپنی حکومت ناموں کے حوالے کیوں کر دے؟“

محمد خان نے تگوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”فرید خان تو گستاخ بھی ہے۔“

فرید خان نے بھی اپنی تگوار کا دست پکڑ لیا۔ ”یہ گستاخی نہیں، آپ کی بات کا مدلل جواب ہے۔“

سلطان کی تیروں پر بھی ہل چکے، نہایت نرودقار لہجے میں دونوں کو سمجھایا۔ ”تم دونوں اپنے بادشاہ کے روبرو نہیں جھگڑ سکتے زیادہ حد ادب۔“ پھر فرید خان سے کہا۔

”اور شیر خان! تو مجھے بے حد عزت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو محمد خان سونوری سے گستاخی کرے، پھر محمد خان سونور سے کہا۔

”محمد خان! تم میری بات غور سے سنو اگر فرید خان کا اپنے سوتیلے بھائیوں سے کسی قسم کا تنازعہ چلا رہا ہے تو یہ

شکار گاہ اس تنازعے کے تفتیش کے لیے مناسب جگہ نہیں۔ گھروں کے مسائل گھروں ہی میں حل پانے چاہئیں۔“

سلطان کے دوسرے مصاحبین بھی فرید خان سے ناخوش تھے اور ان کی خوشحالی ان کے حسد کی وجہ سے تھی۔ وہ

اشاروں کنایوں میں فرید خان کی مذمت اور محمد خان سونوری کی حمایت کر رہے تھے۔ سلطان کی طبیعت انتہائی متعصب ہو چکی تھی، اس نے واپسی کا حکم دیا اور یہ سب مزید شکار کیلئے بغیر

ہی واپس آ گئے۔

سلطان محل میں اس طرح داخل ہوا کہ کسی کو خدا حافظ کہنے کا بھی موقع نہ دیا۔ جملہ مصاحبین کا خیال تھا کہ سلطان،

فرید خان اور محمد خان سونور کو نقصان ضرور پہنچائے گا۔ فرید خان بھی سلطان کے جگہ سے پریشان ہو رہا تھا۔ وہ

اپنی قیام گاہ میں بے دلی سے داخل ہوا۔ اس وقت وہ تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔ کبھی سوچتا کہ وہ سلطانی عتاب کا

انتظار کیے بغیر چپ چاپ فرار ہو جائے اور کبھی دل یہ کہتا تھا کہ بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تقدیر اچھی سے بھاگنا

انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس نے رات کو عشاء کی نماز پڑھی اور سکون کی خاطر قرآن پاک کو جیسے ہی کھولا چوبیسویں پارے کی سورۃ الزمر

کی آیت نمبر 54 سامنے آ گئی۔ ”(تو) ان کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔“

فرید خان شدت جذبات سے روہنسا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیک گئیں۔ اس نے قرآن پاک کو بوسا دیا اور

طلب فرمایا ہے۔“

چاہیں لیکن نہیں ملا سکا۔

سلطان بول رہا۔ ”میں چاہتا ہوں میرے بیٹے جلال میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہو جائیں جو تجھ میں موجود ہیں اس لیے میں نے تجھ کو جلال کا اتالیق نامزد کر دیا ہے۔“

شیر خان نے سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

سلطان نے ایک بار پھر شیر خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اور شیر خان! میں نے جو چہرہ کے حاکم محمد خان کو یہ حکم دے دیا ہے کہ وہ حیرے گھر بہرام جائے اور تجھ کو جاگیر کی تقسیم پر آمادہ کر لے۔“ پھر کسی قدر خاموشی کے بعد کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرا یہ فیصلہ مناسب اور عادلانہ ہے۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”عدل نہایت محترم اور اعلیٰ خوبی ہے جس حکمران میں یہ خوبی نہ ہو، وہ حکمران نہیں غاصب اور ظالم ہوتا ہے۔ میں کسی کی نیت اور غلوں پر شبہ نہیں کرتا مگر دینی زبان میں نہایت مذہبانہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ حضور والا! اپنے نفس میں جھاک کر یہ ضرور معلوم کریں کہ میری بابت محمد خان کو جو حکم دیا گیا ہے وہ حق برائے انصاف ہے بھی یا نہیں؟“

سلطان کی پیشانی پر ٹھٹھکیں ابھر آئیں۔ ”جینی برائے انصاف! میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! جس طرح ایک ملک میں دو بادشاہ اور ایک نیا م میں دو گواہیں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک جاگیر کے دو حاکم نہیں ہو سکتے۔ افسوس کہ میں اپنے موہتے بھائیوں کو اپنی حکومت میں شریک نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ انہیں روزیہ یا سالانہ برابر ملتا رہے گا۔“

سلطان سوچ میں پڑ گیا، کہا۔ ”یہ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے کہ جس طرح ایک ملک میں دو بادشاہ اور ایک نیا م میں دو گواہیں نہیں رہ سکتیں ایک جاگیر میں دو حاکم کس طرح رہ سکتے ہیں۔“

شیر خان کے چہرے پر طمانیت، سکون اور خود اعتمادی کی چمک پیدا ہو گئی۔

سلطان نے کہا۔ ”محمد خان نور جو چہرہ چلا گیا درندہ میں اس کو سبک کر دیتا کہ وہ مجھے تنگ نہ کرے، بہر حال میں نے تجھ کو اپنے بیٹے جلال کا اتالیق مقرر کر دیا۔“

شیر خان نے عرض کیا۔ ”سلطان معظم! میں چند دنوں کے لیے بہرام جانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟ آخر کیوں؟“

سلطان بڑی بے چینی سے فرید خان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے اور نہایت بھرتی اور مستعدی سے چہل قدمی میں مشغول تھا۔ جب شاہی خدام نے فرید خان کو سلطان کے دربار پہنچایا تو وہ ٹپٹپٹے ٹپٹے ایک دم رک گیا۔ فرید خان نے نظریں جھکا لیں اور سلطان نے اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر کہا۔ ”شیر خان! اب تو فرید خان نہیں رہا، میں نے اپنے فرمان کے ذریعے سب کو مطلع کر دیا ہے کہ فرید خان شہر ہلاک کرنے کے بعد شیر خان ہو گیا ہے، اس لیے اب ہر کوئی تجھے شیر خان کہہ کر ہی مخاطب کرے گا۔“

فرید خان نے مذہبانہ عرض کیا۔ ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر مہربان ہیں۔“

سلطان نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، کہا۔ ”ابھی ابھی جب تک تو ہمارے پاس آیا نہیں تھا، میں اسی تنگ و شے میں جلا تھا کہ کہیں تو دل برداشتہ ہو کر بہرام تو نہیں چلا گیا۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”آپ کا اندیشہ درست تھا سلطان معظم! میں معلوم نہیں کس طرح اپنی اہانت برداشت کر گیا میں نے گھر پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر بہرام چلا جاؤں مگر جب میرے رب نے مجھ سے یہ کہا کہ میں اس کی رحمت سے بایں نہ ہوں تو میں رک گیا۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”نہیں بندہ پرور، خاکسار علم غیب نہیں جانتا۔“

سلطان نے مسکرا کر کہا۔ ”علم غیب ہے تو سبھی محروم ہیں۔ میں محمد خان نور سے ذرا بھی خوش نہیں۔ اس نے تیرے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، میں سمجھتا ہوں بہت برا کیا۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”اب ان باتوں کو جانے دیجیے۔ میں نے ضبط و برداشت کی عادت ڈال لی ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”شیر خان! میں تیری ذہانت، علیت، مستعدی اور اصول پسندی سے بے حد متاثر ہوں اور خوش بھی۔ تو بہادر بھی ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھے اپنے بیٹے جلال کا اتالیق بنا دوں۔“

شیر خان نے بے چین ہو کر سلطان سے نظریں ملاتا

شادی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر شیر خان کے سامنے پیش کر دیا۔ شیر خان جس کمرے میں بیٹھا تھا اس کی دیواروں پر مختلف قسم کے ہتھیار لٹکے ہوئے تھے اور شیر خان کی چوکی پر شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس کا خود چوکی پر ایک طرف رکھا ہوا تھا اور عریاں نکوار اور پیش قبض خود کے پاس رکھے ہوئے تھے۔

آنے والوں کے قدموں کی آہٹیں سن کر شیر خان نے ان کی طرف دیکھا اور مستحیل کر بیٹھ گیا۔

شادی نے دربانوں کی شکایت کی۔ ”شیر خان! میں جو پتھر کے حاکم محمد خان کا خاص آدمی ہوں تیرے آدمیوں نے میری بے عزتی کی میں انہیں.....“

شیر خان نے بات کاٹ دی۔ ”محمد خان کا کوئی خط ہے؟ لا میرے حوالے کر۔“

شیر خان کی آواز اور لہجے میں کوئی بات تھی جس نے شادی کو مرعوب کر دیا۔ اس نے خریطے میں سے ایک خط نکال کر شیر خان کے حوالے کر دیا۔ شیر خان نے خط پڑھا اس میں لکھا تھا۔

”شیر خان! تیرے بھائی احمد اور سلیمان ایک مدت سے میرے مہمان ہیں۔ یہ دونوں اپنے حصے اور ورثے سے محروم ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب کے ولی نعمت سلطان محمد نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں ثالث بن کر سلیمان اور احمد کو ان کا حق دلوا دوں چنانچہ تم جب کہو میں دونوں بھائیوں کو تمہارے پاس بھیج دوں تاکہ وہ تم سے اپنا حق اور حصہ وصول کر لیں۔“

شیر خان نے خط پڑھ کر شادی سے پوچھا۔ ”تو محمد خان کے پاس کیا کرتا ہے؟“

شادی نے جواب دیا۔ ”میں اپنے ولی نعمت محمد خان کے دشمنوں سے ملاقاتیں کرنے کے لیے لازم رکھا گیا ہوں۔ میری پہلی ملاقات تو اس نوع کی ہوئی ہے جس طرح تم سے ہوئی ہے اور اگر میں ملاقات سے واپس ہو جاتا ہوں تو دوسری ملاقات میدان جنگ میں کرتا ہوں۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”تو اب جاسکتا ہے انشاء اللہ دوسری ملاقات کے لیے میں میدان جنگ میں ضرور پہنچوں گا۔“

شادی نے پوچھا۔ ”اور خط کا جواب؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”میرا جواب یہ ہے کہ حکومت اور سلطنت ناقابل تقسیم ہوتی ہے۔ یہ اس کو دی جاتی

شیر خان نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ محمد خان نور کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”اگر وہ گڑبڑ کرے گا تو میں اسے روک دوں گا تو مت پریشان ہو۔“

شیر خان نے اصرار کیا۔ ”حضور والا! اب میرا سہرام جانا بہت ضروری ہو گیا ہے، خدا کے لیے مجھے نہ روکیے چلا جانے دیجیے۔“

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”واپسی کب ہوگی؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”کم از کم دو ماہ بعد۔“

سلطان نے کہا۔ ”تو جاسکتا ہے لیکن دو ماہ بعد تیری واپسی اور اس دربار میں حاضری ضروری ہے۔“

شیر خان نے وعدہ کر لیا اور سلطان نے اسے اجازت دے دی۔

شیر خان دوسرے دن علی الصبح اپنے بھائی نظام کے ساتھ سہرام روانہ ہو گیا۔

شیر خان سہرام پہنچا تو پتا چلا کہ اس کے دونوں سوتیلے بھائی سلیمان اور احمد جو پتھر کے حاکم محمد خان کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ شیر خان سہرام میں گھوم پھر کر اس بات کا اعزاء لگا تار کہ اس کی عدم موجودگی میں دونوں سوتیلے بھائیوں نے اس کے خلاف کیا کام کیا ہے، سہرام کا ہر شخص شیر خان کا مدافع تھا۔ اسی دوران جو پتھر کے حاکم محمد خان نے شادی نامی ایک نوجوان کو شیر خان کے پاس بھیجا یہ خوب صورت نوجوان شیر خان کے قصر کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا اور اس ماحول کی ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے شیر خان کے قصر کو خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ قصر کے دربانوں نے شادی کو پکڑ لیا اور اس کا اتنا پتا جو چاہے گئے۔

شادی نے جواب دیا۔ ”لوگو! میں جو پتھر کے حاکم محمد خان کا فرستادہ ہوں مجھے اپنے آقا شیر خان کے پاس لے چلو میں اس کے نام ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔“

دربانوں نے شیر خان کو مطلع کیا کہ شادی نامی ایک خوب صورت نوجوان حاکم جو پتھر کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے اور باریابی کا طلب گار ہے۔ اس کو روک رکھا جائے یا ایک دو دن بعد کا وقت دے دیا جائے۔ شیر خان نے حکم دیا۔ ”شادی کو نہتا کر کے فوراً میرے پاس بھیج دیا جائے۔“

شیر خان کے آدمیوں نے شادی کو نہتا کر دیا۔ حالانکہ وہ اس پر تیار نہ تھا، دو مضبوط اور توانا آدمیوں نے نیچے

ہے جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ مجھے اپنی حکومت میں کسی دوسرے کی شمولیت اور صدمہ داری گوارا نہیں۔ بادشاہ مروریہ اصولوں اور رواجوں کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ ہم دونوں میدان جنگ میں اس طرح ملیں گے کہ حق ہماری طرف ہوگا اور ناحق دوسری طرف۔“

شادی نے شیرخان کے کمرے کا جائزہ لیا، پھر پوچھا۔ ”شیرخان یہ ہتھیار دیواروں ہی پر بچے رہتے ہیں یا انسانی جسموں پر بھی بچے ہیں؟“

شیرخان نے جواب دیا۔ ”یہ ہتھیار کبھی میرے دشمنوں کے جسموں پر بچے رہتے تھے لیکن جب میں نے انہیں زیر کر لیا تو ان کے جسموں پر سے اتار کر دیواروں پر بچا دیا۔“ پھر دیوار کے خالی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس خالی حصے کے لیے مجھے تمہارے ہتھیار دور کر رہیں اُمید ہے تم لوگ واپس نہیں کر دو گے۔“

شادی نے پاؤں پٹکا، بولا۔ ”شیرخان! میری بے عزتی نہ کر دو، تم کیا تم.....“

شیرخان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ”اسے یہاں سے لے جاؤ۔“

دونوں آدمی شادی کو شالوں سے پکڑ کر کھینچے ہوئے باہر لے گئے۔

شیرخان اپنی داڑھی میں انگلیاں چلاتا اور سوچتا رہا پھر اٹھا، کلم دوات اور کاغذ اٹھا لایا، کاغذ پر مونٹا مونٹا لکھا۔ (ترجمہ) ”اللہ کی رحمت سے واپس نہ ہو۔“

اس کاغذ کو دیوار کے اس حصے پر چسپاں کر دیا جو ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنے بھائی نظام کو طلب کیا اور اسے حکم دیا۔ ”نظام تو فوراً الہ آباد چلا جا، وہاں تو گڑھ اور مانگھور کے مشعل حاکم جینہ برلاس سے ملاقات کر اور اسے ہماری وفاداری اور دوستی کا یقین دلایا کیونکہ یہاں سہرام میں بڑے خفارت ہیں اگر میں یہاں ناکام رہا تو پھر جینہ برلاس ہی کے پاس پناہ لوں گا۔“

نظام چلا گیا اور شیرخان متوقع حملے کے بچاؤ اور احتیاطی تدابیر پر غور کرنے لگا۔

☆.....☆

حاکم جانتیہ محمد خان، شادی کی زبان سے شیرخان کا جواب سن کر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے شادی کو حکم دیا۔ ”فوج کو تیار رکھ دو اور پھر فوج کے ساتھ سلیمان اور احمد کو

لے کر شیرخان کے علاقوں میں گھس جا۔ وہاں کی اینٹ سے اینٹ بچاؤ اور شیرخان اور اس کے آدمیوں کو بے دخل کر کے سلیمان اور احمد کو وہاں کا حاکم بنادے۔“

شادی اپنے آقا کے حکم پر فوج لے کر سہرام کے لیے روانہ ہو گیا لیکن سہرام سے پہلے اس کو ٹاڈہ اور خواں پور کے شقہ داروں سے مقابلہ کرنا تھا اور یہ شقہ دار شیرخان کے ملازم تھے۔ ٹاڈہ کو شقہ دار کو شیرخان کی ہدایت پہلے ہی موصول ہو چکی تھی۔ شیرخان نے اس کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ اگر محمد خان کی فوج اس کے علاقے میں گھسنے کی کوشش کرے تو اسے روک دیا جائے اور اسے چل کر محمد خان کے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے، کیونکہ بہترین اور مفید ترین جنگ وہی ہوتی ہے جو دشمن کی زمین پر لڑی جائے۔

ٹاڈہ کا شقہ دار فوج لے کر ٹاڈہ کے باہر نکلا اور شادی کا راستہ روک لیا۔

شادی نے شیر خانی شقہ دار کو سمجھایا۔ ”دیکھ میرا حیرا کوئی بھگتدا نہیں ہے، میں سہرام شیرخان کے پاس جا رہا ہوں۔ میرا راستہ نہ روک۔“

شقہ دار نے جواب دیا۔ ”حیرا راستہ میں نہیں روکوں گا، تو کون روکے گا، جب میں تجھے سہرام جانے دوں گا تب تو ٹوٹو جائے گا، میں تجھے جانے ہی کیوں دوں گا؟“

شادی کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اس نوجوان کو محمد خان نے بطور خاص شادی کے ساتھ کر دیا تھا کیونکہ اس نے محمد خان کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ شیرخان کو اپنی خوش گفتاری سے اس پر آمادہ کر لے گا کہ وہ اپنے سوتیلے بھائی سلیمان اور احمد کو اپنی حکومت میں شریک کرے۔ اس نوجوان کا پس منہ ایک تعارف تھا کہ وہ کسی پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور لودھیوں کی شکست نے اسے بہت آزدہ اور غمگین کر دیا تھا۔ وہ کہ حال میں بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ پٹھان آپس ہی میں خون خرابہ کرتے رہیں، اس نے ہاتھ کے اشارے سے شادی سے پیچھے جانے کی درخواست کی اور خود شیر خانی شقہ دار کے رو برو جا کھڑا ہوا اور اس سے پوچھا۔ ”برادر عزیز! ہم لوگ جنگ نہیں چاہتے۔ ہمیں شیر خان کے پاس چلا جانے دو۔ ہم اپنے معاملات اس سے طے کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ہم خون خرابہ نہیں چاہتے۔“

شقہ دار نے جواب دیا۔ ”اگر تمہیں شیرخان سے

وہیں کھڑا رہا۔ ایک خاندان بھاگتا ہوا بدحواس اس کے پاس سے گزرا۔ حمید کو ان پر دم آگیا اور وہ ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”رک جاؤ، ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔“ یہ لوگ سہم کر رک گئے۔ یہ کل پانچ افراد تھے۔ ایک بوڑھی عورت، ایک اس کا شوہر پچاس پچپن سال کا، ایک نوجوان بمشکل پچیس سال کا رہا ہو گا۔ ایک اس کی بہن بمشکل اٹھارہ انیس سال کی۔ ایک چھوٹی بہن چار سال کی رہی ہوگی۔

پانچ نفری خاندان کا بزرگ حمید کی طرف بڑھا اور اچھائی لپچاتے سے پوچھا۔ ”بھادر نوجوان! ہماری خطاہم نے آپ کا کیا کیا؟“ حمید نے جواب دیا۔ ”تمہاری خطا یہ ہے کہ تم مفتوح ہو۔“

وہ لوگ قہر قہر کاہنے لگے۔ حمید نے انہیں تسلی دی۔ ”لیکن تم لوگ دُور دست اور بیٹیں میرے پاس کھڑے رہو۔“

کافی دیر بعد جب لوٹ مار کا سلسلہ موقوف ہوا، حمید ان سب کو لے کر شادی کے پاس پہنچا۔ شادی نے انہیں دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں پوچھا۔ ”یہ کون ہیں؟“ حمید نے جواب دیا۔ ”میں خود نہیں جانتا یہ کون لوگ ہیں مگر یہ جانتا ہوں کہ یہ اسی مفتوح بستی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ سب تمہارے آدھوں سے جان بچا کر بھاگے جا رہے تھے کہ میں نے انہیں روک لیا۔“

شادی سکرایا۔ ”مگر کیوں روک لیا؟“ حمید نے کہا۔ ”پتا نہیں کیوں روک لیا۔ میں نے انہیں پناہ دی ہے اور انہیں ان کے گھر میں دوبارہ بسانا چاہتا ہوں۔“

شادی نے لڑکی کو بخور دیکھا تو دمک رہ گیا۔ یہ حسین ترین لڑکی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو مکھٹ میں چھپا رکھا تھا مگر شادی نے اس کی ایک جھلک اچھی طرح دیکھ لی تھی بولا۔ ”سمجھا، میں سمجھ گیا کہ تو نے انہیں کیوں پناہ دی ہے۔“

حمید نے گویا شادی کی بات سنی ہی نہیں، اس نے کہا۔ ”تم لوگ میرے ساتھ آؤ اور بتاؤ کہ اس بستی میں تمہارا کون سا گھر ہے۔“

یہ لوگ اب بھی خوف زدہ تھے۔ حمید آٹھ دس سپاہیوں کی گھرائی میں انہیں گھر لے گیا۔ یہ بستی کے باہر کیتھوں کے سامنے ایک مکان تھا۔ نسبتاً دوسرے گھروں سے بہتر۔

بات کرنا تھی تو اس فوج کو اپنے ساتھ نہیں لانا تھا۔ اس فوج کو واپس بھیج دو، میں تمہیں شیرخان کے پاس چلا جانے دوں گا۔“

شادی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور آڑی تلووار سے اپنے سامنے کو پیچھے ہٹایا۔ ”مید! یہ باتوں کا وقت نہیں ہے کام کا وقت ہے۔“

حمید نے شادی کو روکنے کی کوشش کی مگر نہیں روک سکا۔ شیرخانی شہ دار نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور اپنی معمولی سی فوج میں واپس چلا گیا۔ شادی نے اپنی فوج کی طرف مڑ کر دیکھا اور گھوڑے پر آگے کی طرف جھک کر تلووار کو ہوا میں لہرا کر سپاہیوں کو حملے کا اشارہ کیا۔ شادی کی فوج ہزاروں میں اور شیرخانی سیاہ سینکڑوں میں تھی۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے میں گتہ گتیں۔

حمید کو بڑا دکھ تھا۔ اس نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا وہ محاذ جنگ سے ہٹ کر جاسن کے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر جنگ کا نظارہ کرنے لگا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ اس لڑائی سے افسردہ ہو گیا ہے۔

شادی نے اپنے ماہر تیر اندازوں کو حکم دیا۔ ”اگر تم شیرخانی شہ دار کو مار کر گرا دو تو یہ جنگ ابھی ختم ہو جائے گی۔“

تیر اندازوں نے خود کو آہستہ آہستہ فوج سے الگ کیا اور نصف دائرہ بناتے ہوئے شیرخانی شہ دار کی طرف بڑھے پھر جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب ان کے تیروں کی پوچھا شہ دار کو پہنچنے ہی نہیں دے گی تو انہوں نے ایک ساتھ تیر پھوڑے، ان کا منسوبہ کامیاب ہوا اور تیروں نے شہ دار کو اس کے کئی سپاہیوں سمیت زخمی کر کے خاک و خون میں لٹا دیا۔ وہ گھوڑوں سے نیچے گر گئے اور انہی کے گھوڑوں نے انہیں رد کر دیا اور انہیں زخمی کیا، سپاہیوں نے اپنے سردار کو زخمین پر گرتے دیکھا تو ان کے پاؤں اکٹڑ گئے اور جس کا چہرہ منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔

شادی قاتحانہ آبادی میں داخل ہوا اور اپنے مخالفوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے آتش زنی اور لوٹ مار کا حکم دے دیا۔ مکالوں کو لوٹا جانے لگا اور لوٹ مار کے بعد انہیں آگ لگا دی گئی۔ کینوں نے گھروں کو خالی کر دیا اور ادھر ادھر پناہ کی تلاش میں بھاگنا شروع کر دیا۔ حمید نے اس لوٹ مار اور آتش زنی میں کوئی حصہ نہیں لیا، جہاں کھڑا تھا

مکان کی چھتیں کچریوں کی تھیں۔ دروازے پر نیم کے درخت کا سایہ تھا۔

اس منتقل مکان کو کسی نے اتھک نہ لگایا تھا۔ کبھی کہیں گر گئی تھی، دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر بھٹکھو ہونے کا الزام بھی لگاتے رہے اور کبھی بھی تلاش کرتے رہے۔ جب کبھی نہیں ملی تو حیدر سے استدعا کی تالا توڑ دیا جائے۔

حیدر نے تالا توڑ کر انہیں اندر پہنچا دیا اور سپاہیوں سے کہا۔ ”تم لوگ اس گھر پر بہرہ دو۔ ہم نے انہیں چناہ دئی ہے۔“

جب حیدر واپس جانے لگا تو بڑے میاں نے حیدر کو آواز دی۔ ”بیٹے! میری ایک بات تو سننا۔“

حیدر نے ہلٹ کر پوچھا۔ ”کون سی بات؟“
بڑے میاں نے لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ لڑکی نے حیدر سے کہا۔ ”آپ ہمارے محسن ہیں، میں آپ کو یوں نہیں جانے دوں گی۔“

لڑکی کی آواز میں ترقم تھا، کھٹک تھی حیدر کو اپنے دل کی نیا بچک لے کھاتی محسوس ہوئی، جواب دیا۔ ”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا میں دوبارہ آؤں گا آپ کے پاس۔“
لڑکی نے حسرت سے کہا۔ ”کیا ایک کنوڑا پانی بھی نہیں پھینکے اس گھر کا؟“

حیدر نے لڑکی کو دیکھنا چاہا مگر نہیں دیکھ سکا۔ دوپٹے میں چھپا ہوا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

حیدر نے لڑکی کے ہاتھ سے پانی سے لبریز کنوڑا لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ خالی کنوڑا واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو میں نے آپ کی حکایت رنچ کر دی اب تو میں جاسکتا ہوں؟“

لڑکی کے باپ نے پوچھا۔ ”اب تو اس گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؟“

حیدر نے جواب دیا۔ ”نہیں آپ لوگ مطمئن رہیں۔“

لڑکی کی ماں نے پوچھا۔ ”اب کب آؤ گے؟“
حیدر نے جواب دیا۔ ”شاید پانچ سات دن نہ آسکوں ابھی لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں آؤں گا ضرور۔“

لڑکی کی ماں نے کہا۔ ”ہم لوگ تمہارا انتظار کریں گے، افسوس کہ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ کیا ہو؟ کون ہو؟“

حیدر نے جواب دیا۔ ”میرا نام حیدر ہے، میں کون ہوں، کیا ہوں یہ سب بتانے کا ابھی موقع نہیں بھر سکی تا دوں گا۔“

باپ نے پوچھا۔ ”تب بھرتم آؤ گے ضرور؟“
حیدر نے جواب دیا۔ ”ضرور آؤں گا میں وعدہ جو کر رہا ہوں۔“

جب حیدر واپس جا رہا تھا تو پورا گھر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا لڑکی بھی یہی چاہتی کہ حیدر کو جاتے ہوئے دیکھے مگر شرم نے اسے روک رکھا تھا، مگر اس نے اپنی ماں کی بغل میں منڈال کر حیدر کو واپس جاتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کی۔

☆.....☆

شیر خان بہرام میں اپنے شوق دار کی ہلکت کی خبر سن کر بایں ہو گیا، اسے معلوم تھا کہ شادی اپنی فتح مند فوج کے ساتھ بہرام آچکے گا اور اس میں فی الحال مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بہرام سے بھاگنے کی سوچ رہا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کہاں کر جائے گا کہاں۔ اس کے آدمی شادی اور اس کی فوج کی متوجہ کر رہا تھا وہیں پہلے ہوئے تھے تاکہ وہ جیسے ہی نمودار ہو شیر خان وہاں سے فرار ہو جائے۔ جب حیدر اپنے گھوڑے پر گردو خبار اڑاتا ہوا بہرام کے در پر نمودار ہوا تو شیر خان کے آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔ ”تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟“

حیدر نے جواب دیا۔ ”میں شیر خان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

شیر خان کے آدمیوں نے حیدر کو شیر خان کے روہرو پہنچا دیا۔ شیر خان نے اسے پہچاننے کی کوشش کی مگر نہیں پہچان سکا۔

حیدر بھی شیر خان کو بڑے غور سے دیکھتا رہا، بولا۔ ”تو تم ہو شیر خان۔“

شیر خان نے کہا۔ ”مگر میں نے تم کو نہیں پہچانا۔ تو میرے پاس کیوں اور کس کا بھیجا ہوا آیا ہے؟“

حیدر نے صاف صاف بتا دیا۔ ”شیر خان! تم بدظن نہ ہو جانا۔ میں حاکم جو پور محمد خان کا آدمی ہوں اور شادی نے ناظرہ، خواص پور کو میرے سامنے ہی فتح کیا ہے۔“

شیر خان نے زہر خند کیا، بولا۔ ”تو شاید مجھ سے یہ کہنے آیا ہے کہ میں بہرام کو لائے بھڑے بغیری شادی کے حوالے کر دوں۔“

کے بعد سوریوں میں ہندوستان کی حکومت نکل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔“

شیر خان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”شاید تو میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ سردست میں بہرام تک کو نہیں بچا سکتا اور تو پورے ملک کی بادشاہت کی باتیں کر رہا ہے۔“

حمید نے کہا۔ ”شاید میں اس پہلی ملاقات میں اپنے دل کی باتیں سمجھا نہیں پا رہا ہوں لیکن دو چار دن میں اپنے دل کی باتیں تمہیں بخوبی بتا سکوں گا۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”کل تک تو میرا سہمان ہے اس کے بعد داپس جا کر شادی وغیرہ کو بتا دے کہ وہ مجھ سے لڑ بھڑ کر جا کر تو چھین سکتا ہے لیکن میرے ارادے میرے عزائم نہیں بدل سکتے۔“

حمید نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”شیر خان! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں میں لودھی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ حکومت دوبارہ لودھیوں کو مل جائے۔ دراصل میں اس پٹھان کی تلاش میں ہوں جو ہم سب کی عزت و آبرو ہوگا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

شیر خان مسکرایا۔ ”اگر تو میرا مخلص ہے تو مجھے مشورہ دے کہ میں کہاں بھاگ جاؤں؟“

حمید نے کہا۔ ”کیا بھاگنا اتنا ضروری ہے؟ کیا صلح نہیں ہو سکتی؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”میں بھاگوں گا نہیں، باعزت پسپائی اختیار کروں گا، میں تجھ سے یہی مشورہ چاہتا ہوں کہ میں کہاں جاؤں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”تمہارے سلطان محمد بہار کے پاس چلے جاؤ وہ تو تمہاری بڑی قدر کرتا ہے۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”نہیں! میں وہاں نہیں جاؤں گا کیونکہ بہار کا حکمران جو چندر کے حاکم محمد خان کا گھبراہٹ دوست ہے۔ وہ میری وجہ سے اپنے دوست کو ناراض نہیں کرے گا۔“

حمید نے کہا۔ ”بھروسہ جو کہ مجھے بھی تمہارے ہی میں آئے کر دے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

شیر خان نے اپنے سہمان کو جس کرے میں ضمیر اٹھا تھا اس کی سخت نگرانی کا حکم دے دیا۔

وہ عشاء کے بعد خلافت قرآن پاک میں مشغول ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے کہ لڑا کر بولا۔ ”یا اللہ

حمید نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں یہ کہنے نہیں آیا۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا، میں نے تمہارا بڑا ذکر کر رکھا ہے۔“

شیر خان نے بے رخی سے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”حمید لودھی، میں لودھی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، لودھیوں کا آخری فرمان روا ابراہیم لودھی میرا ششے میں بچا لگتا تھا۔ آہ لودھیوں کو مظلوموں نے خاک میں ملا دیا۔“

شیر خان نے بدستور بے رخی برقرار رکھی، بولا۔ ”اگر تو لودھی خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو اس وقت میرے پاس کیوں آیا ہے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”صرف یہ کہنے کے آپس کی جنگ وجدال بند کر دو۔ مظلوم کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے اگر اس ملک میں پٹھانوں کو زندہ اور عزت سے زندہ رہنا ہے تو وہ آپس کے اختلافات ختم کر دیں اور شیر و شکر بن کر رہنا سیکھیں۔“

شیر خان نے کہا۔ ”لڑائی کا آغاز میں نے نہیں جو چندر کے حاکم محمد خان اور شادی نے کیا ہے۔“

حمید نے کہا۔ ”اگر تم دونوں بھائیوں کو ان کا حق دے دیجئے تو اس فوج کی کسی کو نوبت ہی نہ آتی۔“

شیر خان اپنے موقف پر ڈٹ رہا، بولا۔ ”سلطان اور احمد تامل ہیں۔ میں ان نااہلوں کے ہاتھوں اپنی جاگیر برباد نہیں ہونے دوں گا۔“

حمید نے پوچھا۔ ”اگر تمہاری جاگیر چھین کر تمہارے بھائیوں میں تقسیم کر دی جاتی تو؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”اگر ایسا ہوا تو یہ میرے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی اور میں اس ناانصافی کو کبھی برداشت نہیں کروں گا اور جب تک زندہ رہوں گا ناانصافی کو انصاف میں بدل دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔“

حمید نے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”یہ میں تجھے کیوں بتاؤں؟ تو میرے مخالفوں کا آدمی ہے میں اپنے ارادوں سے تجھے کیوں مطلع کروں؟“

حمید نے کہا۔ ”شیر خان! میں تمہارا مخلص دوست ہوں، میں تمہاری خداداد صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم غیر معمولی انسان بن کر ابھرو۔ میں تمہیں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ اگر بات صلح اور نرمی سے بن جائے تو خون خرابہ نہ کرو اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ میں لودھیوں

العالمین! میری رہنمائی فرما۔ میں کہاں جاؤں کیا کروں؟“
 کافی دیر بعد اس کے تصور میں بابر مقل فاح کی ہنسی
 ابھری، اس کے بعد کڑواہٹ پر کے مقل حاکم حیدر برلاس کا
 خیال آگیا۔ یہاں وہ اپنے چھوٹے بھائی نظام کو پہلے ہی
 روانہ کر چکا تھا۔ صبح ہوتے ہوئے شیر خان حیدر برلاس کے
 پاس جانے پر آمادہ ہو چکا تھا۔

شیر خان نے حیدر کو بتایا۔ ”مجھے جہاں جانا ہے ذرا دیر
 بعد چلا جاؤں گا تو بھی جہاں جانا چاہیے، چلا جا۔“
 حیدر نے جواب دیا۔ ”شیر خان! میں تمہارے ساتھ
 چلوں گا، کیونکہ میں نے اپنی قسمت کو تمہاری قسمت سے
 وابستہ کر دیا ہے۔“
 شیر خان نے کہا۔ ”لیکن میں تجھے نہیں لے جاؤں
 گا۔“

حیدر نے بڑے کرب سے کہا۔ ”شیر خان! مجھ پر
 اعتبار کرو، میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں تمہارا بھائی
 خواہ، ہمدرد اور دوست ہوں۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”یقین دلانے کی کوئی
 ضرورت نہیں۔ جب یقین آجائے گا میں تجھے دوست بنا
 لوں گا۔“

حیدر اس ہو گیا، بولا۔ ”شیر خان! کیا تم انسانوں کو
 سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ کیا میں نے تمہیں سمجھنے میں
 غلطی کی ہے؟ میں نے پورے ہندوستان میں تم کو ہی اس
 لائق سمجھا تھا کہ اپنا سامی، اپنا مثالی تصور بناؤں لیکن تم ہی
 مجھے اپنے پاس سے ہٹا رہے ہو۔ کچھ میں نہیں آتا کہ اپنی
 قسمت پر ماتم کروں یا تمہاری قسمت پر۔“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”انسوس حیدر خان!
 میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اللہ نے چاہا پھر بھی
 ملاقات ہوگی۔“

شیر خان نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا کہ وہ حیدر برلاس
 کے پاس جا رہا ہے جسے ساتھ چلنا ہو، چلے۔

شام ہوتے ہوئے شیر خان اپنے ساتھیوں کو لے کر
 مانک پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

حیدر کچھ دیر کھڑا شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو
 جاتے ہوئے دیکھتا رہا اس کے بعد وہ خود بھی کھوڑے پر بیٹھ
 کر ناٹھ روانہ ہو گیا۔

ناٹھ میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھا اس گھرانے
 میں پہنچا جن سے دوبارہ آنے کا وعدہ کرایا تھا۔

جب وہ دروازے پر پہنچا تو لڑکا گھر سے نکل کر کہیں
 جانے والا تھا۔ وہ حیدر کو دیکھتے ہی اندر واپس چلا گیا اور پھر
 دیکھتے ہی دیکھتے دروازے کے دونوں پت اس کے لیے کھل
 گئے۔

بڑے میاں مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے، بولے۔
 ”میں یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے کیونکہ تم ایک سچے انسان
 ہو۔“

حیدر شیر خان کا اعتماد حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے
 اداس تھا بولا۔ ”شاید میں بہت جلد آ گیا ہوں اگر میں اس
 کے ساتھ چلا گیا ہوتا تو اتنی جلد ہی نہ آتا۔“

بڑے میاں نے چونک کر پوچھا۔ ”کس کے ساتھ،
 یعنی کس کے ساتھ؟“

حیدر نے جواب دیا۔ ”میں اپنے ایک دوست کی
 بات کر رہا ہوں۔ میں اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر وہ مجھے
 اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔“

بڑے میاں نے پوچھا۔ ”کیوں؟ وہ اپنے ساتھ
 کیوں نہیں لے گیا؟“

اتنی دیر میں گھر کے سارے افراد دروازے پر آچکے
 تھے۔ بڑی بی بی نے کہا۔ ”یہ کیا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے،
 اندر بلا لو۔ دروازے پر بائیں کرتے رہنا کہاں کی شرافت
 ہے۔“

حیدر کو اندر بلا لیا گیا۔ کنبے والوں نے حیدر کو چاروں
 طرف سے گھیر لیا۔ بڑی بی بی کا رداں خوش تھا، بولیں۔
 ”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“

حیدر نے جواب دیا۔ ”میں نے وعدہ جو کر لیا تھا۔“
 بڑے میاں نے کہا۔ ”اب باتیں ہی کرتی رہو گی یا
 کچھ کھانے پینے کو بھی دو گی۔“

بڑی بی بی فوراً چلی گئیں۔ بڑے میاں نے اپنے سوا
 سب کو چلا کر دیا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔
 ”تمہارا خاندان کہاں ہے؟“

حیدر نے جواب دیا۔ ”میرا کوئی خاندان نہیں۔“
 بڑے میاں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کوئی خاندان
 نہیں! کیا مطلب؟“

حیدر نے جواب دیا۔ ”ہاں میرا کوئی خاندان نہیں۔“
 بڑے میاں سوالیہ نظروں سے حیدر کو دیکھنے لگے،
 بولے۔ ”ہات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

حیدر نے جواب دیا۔ ”میں وہی کارہنہ والا ہوں۔“

مغل فاتح ہارنے دہلی کو فتح کیا تو اس میں میرے خاندان کا صفایا ہو گیا۔ اب میں تہا زدگی سے بیزار اور اصرار بھاگا پھر رہا ہوں۔

بڑے میاں نے ایک سرو آہ بھری۔ ”تب پھر ہم دونوں ہی یکساں مصیبتوں کے شکار ہیں۔ میرا خاندان بھی ایک ایسی ہی مصیبت سے گزر چکا ہے خوب!“ پھر پوچھا۔ ”مگر یہ تم چلے کہاں گئے تھے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”اب کیا بتاؤں کہ کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے جو پندرہ کے عالم محمد خان کے دامن دولت سے خود کو وابستہ کر لیا ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ محمد خان اور شیر خان آپس میں برسر پیکار ہونے والے ہیں تو میں بے چین ہو گیا کیونکہ میں نہیں برداشت کر سکتا کہ پشان آپس میں خون خرابہ کریں۔ میں نے محمد خان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا پھر میں شیر خان کو سمجھانے چلا گیا۔“

بڑے میاں نے چونک کر حمید کی طرف دیکھا۔ ”تو تم شیر خان کے پاس سہرا م گئے تھے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”ہاں میں شیر خان کے پاس گیا تھا۔“

”شیر خان سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں ملاقات ہوئی۔“

بڑے میاں نے بے دلی سے پوچھا۔ ”کیا بات چیت ہوئی؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”میں نے شیر خان کو بہت سمجھایا کہ وہ جنگ و جدل سے باز رہ کر وہ نہیں مانا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ شیر خان اپنے بھائیوں کو ان کا حق دے دے تو یہ جنگ کے بادل چھٹ جائیں لیکن وہ نہیں مانا۔ شیر خان کی دلیل بھی بڑی مضبوط ہے، وہ کہتا ہے کہ جس طرح ایک قیام میں دو گورہیں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اس طرح ایک جاگیر میں دو حاکم کیسے رہیں گے۔ وہ اپنے حق کی حمایت اور تحفظ میں جنگ کو تازہ کر رہا اور لڑتی بھٹتا ہے۔“

بڑے میاں نے نفرت سے کہا۔ ”شیر خان اچھا آدمی نہیں ہے۔“ پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ ”ابراہیم! ذرا اصرار تو آنا۔“

آواز سن کر اس کا بیٹا ابراہیم بڑے میاں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

بڑے میاں نے کہا۔ ”یہ میرا بیٹا ابراہیم ہے آج تم اسے دوسری بار دیکھ رہے ہو۔ کیا تم نے دونوں بار اسے

چادر اوڑھے نہیں دیکھا؟“

حمید کو یاد آیا کہ ابراہیم کو اس نے دونوں بار چادر اوڑھے ہوئے ہی دیکھا ہے، کہا۔ ”ہاں میں نے ابراہیم کو دونوں مرتبہ چادر میں لپیٹا ہوا ہی دیکھا ہے۔“

بڑے میاں نے پرجوش لہجے میں بات کاٹ دی۔ ”اور تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ایسا کیوں ہے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”شاید اب میں اس پر ضرور غور کرتا اور آپ سے اس کا سبب بھی پوچھتا۔“

بڑے میاں نے نفرت انگیز لہجے میں اپنے بیٹے ابراہیم کو حکم دیا۔ ”چادر اتار دے۔“

ابراہیم نے چادر اتار دی۔ چادر کے اندر سے جو کچھ برآمد ہوا اس میں ابراہیم کا سیدھا ہاتھ عاقب تھا۔

حمید نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اس ہاتھ کو کیا ہوا؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”ابراہیم کا یہ ہاتھ شیر خان کے قلم و ستم کی نذر ہو گیا۔ میں اور میرا خاندان شیر خان سے نفرت کرتے ہیں۔“

حمید نے پوچھا۔ ”مگر یہ کیسے طرح ہوا؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”جب شیر خان کا باپ حسن خان زعمہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے شیر خان کے باپ حسن خان نے شیر خان کو اپنی جاگیر کا وارث بنادیا تھا۔ میرا خاندان شیر خان کی جاگیر میں آباد تھا اور ہم سے شیر خان کو یہ شکایت تھی کہ مالہ اور لگان کی ادائیگی سالوں کی باقی ہے۔ شیر خان نے ہم سے بجایا جات طلب کیے۔ ہم لوگوں نے وقت مانگا اس نے وقت دینے سے انکار کر دیا اور ہم پر فوج کشی کر دی ہم نے بھی شیر خان کا مقابلہ کیا۔“

بڑے میاں نے سرو آہ بھر کر کہا۔ ”پھر شیر خان جیت گیا۔ میرا بھائی مارا گیا۔ یہ ابراہیم میرا بیٹا ہے، اس کا سیدھا ہاتھ کٹ گیا۔ یہ کتبہ میرے بھائی کا ہے۔ میرا تو کوئی کتبہ ہی نہیں۔ میری بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم کی ماں میری بھانج ہے اور اس کی اولاد میرے سنی بچتے۔“

بڑے میاں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

حمید نے پوچھا۔ ”کیا آپ لوگوں نے واقعی سالوں سے حساب کتاب نہیں کیا تھا؟“

بڑے میاں نے غمی سے جواب دیا۔ ”سالوں کا حساب باقی تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ فوج کشی کر دی جائے۔“

حمید نے کہا۔ ”چونکہ مجھے حالات و واقعات کا صحیح علم

نہیں ہے اس لیے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”بڑے میاں کا انداز ہی بدل گیا۔ جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم سب شیر خان کے ظلم و جور کے شکار ہیں تو تمہیں اس پر یقین کر لینا چاہیے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”بزرگوار! افسوس کہ میں آپ کا ہم خیال نہیں ہو سکتا اگر یہ بات ثابت ہوگئی کہ شیر خان ظالم ہے تو میں آپ کا ساتھ دوں گا اور شیر خان سے اس کے ظلم و ستم کا حساب کتاب کروں گا۔“

بڑے میاں کے گویا پرانے ذمہ ہرے ہو گئے تھے۔ بجزاری سے حمید کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے قدرے سختی سے حمید کو مخاطب کیا۔ ”نو جوان! مجھے اس کا اعتراف ہے کہ تم نے میرے اس چھوٹے سے کنبے کی جان بچائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں شیر خان کی مدد سرائی شروع کر دوں تم میرے سامنے میرے دشمن کی تعریف نہیں کر سکتے۔“

بڑے میاں اپنی بھادج کے پاس چلے گئے اور اسے مطلع کیا۔ ”بھائی! یہ شخص آپ کی بربادیوں کے ذمے دار شیر خان کا مداح ہے۔ میں اس کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔“ بھائی نے بڑے میاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”عثمان علی شیر خان کا مداح ہونا میری بات نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کو شیر خان سے فائدے پہنچتے ہوں۔ ہر شخص کے اپنے ذاتی تجربات ہوتے ہیں اور انہی تجربات کی بنیاد پر وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے محبت یا نفرت کرتا ہے۔ ایک ایسا ہی تجربات پر جمہیں شیر خان سے متنفر کیے ہوئے ہے اور شاید کوئی خوشگوار تجربات اس کو جوان کو شیر خان سے محبت اور مدد سرائی پر مجبور کر رہا ہو۔“

بڑے میاں نرم ہو گئے۔ ”جب میں اپنے مرحوم بھائی کو یاد کرتا ہوں اور ابراہیم کا کتا ہوا ہاتھ دیکھتا ہوں تو میرے دل اور دماغ میں نفرت اور انتقام کا آتش فشاں اٹھنے لگتا ہے۔“

بھادج نے عثمان علی کو مزید سمجھایا۔ ”عثمان علی جو کچھ ہو چکا اس کو بھلا دو اور اس شریف نو جوان سے بگاڑ نہ کرو۔“ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”اس نے اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتایا؟“

بڑے میاں نے بجزاری سے منہ پھیر کر جواب دیا۔ ”دہلی کا رہنے والا ہے کہتا تھا، پانی پت کی جنگ میں پورا خاندان مارا گیا۔ اب باکل تھا ہے۔“

بھادج کے چہرے پر خوشی کی لہری دوڑ گئی، پوچھا۔ ”رہتا کہاں ہے؟“ عثمان علی نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں، یہ میں نے نہیں پوچھا۔“

بھادج نے کہا۔ ”عثمان علی! تم اس سے باتیں کرو، میں اس کے لیے کھانا تیار کر رہی ہوں اگر کسی طرح بات بن جائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“

عثمان علی نرم پڑ گیا۔ واپس جاتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال ایک بات طے ہے اگر اس نو جوان کو ہم میں رہنا ہے تو اس کو ہماری ہی طرح سونچنا ہوگا۔ میں اور ابراہیم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ شیر خان سے اپنی بربادیوں کا حساب کتاب ضرور کریں گے۔“ اگر حمید کو ہمارے ساتھ رہنا ہے تو اسے بھی ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔“

اسنے میں ان دونوں کے پاس ابراہیم بھی پہنچ گیا۔ عثمان علی نے اس سے پوچھا۔ ”کیوں ابراہیم! ہمیں شیر خان سے حساب کتاب کرنا ہے یا نہیں؟“ ابراہیم نے جواب دیا۔ ”انشاء اللہ! اس کے لیے میرا ایک ہی ہاتھ کافی ہے۔“

لیکن ابراہیم کی ماں نے ان دونوں سے اختلاف کیا، بولی۔ ”عثمان علی! کیا تمہارا بھائی ظلم اور سرکشی پر نہیں اتر آیا تھا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اس نے شیر خان کو لاکڑا، اس سے بغاوت کی اور مارا گیا۔ اس نے زندگی بھر مجھے ننگے پیچھا نہیں، اپنی اولاد تک کو خوش نہیں رکھا۔ وہ میرا شوہر تھا لیکن میں اس کی تحریف نہیں کر سکتی۔“ ابراہیم نے کہا۔ ”لیکن ماں! میرے باپ کی خدمت نہ کرو۔“

ماں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ! تجربے باپ کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر بھائی عثمان علی کی شفقتیں شامل حال نہ ہوتیں تو آج اس خاندان کا معطوم نہیں کیا حشر ہو چکا ہوتا۔“

عثمان علی چپ چاپ حمید کے پاس چلا گیا۔ ابراہیم بھی وہاں سے ہٹ گیا۔ ابراہیم کی بہن مکتوم چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ عثمان علی اور ابراہیم کی باتوں سے مطمئن ہوگئی مگر ماں کی باتوں نے اسے خوش کر دیا۔

☆.....☆

حمید کو شیر خان میں جو عزم، حوصلہ اور غیرت مندی نظر آئی تھی وہ مسکور بھی۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ شیر خان

ایک نہ ایک دن کوئی غیر معمولی شخص ثابت ہو گا۔ اس گھر میں جہاں وہ رہ رہا تھا۔ شیر خان کے خلاف نفرتیں تھیں۔ جذبہ انتقام تھا، غصہ اور غیظ و غضب تھا۔ شادی اپنی فوج کے ساتھ ہسپتال کی طرف بڑھ رہا تھا اس کو حید کا انتظار تھا مگر حید اس کے ساتھ جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے شادی سے کہہ دیا کہ وہ آگے نہیں جائے گا، کیونکہ شیر خان جنگ سے گریز کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ حید نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ شیر خان کا ساتھ اختیار کرے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شیر خان اس پر اعتبار نہیں کرتا مگر وہ مایوس نہیں ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ضرور ہو جائے گا۔

ماں کا رویہ بہت اچھا تھا۔ کلثوم کے انداز میں تکلف اور احتیاط پائی جاتی تھی۔ عثمان علی میں ابتدا میں کسی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے طور پر ہی میں سرد مہری پیدا ہوئی تھی اور ابراہیم اپنے چچا کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ ان حالات میں حید کا اس گھر میں رہنا دشوار ہو رہا تھا۔

ایک دن عثمان علی اور ابراہیم اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کو چلے گئے تو حید نے باورچی خانے کے در پر کھڑے ہو کر ماں سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ یہیں کلثوم بھی موجود تھی چھوٹی بیٹی نسیب کیل کو میں مشغول تھی۔

حید نے ماں سے پوچھا۔ ”یہ چچا عثمان علی اور ابراہیم کہاں چلے گئے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”زمینوں کی دیکھ بھال کرنے، کیوں؟“

حید نے کلثوم کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں، کلثوم نے سر جھکا لیا۔ ماں سر جھکائے کام میں مصروف تھیں۔ حید نے کہا۔ ”ہاں! ان دونوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”کوئی ایسی بات تو تھی نہیں جو بتا کر جاتے۔“

حید نے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے ماں! میں محسوس کر رہا ہوں کہ چچا عثمان علی مجھ سے کچھ کچھ کھپتے رہتے ہیں اور ابراہیم اپنے چچا کا تابع ہے۔“

ماں نے بات بتانے کی کوشش کی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے حید بیٹے! میں تو یہ بات نہیں محسوس کی۔“

ماں نے کہا۔ ”عثمان علی، شیر خان سے نفرت کرتا ہے اور تم اس کی تعریف کرتے ہو تم کو بھی ذرا احتیاط کرنی

چاہیے۔“

حید نے جواب دیا۔ ”ماں! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے؟“

کلثوم نے تڑپ کر حید کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں یاسیت تھی، التجائی، درخواست تھی، خوشامد تھی۔

ماں نے کہا۔ ”اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوا، تمہیں یہ گھر ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کون سا گھر ہے جہاں اختلافات نہیں ہوتے۔ کیا اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہ کو چھوڑ دیتے ہیں؟“

حید نے پوچھا۔ ”ماں! مگر یہ میرا گھر کب ہے جن کا گھر ہوتا ہو گا وہ نہیں چھوڑتے ہوں گے۔“

ماں نے حید کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”اگر تم اسے اپنا گھر سمجھو گے تو یہ تمہارا ہو جائے گا ورنہ لوگ برس برس گمراہوں میں رہ کر بھی ایسی ہی رہتے ہیں۔“

حید نے دیکھا کلثوم سمجھیوں سے اسے دیکھ چاری ہے۔ حید کو اس پر ترس آ رہا تھا۔

ماں نے جب دیکھ کر مزید کہا۔ ”حید! بات سیدھی سی ہے میرے شوہر نے پچھلے کئی برسوں سے سرکاری اختیار کر رکھی تھی۔ شیر خان نے اس کی سرکاری کوقات سے چل دو اور شیر خان نے جو کچھ کیا تھا میرے شوہر کے ساتھ نہیں بلکہ اس فہرست میں اور کئی نام بھی شامل ہیں ان سب کو چل کر کر دیا گیا۔ جب میں یہ سوچی ہوں کہ اگر شیر خان کی جگہ میرا شوہر ہوتا اور شوہر کی جگہ شیر خان تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔“

حید نے کہا۔ ”پھر آپ عثمان علی اور ابراہیم کو سمجھائیں کہ وہ اس معاملے میں زیادہ جذباتی نہ بنیں۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”میں انہیں برابر سمجھاتی رہتی ہوں، میں سمجھتی نہیں ہوں، بس ذرا دقت لگے گا۔“

حید نے کہا۔ ”پھر میں یہ کروں گا کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلا جاؤں۔“

ماں نے بات کاٹ دی، بولی۔ ”اگر تم نے یہاں سے جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو تمہیں روک بھی کون سکتا ہے بشوق چلے جاؤ۔ اپنی خوشی سے آئے تھے اپنی مرضی سے چلے جاؤ گے۔“

حید وہاں سے ہٹ آیا۔ ماں اداس ہو گئیں انہوں نے جاتے ہوئے حید کی طرف دیکھا تک نہیں۔ حید کے چلے جانے کے بعد وہ بڑبڑائے لگیں۔ ”بھائی عثمان علی کو رہے رہے معلوم نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ وہ گزے مردے

اکیڑنے لگتے ہیں۔ وہ معلوم نہیں یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کے دل پر لگے ہوئے زخم کسی دوسرے کو نہیں تڑپائیں گے۔
 کلثوم اضطرابی حالت میں ابھی اور باورچی خانے سے نکل گئی۔ ماں نے کہا۔ ”میں تو اس نوجوان کو روکنے سے رہی، ہاں تو اگر روک سکے تو روک لے۔“

کلثوم ادھر ادھر دھشت سے دھشتی ہوئی حمید کے کمرے تک پہنچ گئی۔ اس نے کڑکی درز سے جھانک کر دیکھا، حمید نے فرش پر ایک چادر بچھا رکھی تھی اور اس پر اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ کلثوم اور زیادہ پریشان ہوئی۔ آہستہ آہستہ چل کر کمرے کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کمرے میں اس کا سایہ چوڑا تو حمید نے محسوس کر دیکھا اپنے سامنے کلثوم کو کھڑا دیکھ کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ کھل کر رہ گیا۔ ”کلثوم یہ تم؟“

کلثوم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں، ہونٹ کپکپا رہے تھے، قہر قرانی آواز میں آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا آپ جا رہے ہیں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”ہاں کلثوم۔“

کلثوم نے آنکھیں میچنے لگیں اور آہستہ سے کہا۔ ”اچھا خدا حافظ۔“

وہ یہ کہہ کر چلی گئی، حمید کانپ گیا، بھاگ کر کلثوم کا راستہ روک لیا، بولا۔ ”کیا اس طرح خدا حافظ کہا جاتا ہے؟“

کلثوم نے مفہوم آواز میں جواب دیا۔ ”کیا اس طرح رخصت ہوا جاتا ہے؟“

حمید نے ادھر ادھر دیکھا، وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا، آہستہ سے کہا۔ ”کلثوم! کیا تم جانتی ہو کہ میں اس گھر میں کس کی وجہ سے آیا تھا؟“

کلثوم نے جواب دینے کے بجائے ڈبڈبائی آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید نے اپنے دامن سے کلثوم کے آنسو پونچھنا چاہے، بولا۔ ”تم پوچھتی کیوں نہیں کلثوم کہ میں اس گھر میں کس کی وجہ سے آیا تھا۔“

کلثوم نے حمید کے دامن سے اپنی آنکھیں بچائیں، بولی۔ ”اب میں کچھ بھی نہیں پوچھوں گی۔“
 حمید نے کہا۔ ”کلثوم! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”میں جانے والوں سے کیا باتیں کروں؟ خدا حافظ کہہ دینے کے بعد کسی بات کی گنجائش

ہی کہاں رہ گئی۔“

حمید نے کہا۔ ”کلثوم! تم خود سوچو کہ میں اس گھر میں کب تک مہمان بنارہوں گا؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”آپ کو اس گھر میں کس نے مہمان سمجھا ہے؟“

حمید نے کہا۔ ”خود میں نے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں اس گھر میں اچانک حادثاتی طور پر داخل ہوا تھا پھر مہمان بن کر آ گیا اور مہمان کو ایک نہ ایک دن تو جانا ہی پڑتا ہے۔“

کلثوم نے کہا۔ ”آپ نے خود کو مہمان سمجھ رکھا ہے درندہ میری ماں کی تو یہی خواہش رہی ہے کہ آپ زمینوں کے معاملات میں چچا عثمان علی کا ہاتھ بٹائیں اور اسی گھر میں رہیں۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”مجھ سے ایسا کہا تو کبھی بھی نہیں کیا۔“

کلثوم نے کہا۔ ”ہر بات کہی تو کبھی بھی نہیں جاتی، بس کبھی جاتی ہے۔“

حمید نے کہا۔ ”گھر افسوس کہ میں ان زمینوں کا آدمی نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد سپاہی رہے ہیں، میں بھی سپاہی ہوں میرے کام کی زمین میدان کا رزار ہے میں رزم گاہ کے لیے پیدا ہوا ہوں۔“

کلثوم رو ہانسی ہوئی چڑ بولی۔ ”پھر یہاں اس گھر میں کیا کر رہے ہو، چلے جاؤ اپنی زمینوں پر معلوم نہیں تو مردوں کو میدان کا رزاری زمینیں کیوں اچھی لگتی ہیں۔ وہ زمینیں جو آدمیوں کو کھٹا جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں ان زمینوں کی طرف بھیجنا چاہتی ہوں جو تمہیں کچھ دیتی ہیں، جہاں فصلیں اگتی ہیں جہاں پھل لگتے ہیں مگر تم لوگ قبرستان کی طرف بھاگتے ہو۔“

کلثوم کی باتوں نے حمید کے دل پر بڑا اثر کیا، بولا۔ ”کلثوم! میں بڑا آدمی انسان ہوں۔ میں نے جس میدان میں اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا اب وہیں سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ معاشرے میں عزت دار رہی ہیں جو مرد میدان ہیں۔“ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ان آنکھوں میں میرا مقام ہے اور تمہارے دل میں میں نے کوئی جگہ بنائی ہے تو میں نہیں بھی رہوں۔ آخر کار میںیں چلا آؤں گا۔“

کلثوم نے کہا۔ ”ہم سب کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں

ساری باتیں تصور میں گھوم رہی تھیں پھر وہ اٹھا اور اپنا سامان
ہاٹھ لیا۔ اس کی جتنی اور جتنی مفقود ہو چکی تھی، اس کا خیال
تھا کہ کلثوم اس بار بھی اس کے پاس آئے گی اور اسے روکنے
کی کوشش کرے گی اس نے کپڑے کی پوٹی ہاٹھنے کے
دوران کئی بار دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نظر
نہیں آیا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا اور ادھر ادھر
نظریں دوڑا کر کلثوم کو تلاش کرنے لگا۔ آخر اس کی نظر اس
حالت میں کلثوم پر پڑی کہ وہ کئی ماں کے کمرے سے باہر نکل
رہی تھی۔ کلثوم نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے
گھبرنے کے در پر کی پھر کھن کے مقابل برآمدے میں چلی
گئی۔ حمید بھی وہیں پہنچ گیا۔ یہاں رنگ برنگے پھولوں کی
بتلیں دیواروں پر سجی ہوئی تھیں۔ کلثوم ایک بتل کے سامنے
تے بھی ہوئی چوٹی پر بیٹھ گئی۔ حمید اس کے پاس جا کھڑا ہوا،
آہستہ سے آواز دینے لگا۔
”کلثوم نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔
”مجھے افسوس ہے بچا عثمان علی کی طرف سے میں معافی
مانگ رہی ہوں۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”کلثوم! معافی مانگنے کی کوئی
ضرورت نہیں۔ میں نے جو بے فیہرٹی اختیار کر لی تھی، اس کا
بھی نتیجہ برآمد ہوا تھا۔“
”کلثوم نے کہا۔ ”کیوں دل برداشتہ ہو کر چلے نہ
جانا۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”کلثوم! میں تم سے جانے کی
اجازت لینے آیا ہوں۔“
”کلثوم کو اس پر حیرت نہیں ہوئی، شاید وہ یہ خبر سننے کے
لیے پہلے ہی سے تیار تھی، پوچھا۔ ”مگر کب آؤ گے؟“
حمید نے جواب دیا۔ ”کچھ ہفتائیں، مجھے خود ہمت نہیں
کہ میں پھر کب آؤں گا۔“

”کلثوم نے کہا۔ ”جانے سے پہلے ماں سے چہ باتیں
کر لیا وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔“
حمید نے کہا۔ ”میں ابھی ان سے باتیں کیے لیتا
ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ ماں کے پاس جانے کے لیے مڑا مگر کلثوم
نے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ وہ اس وقت سوئی ہوئی ہیں۔
حمید کی جان میں جان آئی، بولا۔ ”میں تم سے بھی چہ
باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

اگر آپ میری زبان سے یہ سنتا چاہتے ہیں کہ میں..... کہ
میں.....“

وہ بات پوری نہیں کر سکی اور منہ کو دونوں ہاتھوں سے
چھپا کر روئی ہوئی چلی گئی۔

حمید اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا، اس کی سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا اور ان حالات میں اس کو کیا کرنا
چاہیے۔ جب کلثوم نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی محفل
اور ادا اس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی ہوئی چادر
کے کپڑے اٹھا کر کھونٹیوں پر ٹانگ دینے اور چادر تہہ کر کے
لکڑی کے صندوق میں رکھ دی۔

☆.....☆
حمید کچھ دن کے لیے اور رک گیا۔ وہ کلثوم کو ناراض
کر کے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ماں اس کے رک جانے سے
خوش تھیں مگر عثمان علی انتہائی کوشش کے باوجود اپنی سابقہ گرم
جوشی بحال نہیں کر سکا تھا۔ حمید موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ
کلثوم سے چند باتیں کر کے اسے اپنے اعتماد میں لینا چاہتا
تھا۔

یہ سردیوں کے دن تھے۔ عثمان علی کو اچانک زمینوں
پر جانا پڑ گیا۔ وہ ابراہیم کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے
جاتے جاتے حمید سے کہا۔ ”حمید! اگر تو جانا چاہے تو میری
واپسی تک نہ جانا۔ اس کے بعد چلے جانا۔“

عثمان علی کی اس بات نے حمید کے دل پر چوٹ سی
لگائی، وہ بوکھلا گیا اور فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ
عثمان علی کو کیا جواب دے۔ وہ انتہائی جذباتی تھا، اس کی
بھوک پیاس اور نیند تک اڑ گئی۔ عثمان علی دہریں بھجھا کر حمید
پر چلا کر زمینوں پر جا چکا تھا۔ عثمان علی کی یہ بات ماں اور
کلثوم نے بھی سن لی تھی۔ وہ دونوں اس کے روتوں سے
پریشان ہو رہی تھیں چنانچہ عثمان علی کے چلے جانے کے بعد
ماں نے اس کے دھمی دل پر پھیا رکھنا چاہا، بولیں۔ ”عثمان
علی بھی غموں سے گھٹیا گیا ہے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے
بچا عثمان کی بات میں ان کی خواہش پائی جاتی ہے اب مجھے
نہیں رکنا چاہیے۔“

ماں نے کہا۔ ”میں عثمان علی کو سمجھا دوں گی۔“
حمید جواب دینے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں
چار پائی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ وہ اس غامضانہ سے کہاں اور
کس حال میں ملا تھا پھر دوبارہ اس گھر میں کس طرح آیا،

حمید نے پوچھا۔ ”لیکن یہ وعدہ تم کس طرح کر سکتی ہو؟ کیا تم اپنی ماں، اپنے چچا عثمان علی اور بھائی ابراہیم کی ضدوں اور مرضیوں کے خلاف ثابت قدم رہ سکو گی؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں آزما لیں مگر ایک بات۔ ایک وعدہ آپ کو بھی کرنا ہے۔“

حمید نے پوچھا۔ ”کون سا وعدہ؟“

کلثوم نے کہا۔ ”آپ جہاں کہیں بھی رہیں یہ یاد رکھیں کہ میں انتظار کر رہی ہوں۔ آپ کو اور لڑکیاں بھی مل سکتی ہیں مگر میں آپ کا انتظار کروں گی۔ ہر حال میں۔“

اس کے بعد اس نے حمید کو ایک رومال دیا۔ حمید نے اس رومال کو کھولا تو دیکھا اس میں دو آنکھیں بنی ہوئی ہیں، حیرت سے پوچھا۔ ”کلثوم! یہ دو آنکھیں یہ کیوں؟ ان کا مطلب؟“

کلثوم نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”یہ میری آنکھیں ہیں۔ خطرہ آپ کی جھڑ آنکھیں۔ آپ اس رومال کو ہر وقت اپنے پاس رکھیے گا اور دفن فرمائیں دیکھ کر یہ یاد کر لیں جیسے کہ کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے اور خاص کر اس وقت ضرور، جب کوئی لڑکی یا عورت۔۔۔۔۔“

وہ بات پوری نہیں کر سکی روٹنے لگی۔

حمید نے کلثوم کے رومال سے اس کے آنسو خشک کرنا چاہے مگر وہ جیسے ہٹ گئی، بولی۔ ”اس رومال کو اپنی آنکھوں سے لگائے رکھنا۔ میرے آنسوؤں کے لیے میرا اپنا دامن کافی ہے۔“

اس کے بعد کلثوم حمید کے پاس نہیں ٹھہری۔ وہ بھاگتی ہوئی ماں کے کمرے میں ٹھس گئی۔ حمید حیران و پریشان بھونچکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب کلثوم کی ماں بیدار ہو کر باہر آجائے گی لیکن کچھ دیر انتظار کرنے کے باوجود جب دونوں میں سے ایک بھی باہر نہ آئی تو حمید بے قدموں ایڑی کے بل چل کر ماں کے کمرے تک پہنچا وہ اندر سے بند تھا اس نے کھڑکی کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے جھانک کر اندر دیکھا، ماں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور کلثوم ان کی رانوں پر لیٹی تھی۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں، اس نے سناں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔ ”تجھ کو ایسا وعدہ نہیں کرنا تھا کلثوم! تو مردوں کو نہیں جانتی۔“

کلثوم سسکیاں لے لے کر دروازہ پر تھیں۔

ماں نے پوچھا۔ ”چنب تو نے اس سے انتظار کرنے کا وعدہ کیا۔ تو اس نے کیا کہا تھا؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”کرو۔“

حمید کو کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے، بالآخر ایک ایک کر بولا۔ ”کلثوم! دراصل علی میری بیٹی تھی مگر تمہاری محبت نے مجھے بے غیرت بنا دیا تھا۔ جو پند کا حاکم محمد خان میرا انتظار کر رہا ہے اور میں یہاں۔۔۔۔۔“

کلثوم نے کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ اب کیا ہوگا؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”کلثوم! وہی ہوگا جو تم چاہو گی، میرا آئندہ کاروبار تمہارے جواب کا تابع ہوگا۔“

کلثوم نے شرما کر پوچھا۔ ”میں کب تک آپ کا انتظار کروں گی؟“

حمید کو اس سوال نے خوش کر دیا۔ یہ ایسا سوال تھا جس میں حمید کے سوال کا جواب بھی موجود تھا۔

حمید نے کہا۔ ”کلثوم! میں یہاں سے نکل کر شیر خان کو تلاش کروں گا پھر اس کے ساتھ قسمت آزمائی میں لگ جاؤں گا اور جب تقدیر یاوری کرے گی اور میں صاحب حیثیت ہو جاؤں گا تو تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔“

کلثوم شیر خان کے ذکر پر چونک گئی، بولی۔ ”میں واپس کی مدت پوچھ رہی ہوں اور یہ بار بار آپ شیر خان کا نام کیوں لیتے ہیں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”سروست میں خود نہیں جانتا کہ اس میں کتنا وقت لگے گا۔ شیر خان میرے لیے ایک مثالی انسان ہے جس سے اس سے متاثر ہوں اور اسی جیسا بن جانا چاہتا ہوں۔“

کلثوم نے کہا۔ ”جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میرے گھر کا ہر فرد شیر خان سے چڑتا ہے، جتنا ہے تب پھر آپ بار بار ہمارے سامنے اس کا نام کیوں لیتے ہیں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ میں اس سے نہیں چڑتا، میں اس سے نہیں جلتا، وہ میری محبوب ترین شخصیت ہے۔“

کلثوم نے سنی آتی کر دی، پوچھا۔ ”مجھے تو بس یہ بتا دیجئے کہ آپ واپس کب آئیں گے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”کہہ دوں گا کہ میں خود نہیں جانتا کہ واپس کب آؤں گا لیکن بھی نہ بھی واپس آؤں گا ضرور۔“

کلثوم نے حزیں لب و لہجہ میں کہا۔ ”آپ جب بھی آجائیں، میں انتظار کروں گی، بالوں کی سفیدی تک۔“

لہذا سوسلی ٹیگٹ



خوشگوار بوندوں کا ساز اور نئے سال کا آغاز
جنوری، جاسوسی کی دل گدا کہانیوں کا ایک انداز
اولین صفحات

انٹکوں کی شدت اور آگے بڑھنے کی زبردست خواہش
بالآخر منزل تک پہنچاؤ جی ہے، جرم کا رجحان، ایمان اور
امید کے مختلف اطوار۔ **زویا اعجاز** کے قلم سے.....

انگاریے

وشنوں کے شعلے میں آہنی اعصاب کے مالک جیمین
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نفس میں آگے بڑھتا
ظاہر جاوید مغل کے ایوارڈ سلسلے کی ایک اور کڑی
آوارہ گد
چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت.....

عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سورق کی رنگ

سال نو پر ابھرتی آس و امید کی نئی
انگ و رنگ..... سورق کا ٹکھارنگ

کوسم سہرا کی انگلیوں کے منگے فریب سورق کی نیکی

چینی تھک چینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی دلیپ باتیں... کتنا کیں

کٹھوم نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ کہتے
تھے میں واپس ضرور آؤں گا۔“
ماں نے پوچھا۔ ”مگر کب؟ کتنے دنوں بعد؟ واپسی
کی کوئی مدت نہیں بتائی اس نے۔“
کٹھوم نے جواب دیا۔ ”مدت نہیں بتائی لیکن میں
نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میں بالوں کی سفیدی تک اس کا
انتظار کروں گی۔“

ماں نے فرط غم میں کٹھوم کے سر پر دو ہتھڑ سپرد کر دیئے
اور ممکن آواز میں کہا۔ ”یہ تو نے کیا کیا کٹھوم! تو نہیں جانتی
ان مردوں کو۔ میری بچی تو انتظار کرنی رہ جائے گی اور وہ
مغص تجھے بھول کر کہیں اور شادی کر لے گا۔“
کٹھوم رونے لگی، ماں کی آنکھیں بھی بیگم گئیں،

بولی۔ ”میں اس سے بات کروں گی اور اس سے تیرا وعدہ
واپس لے لوں گی۔ میں اس سے صاف صاف کہہ دوں گی
کہ اگر وہ چار سال کے اندر اندر نہ آیا تو میں اپنی بچی کی
شادی کہیں اور کروں گی۔“

کٹھوم اٹھ کر بیٹھ گئی، بولی۔ ”ماں! خدا کے لیے اس
سے ایسی بات نہ کرنا۔ میں نے جو کہہ دیا میں زندگی بھر اس کا
انتظار کر لوں گی۔“

حمید بچوں کے بل بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں چلا
گیا۔ پٹنگ برلیٹ کے چادر اوڑھ لی، کچھ دیر بعد جب ماں
اس سے بات کرنے پہنچی تو اسے سوتا ہوا دیکھ کر واپس چلی گئی
اور کٹھوم سے کہا۔ ”اور کدو عہ زندگی بھر انتظار کرنے کا۔ وہ
تو جی ہر طرف سے بے فکر ہو کر لی تانے سو رہا ہے۔“



حمید عثمان علی اور ابراہیم کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں نے
پہلے تو حمید سے صاف صاف بات کرنا چاہی تھی لیکن کٹھوم
نے رد رد کر ماں کو روک دیا۔ بس اتنی سی بات کہہ کر رہ گئی۔
”بڑے! کٹھوم لڑکی ہے، لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے
جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا اور اگر..... خدا خواستہ کمر
گرہستی میں پھنس جاؤ تو ہمیں اس کی اطلاع ضرور کرو دینا
تا کہ میں بھی کٹھوم کا بندوبست کروں۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”میں واپس آؤں گا ماں، میں
ضرور واپس آؤں گا، آپ بے فکر رہیں۔“

جب عثمان علی واپس آ گیا اور حمید کو رخصت سفر
باندھے دیکھا تو براہ راست حمید سے بات نہیں کی۔ کٹھوم کی
ماں سے پوچھا۔ ”کیا یہ جارہا ہے؟“

ماہنامہ مسرگوشٹ

ماں نے جواب دیا۔ ”ہاں جا رہا ہے۔“

عثمان علی نے پوچھا۔ ”مگر کہاں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں یہ تو اسی سے پوچھ لو۔“

عثمان علی نے کہا۔ ”آپ کو نہیں بتایا کچھ؟ کچھ بھی نہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”نہ تو میں نے اس سے یہ پوچھا ہے اور نہ اس نے خود سے بتایا۔“

حمید باہر نکل گیا، اس نے گھوڑا اٹکالا اور اس کی پشت پر زین کئے لگا۔

عثمان علی نے حمید کی پوٹی اٹھالی اور کلٹوم کی ماں سے پوچھا۔ ”یہی پوٹی اس کے ساتھ جائے گی یا کچھ اور بھی؟“

کلٹوم کو اپنے چچا عثمان علی کی حرکتوں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور رونا بھی۔ دوڑ کر ان کے پاس پہنچی اور پوچھا۔ ”چچا جان! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

عثمان علی نے اس کے بھاری ہونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”حمید کی پوٹی دینے جا رہا ہوں میں نے سوچا غریب کو خور و خاوا اتنی زحمت کرنا پڑے گی۔“ پھر ہونٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ نہیں کیا ہو گیا ہے کلٹوم! کیا آنکھیں دیکھنے آگئیں؟ ان میں دواؤں، آگ، آنکھیں بڑی نعمت ہوتی ہیں ان کی فوراً پروا کرنا چاہیے۔“

باہر نکل کر عثمان علی نے حمید کی پوٹی اس کے حوالے کر دی، بولا۔ ”یہ اندر رہ گئی تھی، میں نے سوچا تم بار بار کیوں تکلیف کرو، میں ہی لے آیا۔“

ماں، چھوٹی بچی نضب اور امیر الہم دروازے پر موجود تھے لیکن ان میں کلٹوم نہیں تھی۔

حمید نے نضب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جھک کر اس کی پیشانی چومی، پوچھا۔ ”نضب بچھے بھی یاد رکھی یا نہیں؟“

نضب نے پوچھا۔ ”نئی دیر میں آؤ گے والیں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”بہت دنوں بعد مگر واپس ضرور آؤں گا۔“

پھر امیر الہم سے ہاتھ ملایا۔ اس نے اپنے چچا کی طرف دیکھا اور سرد مہمی سے ہاتھ ملا کر چھوڑ دیا۔ ماں کی طرف دیکھا وہ کہہ رہی تھیں۔ ”دیکھو واپس ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی تمہارا۔“

حمید ماں کے قریب چلا گیا۔ ماں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا مانگی دیں۔

بالکل آخر میں وہ عثمان علی سے مخاطب ہوا، بولا۔ ”چچا جان! اجازت۔“

چچا عثمان علی نے کہا۔ ”چلو کچھ دور تو پیدل چلو، میں بھی ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔“

حمید گھوڑے کی گام پکڑ کر چچا عثمان علی کے ساتھ چلتے لگا۔

عثمان علی نے چلتے چلتے کہا۔ ”تم نے اپنی واپسی کی مدت نہیں بتائی۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”نہیں، کیونکہ میں جو مقصد لے کر جا رہا ہوں پتا نہیں وہ کتنی مدت میں پورا ہو۔“

عثمان علی نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔ میں کلٹوم کے سطلے میں تمہارا انتظار نہ کروں۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”جیسی آپ کی مرضی، میں کیا کر سکتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے اڑ لگا دی۔

☆.....☆

حمید کو اثناء راہ معلوم ہوا کہ شیر خان مالک پور میں جیلد بھلاک کے پاس ہے۔ وہ اس تلاش میں ادھر ہی جا رہا تھا کہ شیر خان فوجی مدد کے کمرہم آ گیا۔۔۔۔۔ دونوں ایک دوسرے سے ملے اور شیر خان نے اسے دعا بازی نہ کرنے کے طور پر ساتھ رکھ لیا۔ چونکہ پہنچ کر شیر خان نے محمد خان کو شکست دی پھر کمرہم پہنچ کر بھائیوں سے جاگیر واپس حاصل کی اور پھر باہر کے دربار میں پہنچنے کے لیے آگرا جانے کی تیاری کرنے لگا۔

آگرے جانے سے پہلے شیر خان نے چوہدر کے حاکم محمد خان کو اس کی جاگیر یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں، میں آپ کو اب بھی اپنا چچا سمجھتا ہوں، میرا جھگڑا تو میرے بھائیوں سے تھا جو تم ہو گیا۔

محمد خان نے شیر خان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جاگیر پر دوبارہ تعریف ہو گیا۔

ادھر شیر خان نے اپنی جاگیر کا انتظام اپنے بھائی نظام کے سپرد کر دیا اور خود جیلد بھلاک کے ساتھ آگرے روانہ ہو گیا۔

اس سفر میں حمید اس کے ساتھ تھا۔ شیر خان نے حمید سے سرکشی میں کہا۔ ”ذرا مظلوم کے ظلم و ستم پر نظر رکھنا کیونکہ یہ مشاہدہ ہمارے کام آئے گا۔“

جیلد بھلاک نے شیر خان کا باہر سے تعارف کرایا تو باہر شیر خان سے رسوا پیش آیا۔ وہ کئی دن تک باہر کے پاس

بابر اس کی اس حرکت کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے شیر خان کی ادا پسند آئی۔ حمید برلاس کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ ”حمید! اس کے انداز شاہانہ ہیں۔ یہ شخص کسی نہ کبھی سلطنت مظفہ کے لیے مصیبت ثابت ہوگا۔“

حمید برلاس نے جواب دیا۔ ”بے شک اس افغان میں غیر معمولی اوصاف پائے جاتے ہیں۔“

بابر نے کہا۔ ”یہ میرے بعد ہمایوں مرزا کے لیے مصیبت بن جائے گا، کیوں نہ اسے قید کر لیا جائے۔“

حمید برلاس نے بادشاہ کی خواہش سے اختلاف کیا۔ ”حضور والا اگر اس افغان کو قید کر لیا گیا تو افغانوں کا مظلوموں پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور وہ دربار میں آنا جانا چھوڑ دیں گے۔“

بابر نے کہا۔ ”تب پھر اس افغان پر نظر رکھی جائے۔“

حمید برلاس نے اس کا وعدہ کر لیا۔ شیر خان کھانے میں مشغول تھا۔ وہ دونوں کی باتیں بخور سنتا رہا۔ چونکہ اسے ترکی نہیں آتی تھی اس لیے وہ ان دونوں کی باتوں کا تلفظ اور محتاط مطلب تو نہیں سمجھ سکتا لیکن انداز اور قیاس سے یہ ضرور سمجھ لیا کہ بابر اور حمید برلاس اس کی بابت کچھ ناخوش گواریاں کر رہے ہیں۔

شیر خان کی توجہ قوت فیصلہ اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ باہر نکلا تو اپنی قیام گاہ پر نہیں گیا۔ حمید کو بلو کر فوراً کھسرا روانہ ہو گیا۔ حمید پریشان تھا کہ وہ اگرچہ چھوڑنے میں اتنی عجلت کیوں کر رہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”محترم شیر خان! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں کہ بابر کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔“

حمید نے پوچھا۔ ”کیا بابر نے آپ کی بے عزتی کی ہے؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں مگر میری حس مجھے خطرے کا احساس دلارہی ہے۔“

حمید چپ ہو گیا مگر اسے یقین تھا کہ شیر خان جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں جھوٹ شامل نہیں ہوگا۔

واپسی میں اس نے حمید برلاس کو ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا۔ ”چونکہ میری عدم موجودگی میں میری اپنی جاگیر کا نظم و نسق ابتر ہو چکا ہے اس لیے میں فوری اپنی جاگیر پر واپس جا رہا ہوں۔“

آتا جاتا رہا۔ شیر خان کی تیز نظر انظر میں مظلوموں کے نظم و نسق میں وہ کھف دیکھنے میں کامیاب ہوئی جس جو ملازمین اور منصب داروں نے رشوتوں کے لین دین سے پیدا کر رکھا تھا۔ شیر خان نے حمید سے کہا۔ ”مغل بادشاہ اپنے امراء اور مصاحبین پر اتنا زیادہ اعتماد کرنے لگا ہے کہ وہ رشوت کے کاروبار کو نظر انداز کرتا جا رہا ہے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”لیکن شیر خان! بابر قانع ہے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس لیے نرمی اور مروت سے پیش آ رہا ہے کہ انہی کی مدد اور کوششوں سے ہندوستان کا بادشاہ بنا ہے۔“

شیر خان نے کہا۔ ”حمید! اگر میرے ہم قوم میرا ساتھ دیں تو میں مظلوموں کو ہندوستان سے نکال باہر کروں۔“

حمید کو شیر خان کی بات پر یقین نہیں آیا وہ اسے شیر خان کی خوش فہمی سمجھنے لگا۔

شیر خان کی نگاہیں بابر اور اس کے رفقاء کے کار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے اس دربار میں بابر کے جانشین ہمایوں کو بھی دیکھا ہمایوں کی شخصیت شیر خان کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی۔

حمید برلاس شیر خان پر بہت زیادہ مہربان تھا۔ وہ شیر خان کو شاہی دسترخوان پر لے گیا۔ بابر کے دسترخوان پر امراء اور معزز زمین مؤدب بیٹھے تھے۔ شیر خان محفل میں داخل ہوا اور ادھر ادھر اپنے لیے نشست تلاش کرنے لگا۔ بابر کے قریب جگہ خالی تھی۔ شیر خان وہیں بیٹھ گیا۔ بابر کو شیر خان کی جرأت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے حمید برلاس سے ترکی زبان میں کہا۔ ”مجھے اس نوجوان میں فتنہ و فساد کی بو محسوس ہوتی ہے۔“

حمید برلاس نے جواب دیا۔ ”یہ ہمارا دوست ہے اور اس کی وجہ سے بہت سارے پٹھان ہمارے دوست بن گئے ہیں اور چونکہ پٹھان اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں اس لیے اس میں ہلاکی خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔“

دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ کھانے کا آغاز ہوا شیر خان نے نہایت بے باکی اور بے تکلفی سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ شیر خان سے ذرا دور اور بابر کے قریب ماسچہ کی قاب رکھی تھی۔ وہ اس قاب میں سے کچھ نکال کر کھانا چاہتا تھا۔ آخر اس نے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور اس سے ماسچہ کے چند ٹکڑے کیے اور خنجر کی نوک ہی سے انہیں کھانے لگا۔

امیران دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا مگر آخر باتیں نہیں سن سکا۔
شیرخان نے ملکہ لاڈو سے جو کچھ سنا تھا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ اس پر غور کرنے سے پہلے ہی ضروری سمجھتا تھا کہ پہلے اس امیر کو بے بس اور مضطرب کر دیا جائے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور امیر کو کر بیان سے پکڑ لیا۔ ”تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”میں ملکہ کا تابع فرمان ہوں محض ملکہ کی خوشنودی طبع کی خاطر کھڑا رہتا ہوں۔“
شیرخان نے اس کو بے بس کر کے ایک کمرے میں قید کر دیا۔ ”میرا خیال ہے تو کھڑے کھڑے بہت زیادہ تھک چکا ہے اب چند دن آرام کر۔“
ملکہ لاڈو شیرخان کی باتوں سے بہت خوش ہوئی، اس نے کہا۔ ”شیرخان میں یہ کہہ رہی کی کہ چنار کا لقمہ دقت چلانا میرے بس کی بات نہیں ہے میں تجھ سے شادی کر کے اس کا لقمہ دقت تیرے حوالے کر دینا چاہتی ہوں۔“
شیرخان نے دہلی زبان میں پوچھا۔ ”اگر میں انکار کر دوں تو؟“

ملکہ لاڈو نے جواب دیا۔ ”تب میں تجھے بے وقوف سمجھوں گی اور چنار کی حکومت کسی اور کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔“
شیرخان مسکرایا۔ ”لیکن میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں اس شرط پر آپ سے شادی کر سکتا ہوں کہ آپ آئندہ لقمہ دقت سلطنت میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کریں گی۔“
ملکہ لاڈو نے اس کا وعدہ کر لیا۔

ملکہ نے اسی وقت قاضی کو طلب کر لیا۔ وہ محل ہی میں موجود تھا۔ وہ شیرخان جو بیوہ ملکہ لاڈو کی مزاح پر ہی اور تعزیت کے لیے آیا تھا ملکہ کا شوہر بن گیا اور خوش طامی نے اسے چنار کا حامی بنادیا۔ چنار کا قلعہ اپنی مضبوطی کے لیے بہت مشہور تھا اور اب وہ ایک مضبوط سور پھان کے قبضے میں جا چکا تھا۔

شیرخان نے حمید کو چنار کے قلعے میں بلا لیا۔ حمید نے یہاں جو کچھ دیکھا وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن جب اسے سب کچھ معلوم ہو گیا تو اس نے بھی ایک خطرے کی چوٹی کوئی کی۔ ”محترم شیرخان! مغل حکومت آپ کو چنار کا حکران نہیں تسلیم کرے گی۔“
شیرخان نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

سہرام پہنچ کر شیرخان نے اپنی ہم تیز کردی اور اپنی فتوحات کی حدود بڑھانے لگا۔ اسی دوران شیرخان نے سنا کہ چنار کا حامی قتل کر دیا گیا۔ شیرخان کو اس خبر نے چونکا اور ہوشیار کر دیا۔ اس نے عالم خیال میں دیکھا کہ چنار کی ملکہ لاڈو اس کی طرف دست شوق بڑھا رہی ہے لیکن درمیان میں کچھ حامد اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ شیرخان بیوہ ملکہ لاڈو کے پاس تعزیت کرنے گیا تو امراء نے اس کی عمرانی شروع کر دی۔

ملکہ لاڈو نے پردے کے پیچھے سے شیرخان کو دیکھنا چاہا مگر نہیں دیکھ سکی۔
شیرخان نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ”محترم خاتون! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر قتل کر دیا گیا۔“
ملکہ لاڈو نے کہا۔ ”شیرخان! میں تیرا انتظار کر رہی تھی، خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔“ اس کے بعد اس نے اپنے روبرو کھڑے ہوئے ایک امیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لوگوں کے چہرے تو کسی اور طرف ہوتے ہیں مگر کان ہماری طرف پاگلوں احمقوں کی طرح ہیں۔“

شیرخان نے کہا۔ ”آپ نے درست فرمایا، میں تائید کرتا ہوں۔“
ملکہ لاڈو نے کھڑے ہوئے امیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص جو بظاہر ایک ساکت اور بے جان بت کی طرح کھڑا ہے، دوسرے امراء کا تجربہ ہے۔“
شیرخان نے جواب دیا۔ ”ملکہ عالیہ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

ملکہ لاڈو نے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تو میری مدد کرے۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا تو میری مدد کر سکتا ہے جس کی میں طالب ہوں؟“
شیرخان نے عرض کیا۔ ”آپ کہہ کر تو دیکھیں میں آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“
ملکہ لاڈو شوق سے مسکرائی تھی، بولی۔ ”شیرخان! ایک بار بھر سوچ لے لیکن نہ کرنا۔“

شیرخان نے ساکت وصامت امیر کی طرف دیکھا وہ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا تھا یہاں تک کہ جب ملکہ لاڈو نے شیرخان کے کان سے اپنا منہ لگا دیا تو امیر پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔
ملکہ لاڈو کہہ رہی تھی۔ ”شیرخان! میں تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں تاکہ تو چنار کا لقمہ دقت سنبھال سکے۔“

یعنی تو اپنے خاندان کا واحد زندہ فرد ہے؟“
حمید نے جواب دیا۔ ”محترم شیرخان! میں نے کبھی
آپ سے جھوٹ نہیں بولا۔“

شیرخان کو اپنا غافل اور بے پروا باپ حسن اور سخت گیر
سوتیلی ماں یاد آگئی۔ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”دوست! تجھ کو
تو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ تیرا خاندان تباہ و برباد ہو چکا
لیکن میری طرف دیکھ، میری چٹان، میرا تو باپ بھی موجود
تھا۔ میں اس کی موجودگی میں در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔
میری ایک سوتیلی ماں بھی جو میرے وجود کو اپنے گھر میں
پرداشت نہیں کر سکتی تھی۔“

حمید نے کہا۔ ”آپ بھر بھی خوش قسمت ہیں زمانہ
دیکھ رہا ہے کہ خوش قسمتی نے آپ کی انگلی پکڑ لی ہے اور آپ
اپنی مطلوبہ منزل کی طرف چل پڑے ہیں مگر میں..... میں،
بد قسمتی اب بھی میرے ساتھ ہے۔“

نصف رات بیت بھگی تھی۔ ملکہ لڈا واعر انتظار کر رہی
تھی لیکن حمید کی پڑ سوز باتوں نے اسے روک رکھا تھا۔ باتیں
اکرتے کرتے شیرخان کی آنکھ لگ گئی، وہ سو گیا۔ حمید اس
کے پاس ہی بیٹھ گیا پہلے تو اس نے یہ کوشش کی کہ جب تک
شیرخان سو رہا ہے وہ اس کے پاس بیٹھا اس کی حفاظت
کرے لیکن یہاں آچانک اسے عثمان علی یاد آ گیا۔ عثمان علی،
کلثوم، اس کی ماں اور اس کا بیٹا ابراہیم اور سنی سے نسب۔
اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس نے دیکھا عثمان علی اس
کے سامنے کھڑا اسے احسان ملاتا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔
”اواحق تو جوان! کس بات کی دیر ہے، شیرخان تیرے
سامنے آنکھیں بند کیے پڑا ہے آگے بڑھا اور ایک ہی وار میں
اس کا کام تمام کر دے اور میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو
شیرخان کو قتل کر دے تو کلثوم کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیا
جائے گا۔“

حمید گھبرا گیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور
شیرخان کے سوتے ہوئے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔
جب بات قابو سے باہر ہو گئی تو وہ شیرخان کے پاس
سے اٹھ گیا اور کمڑکی سے دور کوہستانی سلسلوں کا مشاہدہ
کرنے لگا۔ وہ پہاڑیوں پر لگے ہوئے درختوں اور سبزے
میں چھپے ہوئے پھروں کے حسن میں ٹھوکیا لیکن عثمان علی
بلانے سے درماں کی طرح یہاں بھی آ گیا اور پوچھا۔ ”جب
پھر تو نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا کلثوم کو کسی اور سے بیاہ
جائے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”چناں کہ حکمران مغل حکومت کا
نمائندہ ہوتا ہے، اب جب کہ اس کا نامزد حکمران مر چکا ہے
وہ مرحوم کی جگہ اپنا حاکم نامزد کرے گی۔“

اب شیرخان کے تصور ہی کچھ اور تھے اس نے کہا۔
”میں خوب جانتا ہوں کہ مغلوں سے کس طرح نمٹا جائے۔
میں مغلوں سے بچہ آزمائی کروں گا اور انہیں بازو کرادوں گا
کہ حکومت اس کی ہوتی ہے جس کے دست و بازو میں اسے
سنجالنے کی قوت ہوتی ہے۔“

حمید اس وقت بہت خوش تھا۔ اس نے شیرخان کی
بات جو رانے قائم کی تھی وہ بہت پسند ہوئی ہوتا جا رہا تھا۔

☆.....☆

آگرے میں بابر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی لاش کو
بابر کی وصیت کے مطابق کابل کے تاجکستان کے سامنے میں
دُفن کی خاطر روانہ کیا جا چکا تھا۔ کاروبار سلطنت ہمایوں نے
سنجبال لیا۔ نصیر الدین ہمایوں نے۔ شیرخان حیران تھا کہ
یہ کزور شخص پورے ہند کے اقتدار کو کس طرح سنبھالے گا۔
شیرخان کی تجیز اور دور رس نظریں حالات کا جائزہ لے رہی
تھیں، وہ مومنج کی تلاش میں تھا جب وہ ہمایوں پر کاری
مرب لگائے گا۔

حمید اس شاطر، چالاک اور عقلمند افغان کے حوصلے
اور حسن تدبیر کی داد دے رہا تھا۔ اب شیرخان اس پر اعتبار
کرنے لگا تھا۔ جب شیرخان چناں کہ حکمران بن گیا تو حمید کی
حیثیت میں بھی فرق آ گیا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے شیرخان
کی بابت جو سوچا تھا جو اندازہ لگایا تھا وہ حرف بہ حرف پورا
ہوتا جا رہا تھا۔ اب جب کہ اس کی حیثیت غیر معمولی ہو گئی
تھی، اسے کلثوم یاد آ رہی تھی۔ اس کا بچی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ
کر کلثوم کے پاس پہنچ جائے لیکن جب اسے عثمان علی یاد آتا
تو اس کا دل بجھ جاتا۔

جب شیرخان اس کے پاس ہی کہیں ہوتا تو اسے
عثمان علی کی قتل دالی شرط یاد آ جاتی اور وہ کاپ جاتا۔ وہ
سوچتا تھے عظیم انسان کو کس طرح قتل کیا جاسکتا ہے، ایسے
موقعوں پر حمید بہت اداں ہو جاتا۔ وہ اکثر انسو بہتا رہتا۔
خود شیرخان نے بھی کئی بار اس کو روٹے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
شیرخان سوچتا۔ شاید حمید کو اپنا خاندان اور خاندان کے مردہ
لوگ یاد آتے ہیں اور اس کی آنکھیں پریک جاتی ہیں۔

شیرخان نے ایک دن قصد اس کے خاندان کا ذکر
چیئر دیا پوچھا۔ ”حمید! کیا یہ سچ ہے کہ تیرے خاندان میں

حمید چونک بڑا، بولا۔ ”جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے، کیا یہ آپ کا قول ہے؟“
شیر خان نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ میرا اپنا قول ہے۔“

حمید نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”محترم شیر خان! میں آپ کو یہ بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق عسکران لودھی خاندان سے ہے۔ میں ابراہیم لودھی کا بھتیجا ہوں اور اپنی اس خاندانی برتری اور وجاہت کی وجہ سے میں خود کو آپ کی محبت کے شایان شان سمجھتا ہوں.....“

شیر خان نے حمید کی بات کاٹ دی، بولا۔ ”بات مختصر کر حمید لودھی، کام زیادہ ہیں اور وقت کم۔“

حمید نے نام ہو کر پوچھا۔ ”محترم شیر خان! میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ جب آپ کے والد مرحوم نے آپ کو اپنی جاگیر کا وارث بنایا تھا تو آپ نے اپنی جاگیر کے بعض شیعہ داروں پر ظلم و زیادتی کی تھی ان کے خلاف فوج کشی کی تھی اور ان میں سے بعض کو قتل اور کچھ کو زخمی کر دیا تھا۔“

شیر خان نے حمید کو غور سے دیکھا، جواب دیا۔ ”ہاں میں نے ایسا کیا تھا۔ انہوں نے میرے خلاف بغاوت کی تھی وہ خود بخیر رہ گئے تھے، ان میں ایک شخص قتل ہو گیا۔ یہ ان سرکشوں کا بہرہ تھا۔ وہ میرے مقابلے پر آیا اور مارا گیا۔ میں نے اس کی زمین اس کی بیوہ کے پاس رہنے دی۔ میرا خیال ہے عساکر علی کا ایک بھائی عثمان بھی تھا۔ عساکر علی کے بعد شاید وہی اس کنبے کا سربراہ بن گیا تھا۔“

حمید اندر سے لرز رہا تھا، اس نے پوچھا۔ ”کیا وہ لوگ آپ سے خوش ہوں گے؟“

شیر خان نے جواب دیا۔ ”میں خوشی اور ناخوشی کی پروا نہیں کرتا، میں نے جو کچھ کیا تھا میرا ضمیر آج تک مطمئن ہے اور پھر زمانے بھر کو خوشی وہی شخص رکھ سکتا ہے جو منافق ہو یا ظالم و جاہل۔“

حمید چپ ہو گیا، پھر موضوع ہی بدل دیا۔ ”محترم شیر خان! کیا یہ صحیح ہے کہ ہماریوں ہم پر فوج کشی کرنے والا ہے؟“

شیر خان نے کہا۔ ”موضوع نہ بدل، تو نے جس لڑکی سے محبت کی ہے اس کے چچا نے کیا شرط لگا دی ہے؟“
حمید نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”وہ کہتا ہے کہ میں اس کی زمینوں کی دیکھ بھال کروں وہ جنگ و جدل سے نفرت کرتا ہے وہ سپاہیوں کو خوشی اور قاتل کہتا ہے۔“

حمید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”چچا عثمان علی! ذرا انتظار کیجیے۔“

پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں قہر آلود نظروں سے سامنے کڑی کلوم کو ڈانٹ رہی تھی۔ ”لڑکی! یہ تو نے کیا کیا کدنگی بھرا انتظار کرنے کا ہے ہودہ وودہ کر لیا۔“

اس نے چشم تصور ہی سے دیکھا، کلوم کہہ رہی تھی۔ ”ماں میں حمید کا انتظار کروں گی سفید بالوں تک۔“

حمید کو ایسا لگا گویا وہ کلوم پر بڑا ظلم کر رہا ہے۔ معلوم نہیں کس طرح اس کا دماغ جو بھکا تو وہ غیر ارادی طور پر ایک بار پھر شیر خان کے سر ہانے کھڑے ہو کر سوچنے لگا۔ اس نے شیر خان سے کہا۔ ”شیر خان میرے دوست میں تجھے کس طرح مار سکتا ہوں میں۔ بار بار تو رہا ایک طرف، میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

حمید نے دیکھا شیر خان اچانک بیدار ہو چکا ہے۔ شیر خان۔ نہ حمید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، پوچھا۔ ”حمید! کیا بات ہے تو روکیوں رہا ہے؟“

حمید نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”کوئی خاص بات نہیں محترم شیر خان۔“

شیر خان نے پوچھا۔ ”پھر تو روکیوں رہا ہے؟“

حمید نے اپنا منہ چمپا لیا۔ ”کوئی خاص بات نہیں شیر خان!“

شیر خان نے اس سے کہا۔ ”حمید خان! کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں سو گیا تھا؟ نہیں میں سو یا نہیں تھا، میں نے اپنی ادھ مٹی آنکھوں سے تجھ کو کچھ عجیب و غریب کیفیات میں مبتلا دیکھا ہے، تو بڑا بھی رہا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر یہ سب کیا ہے اور تو کیا چاہتا ہے؟“

حمید نے جب یہ دیکھا کہ بات کو چمپایا نہیں جاسکتا۔ تو ہنسا پھرا کر جواب دیا۔ ”ماں محترم! میں آپ سے کچھ چمپانا بھی چاہوں تب ہی نہیں چمپا سکتا۔ میں نے ایک لڑکی سے محبت کی ہے لڑکی کے چچے نے شادی کے سلسلے میں ایک شرط لگا دی ہے جسے میں کسی صورت پورا نہیں کر سکتا۔“

شیر خان نے پوچھا۔ ”وہ شرط کیا ہے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”انہوں نے ایک راز کی بات ہے جسے میں نہیں بتا سکتا۔“

شیر خان نے کہا۔ ”میں اس شرط کو جاننے کے لیے اصرار نہیں کروں گا لیکن تو میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھے گا، جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔“

کریں۔ اسی دوران ہمایوں نے ملا محمد عزیز نامی ایک شخص کو اپنا قاصد بنا کر شیر خان کے پاس روانہ کیا۔ ملا محمد عزیز کبھی زمانے میں شیر خان کا دوست رہ چکا تھا۔ جب وہ شیر خانی لشکر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا شیر خان آستینیں چڑھائے خندق کھودنے میں مصروف ہے۔

شیر خان کو اس کے آدمیوں نے ملا عزیز کی آمد کی خبر دی، تو وہ خندق سے باہر نکلا، پانی منگوا کر ہاتھ دھویا اور حکم دیا کہ اس جگہ شامیانہ نصب کیا جائے۔

شامیانہ لگ گیا تو شیر خان وہیں زمین پر بے تکلف بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کہو کیسے آتا ہوا؟“

ملا عزیز نے جواب دیا۔ ”بادشاہ نے پوچھا ہے کہ شیر خان آخر چاہتا کیا ہے؟“

شیر خان نے کہا۔ ”جتنا مختصر بادشاہ کا سوال ہے اتنا ہی مختصر میرا جواب ہے۔ تم ہمایوں سے کہہ دینا کہ تم خود تو لڑنا چاہتے ہو مگر تمہارا لشکر نہیں لڑنا چاہتا۔ اسی طرح میں خود تو لڑنا نہیں چاہتا مگر میں کیا کروں میرا لشکر لڑنے پر مصروف ہے۔“

ملا عزیز نے کہا۔ ”یقین یہ بات میں خود بادشاہ سے کس طرح کہہ سکتا ہوں۔“

شیر خان نے کہا۔ ”کیوں، اس میں قحاح کیا ہے تو بادشاہ کا قاصد ہے، بادشاہ نے میرے نام ایک پیغام بھیجے دیا تو نے مجھے پہنچا دیا۔ اب میں اس کا جواب دے رہا ہوں وہ بادشاہ کو پہنچا دے۔“

ملا عزیز نے عذر پیش کیا۔ ”شیر خان! آپ میرے دوست رہ چکے ہیں اس لیے میں آپ سے بے تکلفانہ باتیں کر سکتا ہوں مگر بادشاہ تو بادشاہ ہے میں اس کا دوست کبھی بھی نہیں رہا، پھر میں اس سے یہ کس طرح کہوں گا کہ شیر خان نے کہا ہے کہ بادشاہ خود تو لڑنا چاہتا ہے مگر اس کا لشکر نہیں لڑنا چاہتا۔“

شیر خان مسکراتے لگا۔ ”تھل کفر، کفر نہ باشد۔ بادشاہ کو اس کے حریف کا صاف صاف جواب پہنچا دینا یقین دیانت داری سے اور اگر بادشاہ میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں کہ وہ حقیقت اور سچائی کو عمل اور بردباری سے گوارا کر لے تو آخر کار وہ ایک نہ ایک دن اسے شاہی سے نیچے آنا پڑے گا۔“

ملا عزیز نے کہا۔ ”دوست! آپ کی نصیحتیں اور عالمانہ باتیں اپنی جگہ۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں آپ کا

شیر خان نے کہا۔ ”یہ تو بڑی بے ہودہ شرط ہے اس کی۔“

حمید نے کہا۔ ”اس کی اس بے ہودہ شرط ہی نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔“

شیر خان نے پوچھا۔ ”لڑکی سے جدا ہوئے کتنے سال ہو گئے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”تقریباً ساڑھے تین سال۔“

شیر خان نے کہا۔ ”میں نے انتہائی پریشانی اور مایوسی کی حالت میں قرآن پاک سے ایک قال کھالی تھی۔ اس

وقت میرے خدا نے میرے سامنے سورۃ الزمر کی یہ آیت کر دی تھی لا تھتوا امن رقتہ اللہ۔ اس آیت نے میرے

حوصلے بلند کر دیئے اور میں نے اب تک جتنا بھی عروج حاصل کیا ہے اس کے پیچھے یہی آیت کا رفرما ہے۔“

حمید نے کئی بار اس آیت کا ورد کیا اور ایک نیا دلولہ اور ایک نیا حوصلہ عطا کرنے لگا۔

☆.....☆

ہمایوں کو شیر خان کے عزائم سے بغاوت کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے شیر خان کو حکم دیا کہ وہ چناری حکومت

حال ہزا میر ہندویک کے حوالے کر دے۔

شیر خان نے انکار کر دیا۔ میر ہندویک ہمایوں کے پاس واپس چلا گیا اور شیر خان کے جواب سے آگاہ کر دیا۔

اب بات ہمایوں کے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ ہمایوں ایک لاکھ فوج لے کر چناری کی طرف روانہ ہو گیا۔

شیر خان کو ہمایوں کی یلغار کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ پانچ ہزار فوج کے ساتھ قلعے سے نکلا اور چوسا نامی مقام پر دریا سے

گڑھا کے جنوبی کنارے پر خیمہ زن ہو گیا۔ ان دونوں ہارشیں بہت زیادہ ہو رہی تھیں۔ ہمایوں کا لشکر کچھ اور عری نالوں کو

عبور کرتا ہوا دریا سے گڑھا کے شمالی کنارے پر خیمے نصب کرنے لگا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے ایک دوسرے کو دیکھ

رہے تھے۔

شیر خان نے ہمایوں کے ٹڈی دل لشکر کو دیکھتے ہوئے اپنی حفاظت کے لیے خندق کھودنا شروع کر دی۔ اس کام

میں اس کے ساتھی بھی ہاتھ بٹا رہے تھے۔ شیر خان نے چھاؤں استیلا اور مزدور کی طرح خندق کھودنے لگا۔ حمید

نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

دوسری طرف ہمایوں نے اپنا خیمہ ایک اونچی جگہ نصب کرایا اور ہل سازی کے ماہرین کو حکم دیا کہ ہل تعمیر

جواب بادشاہ کے گوش گزار کس طرح کروں؟“

شیر خان نے ملازمین کو بادام کا شربت پلایا اور اسے تسلیاں دینے لگا۔ ”تو میرا دوست رہ چکا ہے اس لیے میں تیری یہ مشکل آسان کر دوں گا۔ میں تیرے ساتھ اپنا ایک آدمی بھیجتا ہوں مجھے جو کچھ تیرے بادشاہ سے کہنا ہے میرا آدمی دلیری سے کہہ دے گا۔“

اس کے بعد شیر خان نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا۔

”شیخ غلیل کو حاضر کیا جائے۔“
کچھ دیر بعد ایک بزرگ کو شیر خان کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔ شیر خان نے ان بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ملازمین! یہ بزرگ شیخ غلیل بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں، انہیں خدا نے بڑی جرأت اور دلیری بخشی ہے۔“

شیر خان، شیخ غلیل کو ایک طرف لے گیا اور انہیں کچھ سمجھا تا رہا پھر انہیں ملازمین کے ساتھ ہمایوں کے پاس روانہ کر دیا۔

شیخ غلیل نے ہمایوں کو صاف صاف بتا دیا۔ ”جناب والا! شیر خان میرا ولی نعمت بننے لے کے سوا کسی اور علاقے سے سرور کا نہیں رکھتا چاہتا۔ وہاں بھی خلیفہ اور سکہ بادشاہ کے نام ہی کا برقرار رکھا جائے گا۔ اس عہد کے لیے شیر خان قسم کھانے کو بھی تیار ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا شیر خان واقعی جنگ نہیں چاہتا؟“

شیخ غلیل نے کہا۔ ”بے شک شیر خان جنگ سے نفرت کرتا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں خود بھی جنگ سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ جنگ جانوں کو ہلاک، املاک کو برباد، خاندانوں کو نابود و منتشر اور کاروبار کو تہہ وبالا کر دیتی ہے۔ اگر شیر خان بنگا لے پر اسی طرح قابض رہنا چاہتا ہے کہ وہاں خلیفہ اور سکہ میرے نام کا رہے گا تو مجھے اس کی یہ شرط منظور ہے۔“
شیخ غلیل نے پوچھا۔ ”پھر میں اپنے ولی نعمت سے کیا کہہ دوں؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”شیر خان سے کہہ دیجیے کہ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی۔ وہ بنگا لے پر عمل سلطنت کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت کرے اور وہاں سکہ اور خلیفہ میرے ہی نام کا برقرار رہے، میں خوش میرا خدا خوش۔“
ہمایوں جنگ سے تنگ آیا ہوا تھا اس نے شیر خان کی

بات مان لی تھی، وہ مطمئن ہو چکا تھا۔

جب شیخ غلیل نے بادشاہ کی رضامندی کی خوش خبری شیر خان کو سنائی تو حید نے پوچھا۔ ”محترم شیر خان! کیا جنگ کے بادل چھٹ گئے، کیا آپ دونوں میں صلح ہو گئی؟“
شیر خان مسکرایا، بولا۔ ”جنگ اور محبت میں سب کچھ جاتر ہے۔“

☆.....☆

رات کا پہرہ، دریا کی طرف سے سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی۔ مینڈکوں اور چبھکروں کی ملی جلی آوازیوں نے رات کے سناٹے کو توڑ دیا تھا۔ اس سناٹے میں شیر خان نے اپنی فوج کو تیار کیا اور اہل کو عبور کر گیا۔ شیر خان کا شہر جرنیل خواص خان فوج کے مستقر تھے جس کے ساتھ شیخون مارنے آگے بڑھا۔ حید شیر خان کے ساتھ تھا اور وہ شیر خان کی عہد شکنی سے خوش نہیں تھا۔

خواص خان نے ہمایوں کے غافل اور سوتے ہوئے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف شور و غل برپا ہو گیا۔

ہمایوں سوتے سے بیدار ہو گیا، پوچھا۔ ”یہ شور و غل کیا ہے؟“

بادشاہ کے خدمت گاروں نے مطلع کیا۔ ”جہاں پناہ! شیر خان نے عہد شکنی کی ہے اور اس نے ہماری سپاہ پر شب خون مارا اور اس کے سپاہی حضور کی تلاش میں ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔“

ہمایوں کھبرا گیا، وہ اپنے بالائی خیمے میں نکل ہو گیا۔ یہاں اس نے وضو کیا اور اپنے سرداروں سے کہا۔ ”میں وضو کر کے نماز پڑھوں گا اور اس دوران تم سب شیر خانی لشکر سے تیرا ڈرنا ہو جاؤ۔“

مغل سپاہی افغانوں سے قسم کھاتا ہو چکی تھی چند سردار بادشاہ کے خیمے میں داخل ہوئے اور وہاں سے اس افواہ کی تصدیق کرنی چاہی کہ بادشاہ اپنی سپاہ کو افغانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کس فرار ہو چکا ہے۔ انہیں بادشاہ کی خیمے میں نہیں ملا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی ان کی ہمتیں جواب دے گئیں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔

شیر خان نے حکم دیا۔ ”نیل کو توڑ دیا جائے۔“
نیل توڑ دیا گیا۔ شیر خان بادشاہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے بونکلا ہٹ میں اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ گھوڑا دریا میں ڈکیاں کھانے لگا۔ اسی عالم میں نظام نامی ایک شخص چڑے کی شک لیے بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس

کہتے ہیں۔“
اس شخص کے چہرے پر رونق آگئی، پوچھا۔ ”تو کیا تم
کلوٹم سے دستبردار ہو گئے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”ہاں کیونکہ میں اپنے آپ میں
اتنی ہمت نہیں پاتا کہ چچا عثمان کی شرط پوری کر دوں۔“
وہ شخص ہنسنے لگا، بولا۔ ”تو گویا انکو رکھتے ہیں۔“
حمید نے جواب دیا۔ ”بھئی کھو۔“

اس شخص نے حمید کے کانوں پر بے تکلفی سے ہاتھ
رکھ دیا بولا۔ ”دوست! اب پھر ایک کام کرو۔ جس کام کی تم
اپنے آپ میں ہمت نہیں پاتے ہو، میں اس کے لیے خود کو
مستعد اور اہل محسوس کر رہا ہوں تم نے کلوٹم سے دستبرداری
اختیار کی اور میں کلوٹم کو جہر قہریت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں تم
اگر چاہو تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں وہ کام نہیں کر
سکتا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”اچھا پھر تم خاموش رہو اور مجھے اپنا
کام کرنے دو۔“

حمید نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”افسوس! ایک لڑکی کی
محبت نے مجھے اتنا اندھا اور بہرہ کر دیا ہے کہ تو افغان قوم
کے ایک مایہ ناز محسن کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔ تو نے یہ کس
طرح سمجھ لیا کہ جو کام میں خود نہیں کرنا چاہتا۔ تجھ کو کرنے
دوں گا۔ اب تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو یہاں سے چلا جا
ورنہ میں تجھ کو گرفتار کرادوں گا۔“
وہ شخص ناراض ہو کر چلا گیا۔

☆.....☆

شیرشاہ بادشاہ بننے کے بعد بہت زیادہ معروف ہو
گیا۔ اس نے رفاہ عامہ کے بہت سارے کام کیے، ایک
طرف تو وہ اپنی سلطنت کی حدود بڑھا رہا تھا تو دوسری
طرف سڑکیں اور سرائیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ ایک سڑک
پشاور سے شروع ہوئی اور پچال کے سوناگھاؤں تک پہنچی
گئی۔ دوسری لاہور سے ملتان، تیسری آگرے سے جوچور
اور چوڑ تک اور چوتھی آگرے سے برہان پور تک۔ سڑک
کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے اور سترہ سو سرائیں
تعمیر کرائیں۔ ان میں قافلے اور مسافر قیام کرتے۔ یہاں
مسلمانوں اور ہندوؤں کی رہائش اور خوراک کے لیے
الگ الگ انتظام تھا۔ ہر سرائے کے ساتھ ایک کنواں اور
ایک پختہ مسجد موجود تھی۔ ایک موزن، ایک امام بھی اور

مٹک کے سہارے بادشاہ کو دوسرے کنارے پہنچا دیا۔
ہاتھوں آکرے کی طرف بھاگا، شیرخان کے جریں خواں
خان نے اس کا چچا کیا۔

ہاتھوں آکرے سے فوج لے کر بھر پلٹا اور اس بار
قنوج کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ شیرخان نے پھر
فلکت دی اور ہاتھوں فرار ہو کر لاہور چلا گیا۔ شیرخان نے
آگرے پر قبضہ کر لیا اور ہاتھوں کے تعاقب میں لاہور روانہ
ہو گیا۔ ہاتھوں نے شیرخان کے تعاقب کی خبر سنی تو لاہور بھی
چھوڑ دیا اور سندھ کی طرف فرار ہو گیا۔

اب شیرخان شیرشاہ بن چکا تھا۔ حمید کی خوشی کی انتہا
نہ رہی وہ اب بھی شیرشاہ کے قریب تھا لیکن شیرشاہ کی غیر
معمولی مصروفیات نے دونوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا
کر دیا تھا۔ اسی دوران ٹاٹے کا ایک شخص حمید کو تلاش کرتا
ہوا آکرے پہنچا اور اس نے حمید کو یہ شخص خبر سنی کہ کلوٹم کی
ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور عثمان علی نے اپنی شرط یاد دلائی
ہے۔

حمید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے پوچھا۔
”کسی نے کوئی خط بھی دیا ہے یا ساری باتیں زبانی ہی کہلا
دی گئی ہیں؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”خط تو کسی نے بھی نہیں دیا
لیکن وہ سب تمہارا بیوی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔“
حمید کا دل ٹاٹے جانے کے لیے ترسے لگا، بولا۔
”میں معریب ٹاٹے جاؤں گا مگر میں شیرخان کا انتظار
کر رہا ہوں۔“

اس شخص نے حمید کے کان میں کہا۔ ”میں یہاں
ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں، کیا تم مجھے شیرخان کے ذاتی
خدمت گاروں میں ملازمت دلوا سکتے ہو؟“

حمید کا ہاتھ ٹھکا، بولا۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا
اور یوں بھی شیرخان کسی پرستار و مشکل سے ہی کرتا ہے۔“
اس شخص نے کہا۔ ”ٹھیک ہے پھر میں خود ہی کوشش
کروں گا۔“

حمید نے اس کا دل ٹٹولا، پوچھا۔ ”پھر تم واپس کب
جاؤ گے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں، جب بھی میرا
کام ہو جائے گا، چلا جاؤں گا۔“

حمید نے کہا۔ ”تم جب بھی ٹاٹے واپس جانا چاہا
عثمان علی سے کہہ دینا کہ اب وہ کلوٹم کی شادی کسی سے نہیں کر

ایک پولیس افسر بھی شاہی ڈاک کے لیے تھوڑے تھوڑے قاصدے پر دو گھوڑے بھی موجود رہتے تھے۔

شیر شاہ کی زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ وہ اپنے حصے کا کام جلد از جلد کر ڈالنا چاہتا تھا جیسے کوئی اس کے کان میں کہہ رہا تھا کہ شیر شاہ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔

وہ کبھی کی طرح چاروں طرف کو نہ رہا تھا۔

حمید نے جب دیکھا اگر شیر شاہ سے ملاقات دشوار بات ہے تو وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ناظرے چلا گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں چچا عثمان علی گھر میں نہیں تھے۔ رنج کی فصل تیار کھڑی تھی۔ چچا عثمان علی اپنی زمینوں پر تھے۔ حمید کے بچنے ہی گھر میں رونق ہی دوڑ گئی۔ گھر میں کلثوم اور نعناب کے علاوہ ایک بڑی بی بی بھی رہ رہی تھیں۔ ابراہیم اپنے چچا عثمان علی کے ساتھ زمینوں میں گیا ہوا تھا۔

کلثوم اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی، اس کی دیکھا دیکھی نعناب بھی رونے لگی۔ حمید نے دونوں کی پشت تھپتھپائی اور انہیں تسلیاں دینے لگا۔ ”کلثوم! افسوس کہ تم دونوں اپنی ماں کے غم کو با آسانی نہیں بھلا سکتیں۔ یہی حال میرا بھی ہے میں تم دونوں کے غم کو اپنے دل پر براہ راست محسوس کرتا رہتا ہوں۔“

کلثوم نے کہا۔ ”میں تو کہیں کی بھی نہیں رہ گئی، چچا عثمان ملنے دیا کرتے ہیں اور بھائی ابراہیم بھی کبھی ملتا کہہ دیتے ہیں کہ شش شرفا کے لیے تنگ ہے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”جس کی جتنی عقل ہوتی ہے وہ بات بھی اتنی ہی کرتا ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”کلثوم! یہ تو بتاناں کو بیماری کیا گئی؟“

کلثوم نے ایک سرد آہ بھری، جواب دیا۔ ”یہ کہ وہ مجھے دہن بنا ہوا نہیں دیکھ سکتی گی اور تم انہیں دھوکا دے گئے۔“

حمید کی چٹائی پر ہزاروں کی شکلیں بڑھ گئیں، بولا۔ ”کلثوم! میں جگوں میں بری طرح الجھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں تھک تو یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں نے تجھے ہر جگہ اور ہر دن یاد کیا ہے۔“

قریب ہی کھڑی ہوئی نعناب نے ان کی باتوں میں مداخلت کی، بولی۔ ”میں تو باجی سے ہمیشہ یہ کہا کرتی تھی کہ آپ کی بچیوں کا یہ مطلب ہے کہ آپ انہیں، باجی کو یاد کرتے ہیں۔“

حمید نے سمجھیوں سے کلثوم کی طرف دیکھا، بولا۔

”کلثوم! تجھ سے پھر کمر میں کہیں کا بھی نہیں رہ گیا تھا۔“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”آپ مرد ہیں آپ کی اس قسم کی مصروفیات ہوتی ہیں، آپ اپنا کم غلط کر سکتے ہیں مگر لڑکیاں اور عورتیں۔ یہ کہاں جائیں۔ گھر کی دیوار پر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں اور جتنیں بیٹے دنوں کی یاد دلاتی ہیں۔ لوگ اور زیادہ مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔“

حمید نے بڑی بی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کون ہیں؟“ کلثوم نے جواب دیا۔ ”ہماری رشتے کی پھوپھی گھر میں کی بوڑھی کی موجودگی ضروری جو بھری۔“

حمید نے پوچھا۔ ”چچا عثمان علی کا کیا حال ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس طرح بدلا جائے۔ وہ شیر خان سے آج بھی اتنی ہی نفرت کرتے ہیں جتنی دس بارہ سال پہلے کیا کرتے تھے۔ شیر خان کی کامیابیاں انہیں کانٹوں پر لٹا رہی ہیں۔“

حمید نے کہا۔ ”اب ان حالات میں کلثوم تو خود ہی بتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور یہ تو طے ہے کہ میں شیر شاہ کو نہیں مار سکتا۔“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”میری تو قسمت..... ہی میری ہے، میں کیا مسمومہ دوں؟“

حمید نے کلثوم کو چھیڑا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ میری عمر موجودگی میں تیرا ایک اور عاشق بھی پیدا ہو چکا ہے؟“

کلثوم نے ڈبڈبائی آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھا۔

”آپ میرے دشمنوں پر تنگ جھڑک رہے ہیں میرے دس عاشق بھی میرے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کر سکتے۔“

حمید نے کلثوم کے آنسو اپنے دہن پر لے لیے، بولا۔

”اری بھئی میں تو یوں ہی ازراہ مذاق پوچھ رہا تھا۔“

کلثوم نے کہا۔ ”حمید! میرا دل بہت دھبی ہے باتوں کی چوٹیں میرے دل میں ناسور پیدا کر سکتی ہیں۔“

حمید نے کہا۔ ”میری تو بہ اب میں ایسی باتیں نہیں کروں گا۔ جس ایک سوال اور کروں گا تو نے جس شخص کو میرے پاس بھیجا تھا ماں کے انتقال کی خبر دے کر، وہ کون تھا؟“

کلثوم نے سوالیہ نظروں سے حمید کو دیکھا اور پوچھا۔ ”وہ کچھ کہتا تھا؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے چچا عثمان علی کی شرط کے بارے میں کیا سوچا۔ پھر اس

نے مجھے بتایا کہ وہ آکرے اس لیے پہنچا ہے کہ وہاں کسی طرح شیر شاہ کا قرب حاصل کرے اور پھر اس کا کام تمام کر کے تختہ کو تیرے چچے سے حاصل کر لے۔

کلثوم نے کہا۔ ”لیکن ایسا ہو گا نہیں۔ اب میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی جو ہونا تھا ہو گیا۔“

حمید نے کہا۔ ”اچھا اب باتیں ختم، میں اس گھر میں چند دن سکون سے رہتا چاہتا ہوں۔“

کلثوم اس سے پوچھتا جا رہی تھی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ محض تعزیت کرنے یا آہ کا کوئی اور بھی مقصد ہے؟ اور یہ کہ اس نے کلثوم کی بات کیا سوچا؟ لیکن وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتی کہ وہ سارے سوالات کو کتنی تیزی سے گھر صرف اس لیے نہیں کر سکتی کہ کہیں ان سوالوں کے جوابات سے اس کا دل اور زیادہ زخمی نہ ہو جائے اور وہ جن باتوں کو سننا نہیں چاہتی حمید کی زبان سے وہی باتیں نہ نکل جائیں۔

حمید نے محفل کیا، کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور سو گیا۔ اس گھر میں اس کو جتنی چین کی فینڈ آئی تھی وہ برسوں سے اس کو ترستا رہا تھا۔ رشتے کی پھوپھی اس کو جو ان کو برداشت نہیں کر پارہی تھی۔ انہوں نے ان دونوں کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنی۔ وہ حمید سے کہہ دیتا جا رہی تھیں کہ جب تک بھائی عثمان علی کمیتوں سے وابستہ نہ آ جائیں حمید کہیں اور رہے لیکن وہ صحت نہیں کر سکیں۔ انہوں نے دیکھا کلثوم نے حمید کی ہر بات کا اسی طرح خیال رکھا ہے جس طرح کوئی بیوی اپنے شوہر کا رکھتی ہے۔ انہیں اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے حمید کو کچھ کہا تو کلثوم ہی بد اعط کر پڑے گی اور وہ حمید کے سلسلے میں اپنی پھوپھی کی کوئی بات بھی نہیں مانے گی۔

حمید نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سو گیا۔ کلثوم کھانا پکانے لگی، پھوپھی نے اس دن جیسا اہتمام کبھی پہلے اس گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھیں، آخر جب ان سے رہا نہیں گیا تو باورچی خانے میں کلثوم کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں اور پوچھا۔ ”کلثوم! یہ تو جو ان کون ہے؟“

کلثوم نے لمبے پروانی سے جواب دیا۔ ”حمید! وہ اس گھر میں والدہ مرحومہ کی زندگی میں بھی رہ چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ تو جو ان ہے جس نے ہمارے پورے کنبے کو ہلاک ہونے سے بچالیا تھا۔“

پھوپھی نے پوچھا۔ ”بھائی عثمان علی کاس تو جو ان کے

بارے میں کیا خیال ہے؟“ کلثوم نے جواب دیا۔ ”پھوپھی جان! وہ حمید سے ناراض رہتے ہیں۔“

پھوپھی کو ایک کھنکھایا، بولیں۔ ”کلثوم! ابونے جس طرح اس کو جو ان کو اپنے گھر میں جگہ دی ہے شریلوں میں ایسا نہیں ہوا۔ اگر تو میری بات مانے تو میں تجھے مشورہ دوں۔“

کلثوم نے کہا۔ ”دیکھئے مشورہ۔“ پھوپھی نے کہا۔ ”تو اس کو جو ان کو آج ہی اس گھر سے رخصت کر دے۔ میں ڈرتی ہوں اگر اس کی موجودگی ہی میں چچا عثمان علی واپس تشریف لے آئے تو کیا ہو گا۔ وہ میری تو بڑی طرح خرابی لیں گے۔“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”نہیں ایسا نہیں ہو گا۔“ پھوپھی نے کہا۔ ”تو اس کو جو ان کو چند دنوں کے لیے کہیں اور بھیج دے۔ اس طرح آپس کی محبتیں برقرار رہتی ہیں۔“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”پھوپھی جان! جہاں تک محبت کا سوال ہے یہ ہر حال میں بحال رہتی ہے افسوس کہ میں حمید کو کہیں اور نہیں جانے دوں گی۔ وہ جب تک ٹاٹھ سے میں ہے اسی گھر میں رہے گا۔“

پھوپھی کی چند یوں پر مل پڑ گئے۔ ”پھر میں کیا جواب دوں گی تیرے چچا کو؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”آپ کو جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود جواب دے لوں گی۔“

پھوپھی بڑبڑانے لگیں۔ ”بھائی عثمان علی آجائیں تو میں ان سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گی جس گھر میں بڑوں کا ادب نہ رہے بڑے کس طرح رہیں گے؟“

کلثوم پھوپھی کی بڑبڑاٹ سنتی رہی، اس نے پھوپھی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ وہ بات کو زیادہ نہیں بڑھاتا چاہتی تھی۔

حمید نے آٹھ دن یوں گزار دیئے کہ ان دونوں کو وقت کا کوئی احساس ہی نہ ہوا۔ ان دونوں کے ہاتھوں سے گھر گونہا رہا۔ نوبت بھی بہت خوش رہتی تھی۔ بس ایک پھوپھی تھیں جن کا منہ سو جا رہتا تھا۔ اس دوران کلثوم نے ایک بار بھی حمید سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ واپس کب جائے گا۔ اس سوال سے اس کی روح ہی خشک ہوتی تھی۔ دوسری

طرف حمید کا یہ حال تھا کہ وہ جلد از جلد شیر شاہ کے پاس واپس جانا تھا مگر کلثوم کی محبت نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ کہہ دے۔ کلثوم! میں جا رہا ہوں مگر کہہ نہیں سکا۔ اتنی سی بات کہنے کے لیے جتنی ہمت... اور حوصلہ درکار تھا اس سے وہ محروم تھا۔

جو بات کلثوم اور حمید نہیں کر سکتے تھے، نضب نے کہہ دی۔ اس نے ناشتے کے دوران حمید سے پوچھا۔ ”حمید بھائی! اب آپ واپس تو نہیں جائیں گے؟“

نضب کے اس سوال نے دونوں کی دھڑکنیں تیز کر دیں پھوپھی کے چہرے پر تازگی پیدا ہو گئی۔ وہ اس سوال کا جواب سننے کے لیے ان تینوں کے قریب جا بیٹھیں۔

حمید نے کلثوم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”نضب! انی الحال تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔“

نضب نے پوچھا۔ ”کب؟“
حمید نے جواب دیا۔ ”میں تو یہاں تعزیت کرنے آیا تھا۔ میں نے یہاں آنے کی شیر شاہ سے اجازت بھی نہیں لی، وہ تو میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

اس بار کلثوم نے کہا۔ ”انتظار تو کسی نہ کسی کو ہوتا ہی ہے، میں کہتی ہوں اب جنگ وجدل کی زندگی چھوڑ دیجیے اور یہاں روکی سوکی جو میسر ہے اسی پر قناعت کیجیے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”کلثوم! اگر میں ایسا جا ہوں بھی تو کیا ممکن ہے چچا عثمان سوئے جا سکتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اپنی شرط یاد دلاتے رہیں گے۔ میں اس کا کیا علاج کروں گا؟“

کلثوم نے کہا۔ ”آپ تو اس شرط سے بے بس ہو گئے لیکن میں بے بس نہیں ہوں چچا عثمان علی کو میں خود جواب دے لوں گی۔“

حمید نے کہا۔ ”اس کے باوجود مجھے ایک بار تو شیر شاہ کے پاس جانا ہی پڑے گا۔“
کلثوم اداس ہو گئی۔ ”آپ کو شیر خان مجھ سے زیادہ عزیز ہے شاید۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”بات یہ نہیں ہے کلثوم! میں شیر شاہ کا دوست ہوں، ملازم ہوں، ہم دونوں نے ایک ساتھ کئی سال گزارے ہیں، میں یہاں اس سے مل کر نہیں آیا۔ میں اس سے ایک بار بلکہ آخری بار ضرور ملوں گا اس کے بعد تیرے پاس چلا آؤں گا۔“
کلثوم نے پوچھا۔ ”پھر کب جائیں گے اپنے ولی

نعت شیر شاہ کے پاس؟“

حمید نے کلثوم کے لہجے میں گہرا طعنے محسوس کیا، اسے کلثوم پر رحم بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی، اس نے کہا۔ ”کلثوم! مجھے بات چیت میں طغور اور استہزاء اور ابھی پسند نہیں، میں جانتا ہوں کہ شیر شاہ نے تم لوگوں کو دیکھ بھانچا ہے اور تمہارے دلوں پر ایک ایسا زخم لگایا ہے جو شاید کبھی بھی مندمل نہ ہو سکے لیکن اس کے باوجود وہ میرا ولی نعت ہے، میں اس سے محبت کرتا ہوں، والہانہ محبت جس کی سرحدیں عقیدت سے ملی ہوئی ہیں۔“

کلثوم نے کوئی جواب دینے بغیر حمید کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن زمینوں پر سے کلثوم کا بھائی ابراہیم واپس آ گیا۔ چھ کٹنا ابراہیم اس نے اپنی بہن کلثوم کو بتایا کہ چچا تین دن بعد واپس آئیں گے، پھر جب اس نے حمید کو اپنے کمرے میں آؤا داند چلتے پھرتے دیکھا تو اس کے حراج میں درخششی آ گئی۔ حمید نے اس کو سلام کیا مگر ابراہیم نے اس کو جواب نہیں دیا وہ حمید کو دیکھا ہوا اپنی کلثوم کے پاس چلا گیا۔ کلثوم اس وقت کپڑے دھو رہی تھی۔ ابراہیم نے توروں پر بل ڈال رکھے تھے، اس نے پوچھا۔ ”کلثوم! یہ کب آیا تھا؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”آٹھ دس دن ہوئے، کیوں؟“

ابراہیم نے کہا۔ ”جب گھر میں کوئی مرد نہیں تھا تو اسے شہر انی کی کیا ضرورت تھی؟“

کلثوم کپڑے دھونا بھول گئی، حیرت سے بھائی کو دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ آپ بول رہے ہیں یا چچا عثمان علی؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”یہ میں بول رہا ہوں لیکن چچا عثمان علی بھی اس شخص کو گھر میں دیکھ کر یہی سوال کرتے۔“

کلثوم نے کہا۔ ”تم لوگ احسان فراموش ہو۔ جب ہم لوگ شاہ کے کے شق دار کی ہزیمت کے بعد جان بچانے کی خاطر یہاں سے بھاگ رہے تھے اگر اس دن اس نوجوان نے ہمارا ساتھ نہ دیا ہوتا تو نہ یہ گھر ہوتا نہ ہم لوگ آپ لوگوں نے اتنی جلدی اس احسان کو بھلا دیا۔“

ابراہیم کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی، بولا۔ ”کلثوم! میں کیا کروں چچا عثمان علی کی ضد نے مجھے بھی مجبور کر رکھا ہے، اب اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو ہماری سرپرستی کون

کرے گا؟

کلثوم نے جواب دیا۔ ”اب ہم لوگ بچے نہیں رہے، اپنے اچھے برے کی ہمیں بھی تیز ہے۔“
 ابراہیم نے کہا۔ ”مگر بھی چچا عثمان علی ہی ہمارے بزرگ ہیں، ہمیں ان کی بات تو مانتی ہی ہے۔ کی اور وہ اس نوجوان کو بالکل پسند نہیں کرتے اور اگر نوجوان حمید چچا کی بات مان لے تو اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے نہیں گے اور یہ ہمیں غیر نہیں پائیں گے۔“

کلثوم نے کہا۔ ”آپ حمید سے کوئی بات نہیں کریں گے بھائی! میں چچا عثمان علی کا انتظار کر رہی ہوں اور جو باتیں آپ یا حمید نہیں کر سکتے میں کروں گی۔“ بولتے بولتے وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پھر بولنے لگی۔ ”چچا عثمان علی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ جن زمینوں سے روزی کما رہے ہیں، شیر خان ہی کی عطا کردہ ہیں اور پھر یہ بات کسے نہیں معلوم کہ میری ماں حمید کو پسند کرتی تھیں۔“
 ابراہیم کی نفرت میں کچھ کی واضح ہو گئی۔ بہن کے دلائل نے اسے مرعوب کر دیا تھا۔

رات کو ابراہیم نے حمید کو کھانے پر پکڑ لیا۔ وہ بہت خوشگوار کیفیت میں تھا۔ حمید سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بھائی حمید! کیا تم بھی مجھ سے ناراض ہو؟“
 حمید نے جواب دیا۔ ”میں کسی سے ناراض نہیں ہو سکتا۔“ ان دونوں کے پاس کلثوم بھی آ گئی۔

کلثوم نے کہا۔ ”اب پھر آپ میری مدد کریں اور چچا عثمان علی کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔“
 حمید نے جواب دیا۔ ”چچا عثمان علی کو میں کیسے راضی کر سکتا ہوں۔“
 کلثوم نے کہا۔ ”میرے مخاطب آپ نہیں بھائی ابراہیم ہیں۔“

ابراہیم نے کہا۔ ”شیر خان سے میں بھی نفرت کرتا ہوں لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس نفرت کے سہارے نہ تو زندہ رہا جا سکتا ہے اور نہ ہی خوشگوار زندگی گزارا جاسکتی ہے۔“
 کلثوم کو اپنے بھائی میں اتنی نمایاں تبدیلی حیران کر رہی تھی وہ پھوٹی نہیں ساری تھی۔

ابراہیم نے پوچھا۔ ”آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں یہاں؟“
 حمید نے جواب دیا۔ ”عارضی طور پر نہیں، تعزیر کی۔“

کرنے آیا تھا۔ اب میں اس لیے واپس جانا چاہتا ہوں کہ اپنے مربی اور محسن کی خدمت کروں گا واپس آ کر۔“

ابراہیم نے کہا۔ ”بھائی حمید! یہ کیا کہہ دیا آپ نے کہ مربی اور محسن، ہمارے گھر میں آپ کا محسن تو کوئی بھی نہیں۔ ہاں آپ کے احسانات ہم پر ضرور ہیں۔“
 حمید نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ لوگوں کو اس لیے محسن کہا تھا کہ آپ نے مجھے اپنے گھر میں رکھا تھا۔ ایک طرح سے میری خدمت کی تھی۔ ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کا میں احسان مند ہمیشہ ہی رہوں گا۔“

کلثوم نے کہا۔ ”آپ ایسا باتیں نہ کیجیے۔“
 ابراہیم نے کہا۔ ”اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چچا عثمان علی کو بدل کر رہوں گا۔“

رات کا کھانا ان سب نے ایک ہی دسترخوان پر کھایا۔ زینب ایک کی صورت دیکھتی اور ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتی مگر اس کے کچھ بچے نہ پڑتا۔

دوسرے دن علی آج کسی نے دروازے پینے شروع کر دیئے۔ ابراہیم نے دروازہ کھولا اور یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ چچا عثمان علی اس کے سامنے کھڑے ہیں، اس نے حیرت سے کہا۔ ”چچا آپ؟“

چچا نے قہر اور طغی کی نظروں سے ابراہیم کو دیکھا اور پوچھا۔ ”میری آمد نے تجھے حیران کیوں کر دیا؟“
 ابراہیم نے جواب دیا۔ ”آپ نے کئی دن بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔“

چچا عثمان علی نے پوچھا۔ ”وہ ہے یا چلا گیا؟“
 ابراہیم چچا کے سوال کا مفہوم سمجھ چکا تھا مگر پھر بھی تجاہل سے کام لیا، پوچھا۔ ”وہ کون؟“
 چچا کو غصہ آ گیا، بولے۔ ”خوب! تو گویا تو وہ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

ابراہیم اپنی بات برازا رہا، بولا۔ ”چچا! آپ مجھے ہوئے نظر آتے ہیں، جانیں غسل کریں کپڑے بدل لیں۔“
 چچا نے کوئی جواب دیے بغیر اندر جا کر پوٹی رہی اور خود مصیبت چکا کر نماز ادا کی، اتنی دیر میں گھر کے سارے ہی افراد جاگ چکے تھے۔

چچا عثمان علی نے اچانک پھوٹی کے بارے میں پوچھ لیا۔ ”اور تیری پھوٹی کہاں چلی گئی؟“
 ابراہیم نے جواب دیا۔ ”اپنے کمرے میں ہوں گی۔“

پچھانے ان کے کمرے کی طرف جائزے کی نظر میں ڈالیں اور پوچھا۔ ”تو نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کب کا آیا ہوا ہے؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”جب میں یہاں آیا تھا تو حمید گھر میں موجود تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا آٹھ دس دن کا آیا ہوا ہے۔“

پچھا عثمان علی بدوڑا نے لگا۔ ”میری کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں مگر میں پھر بھی شیر خان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ میں اگر چاہوں تو بھی اس نفرت کو ختم نہیں کر سکتا جس نے میرے معائنات علی کو منتقل کر دیا تھا۔“ اس کے بعد وہ پھوپھی کے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے کسی تمہید کے بغیر صاف صاف بات کی۔ ”یہ کب کا آیا ہوا ہے؟“

پھوپھی نے پچھا عثمان علی کو دیکھا تو ان کے چہرے پر حلقہ کی پیدا ہوئی، پوچھا۔ ”تم کب آئے؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی بس چلا آ رہا ہوں۔“

پھوپھی ایک دم اداس ہو گئیں، بولیں۔ ”اچھا ہوا جو تم آگئے روز میں تو اس گھر سے اتنا کتنی تھی۔ میں عاجز آئی ہوئی تھی۔“

پچھا عثمان علی نے بے چینی اور غصے سے کہا۔ ”کیا بات تھی؟“

پھوپھی نے کہا۔ ”عثمان علی کیا قیامت قریب ہے جو لڑکیوں سے حیا اٹھتی جا رہی ہے۔“

پچھا عثمان علی نے پوچھا۔ ”آخر بات کیا ہوئی؟ کچھ بتائیں تو کسی۔“

پھوپھی نے پوچھا۔ ”یہ تو جوان کون ہے؟ اپنے خاندان سے تو ہے نہیں۔“

پچھا عثمان علی سب کچھ سمجھ گئے تھے مگر کام تماہل سے لیے جا رہے تھے، کہا۔ ”یہ اپنے خاندان کا نہیں ہے مگر یہ یہاں کیوں ٹھہرا۔“

پھوپھی نے جواب دیا۔ ”میں تو اس پر ناراض ہوئی تھی مگر جب کلثوم نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا تو میں مجبور ہو گئی اور چپ سا دھلی۔“

پچھا عثمان نے بگڑ کر کہا۔ ”میں نے آپ کو اس گھر میں اس لیے چھوڑا تھا کہ آپ ان سب کی بزرگ بن کر رہیں گی مگر آپ نے بچوں کا کردار ادا کیا، آپ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔“

پھوپھی تو یہاں چڑھا کر کھڑی ہو گئیں۔ ”عثمان علی! تم مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے، جو کچھ کہتا سنتا ہے مگر دلوں سے کہو۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر جب میں نے کلثوم کے تہہ میں یہ محسوس کیا کہ وہ اس گھر کی مالک ہے اور میں کچھ بھی نہیں تو میں خاموش ہو گئی۔“

پچھا عثمان علی نرم پڑ گئے۔ پوچھا۔ ”آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا؟“

پھوپھی نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور کہا۔ ”اللہ میری تو یہ غیر مردوں سے کہیں اس طرح باتیں کی جاتی ہیں جس طرح کلثوم اس سے کرتی تھی۔ اس نے تو بس حد ہی کر دی، اللہ میری توبہ۔“

پچھا عثمان علی کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ انہوں نے پھوپھی سے کہا۔ ”ذرا کلثوم کو کہیں بلو لیجیے اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم کو بھی کہیں لے آئیے۔“

پھوپھی دونوں کو بلائے چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئیں۔ کلثوم نے پچھا کو سلام کیا جس کا جواب سرد مہری سے دیا گیا۔ پچھا عثمان علی کلثوم سے نظریں نہیں ملا رہے تھے، انہوں نے پوچھا۔ ”کلثوم کیا میں نے اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھا؟“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے کہ آپ نے اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھا؟“

پچھا نے کہا۔ ”کیا میں نے اپنے مرحوم بھائی کے بعد تم سب کو اپنی اولاد کی طرح نہیں رکھا؟“

کلثوم نے بھر دی جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے، میں نے تو ایسی کوئی بات کی نہیں۔“

پچھا نے بھنجلائے لہجہ میں کہا۔ ”کلثوم! تو جھوٹی ہے، میں حمید سے نفرت کرتا ہوں مگر تو نے اسے اپنے گھر میں ٹھہرا اور اس سے شیشی شیشی باتیں کرنے لگی۔ میں جانتا ہوں کلثوم! وہ حیرے لیے ابھی نہیں تھا اور وہ اس سے پہلے بھی یہاں رہ چکا تھا لیکن ٹھہرانے سے پہلے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ وہ اس گھر کا کچھ بھی نہیں، ہاں تیری ماں کی ایک خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی۔ انہیں حمید سے بڑی دلچسپی تھی مگر وہ بھی اتنی ہمت نہیں کر سکیں کہ میری مرضی کے خلاف حمید کو اپنا داماد بنا لیتیں۔“

کلثوم نے بڑی ہمت سے کام لیا، بولی۔ ”حمید نے ہماری جائیں بچائی تھیں اور ہم لٹنے سے محفوظ رہے تھے اب

آجائیں حید کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔
 ابراہیم نے پوچھا۔ ”لیکن تم محترم! کیا آپ کو اُمید ہے کہ عبداللہ خان اتنا بڑا کام انجام دے گا؟“
 بچانے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ کلثوم بول اُٹھی۔
 ”شادی مجھے کرنی ہے میں عبداللہ خان کو نہیں جانتی اگر وہ
 آپ کی خواہش پوری بھی کر دے گا تو بھی میں آپ کے مہر
 کی پابندی نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے باپ کا خون
 معاف کیا۔“

بچا عثمان ایک دم بگڑ گئے، حج کر بولے۔ ”تو کون
 ہوتی ہے اپنے باپ کا خون معاف کر دینے والی۔ ابراہیم
 نے تو معاف نہیں کیا جو عنایت علی کا بیٹا ہے اور خود میں نے تو
 معاف نہیں کیا کیونکہ میں مرحوم کا بھائی ہوں۔“
 ابراہیم نے بھی اپنی بہن کا ساتھ دیا، بولا۔ ”عم
 محترم! میں نے بھی اپنا خون معاف کیا کیونکہ میں اپنی بہن کو
 دیکھ نہیں دیکھ سکتا۔“
 بچا عثمان علی بے بس اور مجبور ہو چکے تھے لیکن ہتھیار
 اڈال دینا ان کے اصول اور مسلک کے خلاف تھا۔ چنانچہ
 انہوں نے نری کو ترک اور سختی کو اختیار کیا، بولے۔ ”تب پھر

کیا ہم اسے دھکار کر احسان فراموشوں میں شامل ہو
 جائیں گے؟ عثمان علی کو یہ اُمید نہیں تھی کہ کلثوم یوں مقابلے پر
 آجائے گی۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر ضبط و دل سے کام لیا۔
 کلثوم کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کی، بولا۔ ”کلثوم! میں
 نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں بھائی عنایت علی کی موت کا بدلہ
 شیرخان سے ضرور لوں گا اور اگر ہم خود انتقام نہ لے سکے تو
 کسی اور سے یہ کام کرالیں گے چنانچہ میں اپنی یہ قسم پوری کر
 کے رہوں گا۔ اگر تجھے اپنے مرحوم باپ سے ذرا بھی محبت
 ہوگی تو تو اس میں میرا ساتھ دے گی۔“

کلثوم نے جواب دیا۔ ”لیکن عم محترم! اللہ معاف
 کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔“
 بچا عثمان علی نے جب یہ دیکھا کہ کلثوم کسی طرح قابو
 میں نہیں آ رہی تو انہوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا، بولا۔
 ”میں نے عبداللہ خان کو تیری ماں کی موت کی خبر دے کر مجید
 کے پاس بھیجا تھا۔ عبداللہ خان تجھ سے شادی کا خواہش مند
 ہے میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ کسی طرح
 شیرخان کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو میں بھی
 اس کی خواہش پوری کر دوں گا۔ جب تک عبداللہ واپس نہیں

محبوبہ

معاشرے کے نفیاتی مریضوں کا معصوم انسانوں پرستم
آخری صفحات پر اسماعیل قادری کا پرکھنا انداز

مہم جو

ماضی کے پوشیدہ گوشوں کی فسوں گری اور ہندو رچپوں میں پنہاں
راز و نیاز..... تاریخی صفحات پر ابراہیم نجم کے قلم کی روانی

رنگ آسمان

زہرے لے سائیل اور گہری جالوں پر مشتعل خونا کی اور عبرت ناک
واقعات کا نجوم..... ایسے آراء جہت کے خیالات کی پرواز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کریناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ
لحظات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ حسام بیٹ کے قلم کا جادو

2019 کے چلے شارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سیرت النبی

مزید

مختار شہر خانی
خلوئی کی مختار اور
مردانہ جبرجک کا لاشعریں انوار

تنویر دھاض، شالہ ذہین رضوان، حسام عباس، آصفہ ضیا احمد،
 ظفر اقبال ظفر، اعجاز سلیم و صلی کی خوبصورت کہانیاں

مجھے بھی کچھ سوچنا پڑے گا جب تم لوگ میرے وفادار نہیں ہو تو میں وفاداری کیوں اختیار کروں، اب میں بھی تم دونوں سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال تم خود کرو گے۔“

ابراہیم نے پوچھا۔ ”لیکن ہم محترم! یہ کیوں؟“
چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”آج تم دونوں کی باتوں نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ میں تم دونوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ جو کہہ سکتا ہوں وہ بھی ترک تعلق ہے۔ کٹھوم نے اپنی راہ کا جو انتخاب کیا ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں اور جب ہم دونوں کے درمیان کا اتفاق اور اعتماد ہی اٹھ گیا تو پھر یہ گاڑی کس طرح چلے گی، کسی طرح بھی نہیں۔“
چچا عثمان کی یہ ممکن کام کر گئی، ابراہیم نے کہا۔ ”محمم! یہ کام میرے سپرد کر دیں میں حمید کے ساتھ شیر خان کے پاس جاؤں گا اور سوچ پا کر اپنے باپ کا بدلہ لے لوں گا میرے باپ کا بدلہ کوئی اور کیوں لے؟“

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”ابراہیم! حمید کی عثمانی شخصیت سے وہ نہ تو خود ایسا کرے گا اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے دے گا۔“

کٹھوم نے ان کی باتوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی اور ان سب کو باتیں کرتا چھوڑ کر باہر نکل گئی، جاتے جاتے کتنی گئی۔ ”آپ لوگ جو چاہیں کریں، یہ ساری تحریکیں باتیں ہیں مگر وہ ان کو اجاڑنے اور برباد کرنے والی باتیں۔ پہلے تو صرف میرا باپ مارا گیا تھا اب ایسا لگتا ہے بھائی ابراہیم بھی واپس نہیں آئیں گے۔“

چچا عثمان علی نے کٹھوم کو آواز میں دینا شروع کر دیں۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ ”کٹھوم..... کٹھوم میری بات تو سن کہاں چلی؟“

جب وہ کٹھوم کے پیچھے کمرے سے باہر نکلا اس نے باہر حمید کو کھڑے دیکھا۔ شاید وہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ چچا عثمان علی کا ایک آتنا سا سا جو ہو تو وہ گھبرا گئے اس گھبراہٹ میں مجھ بھلاہٹ بھی شامل تھی، وہ کٹھوم کو تو بھول گئے حمید پر برس پڑے۔ ”جب سے تو ہمارے خاندان میں آیا ہے ہم سب کا سکھ چین غارت کر دیا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ آخر تو چاہتا کیا ہے؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”میں واپس جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ایک ہشتا کھلیتا خاندان جہنم کدہ بن جائے۔“

چچا عثمان علی، حمید کو مکان کے باہر باہیچے میں لے گئے۔ یہ باہیچہ مکان سے قدرے فاصلے پر عام گڈڑی سے ملحق واقع تھا۔ اس میں آم، جاسن، اہلی، کمرکھ، لیتھے، بلی، لیوں اور کروندے کے درختوں کی کثرت تھی۔ باہیچے کی فضا میں انواع و اقسام کی ملی جلی خوشبو میں لیوں کی ترش خوشبو سب پر غالب آگئی تھی۔ یہ باہیچہ چچا عثمان علی کا تھا۔ وہ اس باہیچے میں کمرکھ کے درخت تلے بسترے پر بیٹھ گئے۔ اب ان کا رویہ بہت نرم ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی جی اور تڑی کو گھر ہی میں چھوڑ آئے ہوں۔ انہوں نے حمید کو سبزے پر بٹھالایا، بولے۔ ”حمید! میں تیرا احسان مند ہوں کیونکہ تو نے ایک بار ہمارے خاندان کو موت اور بربادی سے بچایا تھا۔ کٹھوم کتنی جتنی ہے کہ میں بے حس اور احسان فراموش انسان ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔“

حمید نے بات کاٹ دی۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”صرف یہ کہ تو کٹھوم کا بچپا چھوڑ دے اور جہاں سے آیا ہے وہیں واپس چلا جا۔“
حمید نے جواب دیا۔ ”میں چلا جاؤں گا لیکن جب تک آپ مجھے صاف صاف یہ نہ بتا دیں کہ آپ مجھ سے بیزار کیوں ہیں، میں نہیں جاؤں گا۔“

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تیرے خاندان سے واقف نہیں ہوں تو کہتا ہے کہ لودھی خاندان کا آخری فرماں روا ابراہیم لودھی تیرا چچا تھا مگر میں کس طرح یقین کر لوں، ان کا کوئی شوش ثبوت تو پیش کر ورنہ میں ایک گناہ خاندان کے نوجوان کو اپنا داماد نہیں بنا سکتا۔“

حمید نے کہا۔ ”میں جو کہہ ہوں آپ کو بتا چکا ہوں کیا میرے عادات و اطوار میرے قول کی گواہی نہیں دیتے؟“
چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ کوئی ثبوت کوئی شہادت؟“

حمید نے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی ثبوت کوئی شہادت نہیں۔“

چچا عثمان نے کہا۔ ”جب پھر تو آگرے واپس چلا جا ہمارا بچپا چھوڑ دے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”میں اس طرح نہیں جاؤں گا اور وہ شرط! شیر خان والی؟ اس کا کیا کیا ہوگا؟“
چچا عثمان علی نے کہا۔ ”شیر خان والی شرط تو اس لیے

رکھ دی گئی تھی کہ نہ تو وہ پوری کرے گا اور نہ کلثوم تیرے حوالے کی جائے گی؟“

حمید نے نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔ ”کلثوم مجھ سے محبت کرتی ہے میں اسے اس جہنم میں نہیں رہنے دوں گا۔“

چچا عثمان علی ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ان کی پیشانی غصے کی شکنوں سے بڑھتی۔ انہوں نے کہا۔ ”حمید! یہ کام اتنا آسان بھی نہیں جتنا تو سمجھ رہا ہے میں تیرا ہر قدم، ہر رد، ہر گھر، ہر گلی، ہر موڑ اور ہر چوراہے پر مقابلہ کروں گا اور یہ ثابت کروں گا کہ تو نے ہمیں جتنا کمزور سمجھ رکھا ہے ہم اتنے کمزور نہیں ہیں۔ ہم ہتھیاروں سے، باتوں سے، دلیلوں سے، دولت سے دس سال سے ہر طرح ہر ذریعے سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔“

حمید نے شمشیر کی لوک چچا عثمان علی کے پیٹ پر سے ہٹائی۔ کہا۔ ”نہیں، میں آپ کو ماروں گا نہیں، آپ نے میری خاندانی دجاہت پر شمشیر کیا لکھن میں نے اسے ثابت کر دیا۔ اشیے اور میری مخالفت ترک کر دیجیے۔ اس طرح میں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو شیر شاہ کو بھی ہلاک کروں لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔“

چچا عثمان علی خاموش تھے گویا ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

جب دونوں گھر واپس جا رہے تھے تو انہیں راستے میں ابراہیم مل گیا۔ وہ دونوں کو تلاش کر رہا تھا جب اس نے انہیں ڈھالوں شمشیروں اور نیزوں سمیت اپنی طرف آتے دیکھا تو پکڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا؟

حمید نے گھر کے دروازے پر کلثوم کو کھڑے دیکھا، اس نے ان دونوں کو اس حال میں دیکھا تو مجسم سوال بن گئی۔ حمید نے اپنا سامان سنبھالا اور کلثوم سے کہا۔ ”کلثوم! میں جا رہا ہوں تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرا انتظار کرے گی اپنے اس وعدے پر قائم رہنا میں واپس ضرور آؤں گا۔“

پھر چچا عثمان علی سے کہا۔ ”اور اب آپ خاموش رہیں گے کیونکہ اگر میں چاہتا تو آپ کو قتل کر دیتا مگر میں نے آپ کو معاف کر دیا، صرف اس خیال سے کہ آپ کلثوم کے چچا ہیں اور میں لودھی خاندان کا ایک شہزادہ۔“

یہ سب کیا ہو گیا تھا اور کیا ہو رہا تھا، نہ ابراہیم سمجھ سکا، نہ کلثوم۔ کلثوم کے چپے زنبب کھڑی تھی، وہ بھی مجسم سوال بنی ہوئی تھی۔

حمید جوش اور جذبے سے سرشار کلثوم زنبب اور ابراہیم کو نحو حیرت چھوڑ کر آ کرے چلا گیا۔ چچا عثمان کو سکوت نے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ابراہیم اور کلثوم نے بار بار یہ معلوم کرنا چاہا کہ حمید اور ان میں کیا واقعات اور حالات پیش آئے

حمید نے نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔ ”کلثوم مجھ سے محبت کرتی ہے میں اسے اس جہنم میں نہیں رہنے دوں گا۔“

چچا عثمان علی ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ان کی پیشانی غصے کی شکنوں سے بڑھتی۔ انہوں نے کہا۔ ”حمید! یہ کام اتنا آسان بھی نہیں جتنا تو سمجھ رہا ہے میں تیرا ہر قدم، ہر رد، ہر گھر، ہر گلی، ہر موڑ اور ہر چوراہے پر مقابلہ کروں گا اور یہ ثابت کروں گا کہ تو نے ہمیں جتنا کمزور سمجھ رکھا ہے ہم اتنے کمزور نہیں ہیں۔ ہم ہتھیاروں سے، باتوں سے، دلیلوں سے، دولت سے دس سال سے ہر طرح ہر ذریعے سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔“

حمید نے حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔ ”تو یہ بات ہے؟ آپ مجھ سے مقابلہ کریں گے؟“

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں تجھ سے مقابلہ کروں گا۔“

حمید نے پوچھا۔ ”تو پھر ویرکس بات کی ایہ مقابلہ بخشی جلدی ہو جائے اچھا ہے آج ہی اسی وقت۔“

چچا عثمان علی کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا، بولے۔ ”تو نہیں موجود رہے گا۔ میں دو ڈھالیں اور تلواریں لے کر آئی ہوں آتا ہوں ہم دونوں ہمیں اسی باغیچے کے سبزہ زار پر آج یہ فیصلہ کریں گے کہ کلثوم کس کے پاس رہے گی۔“

چچا عثمان علی سیدھے گھر گئے اور دو ڈھالیں، دو تلواریں اور دو نیزے لے کر حمید کے پاس پہنچ گئے۔

حمید نے ایک ڈھال، ایک تلوار اور ایک نیزہ چچا عثمان سے لے کر مقابلے کی دعوت دے دی۔

وہ دونوں باغیچے ہی کے سبزہ زار پر مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ چچا عثمان علی کو اپنی شمشیر زنی پر بڑا ناتھ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حمید کو زیر کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

چچا عثمان علی مسکرا رہے تھے، بولے۔ ”لوگ میری تلاش میں یہاں تک آئیں، میں چاہتا ہوں اس سے پہلے ہی جو ہونا ہے ہو جائے۔“

حمید نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

چنانچہ دونوں شمشیریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ شمشیریں نیام سے نکلیں، بجلیاں سی کوئند نے لگیں اور دونوں ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔

جودہ بالکل چپ کم ہو کر رہ گئے ہیں۔ چچا عثمان بالکل بدل چکے تھے۔ انہوں نے اپنا سکوت توڑا تو ان میں یہ حیرت انگیز تبدیلی پائی گئی کہ وہ تو حمید کی مخالفت کرتے تھے اور نہ ہی حمایت۔ انہوں نے کلکوم پر بھی دباؤ ڈالنا چھوڑ دیا۔

☆.....☆

وہ آگرے پہنچا اور شیر شاہ کے دربار میں حاضری دی۔ شیر شاہ اس کی کشمندی سے گھر مند ہو گیا تھا۔ وہ شیر شاہ کی مہمات میں ادھر ادھر دوڑتا بھاگتا رہا۔ وہ کئی سال جنگوں میں الجھا رہا۔ حمید اس کے ساتھ ساتھ رہا لیکن اس دوران ملاقاتیں بہت کم ہو گئیں۔

اسی دوران شیر شاہ نے کالجور کارخ کیا۔ کالجور کا قلعہ اپنی مضبوطی کے لیے بہت مشہور تھا۔ جب وہ اس مہم پر جا رہا تھا تو اس نے حمید کو طلب کیا، اس نے حمید کو کئی ماہ بعد دیکھا تھا، دیکھتے ہی پوچھا۔ ”حمید! تو کہاں رہتا ہے؟ تجھ سے ملاقات کیوں نہیں ہوتی؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”اب آپ جہاں پناہ ہو گئے ہیں میں آپ کا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔“
شیر شاہ نے کہا۔ ”تو نے مجھ سے جاگیر وغیرہ بھی نہیں لی، آخر کیوں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”میں جاگیر لے کر کیا کروں گا؟ اکلا آدمی۔ جو وقت آپ کی محبت میں گزر جائے میرے لیے بہت قیمتی اور یادگار ہے۔“
شیر شاہ مسکرایا اور کہا۔ ”اب تو لڑکیاں اپنے عاشقوں سے مہر میں میرا سرا ہوتی ہیں۔“
حمید گھبرا گیا، حیرت سے پوچھا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

شیر شاہ نے حکم دیا۔ ”اس شخص کو حاضر کیا جائے جس نے کل نماز کی حالت میں مجھے قتل کر دینا چاہا تھا۔“
جب یہ شخص سامنے لایا گیا تو حمید نے اسے پہچان لیا۔ عبداللہ خان تھا۔ حمید گھبرا گیا کہ کہیں یہ جاں اور اچل انسان اس سلسلے میں اس کا نام نہ لے لے۔
شیر شاہ نے اس شخص سے پوچھا۔ ”تج کا بچہ کون ہے؟“
کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟“

عبداللہ خان نے جواب دیا۔ ”بادشاہ سلامت! اچھی بات تو یہ ہے کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس کا چچا آپ کا بدترین دشمن ہے، اس نے کہا تھا کہ میں اس شرط پر اپنی بیٹی کی شادی تجھ سے کروں گا کہ تو اس کے مہر میں

شیر شاہ کا سر پیش کرے گا۔“

عبداللہ خان ذرا بھی نہیں ہنگامہ کرتا تھا۔

شیر شاہ نے کہا۔ ”جب میں مردوں کا تو اپنے دربار کو ہدایت کر جاؤں گا کہ وہ میرا سر کاٹ کر تیرے حوالے کر دیں تاکہ تجھے حیرتی مجبوری مل جائے۔“ پھر حمید سے پوچھا۔ ”اور تو نے بھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے اس لڑکی نے تجھ سے کیا تجھ مانگی تھی مہر میں؟“

حمید بہت گھبرا ہوا تھا، بولا۔ ”اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔“

شیر شاہ نے جواب دیا۔ ”تو شرماتا ہے شاید۔“
شیر شاہ نے حملہ آور کو چھوڑ دیا اور کہا۔ ”جا اور میری موت کا انتظار کر۔“
وہ شخص فوراً فرار ہو گیا۔

یہاں سے شیر شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کالجور روانہ ہو گیا۔ کئی دن بعد وہ کالجور کے قلعے کے سامنے نمودار ہوا۔ وقت ضائع کیے بغیر قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ سرنگیں کھودنے کا حکم دیا۔ ایک طرف قلعے کی دیوار کے نیچے بارود کا ذخیرہ رکھا ہوا تھا۔ شیر شاہ اپنے گھوڑے پر سوار ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ وہ قلعہ کے گزروں سے کھلاش کر رہا تھا۔

حمید اس کے بارود کی ذخیرے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ سارا دن یوں ہی گزر گیا اور رات جیموں میں بسر کی۔ دوسرے دن علی الصبح شیر شاہ بیدار ہوا۔ وضو کیا، نماز پڑھی اور اس کے بعد اس نے لوگوں کو حاضری کا حکم دیا۔ جب لوگ اس کو سلام کرتے وہ کہتا۔ ”کوئی اور ہے یا بس؟ کسی کو مجھ سے کچھ مانگتا ہے؟“

کسی نے عرض کیا۔ ”میں کئی سال سے اپنے گھر نہیں گیا مجھے چھٹی دی جائے۔“

شیر شاہ نے اس کی حقیقات کرائی جب یہ جان لیا کہ وہ سچا ہے تو تینین محافو جنگ پر بھیجی دے دی۔

وہ دیر تک اس طریق پر چھتا رہا اور دیتا رہا۔ آخر میں پوچھا۔ ”حمید لودھی کہاں ہے؟ اس کو حاضر کیا جائے۔“

لوگ حمید کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے جب حمید کو شیر شاہ کے سامنے لایا گیا تو شیر شاہ نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور بقیہ کو رخصت کر دیا، اس کے بعد شیر شاہ نے حمید سے پوچھا۔ ”تو کئی سال سے اپنے گھر نہیں گیا، آخر کیوں؟“

حمید نے جواب دیا۔ ”میرا کوئی گھر نہیں بندہ پرورا

بھر میں کہاں جاؤں؟“

شیرشاہ اسے دیکھتا رہا۔ ”وہ لڑکی تو حیران انگیز کر رہی ہوگی؟“

حمید نے بڑے کرب سے جواب دیا۔ ”میرا کوئی بھی انتظار نہیں کر رہا ہوگا بندہ پرور!“

شیرشاہ نے کہا۔ ”تو نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے حمید، میں نے ناظرہ خواص پوری کاگیر تیرے نام کر دی تو اگر جانا چاہے تو اسی وقت جا سکتا ہے۔“

حمید نے ازراہ اخلاقی کہا۔ ”میں اپنی پوری زندگی آپ کی خدمت میں گزار دینا چاہتا ہوں جہاں پناہ۔“

شیرشاہ نے کہا۔ ”جہاں پناہ نہیں شیرخان کہ حمید لودھی! میں تیرے لیے اب بھی شیرخان ہوں حمید۔“

حمید نے نہایت عظمت اور محبت سے شیرشاہ کی شکل دیکھی اور اپنا سر جھکا لیا۔

شیرشاہ نے کہا۔ ”اچھا کالہر کا قلعہ سر کرنے کے بعد میں خود ناظرہ جاؤں گا اور تیرا قلعہ بنا دوں گا۔“

ربیع الاول کی نو تاریخ تھی اور جمعہ کا دن۔ شیرشاہ نے دو پہر کا کھانا چھ عشاء اور فضاء کے ساتھ کھایا ان میں حمید لودھی بھی شامل تھا۔ شیرشاہ کھانے کے دوران جہاد کے فضائل بیان کرتا رہا، اس نے کہا۔ ”اگر سلطان زندہ ہو جائے تو قازی اور مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے، اس سے بہتر سودا اور کیا ہو سکتا ہے؟“

علمانے اس کی تائید کی اور اس سلسلے کے چند اثر انگیز واقعات بھی سنائے۔ حاضرین پر قوت طاری ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیرشاہ نے پوچھا۔ ”دریاخان سروانی کہاں جا چکا؟“

دریاخان سروانی حمید کے پیچھے کھڑا تھا، وہیں سے آواز دی۔ ”بندہ حاضر ہے۔“

شیرشاہ نے پوچھا۔ ”بارود کا ذخیرہ کہاں ہے؟“

دریاخان سروانی شیرشاہ کو بارود کے ذخیرے کے پاس لے گیا۔ شیرشاہ اس بارودی ذخیرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دم دیا۔ ”انہیں آگ دکھا کر قلعے کے اندر پھینکا جائے۔“

حکم کی تعمیل کی گئی اور بان قلعے کے اندر پھینکے جانے لگے۔ دوسری طرف سے مسلمان سرگرمیوں کے ذریعے قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

شیرشاہ دیہان پر چڑھ گیا۔ یہاں سے کالہر کے قلعہ

کے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا قلعے کے اندر لوگ ادھر ادھر چل رہے تھے۔

شیرشاہ دیہان سے نیچے آیا اور بارودی بانوں کو اپنی مرضی سے قلعے کے اندر بھیجنے لگا اسی دوران ایک گولہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر بارودی ذخیرے پر گرا آگ بجڑک اٹھی اور گولے پھٹنے لگے۔ شیرشاہ اپنے رفقاء کے ساتھ بارودی ذخیرے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ شعلوں نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اس کے ساتھی اس بڑے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، شیرشاہ گر گیا۔ چھ جاں نثاروں نے اسے کھینچ کر دوڑ کیا۔ لوگوں نے پاس ہی ایک چھوٹا سا ڈبرہ لگا یا۔

شیرشاہ مجلس کرسیاہ بڑچکا تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور دوڑتا ہوا ڈبرے میں داخل ہو گیا اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ حمید چند خدمت گزاروں کے ساتھ ڈبرے میں داخل ہوا تو شیرشاہ کو کسی قدر ہوش آچکا تھا، پیچ کر حکم دیا۔ ”یہاں کیا لینے آئے ہو جاؤ اور قلعے کو سر کرو۔“

خیمے میں موجود لوگ باہر چلے گئے اور شیرشاہ کے حکم کی تعمیل میں جوش و خروش سے لڑنا شروع کر دیا۔

اس دن گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ اہلخانے اس کے جسم پر منسل اور گلاب کا پل کیا وہ بے چینی سے اہلخانے سے پوچھتا رہا۔ ”قلعہ کا کیا ہوا، سر ہوا یا نہیں! یہ دیکھو کیوں لگ رہی ہے؟“

کچھ دیر بعد عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ چند امراء دوڑتے ہوئے شیرشاہ کے پاس پہنچے اور خوش خبری سنائی، ”قلعہ فتح ہو گیا۔ قلعہ سر کر لیا گیا۔“

شیرشاہ نے فتح کی خوش خبری کو مسکراتے ہوئے سنا اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ پوری رات بے ہوش رہا، دوسرے دن ربیع الاول کی دس تاریخ تھی شیرشاہ اب بھی زندہ تھا اور ہوش میں آچکا تھا۔ اس عالم میں اس نے حمید کو طلب کیا۔

جب حمید اس کے پاس پہنچا تو شیرشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے کان کو قریب لانے کا حکم دیا۔ شیرشاہ کا چہرہ کافی سونچا تھا جس سے وہ ہنسناک ہو گیا تھا۔

حمید نے اپنا کان شیرشاہ کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ شیرشاہ آہستہ آہستہ کر رہا تھا۔ ”حمید لودھی! جنگ اور محبت میں سب کچھ جانتے ہو ناظرے وہاں جاؤ اور اپنی محبوبہ کو یہ خوش خبری سنا دو کہ شیرشاہ کو میں نے ایک سازش کے ذریعے ہلاک کر دیا۔“

حمید چچ مار کر دو ہوا، اس سے بولا نہیں جاتا تھا۔
شیر شاہ بھرے ہوش ہو گیا، طبیبوں نے بڑی کوشش
کی مگر وہ اسے بچا نہیں سکے آخر آدمی رات کو یہ برقی
اندھیروں میں ڈوب گئی۔

☆.....☆

شیر شاہ کی لاش کو اس کی آبائی جاگیر سہرام لے جایا
گیا اور وہاں ایک تالاب کے بیچ میں اس کی ابدی آرام گاہ
تیار کی گئی، اتنی شاندار کہ بعض مؤرخین نے اسے آگرے کے
تاج محل پر ترجیح دی۔

بھورے پتھر کی یہ عمارت مروانہ طاقت اور ابدی
سکون کا آئینہ دار ہے۔

حمید جاگیر کے کاغذات لے کر ٹاٹے چلا گیا۔ اس
کا دل ٹوٹا ہوا تھا اور جسم پر بھل تھا اس کا گھوڑا بھی آہستہ
آہستہ چل رہا تھا۔ ٹاٹے کے کئی کوچوں میں کوئی تبدیلی
نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج بھی سالوں پہلے جیسے تھے۔

جب اس نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی تو
اندر سے امیراہم کا چہرہ نمودار ہوا، وہ حمید کو دیکھ کر خوش ہو گیا
مگر بھر جیسے ہی چچا عثمان علی نے دور سے پوچھا۔ ”کون
ہے؟“ تو امیراہم کی خوشی کا فور ہو گئی، اس نے کوئی جواب
نہیں دیا۔ حمید اندر داخل ہوا تو سانسے سے چچا عثمان علی کو
اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ چند سالوں میں بڑھ زیادہ ہی
بوڑھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے حمید کا نہایت جوش و خروش
سے استقبال کیا۔ حمید کی نظریں کلثوم کو تلاش کر رہی تھیں۔

چچا عثمان علی نے زور زور سے آوازیں دینی شروع
کر دیں۔ ”اری کلثوم بیٹی تو کہاں چلی گئی دیکھ تو سہی یہ کون
آیا ہے؟“

ایک کمرے سے کلثوم نمودار ہوئی اور آہستہ آہستہ چچا
عثمان علی کی طرف بڑھی وہ ابھی تک حمید کو نہیں دیکھ سکی تھی
کیونکہ حمید دالان کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑا تھا۔
چچا عثمان علی نے حمید کو شانوں سے پکڑ کر کلثوم کے
سانسے کر دی۔ ”دیکھ تو سہی یہ کون آگیا؟“

کلثوم نے حمید کو دیکھا تو شرما گئی۔ اس کی خوشی اس
کے ایک ایک سے پھوٹ رہی تھی، مارے خوشی کے اس کی
آنکھیں میمک گئیں۔

چچا عثمان علی ان دونوں کو ایک کمرے میں لے گئے
اور اپنے ہاتھوں سے بستر تھک کر کے اس پر حمید کو بٹھا دیا،
بولے۔ ”حمید لودھی! مجھے یقین تھا تم ایک نہ ایک دن ضرور

آؤ گے۔ سو میرا خیال درست نکلا۔“ پھر امیراہم سے کہا۔
”یہ تو کھڑا کیا دیکھ رہا ہے جا حمید کے لیے کھانے پینے کا
انتظام کر کچھ۔“

حمید حیران تھا کہ اتنے سالوں میں چچا عثمان علی کتنے
بدل گئے ہیں۔

سر ہانے حمید بیٹھا تھا اور پابنتی کلثوم۔ کلثوم بیٹھی رو
رہی تھی۔

حمید نے ٹاٹے کی جاگیر داری کے کاغذات چچا
عثمان علی کے حوالے کر دیے۔

چچا عثمان علی نے اعلان کر دیا۔ ”حمید مرد ہے میں اس
مرد کی قدر کرتا ہوں۔“

چند دنوں بعد چچا عثمان علی نے ان دونوں کی شادی
کر دی۔
شادی کے کئی دن بعد چچا عثمان علی، حمید کو ایک طرف
لے گئے اور سرگوشی میں سوال کیا۔ ”حمید! مجھے ایک سوال
نے پریشان کر دیا ہے، اس سوال کا جواب تیرے علاوہ کوئی
اور نہیں دے سکتا۔“

حمید نے کہا۔ ”پوچھیے کون سا سوال ہے؟ اگر میرے
پاس اس کا جواب ہے تو میں ضرور دوں گا۔“

چچا عثمان علی نے پوچھا۔ ”شیر شاہ کیسا آدمی تھا، اس
نے اپنے قاتل کو ٹاٹے کی جاگیر بخش دی۔“

حمید نے زب زب کر پوچھا۔ ”چچا عثمان علی یہ آپ کیا کہہ
رہے ہیں؟“

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ ”مجھ سے چھپا بے کار
ہے کیونکہ مجھے سب کچھ پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ کیا بارود
والی سازش میں تیرا ہاتھ نہیں تھا؟“

حمید نے محسوس کیا۔ ”جلے جیسے بمیا تک چہرے
والے شیر شاہ نے اپنے ہونٹوں کو اس کے کان پر رکھ دیا ہے
اور کہہ رہا ہے، جبکہ اور محبت میں سب کچھ جانتے ہوئے ٹاٹے
واپس جاؤ اور اپنی محبوبہ کو یہ خوش خبری سنا دے کہ شیر خان کو
ایک سازش کے ذریعے میں نے ہلاک کر دیا۔“

اب حمید سمجھ چکا تھا کہ چچا عثمان علی حمید سے اتنے خوش
کیوں تھے۔ حمید کی ساری خوشی اڑاں ہو گئی تھی۔ وہ خود کو دنیا
کا بدترین انسان سمجھ رہا تھا۔ بدترین گناہ گار جس نے کوئی
گناہ کیا تو نہیں تھا کہ ایک ناکر وہ گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
اسے گھونسا کر گیا۔



اور اطالوی تاجروں کی اجارہ داری قائم ہونے کی وجہ سے مغربی یورپ اقتصادی بد حالی کا شکار تھا۔ اپنی بیمار معیشت کو سہارا دینے کے لیے مغربی یورپ کے دو بڑے ممالک اسپین اور پرتگال اس کوشش میں تھے کہ ایک دوسرے سے پہلے اپنے دریافت کردہ بحری راستوں سے ایشیائی منڈیوں تک رسائی حاصل کر لیں۔ اسپین سے رقبے، آبادی اور وسائل میں کم تر ہونے کے باوجود پرتگال کا مکمل وقوع جہاز رانی کی صنعت کے فروغ میں معاون تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دریائوں کے منہ پر دور کا آغاز پرتگال کی طرف سے ہوا۔ 1488ء میں بارتولومیو ڈیاس کی طرف سے بحر اوقیانوس اور بحر ہند کے سنگم راس امید کی دریافت کے بعد پرتگالی حکومت نے جنوبی افریقہ کے ساحلوں پر قبضہ جمایا۔ بدلتے حالات میں اسپین نے پرتگال سے انھیں کی بجائے

پرتگالی ہم جو Vasco da Gama وہ پہلا یورپین تھا جس نے 1498ء سے 1499ء کے دوران براعظم افریقہ کے گرد گھوم کر یورپ سے ہندوستان تک رسائی کا جنوب مشرقی بحری راستہ دریافت کیا۔ گمانے پرتگال سے ہندوستان تک کل تین مہمات سرانجام دیں۔ اس کی مہمات کے نتیجے میں نہ صرف یورپین اقوام کو ایشیائی سرزمین تک رسائی کا نیا اور آسان بحری راستہ میسر آ گیا بلکہ افریقی براعظم کی پیدائش ممکن ہوئی اور بحر ہند کی وسعت کے بارے میں بھی نئی معلومات منظر عام پر آئیں۔ 14ویں صدی عیسوی کے دوران یورپین تاجروں کا ایشیا سے رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ ایشیائے کوچک کا زمینی راستہ سلک روٹ اور روٹن اڈا پاروٹ (بحیرہ روم، بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب کا بحری راستہ) تھا۔ دونوں سرچراستوں پر عثمانی ترکوں



اس نے سمندر کے الجھ، پُریچ راستوں میں سے نئے راستے تلاش کرنے کی سعی کی اور کئی اہم راستے تلاش کیے۔ دنیا اسے امیر البحر کہنے پر مجبور ہوئی۔

اس نے سمندر کے راستے ہی دنیا تلاش کی



گاما کے بحری جہازوں نے 22 نومبر 1497ء کو راس امید کے گرد چکر مکمل کیا اور بحر ہند میں رسائی حاصل کی۔ پرتگالی بیڑے نے افریقا کی جنوبی کولائی کے گرد گھومتے ہوئے سفر جاری رکھا۔ انہوں نے 25 دسمبر 1497ء کو خط استواء سے 30 ڈگری جنوب کے خط پر واقع جنوبی افریقا کی بندرگاہ ڈربین میں لنگر گرائے۔ کرس کے دن کی مناسبت سے گاما نے اس علاقے کو نکال (کانام دیا اور چند دن یہاں قیام کیا۔ نکال میں یورپین کا واسطہ مقامی زولو قبائل سے پڑا۔ تہذیب سے کوسوں دور قبائلیوں کی گروہر کا سب سے بڑا زریعہ باجرے کی کاشت اور موسمی پالنا تھا۔ مقامی لوگ سفید قاموں اور ان کے بحری جہازوں کو دیکھ کر حیران تھے۔ تاہم مجموعی طور پر ان کا پرتگالیوں سے روایتی دوستانہ رہل انہوں نے یورپین کے لیے خشک خوراک کا بندوبست کیا اور انہیں مشرقی افریقا کی ان بندرگاہوں کے بارے میں بتایا جہاں سے انہیں ہندوستان جانے کے لیے راہنمائی کئے تھے۔

واسکوڈے گاما نے جنوری 1498ء کی شروعات میں ڈربین سے اپنے سفر کے دوسرے مرحلے کا آغاز کیا۔ وہ بحر ہند میں افریقا کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف سفر کرتا ہوا جنوری کے وسط میں موزمبیق اور فروری کے دوران جزائر پنچے پہنچ گیا۔ اس نے باراج میں کینیا کی بندرگاہ مباسایں لنگر گرائے۔ مباسا میں مختصر قیام کے بعد وہ کینیا کی دوسری بندرگاہ مالنڈی پہنچا۔ جہاں اُس کی ایک عرب ملاح احمد ابن ماجد سے ملاقات ہوئی۔ احمد نے اُسے بحیرہ عرب کے بارے میں اہم معلومات سے آگاہ کیا۔ اپریل کے تیسرے عشرے میں احمد کی راہنمائی میں واسکوڈے گاما نے اپنے سفر کا آخری مرحلہ شروع کیا۔ اس کے بحری جہازوں نے خط استواء پار کیا اور بحر ہند میں شمال مشرق کی طرف بڑھے۔ اپریل کے وسط میں وہ بحیرہ عرب کی حدود میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے انبارخ مشرق کی طرف کر دیا۔ مئی کے آغاز پر پرتگالی بحری جہاز، جزائر مالدیپ کی حدود میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی منزل کی طرف گامزن رہے یہاں تک کہ 20 مئی 1498ء کے دن واسکوڈے گاما نے جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ میں قدم رکھا۔

گاما کی ہندوستان آمد کے وقت تخت دہلی پر لودھی حکمران اسکندر شاہ (1489ء سے 1517ء) برائمان تھا جبکہ جنوبی ہندوستان چھوٹی بڑی متحدہ خود مختار سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا۔ کالی کٹ سمیت ساحل مالابار، ہندو سلطنت دجایاگر کے

کرسٹوفر کولبس کو بحراوقیانوس کو مغرب کی طرف سے پار کر کے ہندوستان تک رسائی کی ہم پر روانہ کیا اور یوں 1492ء میں امریکا دریافت ہوا۔ ہسپانوی حکومت کی طرف سے امریکا اور پرتگالیوں کی طرف سے ہندوستان کی ملکیت کے دعوے کے پس منظر میں 1494ء میں دنیا کی تقسیم کا معاہدہ مکمل میں آیا۔ اس معاہدے کی رو سے پرتگال کو ایشیا، افریقا اور بحر ہند سمیت دنیا کے مشرقی اور اترین کو امریکا سمیت بحراوقیانوس میں ہم جوئی کا حق حاصل ہو گیا۔ معاہدے میں طے پایا کہ دونوں ممالک کے ہم جواہی اپنی طرف سے دنیا کو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ دنیا کی تقسیم کے معاہدے کے بعد ہسپانویوں نے امریکا کو پار کر کے مغرب کی طرف سے ہندوستان تک رسائی کی کوشش شروع کی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے پرتگال ہم جو واسکوڈے گاما نے جنوب مشرق میں افریقا کے گرد گھوم کر ہندوستان میں قدم رکھا۔

واسکوڈے گاما 1460ء میں جنوبی پرتگال کے ساحلی قصبے ماتیس میں پیدا ہوا۔ اس نے لوزین میں پرتگالی بحریہ میں شمولیت اختیار اور اترین کی اتحادی (بعد میں اسپین میں شامل) ریاست کیسٹائل کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا۔ ان جنگوں کے نتیجے میں گاما کی صلاحیتیں گھر کر سامنے آئیں اور وہ بدترین ترقی کرتے ہوئے کلیدی عہدے پر پہنچ گیا۔ 1480ء کے عشرے میں اس نے ڈونا انا ایلا نامی پرتگالی دوہیزہ سے شادی کی جس سے اس کے سات بچے ہوئے۔ 1495ء میں پرتگالی بادشاہ جان دوم کے انتقال کے بعد نئے بادشاہ میٹول اول (1521-1469) نے اقتدار سنبھالنے ہی ہندوستان جانے والے بیڑے کی تیاری کا کام چھوڑ کر نئے حکم دیا۔ تاہم کسی نہ کسی وجہ سے مزید دو سال کی تاخیر ہو گئی جس کے بعد واسکوڈے گاما کو ہندوستان تک رسائی کی ہم کا نائب منتخب کیا گیا۔

8 جولائی 1497ء کو واسکوڈے گاما کی قیادت میں دو بڑے بحری جہازوں ساؤ گیمبریل، ساؤ رائسل اور دو چھوٹی کشتیوں پر سوار 170 ملاحوں نے لڑین کی بندرگاہ سے ہندوستان کے سفر کی شروعات کیں۔ شمالی بحراوقیانوس میں کیپ ورڈے کے جزائر کے قریب پہنچ کر گاما نے افریقی ساحل کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے براہ راست راس امید کی طرف بڑھنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے منتخب شدہ راستے کی وجہ سے وہ جنوبی بحراوقیانوس میں اس حد تک دور نکل گیا کہ اُسے دوبارہ راس امید کی طرف آنے کے لیے مشرق کی طرف سفر کرنا پڑا۔

ملاقات کر کے اسے "بحر ہند کے امیر البحر" کا خطاب دیا۔ گاما نے پرتگال سے ہندوستان تک کے سفر کے دوران کل 45 ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا جو اس وقت تک کسی بھی یورپین کی جانب سے ایک ہی ہم کے دوران طے کردہ سب سے طویل فاصلہ تھا۔ تاریخ میں وہ پہلا یورپین کہلایا کہ جس نے جنوب مشرقی ہندوستان سے سفر کرتے ہوئے ہندوستان تک کا سفر کامیابی سے طے کیا تھا۔

گاما کی کامیاب ہم کے بعد پرتگالی بادشاہ نے 1500ء میں بحریہ کے ایک افسر پیڈرو الیورس کیمبرل کی قیادت میں 13 جنگی جہازوں اور ایک ہزار ملاحوں پر مشتمل ایک بڑی ہم کو ہندوستان روانہ کیا۔ کیمبرل کی یہ ہم یورپ سے برازیل کا بحری راستہ دریافت کرتی ہوئی 1500ء کے وسط میں ہندوستان پہنچ گئی۔ کالی کٹ میں پرتگالی تجارتی کالونی کی بنیاد رکھنے کے دوران پیڈرو کے چند سپاہی مقامی ہندوؤں کے ساتھ ہوئی جھڑپ میں مارے گئے۔ پیڈرو 1501ء میں پرتگال واپس پہنچا تو پرتگالی بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے گاما کو بحریہ کی ہم پر ہندوستان روانہ کرنے کا اعلان کیا۔

واسکوڈے گاما نے 12 فروری 1502ء کو 15 بحری جہازوں اور ان پر سوار 800 ملاحوں کے ساتھ ہندوستان کے لیے اپنی دوسری ہم کا آغاز کیا۔ وہ اپنے مقررہ راستے پر سفر کرتا ہوا بحیرہ عرب میں داخل ہوا جہاں اس کا سامنا جدہ سے کالی کٹ جانے والے مسلمان حامیوں کے ایک بحری جہاز سے ہوا۔ گاما کے حکم پر اس کے حملے نے مسلمانوں کا مال و اسباب لوٹ لیا اور جہاز کو اس کے 400 مسافروں سمیت آگ لگا دی۔ پرتگالی بیڑہ اکتوبر 1502ء میں کالی کٹ پہنچا جہاں مقامیوں کے ساتھ گاما کا رویہ مکمل طور پر ظالمانہ رہا۔ اس نے کالی کٹ کے حکمران زیمورین کو قتل کر دیا کہ وہ شہر سے تمام عرب تاجروں کو نکال باہر کرے۔ زیمورین کے پس و پیش کرنے پر گاما کے سپاہیوں نے 38 ہندوؤں کو گرفتار کر کے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور بندرگا، گوگولہ باری کر کے جہاں کر دیا۔

مقامیوں اور پرتگالی سپاہیوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ تاہم راجا کی فوج پرتگالیوں کے آتشیں ہتھیاروں کے آگے نہ ٹھہر سکی بلکہ آخر زیمورین نے واسکوڈے گاما کے تمام مطالبات منظور کر لیے۔ ساحل مالابار پر کنٹرول اور مقامیوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے بعد گاما نے 1503ء کے آغاز پر پرتگال واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس نے مشرقی افریقی ساحلوں

ماتحت تھا اور یہاں راجا زیمورین کی حکومت تھی۔ واسکوڈے گاما، افریقا کے گرد گھوم کر ہندوستان تک رسائی رکھنے والا پہلا یورپین تھا، تاہم وہ کالی کٹ میں قدم رکھنے والا پہلا پرتگالی بحریہ نہیں تھا۔ گاما ہندوستان آمد سے 11 سال پہلے پرتگالی ہم جو، بیروڈا کو دہلی و بحیرہ روم، بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب کے روسن اٹلیا روٹ کے راستے کالی کٹ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اس زمانے میں مقامی ہندو حکمرانوں کے عربوں اور اطالوی تاجروں سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ہندوستانی حکمرانوں کو مغربی یورپین اقوام کی باہمی ٹکھن کے پس منظر سے آگاہی حاصل تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر سپانوی اور پرتگالی ہم جوئے بحری راستوں پر سفر کرتے ہوئے ہندوستان پہنچ ہی جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ پرتگالی بیڑے کے کالی کٹ آمد کے بعد راجہ زیمورین نے واسکوڈے گاما کو خوش آمدید کہا۔ گاما نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مقامی دربار میں عرب تاجروں کا خاصا رسوخ تھا، فوری طور پر راجا سے کسی بھی قسم کا باقاعدہ تجارتی معاہدہ کرنے سے گریز کیا۔

گاما نے اگلے تین ماہ تک جنوبی ہندوستان میں قیام کیا۔ وہ 29 اگست 1498ء کو کالی کٹ سے پرتگال روانہ ہوا تو اس کے بحری جہازوں پر گرم مصالحوں کے ساتھ ساتھ ایک درجن سے زیادہ ہندو بھی ساتھ تھے۔ پرتگال واپسی کا یہ سفر خاصا دشوار ثابت ہوا۔ گاما کو بحیرہ عرب اور بحر ہند کے کٹے مسند میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران اس کے چار میں سے دو بحری جہاز حادثے کا شکار ہو کر ڈوب گئے جبکہ 100 سے زیادہ ملاح جھوک پیاس کی وجہ سے ہلاک ہوئے جن میں اس کا بھائی پاؤلو (Paulo) بھی شامل تھا۔ وہ اپنے دو بحری جہازوں کے ساتھ 7 جنوری 1499ء کو دن مانڈی پہنچا۔ جہاں اس نے خوراک جمع کی۔ اس کے بحری جہازوں میں اسید کے گروگھوم کر بحر اوقیانوس میں داخل ہوئے تو سمندری طوفان میں بھنس کر ایک دوسرے سے ٹکڑے ہوئے۔ خوش قسمتی سے دونوں بحری جہاز شمال کی طرف پڑھتے رہے۔ 10 جولائی کو پہلے بحری جہاز نے نوبن پہنچ کر واسکوڈے گاما کے فلک شب کی ہم نشدگی کی اطلاع دی۔ پرتگالی حکومت ایک کامیاب ہم کے غیر متوقع انجام کو لے کر گونگو کا شکاری کہ جنبر 1499ء کو واسکوڈے گاما اپنے فلک شب ساؤ گمبریل کے ساتھ پرتگال واپس پہنچ گیا۔ یوں گاما کی ہم کے اختتام پر دو بحری جہاز اور 55 ملاح ہندوستان سے پرتگال واپسی میں کامیاب رہے۔

پرتگال میں بادشاہ میخئل اول نے واسکوڈے گاما سے

پر قیام کیا اور موزمبیق میں سوفالا (Sofala) کی مقامی بندرگاہ میں پرتگالی کالونی کی بنیاد رکھی۔ وہ ستمبر 1503ء میں لڑبن واپس پہنچا تو اس کا جنگ سے لوٹنے کا سیلاب سپاہی کی طرح استقبال کیا گیا۔ بادشاہ میٹوئل اول نے اسے ہندوستان میں ظالمانہ کارروائیوں کے بدلے انعام و اکرام سے نوازا۔ اسے اعزازات، خطابات، پیش کیے، جنوبی پرتگال میں ویڈی گوترا کے مقام پر جاگیر عطا کی گئی۔

واسکو ڈے گاما نے اگلے میں سال کے دوران پرتگالی بحریہ کے لیے نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ اس نے مارچ 1505ء میں گوا کے لیے تاحر واپس پرتگالی وائسرائے فرانسسکو ڈی ایل میڈا کو ہندوستان کے سلاور وہاں کے سیاسی حالات سے متعلق اہم مشورے دیے۔ اس نے 1511ء میں الفاسو ڈی الہریک کی زیر قیادت پرتگالی فوجوں کے سلطنت آف ملاکا پر قبضے کی خبریں سنیں۔ وہ لڑبن میں ہی تھا جب پرتگالی بہم جو، فرڈی میٹوئل نے اسپین کے پرچم تلے دنیا کے گرد پہلا کامیاب پھر (1519ء سے 1522ء) مکمل کیا۔ میٹوئل کی اس بہم کے نتیجے میں یورپین اقوام کو بحر الکاہل کی وسعت کا اندازہ ہوا اور اسپین کے لیے مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کا دروازہ مکمل کیا۔ پرتگالی حکام کے لیے یہ صورت حال سوہان روح سے کم نہیں تھی۔ وہ راس امید کے جنوب مشرقی بحری راستے پر بحریہ کی بیٹھتے تھے اور اس کے دشمنوں نے ہندوستان تک رسائی کے مغربی بحری راستے کو تلاش کر لیا تھا۔ میٹوئل کی بہم کے اسپین واپس پہنچنے کے بعد پرتگالی بادشاہ میٹوئل اول نے ایشیا میں اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے لیے واسکو ڈے گاما کو ہندوستان کا نیا وائسرائے مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔

گاما کی قیادت میں پرتگالی بحری جہاز 1524ء کے وسط میں ہندوستان روانہ ہوئے اور ستمبر میں کالی کٹ پہنچ گئے۔ تاہم ابھی گاما نے چین کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ دن بدن اس کی حالت بگڑتی گئی یہاں تک کہ دسمبر 1524ء کالی کٹ سے 150 کلومیٹر جنوب میں واقع بندرگاہ کوشن (Cochin) میں واسکو ڈے گاما کا انتقال ہو گیا۔ گوا کی بندرگاہ میں اس کی نعش کو سمندر برد کیا گیا۔ 1539ء میں اس کی باقیات کو سمندر سے نکال کر پرتگال پہنچایا گیا اور ایک تابوت میں رکھ کر ویڈی گوترا کے چرچ میں محفوظ رکھ دیا گیا۔ 1880ء اور 1898ء کے دوران دوسروں میں گاما کی باقیات کو لڑبن لا کر دفن دیا گیا۔

واسکو ڈے گاما نے یورپ سے ہندوستان تک اپنی تین

مہمات کے دوران مجموعی طور پر 11 لاکھ 20 ہزار کلومیٹر کا طویل سفر طے کیا۔ اس نے جنوبی افریقا سے کیپ تک افریقا کی لگ بھگ چھ ہزار کلومیٹر طویل مشرقی ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔ اس کی مہمات کا سب سے نمایاں پہلو ہندوستان تک رسائی کے نئے جنوب مشرقی بحری راستے کی دریافت تھا۔ پرتگال کی بندرگاہ لڑبن سے ہندوستان تک اس بحری راستے کی مجموعی لمبائی 20 ہزار کلومیٹر تھی۔ گاما کی دریافت کے اثرات نہ صرف یورپ بلکہ ایشیا میں بھی محسوس کیے گئے۔ اس کا دریافت کردہ بحری راستہ ^{فصلی} کے پرخطر اور طویل راستوں کی نسبت زیادہ محفوظ تھا۔ اس آسان بحری راستے کے میسر آ جانے کے بعد آنے والے سالوں میں یورپ اور ایشیا کے مابین تجارت کا زمینی راستہ، سلک روٹ متروک ہو گیا۔ جبکہ رومن انطراروٹ سے تجارت صرف اسکندریہ اور اٹلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ یہ صورت حال عربوں، چینی ترکوں اور مالوئی تاجروں کے لیے ایک بڑا دھچکا تھی۔ جوئیل ایزس ایشیائی تجارت پر مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔ ہندوستان تک آسان سمندری رسائی کا سب سے زیادہ اثر پرتگال پر ہوا، جب اسے اسپین پر فوجی اور نفسیاتی برتری حاصل ہوئی۔ پرتگالیوں نے جدید آتشیں ہتھیاروں کے بل پر اگلی دوہائیوں کے اندر اندر بحر ہند اور اس سے ملحقہ علاقے میں اپنی نوآبادی سلطنت قائم کر لی۔ افریقا کی مشرقی ساحلی پٹی، جنوبی ہندوستان اور انڈونیشیا کے جزائر میں بحریہ کے اڈے قائم ہونے کے بعد پرتگالی، بحر ہند کی تجارت پر چھا گئے۔

کرشوف کوئیس سے واسکو ڈے گاما کی بہم کا موازنہ کسی حد تک گاما کے حق میں جاتا ہے۔ گاما نے ہندوستان تک رسائی کی بہم میں کوئیس کی نسبت تین گنا زیادہ فاصلہ طے کیا، جس کے لیے جہاز رانی میں اعلیٰ مہارت کی ضرورت تھی۔ کوئیس کے لیے اپنی بہم کے دوران امریکا کی دریافت کا موقع نہ ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اپنے بیڑے کا رخ پھر بھی کرتا امریکا کو اس کے راستے میں آٹامی تھا، جبکہ واسکو ڈے گاما کے بحری جہاز، جنوبی افریقا میں راس امید کے گرد چکر لگاتے ہوئے بحر ہند کی وسعت میں کہیں کو سکتے تھے۔ جیسا کہ 1500ء میں پیڈرو الوارس کیمبرل کے چار بحری جہازوں کے ساتھ ہوا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئیس نے ہندوستان کے دھوکے میں امریکا دریافت کیا جبکہ واسکو ڈے گاما اپنی اصل منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

۲



کرتے ارض پر آدم آئے تو شیطان بھی آگیا اور پھر خیر و شر کا ٹکرائو، رسہ کشی جوہن پر پہنچ گئی۔ آدم کے وارث سچے اور سیدھے راستے پر گامزن رہے لیکن شیطان سے وابستہ بوجانے والے ان راستوں پر بڑھتے نظر آئے جسے تباہی و بربادی کا راستہ کہا جاسکتا ہے۔ گو کہ وہ راستہ بہت آسان، خوشنما اور نفع بخش نظر آتا ہے لیکن ایسے لوگ معاشرے کے ناسور کہلاتے ہیں۔ ایسے ہی چند بدعماشوں کے جرائم پر ایک ہلکی سی نظر۔

معلوماتی تحریر پڑھنے والوں کے لیے ایک اہم تحریر

جب سے یہ دنیا تخلیق ہوئی ہے خیر اور شر ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے ہیں۔ انسان اپنی جبلت میں فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی۔

آدی تو سب ہی ہوتے ہیں لیکن انسان بہت کم ہوتے ہیں۔ غالب نے اس لیے کہا تھا کہ آدی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔

آدی اپنے آغاز ہی سے جرم کرتا چلا آیا ہے۔ اس کی مثال بائبل اور قبائل کا واقعہ ہے۔ وہیں سے جرم کی ابتدا ہو گئی۔ اس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا ہے دور کرنے کا نام نہیں لے رہا۔ جرائم کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں، جیسے جیسے یہ دنیا

بازی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا قافلہ عبور کرنا بھی ایک کارنامے سے کم نہیں ہوتا تھا۔

لوگ ہمتوں کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے سفر کیا کرتے، جب جا کر دوسرے کنارے کو دیکھ پاتے۔

چارلس ایک پُر جوش جوان تھا۔ وہ انگریزی دوست روزیلا سے کہا کرتا۔ ”تم دیکھ لیتا میں کسی دن اس سمندر کو کراس کرتا ہوں دوسرے کنارے تک پہنچ جاؤں گا۔“

”ہاں مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔“

”کیوں تمہیں کیسے یقین ہے؟“

”اس لیے کہ تم رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے مجھ تک پہنچ چکے ہو۔“

چارلس ہنس دیتا۔ ”یہ بات تو ہے دیے ایک بات بتاؤں۔ بہت سی چیزیں مجھے ہانٹ کرنی رہتی ہیں۔ جیسے دور تک پہنچا ہوا نیلا آسمان، عظیم سمندر اور آزاد فضاؤں میں اڑتے ہوئے آزاد پرندے۔“

”تم نہیں شاعر تو نہیں ہو گئے؟“

”یہ تو فخر کی بات ہے کہ میں شاعر ہوتا جا رہا ہوں۔“ زندگی اسی طرح خوشیوں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ پنپ رہا تھا جو مغرب میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یعنی وقاداری کا۔ خیال کا اور ایک دوسرے سے احترام کا۔

پھر وہ بھی آگیا جب وہ دونوں ایک ہو گئے۔ ان کی شادی ہو گئی۔

پہلی ہی رات چارلس نے بتایا کہ میرا ایک خواب ہے ہوا بازی کا خواب ایک ادارہ ہوا بازی کی تربیت دے رہا ہے اور میں نے اس ادارے میں شرکت اختیار کر لی ہے۔

”یعنی تمہارے خواب اور اونچے ہو جائیں گے۔“ روزیلا نے کہا۔

”تم سے شادی کے بعد اونچے تو ہو ہی گئے ہیں۔“ چارلس نے دوسرے کاموں پر دھیان دینے کے ساتھ ساتھ ہوا بازی کے ادارے سے ٹریننگ بھی لینی شروع کر دی۔

اس کا کہنا تھا کہ ہوا بازی اس کا صرف شوق نہیں ہے بلکہ جنون ہے اور جنون کی کوئی حد نہیں ہوا کرتی۔

وہ روزانہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا کہ اسے اپنے اس چھوٹے طیارے سے سمندر کراس کرنا ہے۔

ترقی کرتی جا رہی ہے دیے دیے نئے زاویے سامنے آتے جا رہے ہیں، نئے نئے انداز کے جرائم ہونے لگے ہیں۔

کبھی کہا جاتا تھا کہ فساد کی تین جڑیں، ذرہ، زمین اور دن۔ لیکن موجودہ دور میں ایک اہم عنصر زبان بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ اب زبان کے نام پر بھی نکل ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھر دلوں کو جلا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کی عورتوں کی بے عزتی کی جاتی ہے۔

اگر ہم بڑے جرائم کی معلومات تاریخ سے یہ فہرست پیش کریں تو مونی مونی ڈکسٹریز میں صرف نام ہی نام ہوں گے۔

آپ ذرا جرائم کی اقسام بھی دیکھیں۔

جنکی جرائم مذہبی جرائم، انفرادی جرائم، اجتماعی جرائم، معاشی جرائم۔ اب ایک اور قسم سامنے آئی ہے اور وہ ہے سائبر جرائم۔ ان کے علاوہ جنسی جرائم، نفسیاتی جرائم اور نہ جانے کیا کیا۔

مختصر یہ کہ انسان ہر قسم کے جرم کرتا پھر رہا ہے۔ بعض دل جلے تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اس دور میں صرف وہی مجرم نہیں ہے جس کو جرم کا موقع نہیں ملا۔ یعنی کرپٹ وہی ہے جس کو کرپشن کا پاس نہیں ملا۔

ہم نے بیسویں صدی میں ہونے والے جرائم کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا میں منظر جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان مجرموں کے پس منظر کو کھنگالا ہے۔

مظہور جریڈے کا نام میگزین نے ان جرائم کی مختلف وجوہات کی بنا پر Crimes of the century کا نام دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری دنیا میں اس صدی میں ایک سے ایک جرائم رونما ہوتے ہوں گے لیکن ان واقعات کو اتنی اہمیت دی گئی کہ ان جرائم نے ایک دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ ان جرائم کو بہت زیادہ شہرت ملی ہے۔

آئیں تحریر کا آغاز کرتے ہیں۔

The lind burgh -1 kidnapping

یہ واقعہ 1911 میں امریکا کی سرزمین پر پیش آیا۔ چارلس لینڈ برگ ایک ہوا بازی تھا۔ اس زمانے میں ہوا بازی اتنی ایڈوانس نہیں ہوئی تھی آج ہو گئی ہے۔ ہوا

یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے نیشنل ہیرو کا لقب دیا گیا۔ ایسا ہیرو جس نے اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر حاصل کر لی تھی۔ دوسری اچھی خبر چارلس کے لیے یہ تھی کہ اس کی بیوی ماں بننے والی تھی۔

اور ایک دن روزیلا ماں بن گئی۔ بہت خوب صورت بچہ تھا۔ اس کا نام برائن برڈ رکھا گیا۔ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تار بن گیا تھا۔

اس بچے کے لیے ملک بھر سے تحائف آنے لگے۔ لوگوں نے اس خبر کو ایک شاعر اور خبر قرار دیا تھا۔ جب برائن برڈ ایک سال کا ہوا تو پھر وہ واقعہ رونما ہوا جس نے پورے ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

چونکہ چارلس کی ہوا بازی کی کامیابی اور اس کے یہاں بچے کی پیدائش کو زبردست شہرت مل چکی تھی۔ اس لیے اس بچے کے غائب ہونے یا انخواہ ہونے کی خبر نے بھی ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔

برائن برڈ اپنے گھر سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ڈرامی دیر میں وہ کہاں جا سکتا تھا۔ اس وقت چارلس اور روزیلا گھر پر ہی تھے۔ روزیلا چارلس کے لیے کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ چارلس اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اچانک روزیلا کو خیال آیا کہ اس نے بہت دیر سے برائن کو فیکہ نہیں کیا ہے۔

وہ چارلس کو کافی دے کر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی لیکن برائن بستر پر نہیں تھا۔ اس نے اچر اچر دیکھا وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے ہولکا کر چارلس کو آوازیں دیں وہ بھی دوڑتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

ان دونوں میاں بیوی نے پورا گھر چھان مارا، جہاں جہاں اس کے ہونے کے امکانات ہو سکتے تھے وہ سب دیکھ لیے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔

دونوں میاں بیوی پاگوں کی طرح تلاش کرتے اور آوازیں دیتے ہوئے پھر رہے تھے۔ اس گھر میں اس وقت ایک کار پینٹر پچھلے حصے میں اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ بھی اس تلاش میں ان کے ساتھ ہوا لیکن برائن کہیں نہیں تھا۔ اب روزیلا کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔

چارلس نے پولیس کو فون کر دیا۔ وہ ایک قوی ہیرو بن چکا تھا۔ اس کے بچے کی گمشدگی

اسے سمجھا جاتا کہ دیکھو ابھی ہمارے جہاز اس قافلہ نہیں ہیں کہ اتنی لمبی پرواز کر سکیں۔ انجن ابھی کمزور ہیں۔ ان کو زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے قافلہ بنایا جا رہا ہے لیکن اس میں ابھی وقت لگے گا لیکن وہ جنون ہی کیا جو ایسی باتوں کو خاطر میں لائے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ جب اسے اطلاقک پار کرنا تھا۔

یہ ایک تاریخی دن تھا۔ اسے الوداع کہنے کے لیے روزیلا کے علاوہ ہزاروں لوگ جمع تھے۔ روزیلا کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ ہزاروں غدشات تھیں۔

اس کے ساتھ ہی گھر کے احساسات بھی تھے۔ اس کا محبوب شوہر ہوا بازی کی تاریخ میں پہلی پار ایک نئے باب کا اضافہ کرنے جا رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک چارلس سے لپٹی بھی رہی تھی۔ اسے مشورے دے رہی تھی۔ ”دیکھو بلاوجہ ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا۔ جہاں خطرہ محسوس ہو وہاں حفاظتی قدم اٹھالینا۔“

چارلس اس کی باتوں پر ہنسنے لگا تھا۔ ”یالا خراس کی اڑان کا وقت آ گیا۔ اس نے روزیلا اور دوسروں کو خدا حافظہ کہا اور اپنے جہاز کی طرف چل دیا۔

ویسے وہ خود بھی کچھ خوفزدہ تھا۔ اس کو جو جہاز دیا گیا تھا اس کی مکمل کارکردگی ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔

وقت آ گیا۔ اسے اشارہ دیا۔ اس نے جہاز کو چھوٹے سے رن وے پر دوڑا دیا۔ چند ہی لمحوں میں جہاز فضا میں بلند ہو کر اپنی منزل کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ روزیلا بہت دیر تک آسمان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ پھر جب وہ طیارہ دکھا ہوا اسے اوجھل ہو گیا تو وہ گھرواپس آ گئی۔

ادھر کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ وہی علانیات تھیں جو کسی بچے کی آمد سے پہلے ہوا کرتی ہیں۔ اس گھر کے لیے یہ ایک اچھی خبر تھی۔

روزیلا کو اب صرف خبروں کا انتظار تھا۔ وہ خبریں جو شوہر کی سلامتی کے حوالے سے ہوتیں۔ آخر وہ خبر آئی تھی کہ چارلس کے طیارے نے اطلاقک عبور کر لیا ہے۔ پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔ تاریخ میں وہ پہلا انسان تھا جس نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

چارلس کی والدہ بھی شاعرانہ انداز میں ہوئی تھی۔ پورا شہر اس کے استقبال کے لیے اٹھ آیا تھا۔

ماہنامہ سرگزشت

کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں پولیس اس کے گھر پہنچ گئی۔ پولیس کے اعلیٰ حکام بھی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس گھر میں باہر کا کوئی فرد نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کارپینٹر کے۔ وہ بھی سارا وقت نگاہوں کے سامنے رہا تھا۔ اس پر شبہہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ریڈیو سے جب چارلس کے بچے کے غائب ہو جانے کی خبر نشر ہوئی تو پورا ملک چارلس اور روزیلا کی پریشانی میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

چارلس کے لیے دہری مصیبت تھی۔ ایک طرف تو برائن غائب ہو گیا تھا، دوسری طرف روزیلا بستر سے جاگتی تھی۔ اس کے لیے یہ دکھ برداشت کے قابل نہیں تھا۔ وہ جنون کے عالم میں چارلس کا گریبان تمام لیتی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی، جاؤ میرے بچے کو لے کر آؤ۔“

چارلس رندھی ہوئی آواز میں اسے دلا سے دیتا رہتا۔ پولیس نئے برائن کو تلاش کرتے کرتے تھک گئی۔ رہ رہ کر اس وقت گھر میں کام کرنے والے کارپینٹر کی طرف خیال جاتا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ کارپینٹر ان کی نگاہوں کے سامنے ہی کام کرتا رہا تھا۔

ایک دن اوجانک چارلس کو کسی کا فون ملا۔ فون کرنے والا یہ بتا رہا تھا کہ اس نے چارلس کے بچے کو لوہڑی نام کے ایک مشکوک شخص کے گھر میں دیکھا ہے۔

فون کرنے والا یہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی کام سے لوہڑی کے محلے کی طرف گیا تھا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ لوہڑی کے گھر میں کوئی بچہ آگیا ہے جب کہ دونوں میاں بیوی لاؤد تھے۔ فون کرنے والے کو یہ بات لوہڑی کے محلے کے ایک آدمی نے بتائی تھی۔

چارلس نے اسی وقت پولیس کو اس کال کی خبر دے دی۔ پولیس فوری طور پر لوہڑی کے محلے کی طرف روانہ ہوئی۔ فون کرنے والے نے لوہڑی کے محلے اور گھر کا پتا بھی سمجھا دیا تھا۔

اس کا گھر ایک خستہ حال محلے میں تھا۔ فون کرنے والے کی اطلاع درست نکلی تھی۔ ادھر ادھر کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ لوہڑی واقعی ہے اولاد تھا لیکن کچھ دنوں پہلے اس کے یہاں ایک بچے کی آمد ہوئی تھی۔

پولیس لوہڑی کے گھر میں داخل ہو گئی۔ لوہڑی اور اس کی بیوی گھر میں ہی تھے۔ وہاں ایک بچہ بھی تھا لیکن وہ برائن برڈ نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔

لوہڑی سے جب اس بچے کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو اس نے بتایا کہ چونکہ وہ بے اولاد تھے اس لیے لوہڑی بیوی کی بہن نے اپنا بچہ ان کو دے دیا تھا۔

اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ روزیلا ہر رات خواب میں اپنے بچے کو دیکھا کرتی جو اسے بلا رہا تھا۔ وہ چارلس سے بات کرتی تو وہ اسے سلی دینے لگتا۔

ایک صبح جب چارلس اپنے بستر پر ہی تھا تو روزیلا روتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔ ”جلدی چلو میں نے اپنے برائن کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ دروہا ہے، جلدی چلو۔“

”لیکن کہاں چلوں؟“

”بارک میں؟“ روزیلا نے بتایا۔

چارلس اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے ساتھ قریبی بارک میں آگیا اور ان کا برائن تو لیے میں لپٹا ہوا اس بارک کے ایک گوشے میں موجود تھا۔

فوری طور پر پولیس کو خبر دے دی گئی۔ پولیس کے ساتھ اخباری نمائندے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد چلی آئی تھی۔

ریڈیو سے بھی یہ خبر نشر کر دی گئی۔ لیکن ایسے ہی سوالات تھے جن کے جواب کبھی نہیں مل سکے۔

کون لے گیا تھا بچے کو؟ کیوں لے گیا تھا؟ اور وہاں کیوں کیا؟ یہ راز آج بھی برفہن میں قائم ہے۔ ان سوالوں کے جواب نہیں مل سکے۔ قیاس تو بہت سے کیے گئے لیکن حقیقت کوئی نہیں جانتا۔ دراصل یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے، بچے تو انوا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پوری دنیا میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اس واقعے کو اس لیے اتنی شہرت مل گئی کہ برائن ایک شخص ہیر کا درجہ رکھنے والے کا بچہ تھا۔

مونالیزا کی پوری (1911)

بیسویں صدی کے آغاز کا یہ جرم پوری دنیا میں اپنی مثال آپ نہ کیا تھا۔

مونالیزا کی پینٹنگ سے کون واقف نہیں ہے۔ لیونارڈو رانچی کی اس پینٹنگ نے پوری دنیا کو اپنے حرم میں گرفتار کر لیا تھا اور آج تک وہی عالم ہے۔ وہ شخص جسے آرٹ اور ادب وغیرہ سے ذرا بھی دلچسپی ہے وہ مونالیزا سے واقف ہے۔

اس بے مثال تصویر کے حوالے سے کئی سوالات ہیں۔ کون سی یہ مونا لیزا؟ مصور نے کس کو دیکھ کر یہ تصویر بنائی تھی؟ اس کی مشہور زمانہ مسکراہٹ کا مفہوم کیا ہے؟ وہ کیوں اتنی پراسرار تھی۔

مونا لیزا کی پراسرار مسکراہٹ کو بھی کئی مفہوم دیے گئے۔ ایک عرصہ تک سمجھ میں ہی نہیں آ سکا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ کسی خوشی کا اظہار ہے یا یہ کسی غم کا اظہار ہے۔ لیکن پچھلے دنوں پونچھوٹی آف فری برگ کے محققین نے ریسرچ کر کے یہ بتایا کہ یہ پراسرار مسکراہٹ غم زدہ نہیں بلکہ خوشی کی مسکراہٹ ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنی خوشی کا اظہار بھی مکمل کر نہیں کیا ہے۔ بلکہ جس کو دلی مسکراہٹ کہا جاتا ہے۔ وہی اس کے ہونٹوں پر ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مونا لیزا اس دنیا کی مخلوق نہیں تھی۔ بلکہ مصور نے کسی خلائی مخلوق کو اپنا ماڈل بنایا تھا۔ مونا لیزا اٹلی کا شہر تھی۔ غم آنکھوں اول اسے اٹلی سے فرانس لے کر آیا تھا۔ پولین نے اس پینٹنگ کو اپنی خواب گاہ کی دیوار پر سجا رکھا تھا۔ پھر اس تصویر کو فرانس کے ایک میوزیم میں رکھ دیا گیا اور وہیں سے یہ شاہکار چوری ہو گیا۔ اس تصویر کی رات دن حفاظت کی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک ایسا شاہکار تھی کہ پوری دنیا میں اس کا کوئی جانی نہیں تھا۔

یہ واقعہ 20 اگست 1920ء کا ہے۔ جب مونا لیزا کو غائب کر دیا گیا تھا۔ اس خبر نے پورے فرانس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گرچہ مونا لیزا کا تعلق اٹلی سے تھا لیکن اب وہ فرانس کی ملکیت تھی۔ اسے فرانس کے قومی اثاثے کی قیمت حاصل تھی اور قومی خزانہ اس طرح غائب ہو جائے یہ بہت بڑی بات تھی۔

شعبہ ملازمین پر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی اہمیت کیا ہے اور اس کی قیمت کیا ہے اور اس کا سودا کتنے میں ہو سکتا ہے۔

اس پینٹنگ کی قیمت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ صرف اس کی انشورنس ایک کھرب سے بھی زائد کی تھی۔ اس شاہکار کو مٹانے کی کج تاریخ تو نہیں معلوم، لیکن یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کو چند سو تین سو سیویں سے لے کر پندرہ سو آٹھ سو سیویں کے درمیان بنایا گیا تھا۔ مونا لیزا کا اصلی نام لیزا گرڈنہیں تھا۔ مونا لیزا کا

مطلب ”میری لیزا“ ہے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور اس کا تعلق اٹلی کے شہر فلورنس سے تھا۔ اس کے شوہر کا نام فرانسکو تھا۔

وہ فلورنس کا ایک مشہور تاجر تھا۔ اسی نے لیزا کو اپنی بیوی کی پینٹنگ بنانے کو کہا تھا۔ فلورنس کے جس مکان میں لیزا نوڈلجی نے قیام کیا تھا وہ اسی تاجر مونا لیزا کے شوہر کی ملکیت تھی۔

اس وقت مونا لیزا صرف پندرہ برس کی تھی۔ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔

اس کے شوہر فرانسکو کا کاروبار بہت گھٹاؤ تھا۔ وہ تاجر تھا اور پچھلے عورتوں کو کنیز بن کر لاتا اور اپنے دوستوں کو بیچ دیا کرتا۔ یہ سب مونا لیزا کو پسند نہیں تھا۔ وہ ایک حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔

فرانسکو نے مونا لیزا کو دیکھا اور شادی کے لیے پسند کر لیا۔ مونا کے والدین فرانسکو کی دولت سے مرعوب تھے اور انہوں نے مونا لیزا کی شادی اس تاجر سے کر دی۔

مونا لیزا کے ہونٹوں پر ایک دکھ بھری طویر مسکراہٹ نمودار ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ ایک ایسی ادا اس مسکراہٹ ہے جس کا محرک آج تک قائم ہے۔

فرانس کا بادشاہ اس پینٹنگ کو اٹلی سے فرانس لے آیا تھا۔ اٹلی والوں کو اس پینٹنگ سے ایک جذباتی لگاؤ تھا اس لیے کئی بار اسے فرانس سے اٹلی لانے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

آخر کار اگست 1911ء میں مونا لیزا چوری ہوئی گئی۔ یہ چوری ایک عہد کی چوری تھی۔ یہ ایک شہکار کی چوری تھی۔ ایک عظیم مصور کے ایک عظیم فن پارے کی چوری تھی۔

آرٹ سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس خبر کو بہت حیرت اور دکھ سے سنا تھا۔ چاہے ان کا تعلق دنیا کے کسی بھی علاقے سے ہو۔

اس چوری کا پس منظر بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس پر کئی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ اس خیم پر کئی فلمیں بن چکی ہیں۔

دین سینفرد بروسوں سے اس پینٹنگ کو دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ نام کی طوالت کی وجہ سے اسے صرف دین کہا جاتا تھا۔ وہ اٹلی کا باشندہ تھا اور اس میوزیم میں کام کرتا تھا جہاں وہ پینٹنگ رکھی گئی تھی۔

دین کو یہ دیکھ کر کوفت ہوئی تھی کہ لوگ دنیا بھر سے اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسے فرانس کا قومی خزانہ ضرور کرتے ہیں۔ جب کہ وہ اٹلی کی ملکیت تھی، اس کے اپنے ملک کی۔ جہاں کا لیوناڈو وانچی تھا جہاں کی مونا لیزا تھی اور جہاں مائیکل انجیلو ہوا کرتا تھا۔

لاروے میوزیم میں رکھی ہوئی وہ نایاب پینٹنگ دین کو یاد دلاتی رہتی تھی کہ وہ اٹلی کی ہے اور اسے اٹلی واپس جانا ہے۔ دین ایک محبت وطن انسان تھا۔

وہ اپنے فرانسیسی دوستوں کے درمیان بینہ کراٹلی کی کہانیاں سنایا کرتا۔ ”ارے وہاں کی تو فضاؤں میں بھی آرٹ مگلا ہوا ہے۔ انتہائی ہے کہ وہاں کے آسمان پر بننے والے بادل بھی ایک خاص قسم کا بیڑن بناتے ہیں۔ وہاں کی گھیاں اور سڑکیں ماسٹر پیس کا حقیقت رکھتی ہیں۔ وہاں کیا ہے، گلی میں کھلتا ہوا اگر کوئی بچہ شرارت میں کسی دیوار پر رنگوں کے چھینٹے ماروے تو وہ بھی تصویر بن جاتی ہے۔“ ”بھائی اگر ایسا ہی ہے تو اپنے ملک چلے جاؤ، یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس کے فرانسیسی دوست کہا کرتے۔

دین کچھ دیر تک جواب دیتا۔ ”ہاں جانا تو ہے لیکن ابھی نہیں، ابھی کسی کا انتظار ہے۔“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ دین کو کس کا انتظار ہے یا اس کے ذہن میں کسی آنندھیاں چل رہی ہیں۔ جب اسے پتا چلتا کہ فلاں تاجر نے فلاں ملکنے اسے کروڑ کی پیشکش کی ہے تو وہ بھتا کر رہ جاتا۔ وہ جب یہ سنتا کہ اس پینٹنگ کی قیمت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔

دین کے خواب اب کچھ اور ہو گئے تھے۔ پہلے تو وہ صرف اپنے ملک کے لیے سوچا کرتا تھا۔ اب اس نے خود اپنے لیے سنی سوچنا شروع کر دیا۔ خود اس کے معاشی حالات خراب تھے۔ وہ اپنے ملک سے دور ایک دوسرے ملک میں ایک میوزیم میں ملازمت کر رہا تھا۔

اٹلی میں اس کی ایک بیوی تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ ان کی شادی کو ابھی صرف دو ہی سال ہوئے تھے۔ ان دونوں نے جی بھر کر ابھی زندگی بھی نہیں برتی تھی۔

بہت سے خواب تھے جن کی تعبیر نہیں ملتی تھی۔ اٹلی میں جدوجہد کے دوران دین کو فرانس کے ایک میوزیم میں ملازمت کا موقع مل گیا۔

وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرانس چلا آیا۔ ان دونوں کے پاس اچھے دنوں کی امیدیں تھیں لیکن وہ اچھے دن آنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ مونا لیزا کی پینٹنگ کو پہرہوں دیکھتا رہتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے مونا لیزا کی مسکراہٹ اسے یہ یقین دلا رہی ہو کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ دین تھوڑی سی ہمت کرے، وہ اس کا ساتھ دے گی۔

اور آخر کار اگست 1911ء میں وہ موقع مل گیا۔ اس میوزیم میں ملازمین شفٹ میں کام کیا کرتے تھے۔ صبح کو آنے والے شام کو چلے جاتے۔ شام والے رات تک رہتے تھے۔

میوزیم کی کوئی چیز لے کر کیت سے گزرنا بہت مشکل تھا۔ سیکورٹی انتہائی جوزف ایک سخت گیر انسان تھا۔

وہ شیشے کی ایک بند بکین کے اعر بیٹھا آنے جانے والوں کو قوتابی لگا ہوں سے دیکھتا رہتا۔ کسی کی تلاشی تو نہیں لی جاتی تھی لیکن اس کی نگاہوں سے کچھ لکھنا بہت مشکل تھا۔

اس کے لیے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کی ضرورت تھی۔

دین نے اس عمل کو انجام دینے سے پہلے اپنے اعصاب اور سانسوں کو قابو میں رکھنے کی مشقیں شروع کر دی تھیں۔

دین کو پتا چلا کہ آج سیکورٹی انتہائی کی طبیعت خراب ہے۔ وہ نہیں آئے گا۔ اس کی جگہ ڈیوٹی پر ایک دوسرے شخص کو بٹھایا گیا تھا لیکن اس میں وہ بات نہیں تھی جو پہلے والے میں تھی۔ دین کو اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

دن کی شفٹ ختم ہوئی، میوزیم کا اسٹاف آہستہ آہستہ باہر جانے لگا لیکن دین ایک کمرے میں جا کر چھپ گیا۔ اس دن اس نے ایک بڑا سا اور کوٹ پہن کر رکھا تھا۔

مونا لیزا کی پینٹنگ کے ارد گرد چہرا دینے والے بھی باہر ریٹ ہاؤس میں چلے گئے۔

دین یہ سب اطمینان کر لینے کے باوجود بہت دیر تک چھپا رہا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اب لگا ہیں اس کی نگراں نہیں ہوں گا۔

بھر وہ آہستہ آہستہ اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ پینٹنگ موجود تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بہت بڑی واردات ہونے جا رہی تھی۔

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں سحر ہر ایسے عجیب وغریب امر کو کہا گیا ہے جو کہ شیاطین اور کافر جنات کے ذریعے کروایا جائے، ان کی ناجائز خواہشات کو پورا کر کے، انہیں خوش کرنے کے مختلف طریقے ہیں مثلاً کفر اور شرک کے الفاظ پر مشتمل کلمات کا منتر پڑھنا، ناپاک جگہ اور ناپاک کی حالت میں (نحوہ باللہ) اللہ تعالیٰ کا پاک کلام پڑھنا، غلط اور حرام چیزیں استعمال کرنا، حرام غذا کھانا، حرام جانور یا انسان کے اعضا حلائی، ہال، ناخن اور خون وغیرہ استعمال کرنا، نجاست کھانا، خون پینا یا اس شیطان جن کو پلانا، کسی کو ناحق قتل کرنا، زنا اور بدکاری کرنا، ناپاک لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کے ساتھ غیر فطری عمل کرنا، جھوٹ بولنا، دھوکا دینا اور بے ایمانی کرنا۔

اس نے دین سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہر قسم کے خطرے کی پروا دیکھے بغیر مونا لیزا کی پینٹنگ کو واپس اٹلی پہنچا دے گا۔

لیکن اس سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ اس نے ایک آرٹ ڈیلر سے بات کر لی۔ وہ آرٹ ڈیلر ان سے بڑا محبت وطن ثابت ہوا۔ اس نے حکام کو خبر کروی۔

اس طرح سب کے سب گرفتار ہو گئے۔ پھر اگرین اور دین بھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان دونوں کو صرف چھ ماہ کی سزا ہوئی کیونکہ انہوں نے یہ جرم اپنے وطن کی محبت میں کیا تھا۔

اب ایک اور بڑے جرم کا قصہ سن لیں جسے Great Train Robbery کا نام دیا گیا ہے۔

ریلوے کی تاریخ کا یہ سب سے مشہور ڈاکا ہے۔ اس ڈاکے کو اتنی شہرت ملی کہ یہ ڈاکے کی تاریخ میں مثال بن کر رہ گئی۔

اس بے مثال ڈاکے کو مرکزی خیال بنا کر اس پر کئی ناول بھی لکھے گئے۔ جن میں چند یہ ہیں۔

The great Train Robbery
1- Robbery
جان گرسلنگ اور ولینس۔

اس نے آہستہ سے پینٹنگ اتار کر اپنے لباس میں چھپالی۔ اس نے اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنے کے لیے گہری گہری سانسیں لیں اور آہستہ آہستہ پورے استاد کے ساتھ قدم جماتے ہوئے میوزیم سے باہر نکل آیا۔

کسی نے اسے نہیں روکا تھا۔ کوئی آواز نہیں آئی تھی کہ اوئے رک جاؤ۔ کہاں جا رہے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوا اور وہ باہر آ گیا۔

کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اتنی دیر سے کیوں جا رہا ہے۔ عام طور پر ملازمین وقت کے بعد ہی جایا کرتے تھے۔ وہ گھبرائی آیا۔ اس کے پاس اس وقت دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی چوری کی تھی۔ یہ ایک قوی چوری تھی۔ وہ فرانس کا اثاثہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اس نے اس پینٹنگ کو موٹے کپڑوں میں لپیٹ کر بہت احتیاط سے صندوق میں رکھ دیا۔ اب فی الحال اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

وہ جانتا تھا کہ پورے ملک میں کھلبلی مچ جائے گی، ہر اس آدمی پر شبہ کیا جائے گا جو اس پینٹنگ کے آس پاس رہا ہو۔

اس کی توقع کے میں مطابق دوسرے دن پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مونا لیزا کی چوری کوئی عام بات نہیں تھی۔

پولیس، خفیہ ایجنسیاں سب اس نایاب تصویر کو تلاش کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

دین نے اس پینٹنگ کو پورے ڈھائی برس تک اپنے گھر میں محفوظ رکھا تھا۔

اس پر اس لیے شبہ نہیں کیا گیا کہ اس نے بہت مبرا کا مظاہرہ کیا تھا۔ پورے ڈھائی برسوں تک وہ پینٹنگ اس کے پاس رہی تھی۔

لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ اس کا کیا کرنا، وہ فرانس میں فروخت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی کسی ملک سے باہر لے جاسکتا تھا۔

ساری سرحدیں سیل کر دی گئی تھیں۔ ایسے میں اسے پھر اگول کیا جوا ہے اس کام میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ بھی اٹلی کا باشندہ تھا اور اس کو بھی مونا لیزا کی پینٹنگ سے پیار تھا۔ وہ بھی اسے اٹلی کی گاہک رکھتا تھا جسے درودی اٹلی سے فرانس پہنچا دیا گیا۔

روڈ ٹرانزپورٹ مرکز کی حیثیت اس لیے حاصل تھی کہ وہی اس پوری پلاننگ کا سرخیز تھا۔

یہ سارے لوگ اگرچہ جرائم کے اپنے اپنے میدان میں بہت کامیاب تھے۔ ہر ایک نے مختلف جرائم کر رکھے تھے لیکن کسی ریل کو لوٹنے کا ان کے پاس کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہ بہت ٹیکنیکل معاملہ تھا۔ اس میں دلیری کے ساتھ ساتھ بہت ہوشیاری کی بھی ضرورت تھی اس لیے لندن کے ایک اور گینگ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس گینگ کو "ساڈھ کوسٹ ریلز" کہا جاتا تھا۔

اس گروپ میں تین ایسے نام تھے جو ریل میں ڈکیتی کر چکے تھے۔ ان کے پاس اس قسم کی ڈکیتی کا تجربہ بھی تھا۔ روڈ ٹرانزپورٹ کے کہنے پر ایک اور آدمی روجر کو اس ٹیم کا حصہ بنا لیا گیا۔ وہ بغیر مقررہ اسٹاپ کو سٹیز کو تھمیل کر کے ٹرین کو روک دینے میں مہارت رکھتا تھا۔

اس طرح یہ سولہ رکنی ایسا گینگ تیار ہو چکا تھا جسے آگے چل کر ڈاکے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔

بالآخر 7 اگست 1968ء کو بدھ کے دن رائل میل ٹرین اپنے سفر پر روانہ ہوئی۔ اس میں 12 ڈبے تھے جس میں خطوط اور پارسل تھے۔

ہر ڈبے میں خطوط اور پارسل کے انبار لگے ہوئے تھے۔ 72 افراد پر مشتمل ڈاک خانے کا عملہ ہر ڈبے میں خطوط اور پارسل کی چھاننی کر رہا تھا۔ اس کام کو چلتی ریل میں کیا جا رہا تھا تا کہ جب ٹرین اپنی منزل پر پہنچے تو خطوط اور پارسل کے ہنڈل بندھے ہوئے تیار ہوں۔ پھر ان کو ان کے مقررہ چول تک پہنچا دیا جائے۔

ان ڈبوں کے علاوہ اس ٹرین میں کچھ ایسے ڈبے بھی تھے جن کو H.V.P کا درجہ دیا گیا تھا۔ یعنی High value Packages کے لیے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے دروازے اور قیمتی اشیاء ان ہی ڈبوں میں رکھی ہوئی تھیں۔

ایسے ڈبوں کی حفاظت کے لیے مخصوص الارم بھی لگائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے دروازے اور کھڑکیاں بھی بہت احتیاط اور سختی سے بند کی گئی تھیں۔

ٹرین کے ڈرائیور کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مقررہ رفتار سے کم نہیں چلائے گا اور ٹرین صرف ان ہی مقامات پر رکنے کی جہاں اسے روکنے کا حکم ہے۔

لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود ایسی محفوظ

The Robbers Tale(1965)

Peta Fordha

ان کے علاوہ ان ڈاکوؤں کی سوانح عمریاں بھی لکھی گئی ہیں۔ جیسے The Train Robbers (1964) کتابوں کے علاوہ اس ڈاکے پر ٹی وی سیریل اور لا جواب فلمیں بھی بنائی گئیں۔

1965 میں بنی فلم Help۔

1965 میں بنیس باطری فلم ٹھنڈر بال۔

☆.....☆

اس کہانی کی ابتداء کچھ یوں ہوتی ہے۔ جس ٹرین میں ڈاکا ڈالیا گیا، وہ رائل میل ٹرین کہلاتی تھی۔ اس کے ذریعے خطوط اور پارسل ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچائے جاتے۔

اس ٹرین کے ذریعے نوٹوں کے علاوہ سونے کی اینٹیں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجی جاتی تھیں۔ گھگھے میں کام کرنے والے کسی بھی شخص کو ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی کہ آج کی ٹرین میں کیا جا رہا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہوگا جب ایک بڑا خزانہ انتظامی معاملات کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر لے جائے جاتے۔

بیزرک میکنا اسی جگہ میں کام کرنے والا شخص تھا۔ میکنا کے پاس پوری معلومات ہوا کرتی تھی۔ وہ خواب دیکھتا رہتا کہ وہ ساری دولت اس کے پاس آگئی ہے اور وہ دنیا بھر میں عیش کرتا بھر رہا ہے۔

لیکن کس طرح؟ اس خزانے کی انتہائی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ خونخوار قسم کے مسلح لوگ اس خزانے کے آس پاس ہی ہوا کرتے۔

بہت احتیاط اور مکمل رازداری کے ساتھ اس خزانے کو ریل میں رکھا جاتا اور اس احتیاط اور رازداری کے ساتھ اسے اتارا بھی جاتا۔

اس کی ملاقات دو آدمیوں سے ہوئی جو پہلے بھی ڈکیتیاں کر چکے تھے لیکن کسی ٹرین کو لوٹنے کا یہ ان کا پہلا تجربہ ہوتا۔

ان کے نام دگرڈن گوڈی اور مسٹر ایڈمگ تھے۔ ان سمجھوں نے مل کر اپنے ہی جیسے کچھ اور لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ان میں بروڈر ریٹلف، چارلس دین سن اور رے جیمز تھے۔ اب یہ پورا گینگ بن چکا تھا۔

ٹرین میں ڈاکا پڑ گیا تھا۔

اس ٹرین کے ڈرائیور کا نام ملز تھا۔ اس کی عمر اٹھادس برس تھی۔ صرف دو سال بعد اس کی ریٹائرمنٹ ہونے والی تھی۔

اتنی طویل سروس میں اب تک اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ نارمل تھا۔

ہمیشہ کی طرح ٹرین اپنی مقررہ رفتار سے جارہی تھی۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ ملز نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا کہ اس کے لیے قمر اس سے کافی نکال کر دے دے۔

”ملز! تم کافی بہت بیٹے لگے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ اس کے ساتھی نے تنبیہ کی۔ چھو سکرادیا۔ اچانک اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ اشارہ سرخ نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریل کو فوری طور پر روک دیں۔

یہ ایک حیرت کی بات تھی۔ اس مقام پر تو اس ٹرین کو پہلے کسی رکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

ماہر اور شاطر ڈاکوؤں نے سنٹل کو سرخ رکھنے کا یہ طریقہ استعمال کیا تھا کہ ایک بہت طاقت ور حکم کا ایسا تارچ جس کے آگے سرخ خشخاش لگے ہوئے تھے۔ اس داروات میں استعمال کیے تھے جب کہ ریلوے کے اصل سنٹل کو شیپ لگا کر اس طرح بند کر دیا گیا تھا کہ اس کی روشنی باہر نہ جاسکے۔

ٹرین کے اچانک رگ جانے کی وجہ سے ایک تجسس تو پیدا ہو گیا تھا لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ریل کے راستے میں کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

جب کچھ دیر ہو گئی تو ملز نے اگلے اسٹیشن سے رابطہ کرنا چاہا لیکن رابطے کا سسٹم جام ہو چکا تھا۔

یہ بھی ان ڈاکوؤں کی کارستانی تھی۔ انہوں نے بڑی مہارت کے ساتھ ٹرین اور اسٹیشن کے درمیان رابطے کی لائن کاٹ دی تھی۔

”ملز میں ڈرا نیچے تک دیکھ کر آتا ہوں۔“ اس کے ساتھی نے کہا۔

جان انجن روم سے باہر آ گیا۔ وہ سنٹل تک پہنچا لیکن وہاں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

سنٹل ابھی تک سرخ تھا۔ وہ انجن روم کی طرف واپس بڑھا لیکن ڈرائیور کے

پاس پہنچنے سے پہلے ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔

ملز ٹرین میں اپنے ساتھی کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا جو سنٹل کی خرابی کا معلوم کرنے گیا تھا کہ اچانک دو آدمی انجن روم میں داخل ہو گئے۔

ایک دائیں طرف سے دوسرا بائیں طرف سے۔ ملز نے ایک کو پکڑ لیا لیکن اس وقت پیچھے سے اس کے سر پر وار ہوا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

گینگ کے ایک آدمی نے انجن کا کنٹرول سنبال لیا اور ٹرین ایک بار پھر روانہ ہو گئی لیکن اس کی منزل اب کچھ اور تھی۔

جس کا مختلف ڈبوں میں اپنا کام کرتے ہوئے لوگوں کو احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ کچھ دیر کسی وجہ سے رکی رہنے کے بعد ٹرین پھر آگے کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ اس دوران کچھ لوگ ان خاص ڈبوں میں داخل ہو چکے تھے جن میں خزانہ رکھا ہوا تھا۔ ان ڈبوں میں چونکہ کوئی آتا جاتا نہیں تھا اس لیے محکمے کے ان لوگوں کو جو مختلف ڈبوں میں کام کر رہے تھے احساس تک نہیں ہو سکا کہ کیا سے کیا ہو رہا ہے کیونکہ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔

اس ٹرین کو پہلے نمبر 1 کے پاس پھر روک لیا گیا۔ یہاں ایک بڑا سا ٹرک پہلے سے تیار کھڑا تھا۔

یہ ساری کارروائی 15 سے 20 منٹ میں مکمل ہو چکی تھی۔

سونے کی اینٹوں اور زہرات وغیرہ کے خلیے ٹرین کے ڈبوں سے ٹرک میں منتقل کر دیئے گئے۔

یہ سارا عمل انتہائی برقی رفتار سے ہوا تھا۔

اس کے بعد کچھ لوگ اس ٹرک کو لے کر روانہ ہوئے اور کچھ لوگ ان گاڑیوں میں بیٹھ گئے جو پہلے سے کھڑی ہوئی تھیں۔

ریلوے کی تاریخ کا سب سے بڑا ڈاکا مکمل ہو چکا تھا۔

اب لوگوں کو محفوظ مقام پر پہنچنا تھا جس کی پلاننگ ہو چکی تھی۔ ان لوگوں نے ایک ایسی چھوٹی سڑک کا انتخاب کیا تھا جس پر آمد و رفت کم ہوا کرتی تھی۔

وہ سب ایک ہی جگہ پر سوچ رہے تھے کہ کسی بھی لمبے ریڈیو سے اس ڈاکے کی خبر نشر ہونے والی تھی۔ خبر کے نشر ہو جانے کے بعد ان کے لیے سربہت دشوار ہو جاتا۔

حیرت انگیز طور پر اس واردات میں صرف ایک آدمی ہلاک ہوا تھا اور وہ تھا بے چارہ ٹرین ڈرائیور جیک ملز۔ جو کچھ دنوں کے بعد ریلوے سے ریٹائر ہونے والا تھا لیکن موت نے اسے زندگی ہی سے ریٹائر کر دیا تھا۔
اب ایک اور بڑے جرم کی روداد سن لیں جسے اسکول شوٹنگ کہا جاتا ہے۔

خدا جانے انسان کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اسکولوں میں ہونے والی فائرنگ کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ننھے ننھے بچوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔

خاص طور پر امریکا میں ایسی شرمناک اور ہولناک وارداتیں بہت ہوا کرتی ہیں۔ مینے میں کم از کم ایک یا دو اسکولوں میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔

عام طور پر اس قسم کی وارداتیں کرنے والا اس اسکول کا طالب علم ہوتا ہے۔ کہیں سے اسلحہ لایا اور اپنے اسکول کے ساتھیوں پر گولیاں برسائی شروع کر دیں۔

یہ ماہرین نفسیات کا کام ہے کہ وہ ریسرچ کریں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ تشدد کا رجحان کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ ہم اس مضمون میں جرائم کے خوالے سے موجودہ

صدی میں ہونے والے بڑے جرائم کی کہانی سنا رہے ہیں۔ اس لیے ایک ایسے ہی واقعے کے بارے میں تذکرہ سنیں۔ یہ خون ریزی 1999ء میں ہوئی تھی۔

اس خون ریزی کو Columbine 14 massacre 1999 کا نام دیا گیا ہے۔

اس شدید خون ریزی میں 15 طالب علم موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے جب کہ 24 کے قریب شدید زخمی ہوئے تھے۔

ان میں سے بھی کئی بعد میں مر گئے۔ یہ واقعہ 20 اپریل 1999ء کو کولمبین ہائی اسکول میں پیش آیا تھا۔

گھر والے ایم کے ہاؤس کے حواج اور اس کے غصے کی وجہ سے بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ اس نوجوان کی فطرت میں تیزی اور پورے معاشرے سے نفرت شامل تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا اور گھر کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا کرتا۔ ایک بار اس کی ماں دوپہر کے وقت آرام کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

عام طور پر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ بہر حال اس نے دروازہ

جب ٹرین کو ایک جگہ رکے ہوئے بہت دیر ہو گئی تو کچھ لوگ ڈبوں سے نیچے اتر آئے۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ ٹرین ایسی جگہ پر ہوئی تھی جو رستہ نہیں تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے مخصوص ڈبوں تک گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ڈبے کھلے ہوئے تھے۔

کچھ لوگ انجن روم کی طرف گئے۔ انہوں نے ڈرائیور کو خون میں لٹ پت بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک جگہ اسسٹنٹ بھی زمین پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی تھا جو سیکل کی خریدی دیکھنے اتر تھا۔

ذرا سی دیر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پورے اسٹیٹ کی پولیس کو وارنٹ کر کے بتا دیا گیا کہ ریلوے کی تاریخ کی سب سے بڑی چوری ہو چکی ہے۔

پولیس نے ہر جگہ ٹانکے لگا دیئے۔ پولیس نے ہر اس امکانی راستے کو مسدود کر دیا جہاں وہ بڑا ٹرک گزر سکتا تھا۔ جس ٹرک پر چوری کے خلیے کھل گئے تھے۔

لیکن پولیس کو ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ٹرک تو بہت پہلے جنگلوں میں نہیں پہنچا دیا گیا ہے اور سارے خلیے چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔

ان لوگوں نے فرار کے لیے مختلف راستے اختیار کیے تھے۔

تھیلوں کی تقسیم ایک جگہ رک کر کردی گئی تھی۔ ہر ایک کو اس کا حصہ چکا تھا۔ اس کے بعد مختلف گاڑیوں میں سوار ڈاکوؤں کا یہ قافلہ منتشر ہو گیا تھا۔

دس بارہ گاڑیوں نے کئی راستے اختیار کیے تھے۔ پولیس کے چیف نے بعد میں ایک انٹرویو میں بیان دیا تھا کہ ان لوگوں کی پلاننگ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ انتہائی

شاطر دماغ اس ڈاکے میں ایک ساتھ ہو گئے تھے۔ اس گروہ کی گرفتاری پہلے صرف ایک ممبر کی گرفتاری کے بعد ممکن ہوئی تھی۔

پولیس نے چاروں طرف اپنا جال پھیلا دیا تھا۔ خاص طور پر ان جرائم پیشہ افراد پر بڑی نگاہ رکھی جا رہی تھی جن کے ریکارڈ مجرمانہ تھے جو پہلے بھی اس قسم کی حرکتیں کر چکے تھے۔

پہلے صرف ایک گرفتار ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پھیلا چلا گیا۔ ایک کے بعد دوسرا۔ اس طرح پورے سترہ افراد (جو اس ڈاکے میں ملوث تھے) پکڑ لیے گئے۔

164 میں ایک ٹرائل کے بعد انہیں سزا سنائی گئی۔

کھولا تو اس کا بڑی ٹام غصے میں پھرا ہوا کھڑا تھا۔
وہ پچاس پچھن کی عمر کا ایک خوش مزاج انسان تھا۔
محلے کے لوگ اسے اکل ٹام کہا کرتے تھے اور وہ بھی ان کی
باتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔

”جی اکل ٹام۔“ ایک کی ماں نے پوچھا۔ وہ بھی
اسے اکل ٹام ہی کہا کرتی تھی۔

”ایک کہاں ہے؟“ اکل ٹام نے پوچھا۔

”وہ اس وقت کتبہ باہر گیا ہوا ہے۔“ اس کی ماں
نے بتایا۔ ”خیریت تو ہے نا۔“

”نہیں خیریت نہیں ہے۔“ اس نے میرے بیٹے
سپسن کو مار مار کر بری طرح ڈنکی کر دیا ہے۔ ”اس کو
سنبھالو۔ ورنہ میں شریف کو رپورٹ کر دوں گا۔“

ایک کی ماں کے لیے یہ کوئی نئی شکایت نہیں تھی۔ کچھ
دوں سے ایک کے مزاج میں تشدد اور ضد کا عنصر شامل ہوتا
جارہا تھا۔

اس قسم کے واقعات کی جڑیں بہت گہری اور بہت
جدباتی ہوتی ہیں۔ ایسی کوئی بات ہوتی ہے کہ انسان ہمزک
کر شیطان بن جاتا ہے۔ اس کی جبلت میں جہاں ایک
طرف خیر ہے تو دوسری طرف شر ہے۔

اس کہانی کی ابتداء کچھ یوں ہوتی ہے کہ ایک نے
اپنے گھر میں اپنے کپیٹر میں ایک ویب سائٹ بنائی جس کا
نام اس نے امریکا آن لائن رکھا تھا۔

شروع شروع میں اس میں دلچسپ ویڈیو آڈیو،
مختلف قسم کے کھیل ہوا کرتے تھے۔ کچھ اور نوجوان بھی
امریکا آن لائن میں شامل ہو گئے تھے۔ سب اس کے
مزاج کے نوجوان تھے۔ بلاشبہ کرنے والے لیکن ان سبھوں
میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ سب کے سب ضدی مزاج
کے تھے۔ یعنی دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہونے والے۔
ان نوجوانوں کی صف میں بھی اس قسم کی سرگرمی ہوا
کرتی تھی۔ کسی کی گاڑی کے ٹائر پھاڑ دیئے۔ شیشے توڑ
دیئے۔ کسی کے ہاتھ چاقو زور زور سے مار دیا، وغیرہ۔

شاید ان مشترکہ عادات نے انہیں ایک دوسرے کے
ذہنی طور پر قریب کر دیا تھا اور انہوں نے امریکا آن لائن
جوآن کر لیا تھا۔

کھیلوں کی خبروں اور دل چسپ کہانیوں کے بعد
ایک کے بتائے ہوئے اس سائٹ نے ایک خطرناک درخ
اختیار کر لیا۔

اب اس میں تشدد کے نئے نئے طریقے بتائے جانے
لگے۔ ہم بتانے کی ترکیبیں آنے لگیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس
نے اپنی کچھ جاننے والوں کو دھمکیاں بھی دینی شروع
کر دیں۔

کلیڈ بولڈ نام کے ایک نوجوان نے اپنے ایک دوست
براؤن کو اس سائٹ کے بارے میں بتا دیا کہ ایک نے اس
کے ذریعے اسے اور اس کے گھروالوں کو مارنے کی دھمکیاں
دی ہیں۔

براؤن نے اس کا ذکر اپنے والدین سے کر دیا۔
انہوں نے اپنے طور پر اس سائٹ کو دیکھا اور اس نتیجے پر
پہنچے کہ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ صورت حال بہت
خطرناک ہے اور کسی وقت بھی اس نوجوان ایک کی ذہنی
حالت مزید خراب ہو سکتی ہے اور وہ پورے معاشرے کے
لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ لوگ جفرن کا ذہنی کے شریف کے پاس پہنچ گئے۔
وہاں معاملے کی تحقیق کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر ایک سراغ
رساں گوریا کو مقرر کر دیا گیا۔

گوریا پر تفتیش کے دوران انکشاف ہوا کہ صورت
حال کہیں زیادہ خراب ہے۔ ایک اپنے اسکول کے بہت
سے ساتھیوں کو مارنے کی دھمکی دے چکا ہے۔ ساتھیوں کے
علاوہ اس نے اپنے ٹیچر کو بھی اس قسم کی دھمکیاں دے رکھی
ہیں۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔

اس نے کئی جگہ لکھا تھا کہ وہ سب سے نفرت کرتا
ہے۔ اسے اس معاشرے سے نفرت ہے۔ اگر اس کے بس
میں ہو تو وہ سب کو گولی سے اڑا دے۔

ایک نے یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ اس نے ایک
پاپ بم تیار کر لیا ہے اور کسی بھی دن وہ اس بم کو اپنے
دشمنوں کے خلاف استعمال کرے گا۔ اس کے وہ دشمن اس
کے خیال کے مطابق اس معاشرے کے وہ لوگ تھے جو اسے
پسند نہیں کرتے۔

کچھ دنوں کے بعد ایک نے کلے بولڈ کو بھی اپنے
ساتھ ملا لیا کہ چرچے کے بولٹ اس سے ناراض تھا لیکن اپنی
فطرت میں وہ بھی ایک جیسا ہی تھا۔

ان دونوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی اور اس دوستی
نے تشدد کے نئے نئے رجحان کو جنم دیا۔

دونوں تفریح کے طور پر دہشت اور سنسنی پھیلانے
لگے۔ ان دونوں نے مل کر چھوٹے موٹے جرائم بھی شروع

کر دیے۔

ایک بار وہ دونوں ایک دیکھنے سے سامان چراتے ہوئے پکڑے گئے۔

چونکہ ان کی عمریں زیادہ نہیں تھیں اس لیے دونوں کو ذہن اور نفسیاتی مار کے لیے مختلف اداروں میں بھیج دیا گیا۔

نفسیات کے ماہرین سے لے کر فزیو تھراپسٹ تک۔ حیران تھے کیونکہ ان دونوں نے ان اداروں میں بہت بہتر رویے کا اظہار کیا تھا۔

ان کی کڑی نگرانی بھی کی جاتی رہی اور آخر کار چھ ماہ بعد ان دونوں کی سزا میں ختم کر دی گئیں۔

لیکن انہیں یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اپنے محتاج سے چندہ دونوں میں ایک اور ضرور ملا کر دیں تاکہ وہ ان کی ذاتی پروا کر لیں کا جائزہ لیتا رہے۔

سب کچھ بظاہر ٹھیک ہی ہو گیا تھا۔

ایرک نے اپنی ویب سائٹ بند کر دی۔ کم از کم اس میں سے وہ مواد ہٹا دیا جس میں تشدد کے اور ہم وغیرہ بتانے کے طریقے بتائے جاتے تھے۔

انتانہیں بلکہ ان دونوں نے اس دیکھنے کے بالکل ہی بھی معافی مانگ لی جس دیکھنے سے انہوں نے چوری کی تھی

یعنی بظاہر وہ دونوں اچھے بچوں کی طرح رہنے لگے تھے۔ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے سینوں میں کتنا بڑا طوفان پرورش پا رہا ہے اور وہ دونوں امریکی تاریخ کا ایک

بھیا تک جرم کرنے جا رہے ہیں۔

بہت ہی شیطانی اسٹیم تھی ان کی۔ انہوں نے انتہائی راز داری کے ساتھ آتش گیر اسلحہ جمع کر لیا تھا۔ ان میں

رائفلوں، شاٹ گنز، بارودی مواد اور ہلکے بم بھی تھے۔

آخر کار وہ تاریخ بھی آگئی۔ جب انہیں اپنے اس شیطانی منصوبے پر عمل کرنا تھا۔

وہ تاریخ مئی 20 اپریل 1990 اور منگل کا دن۔ اسکول کے مشرق کی طرف کچھ فاصلے پر ایک میدان

تھا انہوں نے بڑی ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ ایک بم اس میدان میں نصب کروایا۔

دوسری صبح انہوں نے پہلے والے بم کی بالکل مخالف سمت میں ایک اور بم نصب کیا۔ یہ دونوں بم ریوٹ سے

آپرٹ ہوتے تھے۔ ان بموں کو نصب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جگہ جگہ دھماکے کر کے اور آگ لگا کر اسل واردات سے قوجہ ہٹا دی

جائے۔

پولیس اور دوسری گاڑیاں ان دھماکوں کی طرف متوجہ رہیں اور یہ اسکول میں اپنی دشت اور بریت کا کھیل رچا سکیں۔

ساڑھے گیارہ بجے ایرک اور اس کے ساتھی بولڈا اپنی اپنی گاڑیوں پر علیحدہ علیحدہ اسکول کے احاطے میں داخل ہوئے۔

ایرک نے اپنی گاڑی شمالی دروازے کے پاس پارک کی تھی جب کہ بولڈ نے اپنی گاڑی کینے ٹیریا کے پاس گھڑی کی تھی۔

بچے کے وقت کینے ٹیریا میں تین سو کے قریب طالب علم ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کتنے مرتبے ہیں اور کتنے زندہ رہتے ہیں۔

ان دونوں نے اپنی اپنی گاڑیوں میں بم نصب کر دیے تھے جن کے ریوٹ ان کے پاس تھے۔

یہ ان بموں کے ریوٹ تھے۔ جن کو وہ میدانوں میں نصب کر آئے تھے۔ ایرک گاڑی سے اتر کر کینے ٹیریا کی طرف بڑھا اور اچانک اسے اپنا ایک ساتھی براؤن دکھائی دے گیا۔

براؤن نے کئی بار ایرک کی مدد کی تھی اس لیے ایرک کے دل میں اس کے لیے نرم جذبات تھے اور شاید وہی واحد شخص تھا جس کے لیے وہ نرم گوشہ رکھتا تھا۔

ایرک تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور زور سے چلا یا۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ ورنہ بہت برا ہوگا۔“

براؤن نے بعد میں ایک انٹرویو میں بتایا کہ میں ایرک کے دھمکانے پر بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے بھیا تک ہو رہے تھے کہ کچھ کچھ میں

نڈانے کے باوجود میں وہاں سے بھاگ لیا تھا۔ شاید اس کی گھنٹی جس نے اسے خبردار کر دیا ہوگا کہ معاملہ بہت خوفناک ہونے والا ہے۔

ایرک اور بک نے ایک دوسرے کو اشارے کیے اور بم کا ریوٹ ببا دیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تو ریوٹ نے کام نہیں کیا تھا یا پھر بموں میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔

ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

وہ بموں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لے کر آئے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے اپنی اپنی گاڑی کی طرف گئے اور

گاڑیوں میں چھپایا ہوا اسلحہ نکال لیا۔

اس کے بعد وہ مکمل شروع ہوا جو امریکی تاریخ کا بدترین اور خون آشام مکمل تھا۔

دونوں الگ الگ اونچی سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے اور اندھا دھند گولیاں برساتی شروع کر دیں۔

ہر طرف چیخ و پکار، لڑکے لڑکیاں گولیاں کھا کھا کر مر رہے تھے، زخموں پر ہاتھ دھو رہے تھے، دھڑکیاں سن رہے تھے۔ لیکن ان دونوں کو کوئی پروا نہیں تھی، ان کی جہالت کو سکون مل رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں نے دو مختلف مقامات پر نصب ہموں کے ریسیوٹ بھی دبا دیئے تھے۔ دھماکوں نے

پورے علاقے کو لڑا کر رکھ دیا۔ پولیس پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتی پھر رہی تھی۔

بہر حال دس منٹ کے اندر پولیس بھی اسکول پہنچ چکی تھی۔ ان دونوں نے پولیس کو دیکھ کر یہ جان لیا تھا کہ ان کا مکمل ختم ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں اس بات کا

اطمینان تھا کہ انہیں جو ایڈیوڈیج کرنا تھا وہ کر چکے ہیں۔ اب انہیں گرفتار نہیں ہونا تھا اس لیے دونوں نے

خودکشی کر لی۔ اس طرح اس خودی مکمل کا خاتمہ ہوا۔ ماہرین نفسیات دیکھ بھج کرتے رہے کہ آخر کیوں

نوجوانوں میں تشدد کا یہ رجحان آ رہا ہے۔ اس کی بے شمار وجوہات سامنے آتی گئیں۔

1- اولاد کی طرف سے والدین کی پروردائی۔

2- ماں اور باپ کے درمیان تلخی۔

3- ویڈیو گیمز۔

4- ماروٹاؤ کی فلمیں۔

5- جھان بربا کرنے والی موسیقی۔

6- حد سے زیادہ آزادی۔

7- اسکول کا محول وغیرہ اور سب سے بڑھ کر خود ان کی مجرمانہ فطرت۔

صدی کے اس بڑے جرم کے بعد ہم ایک اور جرم کی طرف آتے ہیں اسے The So of Sam دیا گیا ہے۔

وہ ایک خستہ حال قدیم مکان تھا۔ اس مکان میں ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ اس مکان باجوہ کی کیسٹ ایسی تھی جیسے قدیم کسی محل یا قلعے کے کھنڈری ہوئی ہے۔

اس کی کچھ دیواریں گر چکی تھیں جو دیواریں مرنے سے محفوظ رہ گئی تھیں۔ ان کی جڑوں کے پاس چٹکی خادوار

پودے لگ آئے تھے۔

اس دیران مکان کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ بس ایک کہانیاں۔

کوئی یہ کہتا تھا کہ اس اجاڑ مکان میں بدروحیں رہتی ہیں۔ کسی کا یہ کہنا تھا کہ یہ مکان شیطان کے پجاریوں کا مرکز ہے۔ شیطان کے پجاری یہاں جمع ہو کر الاؤ کی روشنی میں

شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ علاقہ نیویارک کے بروک لین کا تھا۔

اس رات بارش..... ہو رہی تھی۔ جس رات ڈیوڈ بر کوڈیٹر اپنے جیسے کچھ ساتھیوں کو لے کر الاؤ کے پاس بیٹھا

ہوا تھا۔ باہر ہوا نہیں تین کرتی پھر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹکڑوں درجوں کو فوج خانی کر رہی ہوں۔

ڈیوڈ نے کارروائی کا آغاز کر دیا۔ یہ کارروائی کیا تھی۔ شیطان کو خوش کرنے کے لیے کچھ بول تھے۔ ڈیوڈ کو یہ بول

ایک پراسرار شخص نے سکھائے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ڈیوڈ ان یوں کو اندھیرے راستے میں الاؤ جلا کر دھراتا

رہے تو شیطان مہربان ہو کر اس کو اتنی طاقت دے دے گا کہ کسی نے ایسی طاقت کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

کچھ دیر کی پوجا کے بعد ڈیوڈ نے اعلان کیا کہ شیطان کی روح اس میں حلول کر آئی ہے اور وہ یہ کہہ رہی ہے کہ اگر

اسے دولت اور طاقت چاہیے تو قربانی دینی ہوگی۔ تازہ تازہ خون کی، انسانوں کی۔

الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ ایک ٹرانس کی کیفیت میں اس کی باتیں سنتے رہے۔ اپنے شیطان سے ہدایت

لینے کے بعد ڈیوڈ واقعی شیطان بن گیا۔ کہانی وہاں سے شروع نہیں ہوتی، جہاں سے وہ

سامنے آتی ہے بلکہ اس قسم کی یہ کہانی کی جڑیں گہنی دور ماضی میں ہوتی ہیں۔

محرورمیاں، ناگامیاں، مزاج کا چڑچا پن، خد، غصہ، یہ سب مل کر کسی بھی شخص کو انسان سے شیطان بنا دیتے

ہیں۔ ڈیوڈ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

وہ ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا، اس کی پیدائش بروک لین نیویارک میں ہوئی تھی۔ اس کے والدین کے

ابتدائی ایام بہت غربت زدہ تھے۔ روایت کے مطابق اس کا نام یہودی شجرے پر رکھا

ہتول جھین لیا تھا۔

اس واقعے کے بعد ڈیوڈ کے باپ نے اپنا ہتول بہت احتیاط سے چھپا کر رکھنا شروع کر دیا تھا۔ ویسے تو اس کے بعد ڈیوڈ نے بھی کوئی ایسی خطرناک حرکت نہیں کی تھی لیکن دونوں میاں بیوی اس کی طرف سے پریشان رہنے لگے تھے۔

ڈیوڈ کے حراج میں تشدد کا عنصر پروان چڑھنے لگا تھا۔ اس کے سوتیلے باپ نے اپنی کن اب اس سے چھپا کر رکھی شروع کر دی تھی۔

ڈیوڈ نے اپنے ایک دوست سے پوچھا۔ ”کیا تم میرے لیے کسی کن کا بندوبست کر سکتے ہو؟“

”کیا کرنا ہے کن کا؟“

”بس یوں ہی۔ مجھے اپنی حفاظت کے لیے کن کی ضرورت ہے۔“ ڈیوڈ نے بہانہ بنا دیا تھا۔

دو دھاری دونوں کے بعد اس کے دوست نے آری ہے 44 کلبر کی کن لا کر اس کو دے دی تھی۔

1970ء کے آغاز ہی سے ڈیوڈ نے اپنے جرائم کا آغاز کر دیا تھا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی کن نہیں تھی۔ وہ چاقو سے کام لیتا تھا۔

اس بے چارے انجینی کی شامت ہی آگئی جب وہ ایک ایسی گلی سے گزر رہا تھا جہاں اس وقت سناٹا تھا۔ وہ جیسے ہی ایک جنرل اسٹور عبور کر کے گلی کے موڑ پر پہنچا اس پر چاقو سے حملہ کر دیا گیا۔

اس کی قسمت اچھی تھی کہ چاقو کی تیز دھار اس کے شانے کو ادھیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس پر یہ حملہ ڈیوڈ ہی نے کیا تھا۔

ڈیوڈ نے بعد میں اپنے ایک دوست کو بتایا۔ ”یاد رہے ڈیوڈ نے بعد میں کام پورا نہیں ہو سکا۔ میرے پاس صرف چاقو تھا۔ اگر کوئی کن ہوتی تو ساری گولیاں اس کے بدن میں اتار دیتا۔“

”لیکن کیوں بار! اس آدمی نے تمہارا کیا لگاڑا تھا؟“

”لگاڑا تو کچھ نہیں تھا لیکن یہ شیطان کی خواہش تھی اور تم جانے ہو کہ میں شیطان کی ہر بات ماننے کے لیے مجبور

کیا تھا۔ بہت پریشان کر دینے والے روز و شب تھے۔ اس کا باپ ایک ناکارہ قسم کا شرابی انسان تھا۔ (میں نے اس قسم کی جتنی کہانیاں پڑھیں یا سنی ہیں ان میں جرم کرنے والے یا تباہ ہونے والے اور ناکارہ قسم کے لوگوں میں ایک عنصر مشترک طور پر پایا جاتا ہے اور وہ ہے شراب۔ وہ سب شراب نوشی کیا کرتے اور شراب کے نشے میں الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شراب واقعی ام التباہ ہے)

بہر حال ہوا یہ کہ اس کا باپ اسے اس وقت چھوڑ کر فرار ہو گیا جب وہ بہت چھوٹا تھا لیکن اس کی ماں کو اس کی پروا کس لیے نہیں تھی کہ اس نے حفظ اقدم کے طور پر اپنا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس کے تعلقات کسی اور شخص سے استوار ہو گئے تھے اس لیے ڈیوڈ کے باپ کے بھاگ جانے کے بعد وہ اس آدمی کے پاس چلی گئی تھی۔ اس نے ڈیوڈ کو اداروں کے حوالے کر دیا تھا۔

ڈیوڈ کی پرورش ایک یہودی خاندان نے کی۔ وہ ایک سیدھا سادا خاندان تھا جس کا پرنس ہارڈویز کا تھا۔ اس گھر سے ڈیوڈ کے جوہر نکلتے چلے گئے۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا، اس کے حراج کی پیچیدگی سامنے آتی چلی گئیں۔

اس کی ابتدا شاید اس وقت ہوتی ہے جب وہ صرف آٹھ برس کا تھا۔ اس نے ایک دن میز کی دروازے سے اپنے باپ کا ہتول نکال کر بلاوجہ گولیاں چلائی شروع کر دی تھیں۔

دونوں میاں بیوی اس وقت کچن میں کھانا کھا رہے تھے۔ جب انہوں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تو دونوں ہولکھار کر دوڑے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔

ہتول ڈیوڈ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی آرائشی اشیاء کو نشانہ بناتا کر انہیں برباد کیے جا رہا تھا۔

پورے کمرے میں ان چیزوں کے ٹکڑے پھرتے ہوئے تھے۔

”ڈیوڈ رک جاؤ۔“ اس کا باپ چلتا یا (میں یہاں اس کے پریش کرنے والے ہی کو اس کا باپ کہہ رہا ہوں) یہ کیا کر رہے ہو، روکھ دو ہتول۔“

”مرہ آ رہا ہے بابا۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”گولیوں کی آوازیں کتنی گونج رہی ہیں۔“

اس وقت اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اس سے

ہوں۔“

پولیس اس شخص کو ڈنکی کرنے والے کو تلاش کرتی رہی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ڈیوڈ کی ہوشیاری یہ بھی کہ وہ ہر واردات کے بعد اپنی نازل زندگی کی طرف لوٹ آتا۔ کسی کو احساس تک نہیں ہونے دیتا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔

وہ اپنے گھر میں نازل ہو گیا تھا۔ اس کے والدین اس کی کونسلنگ کر رہے تھے اور ان کی رپورٹ یہ بھی کہ ڈیوڈ آہستہ آہستہ بالکل ٹھیک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے مزاج میں جو تشدد کا رجحان پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو رہا ہے اس لیے اس پر کوئی شک بھی نہیں تھا۔

پہلی واردات کے بعد وہ دو مہینوں تک بالکل خاموش رہا۔

پھر اسے ایک ٹارگٹ مل ہی گیا۔ وہ محبت کرنے والا جوڑا تھا۔ ایک پارک کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

دونوں جوان تھے لڑکی کے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ خوب صورت مگر گھبرائے بال تھے۔

نہ جانے کیا تھا کہ ڈیوڈ جب بھی ایسی لڑکی کو دیکھتا جس کے بال سیاہ اور گھنگھریالے ہوں اس کے وجود میں ایک آگ سی لگ جاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ایسی لڑکی کو تڑپا کر مار دے۔

لیکن اس وقت تڑپا کر مارنے کا موقع نہیں تھا۔

اس کے پاس کن آچکی تھی۔ وہ اچانک پودوں اور جھاڑیوں کی آڈ سے نکل کر ان دونوں کے سامنے آ گیا۔ ان دونوں نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن کچھ سمجھ نہیں سکے اور جب تک بھینے کے قابل ہوئے، اس وقت تک ڈیوڈ نے ان پر گولیاں برساتی شروع کر دی تھیں۔

لڑکا تو اس وقت چپاں بچن ہو گیا تھا جب کہ وہ لڑکی اسپتال جا کر مر رہی تھی۔ ڈیوڈ سوشل واردات سے فوری طور پر غائب ہو گیا تھا۔

مرنے سے پہلے اس لڑکی نے پولیس کو ڈیوڈ کا حلیہ بتا دیا تھا لیکن پراہم یہ بھی کہ نیویارک میں اس حلیے کے ہزاروں نوجوان گھوم رہے تھے۔ وہ بے چاری سوائے قد اور جسامت کے اور کچھ نہیں بتا سکی تھی۔

ڈیوڈ نے اس واردات کے بعد پہلی بار اپنا نام سن آف سام رکھا تھا۔

اس کا ایک ساتھی بیمار پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو خط تحریر کیا اس تحریر میں اس کے ارادے پوری طرح ظاہر ہو گئے تھے۔ اس نے لکھا تھا۔ ”میرے دوست یہ جو زندگی ہے نا، یہ تھوڑے دنوں کی ہوتی ہے لیکن جس کو شیطان اپنا دوست بنالے اس کی زندگی طویل بھی ہو جاتی ہے اور پیش سے بھی گزرتی ہے۔ مجھے شیطان نے اپنا دوست بنالیا ہے اس لیے وہ مجھے مواقع فراہم کرتا رہتا ہے کہ میں اس کے سامنے من پسند قربانیاں پیش کر سکوں اور جانتے ہو وہ من پسند قربانیاں کیا ہوتی ہیں۔ خوف، جحان اور خوب صورت تازہ جسموں کا خون۔ خاص طور پر لڑکیوں کا۔ میں اس سفر پر چل پڑا ہوں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تمہارا دوست سن آف سام۔ ہاں اس پر حیران مت ہو میں نے اپنا نام سن آف سام رکھ لیا ہے۔“

سوال یہ ہے کہ اس دوست نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں کہ اس کے دوست ڈیوڈ نے اسے ایسا خط لکھا ہے جس میں اس کے خطرناک ذہن کا پتا چل رہا ہے۔

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دوست خود بھی اسی مزاج کا تھا۔ اسی لیے ڈیوڈ نے اس کی دوستی ہوئی تھی۔

اس مرنے والی لڑکی نے جو حلیہ بتایا تھا اس حلیے کی تصدیق ایک ایسے آدمی نے بھی کر دی جس نے ڈیوڈ کو تیزی سے ایک طرف جاتے اور گاڑی میں بیٹھنے ہوئے دیکھا تھا۔

اس نے بتایا۔ ”ہاں میں نے اس حلیے کے آدمی کو تیزی کے ساتھ گاڑی کی طرف جاتے اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”کیا تم اس گاڑی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”نہیں مجھی صرف اتنا بتا سکا ہوں کہ وہ کالے رنگ کی تھی۔“

اب کیسے تلاش کیا جاتا۔ نیویارک میں کالے رنگ کی لاکھوں گاڑیاں ہیں۔

بروک لین کے علاقے میں ٹرا نام کی ایک لڑکی رہا کرتی تھی۔ انہیں بیس برس کی۔ بہت خوب صورت، اس کے بال سیاہ تھے۔ جسم چمک رہا تھا، ایک صبح اس نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک لفافہ پڑا ہوا پایا۔

اس لفافے پر ٹرا کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس لفافے میں لڑا کے لیے ایک خط تھا جس میں لکھا تھا۔ ”تم بہت خوب صورت ہو اور تمہاری بھی خوب صورتی تمہاری موت ہے۔ تمہارا نجات دہندہ سن آف سام۔“

آگاہی ہوئی تھی۔

پولیس نے چاروں طرف اپنے آدمیوں کا جال پھیلا دیا۔

بالآخر وہی گاڑی نیویارک سے کچھ فاصلے پر ایک کھنڈر نما مکان کے سامنے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔

اس وقت اس گاڑی میں کوئی نہیں تھا۔ اس کا ڈرائیور شاید اس کھنڈر کے اندر چلا گیا تھا۔

مائیک (پولیس کا آدمی) نے وائریس کے ذریعے پیغام دے کر دوسرے پولیس والوں کو بھی طلب کر لیا۔

اس کھنڈر کے سامنے کچھ اور گاڑیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کچھ اور لوگ بھی اس وقت اندر موجود ہیں۔

کچھ دیر میں پولیس کے کچھ لوگ پہنچ چکے تھے۔ ڈیوڈ کی گاڑی کی تلاش لی تو اس کے اندر سے کچھ چیزیں نکلیں۔

ایک رائفل بھی تھی۔ ایک بڑے سے تھیلے میں گولیاں اور کچھ بارودی مواد بھی تھا۔ ان کے علاوہ ایک خط بھی تھا جو ماریہ نام کی کسی لڑکی کو بھیجا جانے والا تھا اور اس خط میں وہی لکھا تھا تمہارا بچاؤ دہندہ سن آف سام۔

پولیس جب کھنڈر کے اندر داخل ہوئی تو اس وقت ایک کمرے میں ملاؤ روشن تھا اور کچھ لوگ اس الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے شیطان کی پوجا کر رہے تھے۔

شیطان کی ایک بڑی تصویر کے علاوہ کچھ کتابیں بھی تھیں جو جادوؤں کی تھیں۔

پولیس نے پہلے بول کر سب کو گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاری 10 اگست 1977ء کو ہوئی تھی۔ دوسرے دن ڈیوڈ نے اعتراف کر لیا کہ میرا ہی نام سن آف سام ہے اور وہ اب تک گیاہ لڑکیوں اور تین مردوں کو مار چکا ہے۔

اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر کسی نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو شیطان اس کا بدلہ لے گا۔

لیکن اس دھمکی کے باوجود عدالت نے اسے سچے بار عمر قید کی سزا سنائی۔ یعنی ایک طویل عرصے کی سزا۔

اس طرح یہ کہانی اختتام کو پہنچی لیکن کیا یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ ایسے دشمنوں اور

جنوں سے پاک ہو چکا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک معصوم لڑکی کے ساتھ جنسی زیادتی اور تشدد کر کے اس کو قتل کر دیتے ہیں۔

اس نے پولیس کو اس گاڑی کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ پولیس کو پہلی بار اس قاتل کے بارے میں کچھ

لڑا اس خط کو پا کر بہت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے پولیس کے پاس جا کر وہ خط دکھادیا۔ پولیس نے اس خط کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

پولیس والے اس خط کے معاملے میں اس لیے بھی سنجیدہ ہو گئے تھے کہ کچھ دنوں پہلے ہی ایک پارک میں ایک جوڑا قتل ہو چکا تھا۔

بہت ممکن تھا کہ اس خط کا تعلق بھی اسی کیس سے بنا ہو۔ پولیس نے لڑا کو احتیاط رہنے کی ہدایات کر دی تھیں۔

لیکن ایک ہفتہ بعد ہی اس لڑکی کو بھی اسی طرح گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ لڑا شاپنگ سینٹر سے نکل کر پارکنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی کہ اس پر گولیاں برسادی گئیں۔ وہ

موقع پر ہی ہلاک ہو گئی تھی لیکن وہ جنونی قاتل سن آف سام ابھی تک ہاتھ نہیں آسکا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد درجنیہ نام کی ایک اور لڑکی کو اس قسم کا ایک خط موصول ہوا، لکھنے والے نے اپنا نام نجیات دہندہ سن آف سام لکھا تھا۔

پولیس کے تجربے کے مطابق دونوں خطوں میں گہری مماثلت تھی۔ جملوں کی ساخت بھی وہی تھی اور نام بھی وہی تھا۔ سن آف سام۔

اب اس نام کی شہرت ہونے لگی تھی۔ ریڈیو اور اخبارات نے چیخا شروع کر دیا تھا کہ نیویارک میں سن آف سام نام کا ایک درندہ لڑکیوں کا قتل کرتا پھر رہا ہے۔

لڑکیوں کو احتیاط رہنے کی تاکید کی جا رہی تھی۔ ان سے کہا جا رہا تھا کہ وہ خاص طور پر اندھیرے کے بعد باہر نکلنے سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ انسان جگہوں پر نہ جائیں۔ چاہے وہ کوئی پارک ہو یا کوئی راستہ ہو۔

لیکن ڈیوڈ کی اس قسم کی سفاکانہ وارداتوں کا سلسلہ رک نہیں سکا۔ بالآخر اس نے ایک دن ایک راہ چلتی لڑکی پر فائر کھول دیا۔

اس کی بد قسمتی یا لڑکی کی خوش قسمتی کہ اس کا نشانہ خطا گیا۔ وہ لڑکی دوڑتی ہوئی قریبی عمارت کے کپڑوں میں ٹکس گئی۔ ڈیوڈ اس وقت اپنی گاڑی میں تھا۔

اس لڑکی نے اپنے اوسان کو قابو میں رکھتے ہوئے ڈیوڈ کی گاڑی کا نمبر، اس کا رنگ اور اس کا حیلہ وغیرہ ذہن نشین کر لیا تھا۔

اس نے پولیس کو اس گاڑی کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ پولیس کو پہلی بار اس قاتل کے بارے میں کچھ





فلم نگری

انور فرہاں

پاکستان کی فلمی صنعت صفر سے شروع ہوئی تھی لیکن اس صنعت کو تجربے کار ہنرمندوں نے اوج پر پہنچا دیا۔ کڑی محنت سے سنووارا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ محدود وسائل کے باوجود نئے نئے لوگوں کو سامنے لایا گیا۔ نہ صرف اداکاری میں بلکہ ہر شعبہ میں ایسے ایسے لوگ سامنے آئے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ گلوکاری سب سے منفرد شعبہ ہے کیونکہ گلوکاری قدرت کا عطیہ ہے۔ ہر ایک کے گلے میں سوز پیدا نہیں ہوتا، اس کے گلے میں بھی سوز تھا تبھی تو وہ فرش سے اٹھ کر عرش پر جا پہنچی۔

پاکستان کی ایک معروف گلوکارہ کی مختصر داستان

صرف شاہ نور اسٹوڈیو میں بننے والی فلم میں کام کریں گی بلکہ دیگر نگار خانوں میں بھی جا کر شٹل کریں گی۔ انہی دنوں انہوں نے ایک فلم سائن کی جس کا نام ”سہاگ“ تھا۔ وہ اس فلم کی ہیروئن بھی تھیں اور گلوکارہ بھی۔ اس فلم کا افتتاح ان ہی کے ایک گانے کی ریکارڈنگ سے ہوا۔ اس گیت کی دھن موسیقار مہاں شریار نے کمپوز کی تھی۔ بطور موسیقار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ ”سہاگ“ کی افتتاحی تقریب میں جو گانا صدائیں بند کیا گیا اس کے بول تھے۔ دل میں تمہیں بسا کے بھی اپنا نہ ہم بنا سکے تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے جنوری 2019ء

اللہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ یہ اللہ کی کتاب میں لکھا ہے اور اسے ہم اور آپ اکثر دیکھتے ہیں، ایسے کی واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے اللہ رب العزت کی کبھی ہوئی بات حقیقت کے روپ میں نظر آتی ہے۔ آج میں بھی آپ کو ایک ایسے ہی واقعے کی روداد سننا کر آپ کی توجہ اپنی جانب کروں گا۔ یادش بخیر یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملکہ ترنم، مادام نور جہاں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ صرف اسی فلم میں گانے گائیں گی جن میں وہ ہیروئن کا کردار ادا کریں گی۔ یہ 1953ء کی بات ہے۔ البتہ انہوں نے اس بات کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ ماہنامہ میسرگوشیت

انہوں نے اس قلم نش کی تجربے کیے۔ انہوں نے ایک کلاسیکل گانا گلوکارہ زماہہ پروین سے گویا۔ جو ان کے خیال میں زماہہ پروین کے علاوہ اور کوئی گلوکارہ نہیں کا سکتی تھی۔ اس گیت کے بول تھے۔ ”نہیں میں مجر آئے۔“

اس قلم کے لیے انہوں نے ایک گیت بنی گلوکارہ مسز جہاں آراء جہون کی آواز میں بھی صدا بند کیا۔ جہاں آراء جہون ایک شوقیہ گلوکارہ تھیں جن کی آواز بھاری تھی۔ وہ ایک مقامی کانچ میں پیکچر اڑھیں۔ یہ گانا ریکارڈ تو ہو گیا اور اسے فلم بند بھی کر لیا مگر مہیاں شہریار کو اس گانے میں کچھ مزہ نہیں آیا۔ وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے قلم ساز سے کہا۔ ”کاشی صاحب! میں یہ گانا دوبارہ صدا بند کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا اسی پیکچر خاتون سے دوبارہ؟“

”نہیں کاشی صاحب اس سے نہیں کسی اور سے۔“

”اب کس سے گواہیں گے؟“

”لاہور یونیورسٹی کے گانے والی ایک لڑکی سے۔“

”کیا آپ اسے جانتے ہیں؟“

”جی ہاں، جب میں ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک تھا تو اسے گانے ہوئے سنا ہے۔ بہت اچھی آواز ہے اس کی اور اب تو وہ کونسلر قلمی کانول میں بھی حصہ لینے لگی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اسے بلائیے اور ہمیں بھی اس کی آواز سنائیے۔“

یوں مہیاں شہریار نے عذرا نسیم کو بلایا اور اس سے دو تین گانے سنے جو عاشور کا قلمی کو بھی اچھے لگے۔

”عذرا نسیم! ہم تم سے اپنی قلم ”بے گناہ“ کے لیے تمہاری آواز میں گانا صدا بند کروانا چاہتے ہیں۔“ مہیاں شہریار نے کہا۔ ”گاؤ کی؟“

”مردو گاؤں کی۔ تو میرے لیے۔“

”کورس گانے کب تک گاتی رہو گی؟ اب اس کیلے بھی گاؤ۔“

”آپ کی رہنمائی چاہیے۔“

اور پھر وہ وقت آ گیا جب اس نئی گلوکارہ سے جہاں آراء جہون کا گایا ہوا گیت دوبارہ ریکارڈ کرایا گیا۔ جس کے بول تھے۔

نہیں میں مجر آئے

مورکھ میں تڑپائے

روٹھ گیا مور پیار

گانے کی صدا بندی کے وقت میڈم نور جہاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر جیسے جیسے گانا آگے بڑھتا گیا ان کے جذبات اسی قدر مشتعل ہوتے گئے اور پھر وہ بے اختیار رونے لگیں۔ تقریب میں موجود کچھ لوگوں نے تو یہ سمجھا کہ مادام حساس دل کی مالک ہیں اس لیے گانے میں بیان کیے گئے تاثرات نے انہیں رلا دیا ہے لیکن جو قلم والے ان کی نجی زندگی اور موجودہ حالات سے واقف تھے وہ سمجھ گئے کہ وہیں بات پر آبدیدہ ہوئی ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ ان دنوں ملکہ ترم اور سید شوکت حسین رضوی کے تعلقات کشیدگی کے فکار ہو چکے تھے۔ دونوں مہیاں بیوی میں بڑی حد تک کھچاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ سید صاحب اب ان سے دور دور رہنے لگے تھے۔

تذکرہ گیت کے علاوہ اس قلم کے مزید دو گانے بھی میڈم نے ریکارڈ کروا دیئے اور ”سہاگ“ کی شوٹنگ کا آغاز بھی ہو گیا۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک ٹھاک چلا پھر آگے چل کر مادام کسی معمولی سی بات پر مہیاں شہریار سے ناراض ہو گئیں اور ایسی ناراض ہوئیں کہ انہوں نے مہیاں شہریار کو اس قلم سے فارغ کروا دیا۔

ایک طرف ملکہ ترم تھیں اور دوسری طرف بے جاہرہ ایک نیا ٹیلا موسیقار، قلم ساز کے لیے بے پڑے امتحان کا وقت تھا۔ اس کے علاوہ یونٹ کے دوسرے لوگ بھی مہیاں شہریار کے کام سے خوش تھے۔ ان سے کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی مگر مادام پھند تھیں کہ ”اس موئے قلم سے کٹ کرو، ورنہ۔“

اگر وہ ان کا حکم نہ ماننے تو وہ خود ان کی قلم سے علیحدہ ہو جانے کی دھمکی دیتیں۔ لہذا بادل غواستہ انہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ ملکہ معظمہ کا حکم ماننا پڑا۔ مہیاں شہریار کو یہ بات بہت بری لگی۔ کتنی بھی چاہیے تھی۔ انہوں نے اس وقت تو خون کا گھونٹ لی لیا لیکن یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس توہن کا بدلہ ضرور لیں گے۔

”تمہیں اس بات پر پڑا آخر ہے تاکہ مجھ جیسا کوئی اور نہیں۔ میں ایک نئی نور جہاں پیدا کر کے تمہارے غرور کا سر ایک دن نچا کر دوں گا انشاء اللہ۔“

اور پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ”سہاگ“ کی ٹیم سے فارغ ہونے کے بعد جلد ہی انہیں (مہیاں شہریار کو) ایک نئی قلم مل گئی۔ یہ قلم ساز عاشور کا قلمی کی قلم ”بے گناہ“ تھی۔ مہیاں شہریار نے موسیقار سے مگر بہت باصلاحیت تھے۔

برکھا کی انٹی من کھلائے

مجھ دکھیا کوئیندہ آئے

سویا ہے سب سنہار

روکھ گیا موراپار

آشای آشا میں موری جیون جیتی جانے

میں باری اور ساجن جیتے

نیازی منجھ حار

روکھ گیا موراپار

دوستو! ان دنوں آج کی طرح ریکارڈنگ کا نظام

نہیں تھا۔ آج کل تو یہ سہولت ہے کہ گانا صدا بند کر کے رکھ

لیں۔ جب چاہیں اسے آرڈسٹ پرکس بند کر لیں۔ اس دور

میں ایسا نہیں تھا۔ نئی گلوکارہ کو دو تین ریہرسلوں کے بعد پہلے

یہ گانا ہزاروں بار اس گہنی میں صدا بند کیا گیا اور جس نے بھی

اسے سنا دو دوسرے بغیر نہیں رہا۔ سب نے کہا۔ ”یہ آواز تو نور

جہاں سے مشابہ ہے۔“

اس گانے کی صدا بندی کے بعد وہاں موجود تمام

لوگوں نے نئی گلوکارہ کو مبارکباد دی اور بے چاری عذرا نسیم

عجز و اکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی رہی۔ ”ارے

نہیں۔“

”کہاں میں کہاں ملکہ ترنم۔“

”مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

ایک طرف پہلی بار کسی ظم کے لیے گانے والی گلوکارہ

کی یہ کیفیت۔ دوسری طرف میاں شہریار کے دل میں لہو

پھوٹ رہے تھے۔ ”مجھے جس نئی نور جہاں کی تلاش تھی

میرے سب نے مجھے ملا دی ہے۔“

تیسری طرف قلم ساز عاشق کاشمی جو اس گیت کے

شاعر بھی تھے۔ اس نئی گلوکارہ کی پرفارمنس سے بے حد خوش

تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا تحریر کردہ یہ گیت، اس گلوکارہ کی

آواز میں ضرور ہٹ ہوگا۔

اب یہ گانا دو بارہ ایورینو اسٹوڈیو میں ریکارڈ کرنے

کی باری تھی چونکہ موسیقار شہریار ہر لحاظ سے مطمئن تھے

چنانچہ انہوں نے کارخانے میں صدا بندی کے موقع پر نئی

گلوکاروں کی تعارفی تقریب کا بھی پروے پانے پر اہتمام

کیا۔ بہت سے مہمانوں کو مدعو کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ

سے زیادہ لوگوں کو بتا سکیں کہ انہوں نے ظم اعظمی کو ایک

نئی نور جہاں دی ہے۔

اس گیت کی ریکارڈنگ کے بعد میاں شہریار نے نئی

زندگی نامہ

خاندانی نام: عذرا نسیم۔

قلمی نام: نسیم بیک۔

ولادت: امرتسر (بھارتی پنجاب)۔

تاریخ پیدائش: 24 فروری 1936ء۔

والدہ: بدھاں بائی۔

پرورش و تعلیم: بھارتیگیم (اہلیہ آقا حشر کاشمیری)

استاد: فخر موسیقی کے پہلے استاد عاشق علی خان،

دوسری استانی عتی بیک۔

قلمی کیریئر کا آغاز: ریڈیو پاکستان لاہور سے

بطور گلوکارہ کیا۔ سال 1950ء کا تھا اور ان کی عمر اس

وقت صرف 14 سال تھی

قلمی دنیا سے وابستگی: 1955ء سے کورس

گیتوں میں بطور سائی گلوکارہ۔ پہلا کورس کا ظم گنار کا

تھا۔ باہا چچی نے اپنی ظم گندی گڈا میں پہلی بار گانے کا

موقع دیا۔ اس کے بعد شہریار نے باضابطہ سولو گیت

ریکارڈ کرانے شروع کر دیئے۔

قلموں کی تعداد: سو سے زائد۔

گانوں کی تعداد: 400 سے زائد۔

شوہر: دین محمد (لاہور کے معروف پبلشر)۔

اولاد: چھ بچے۔

انتقال پر طحال: مجھے بچہ کی زندگی کے ایک بچے

بعد دماغ کی شریان پھٹنے سے ہوئی۔

تاریخ وفات: 29 ستمبر 1971ء بمقام لاہور۔

گلوکارہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بات کی

خوشی ہے کہ میں اپنی ظم ”بے گناہ“ کے اس گیت کے حوالے

سے پاکستانی قلمی صنعت کو ایک انمول آواز کا تحفہ پیش کر رہا

ہوں۔ آپ لوگوں کو یقیناً اعزاز ہو گیا ہوگا کہ یہ آواز صرف

اول کی گلوکاراؤں کی آواز سے کم نہیں۔“

”بھئی..... بھئی۔“

”ارے صاحب یہ تو نور جہاں غانی ہے۔“

”بلاشبہ یہ ایک خوب صورت آواز ہے۔“

یہ اور ایسے ہی تعریفی کلمات قلمی پڑتوں نے اس نئی

گلوکارہ کے بارے میں کہے۔

میاں شہریار نے جو اس وقت بے حد خوش تھے اس نئی

جنوری 2019ء

75

ملہنامہ مسرگوشٹ

Digitized by Google

انہونی

نسیم بیگم کا ایک گانا آواز کار رینگلا پر بھی عکس بند ہوا ہے۔ چوکے مت کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عورت کا گایا ہوا گیت مرد پر کیسے قلمبیا جاسکتا ہے؟ مانتا ہوں، مانتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا۔ قلم بھی ”عالم طائی“ اس کے ایک منظر میں دکھایا گیا ہے کہ جادو کے زور سے رینگلا کی جن تبدیلیں ہو جاتی ہے اور وہ مرد سے عورت بن جاتا ہے۔ عورت کے روپ میں اس پر جو گیت قلمبیا جاتا ہے اسے نسیم بیگم نے گایا تھا جس کے بول تھے

میں حسین ہوں اکیلی ہزار میں
دیکھو چیر و نہ بچھو کو بازار میں
دوستو! یہ قلم والے بھی بڑے عجیب ہوتے
ہیں اپنی فلموں میں انہونی کو بھی ہونی بنا دیتے ہیں۔

اگرچہ ”بے گناہ“ نسیم بیگم کی آواز کو شناخت مل گئی تھی لیکن اگلے برس 1959ء کی پہرہٹ پنجابی فلم ”مکرتار سنگھ“ کے مقبول عام گیت ”دیاں دارا جا میرے باہل دا پیارا“ نے ان کی مقبولیت کو عام مرد و عورت پر پہنچا دیا۔ یہ گیت شادی بیاہ کے موقعوں پر آج بھی خاص طور پر گایا جاتا ہے اور بینڈ باجے والے بھی اس کی دھن بجاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس گیت کی شہرت کی وجہ سے 1999ء میں بننے والی فلم ”دیاں دارا جا“ میں من و عن نسیم بیگم ہی کی آواز میں یہ مکمل طور پر شامل کیا گیا۔ دیاں دارا جا ہدایت کار پرویز رانا کی پنجابی فلم تھی۔ پرویز رانا نے اس گیت کی کچھ انٹرنیشنل فرزانہ نسیم پر کی تھی۔ فرزانہ اداکارہ شامی کی بڑی بہن ہیں۔ فرزانہ نے اس فلم میں شان کی بہن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کا واقعہ 1993ء میں بھی ہوا۔ جب قلم ”مسودا گز“ میں نسیم بیگم کا گایا ہوا فلم ”ناور دھن“ کا نغمہ ”اے راہ حق کے شہید و وفا کی تصویر“ شامل کیا گیا۔ اگرچہ اسے نئے منکر سے بھی گویا جاسکتا تھا مگر اس میں نسیم بیگم جیسی آواز کا تاثر پیدا ہونے کا امکان کم تھا اس لیے قلم کی ڈیمانڈ کے مطابق نسیم بیگم سے ہی گویا گیا۔

نسیم بیگم مشکل سے مشکل دھن میں اپنی گائیکی کا بھرپور تاثر قائم کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے فلمی کیریئر کے ابتدائی برسوں ہی میں اپنی صلاحیتوں کا مکمل جھانک دیا تھا۔ ان کے گائے ہوئے کئی کلاسیکل نغمات کو اہل ذوق نے سراہا۔

قلم ”عزم“ کے لیے ریکارڈ کروائی لیکن افسوس کہ یہ قلم نہیں بن سکی۔ اسی دوران 1954ء کی فلم ”دکھنام“ کے ایک کورس گیت میں نسیم بیگم کو گلوکارہ کوثر پروین کی لیڈ میں ہموائی کا چانس ملا جس کے بول کچھ یوں تھے

بچم جھما جھما ناچ اٹھا تک میرا
نسیمی کرکھ تک بن مٹن کے

اس کورس میں آئرن پروین کی آواز بھی شامل تھی۔ یہ وہ دور تھا جب نسیم بیگم، نسیم بیگم نہیں بنی تھیں۔ ریلو پر گانے والی عذرا نسیم تھیں۔ انہی دنوں میاں شہریار کی میڈیم نور جہاں سے مٹن گئی اور میڈیم نے شہریار کو قلم ”سہاگ“ سے فارغ کر دیا۔

نسیم کہا کرتی تھیں۔ ”میری نانی اماں برے سے برے وقت میں بھی مکتی تھیں۔ اللہ نے جو کیا ہے، اچھا ہی کیا ہو گا۔“

نانی اماں کی اس بات کے تناظر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شہریار کے ساتھ جو ہوا اس میں اللہ کی بھینا کوئی مصلحت تھی۔ چوٹ کھائے ہوئے میاں شہریار نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ کوئی ایسی گلوکارہ کو سامنے لائیں گے جو مکمل ترنم کی فکر کی ہوگی اور ایک وقت آیا جب وہ اپنے خراب کو تہیہ کی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنی دوسری فلم ”بے گناہ“ میں جب انہوں نے عذرا نسیم سے قلم ساز عاشور کاظمی کا گیت مدعا بند کر لیا تو سننے والے بے ساختہ بول اٹھے۔ ”یہ تو نئی نور جہاں ہے۔“

لوگوں کے اس خیال پر شہریار نہال ہو گئے۔ انہیں ان کی منزل مل گئی تھی۔ نئی نور جہاں مل گئی تھی جو کچھ انہوں نے سوچا تھا اس پر عوام نے ہر گیت کر دی تھی۔ نسیم بیگم کا یہ پہلا بولو سا گیت تھا اس کے علاوہ میاں شہریار نے ”بے گناہ“ کے مزید چار گانے نئی نور جہاں سے ریکارڈ کروائے۔ اس فلم میں گایا نسیم بیگم کا یہ نغمہ خاص طور پر عوامی توجہ کا مرکز بنا۔

نئیوں میں جل بھرتے

مور کھن تڑپائے

ردھہ گیا مور پیار

دیکھ لیا تیرا پیار

”بے گناہ“ 7 فروری 1958ء کو ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار اور بیگ تھے جنہوں نے نیر سلطانہ کے مقابل ہیر کا کردار بھی ادا کیا تھا۔

ملینا میسرگوتشت

جنوری 2019ء

77

1962ء میں جب موسیقار رشید طرے نے اپنی ذاتی قلم ”موسیقار“ کے نام سے شروع کی تو اس کے دو کلاسیکل فنون کے لیے انہوں نے نسیم بیگم کی آواز کو بہتر سمجھا۔ یہ دو کلاسیکل گیت یہ تھے۔

☆ سرسوں پھولی رہے (نسیم بیگم اور سلامت علی خان)

☆ چمکوا برج دیکھی کو چل ری چمکوا (نسیم بیگم ہمراہ)

قادری (بی)

نسیم بیگم سے دوسرے موسیقاروں نے بھی کلاسیکل اور نیم کلاسیکل گیت گوائے جن میں چند پیش خدمت ہیں۔

☆ میری انگلیاں نہ کہنا میں مورا (قلم دروازہ)

☆ ارج تو سن میری میں ختی کراں تیری (قلم دیوانہ)

☆ دعا دے گی مور تیا تھاری

☆ میں دل دے کے ہاری (قلم محبوب)

☆ ریلے مورے نیوں جیسے بان ایسے ماروں (قلم)

گل بکاؤلی)

☆ چمن چمن ہا ہے پائل (قلم کسم)

☆ جھیں دل دے کے یاں میں تو ہارنی (قلم توبہ)

☆ پکوں پر انھوں کے چپ طے (قلم شام ڈھلے)

☆ نسیم بیگم نے حسن طارق کی قلم ”کنیز“ میں بھی یہ

کلاسیکل غزل ریکارڈ کرائی تھی جس کے شاعر آغا حشر کاشمیری تھے۔

☆ غیر کی باتوں کا آخر اختیار آئی گیا

اس کی ضمن بنیادی طور پر مختار بیگم نے بنائی تھی۔

تاہم اسے موسیقار عظیم احمد نے قلم ”کنیز“ کے لیے نئے

کپور کردہ ومن پر صدا بند کیا۔

☆ نسیم بیگم نے کلاسیکل، نیم کلاسیکل، بلکہ چمکے طریقہ

اور الیہ، مزاجیہ، ہر انداز کے گیتوں اور گانوں کو اپنی آواز

کے جادو سے شاہکار بنادیا۔

☆ نسیم بیگم نے یوں تو سارے ہی موسیقاروں کی فنون

کے لیے اپنی آواز کا جادو چکایا جن میں تسلیم اقبال، اسے

حمید، حسن لطیف، خواجہ خورشید انور، رشید طرے، ماسٹر

عنایت حسین، معصوم رحیم، ماسٹر عبداللہ، اعظم بیگم، تھدق

حسین، اصغر علی محمد حسین، ناشادہ کالے خان شیر، رحمن، ورا،

نذیر جعفری، منظور اشرف، مسل الدین، شہر یار، سل داس،

بابا چشتی، ماسٹر منظور، ایم جاوید، سکیل رحمان، نثار بڑی، وزیر

افضل، عظیم احمد، ایم الیاس بیٹ، بخشی وزیر، طفیل نیازی،

عنایت جعفری، فیروز نظامی، خادم حسین، سید طرے، امجد

یوپی، کمال احمد، نذیر علی، طامو، طالب حسین، سیکے جی، مشتاق علی، اعجاز چابی، ظفر خورشید، فتح علی خان، ایم اشرف قابل ذکر ہیں لیکن ان کی فنی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والوں میں موسیقار رشید طرے، موسیقار جوڑی سلیم اقبال، اسے حمید اور ماسٹر عنایت حسین کے نام نمایاں ہیں۔ ان کی موسیقی میں کئی نئے امر کلیت کا حصہ بن گئے۔

☆ اس وقت چند موسیقاروں کے ایک ایک گیت موصفا پیش خدمت ہیں۔

☆ رشید طرے۔ میرے دل کے تار بھیں بار بار (قلم

جسٹکار مراد مہدی حسن)

☆ سلیم اقبال۔ چھپ گئے تارے عدا کنارے۔ تم نہ

آئے پیا (قلم دروازہ)

☆ اسے حمید۔ ہم نے جو پھول چنے دل میں تجھے جاتے

ہیں (قلم سکی)

☆ ماسٹر عنایت حسین۔ بادلوں میں چھپ رہا ہے چاند

کیوں (ہمراہ سلیم رضا، قلم اک تیرا سہارا)

☆ خواجہ خورشید انور۔ میرا چھڑا اٹم کھڑا کیا۔ میری پائل

ہا ہے چمن چمن (قلم جولی)

☆ مسل الدین۔ تیری بات سمجھ نہ آئے۔ آسان کبھی

دشوار کبھی (ہمراہ احمد رشیدی قلم دیوانہ)

☆ سل داس۔ ہائے موہے کوئی نجر نہ گائے۔ موری پالی

عمر (قلم کا جمل)

☆ سکیل رحمان۔ بہت پیچھے دل کو لگا کے (قلم میں دن)

☆ نثار بڑی۔ پیار نہ ہو جب دل میں تو جیتا ہے ادھورا

(ہمراہ احمد رشیدی قلم لاکھوں میں ایک)

☆ طفیل نیازی۔ پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹنا شام وحر

(قلم دھوپ اور سائے)

☆ وزیر افضل۔ نیوں میں کبر ا سجالے، پائل چمکالے

(ہمراہ آثرن پروین قلم الیلا)

☆ ناشادہ۔ دشمن دل چھا کے روئیں گے۔ تم کو آزما کے

روئیں گے (قلم رشتہ ہے پیار کا)

☆ کریم شہاب الدین۔ آج بھی جاسا جانا پائل منو اب

مانے نا (قلم جنگلی پھول)

☆ دیو بھٹہ چارہ۔ چمن چمن بھو ا بولے سکتا

ڈولے (ہمراہ مسعود ناظم بی)

☆ مسعود حسین۔ چلے موری چال جوانی دیوانی کرے دنیا

نیم نیکم کے ٹاپ 20 گیت

- 1۔ چھاتوری چاندنی میں جیا جلا جائے (قلم بانی)
- 2۔ اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو (قلم شہید)
- 3۔ سوار چرخ ہم کا سوار بہار کی (قلم شام بھٹے)
- 4۔ لگا ہیں ہو گئیں پر خم ذرا آواز تو دینا (قلم شام بھٹے)
- 5۔ دیس دلا دیا میرے باہل دلا دیا (قلم کرتا سنگھ)
- 6۔ کھڑے ہے سہرا ڈالے آ جا لو آنے والے (قلم نیکی)
- 7۔ ہمیں دن کی ہوا میں سلام کہتی ہیں (قلم ادر وطن)
- 8۔ سائوں وی لے چل نال دے او با دوسنی کڈی والیا (قلم جن بھر)
- 9۔ ہم بھول گئے ہر بات مگر ترانچا نہیں بھولے (قلم نیکی)
- 10۔ میرا چھوٹا بھائی کھڑا کیا (قلم بولی)
- 11۔ اے دل کی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں (قلم اک تیرا سہارا)
- 12۔ نام لے لے کر اہم تو ہے جیائیں گے (قلم اولاد)
- 13۔ جیجی جیا جیا نقاب جب اٹھایا (قلم شہید)
- 14۔ محبت کے دم سے دینا نہیں ہے (قلم پرستان)
- 15۔ آج بھی جاؤ دلدار جب سے تو گیا ہے دل ہے پارا (قلم فرقی)
- 16۔ اک پہر اجاؤ اک میرا تارا (قلم شہید)
- 17۔ اونچی تھی راہوں میں پل موری جھکے (قلم سلنی)
- 18۔ اب کہاں ان کی وفا یاد دہانی ہے (قلم کوثر)
- 19۔ میری نظریں ہیں تلووار کس کا دل ہے روکے وار (قلم شہید)
- 20۔ ٹھکڑا ٹھکڑا لہرائی ہے پھر یاد کسی کی آئی ہے (قلم اک تیرا سہارا)

فیض احمد فیض۔ لاؤ اپنے حسن کی ناؤ۔ نیناں اتریں پار (قلم سکھ کا پستانا)

منیر فیاضی۔ اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو (قلم شہید)

حمایت علی شاعر۔ ہم نے جمیں دل دے دی دیا۔ اب تم یہ بتاؤ کیا ہو؟ (میراہ سلیم رحیم جھکار)

فتیل شفا۔ اب کہاں ان کی وفا یاد دہانی ہے۔ ساتھ تو ٹوٹ گیا اس کی صدا بانی ہے (قلم کوثر)

کوپا مال (قلم کل بکاؤلی)

فیروز نظامی۔ آج ہے سگائی کل ہارات آئے کی جھوم کے (قلم مشکوٰۃ)

سیف چٹائی۔ نیناں روئیں جھم جھم۔ کیسے میں چمپاؤں تم (قلم اپنا پرایا)

دجاہت مہرے۔ میں بھول بیٹھے آئی (قلم ذرق)

کمال احمد۔ بیگہ بیگہ بدن جیسے جھوٹا چمن (قلم کئی سال پہلے)

طالب حسین۔ غصہ پونیا ساون مہینا۔ ناچے تاکن باجے تین (قلم ناچے تاکن باجے تین)

فتح علی خان۔ غرضوں کے زمانے آئے جیا لہرائے (قلم سامی)

آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرا نیم نیکم نے نیم نیکم کے علاوہ فریدہ خانم اور اداکارہ رانی کی بھی پرورش اور تربیت کی تھی۔ اب اس حسن اتفاق کو بھی دیکھنے کے رانی کی پہلی ریلیز شدہ فلم ”محبوب“ تھی جس میں نیم نیکم نے رانی کے لیے ”لے لے بیک“ دیا تھا۔ اسی طرح گلزار فریدہ خانم کے ساتھ نیم نیکم نے 1967ء کی فلم ”میں وہ نہیں“ کا ویڈیو شوٹنگ کیا جس کی دھن موسیقار اے حیدر نے بنائی تھی۔ بول تھے۔ ”میرے ہر برس تو شادماں“

فریدہ خانم کے علاوہ نیم نیکم نے اور بھی کئی نگرز کے ساتھ لغات گائے ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر موسیقاروں کے حوالے سے کیا جا چکا ہے جب کہ چند قابل ذکر مہمائی کے بارے میں عرض ہے۔ آپ نے تیرہ ٹور کی آواز میں نامور شاعر بہنواز کھنوی کی غزل ”اے چنڈ بول کر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے“ پارہا بنی ہوئی۔ یہ غزل قبل ازیں 1960ء میں فلم ”خیر میل“ کے لیے نیم نیکم اور ذرا بدہ پردین کی آوازوں میں ریکارڈ کی گئی تھی۔

اسی طرح شہنشاہ غزل مہدی حسن کی آواز میں حفیظ ہوشیار پوری کی غزل ”محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے۔ تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے“ بے حد مقبول ہوئی جب کہ یہی غزل جب نیم نیکم کی آواز میں صدا بند کی گئی تو اسے بھی زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔

نامور شاعروں کی بات پہلی ہے تو کچھ نامور شاعروں کے کلام اور نیم نیکم کی آواز کے سنگم کا بھی ذکر ہو جائے۔ جوش پنج آبادی۔ رات آئی تو سانی نے بڑی دھوم مچائی (قلم آگ کا دریا)

عزیز فتویٰ۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا نہ کیجئے (قلم لغنام)

فضل احمد کریم فضلی۔ میرے دل کو بھایا ایک اخبار والا (قلم وقت کی پکار)

احمد راہی۔ چندا توری چاندنی میں جیا جلا جائے رے (قلم باہتی)

فنا نس باہمی۔ کچھ اس طرح تڑپ کے ہم بے قرار ہوئے (قلم مہر اداغ)

رباض الرحمان ساغر۔ سنو بہارو آج بیا سے ہوئی ملاقات (قلم زندگی ایک سفر ہے)

مشیر کاظمی۔ زمانے میں رہ کے بھی ہم ہیں اکیلے (بہرامہ والا)

ہمیں راس آئے نہ دنیا کے لیے (قلم یہ راستے ہیں پیار کے)

آرزو اکبر آبادی۔ روشنی تھی کھڑکی، محفل میں بلایا آپ نے (قلم شب بخیر)

مختب جارجی۔ چھوڑ نہ دینا ساتھ۔ ساجن کالی کالی رات میں (قلم میخانہ)

صوفی غلام مصطفیٰ نسیم۔ سو پار چمن مہکا سو بار بہار آئی (قلم شام ڈھلے)

کلیم عثمانی۔ خبر کیا تھی کہ امیدوں کے تارے ڈوب جائیں گے (قلم دھوپ چھاؤں)

مسرور انور۔ اے نازنین اے دریا۔ قابو میں رکھنا دل ذرا (بہرامہ والا قلم صاعقت)

شاب کیہ الوی۔ کیا ادا لے دلیری ہے۔ کیا ادا لے ناز ہے (بہرامہ والا قلم مہتاب)

شیون رضوی۔ دیوانے محبت کی ادا جان گئے ہیں (قلم سالگرہ)

نسیم نسیم کے اردو قلمی گانے زیادہ پسند کیے گئے تاہم انہوں نے سینکڑوں پنجابی قلمی گیت بھی گائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ایک پنجابی قلم ”دھڑے رب

میلے“ کے لیے بلوچی زبان میں بھی ایک گانا گایا تھا جو اداکارہ زمرہ پر قلم کیا گیا تھا جس کے بول تھے۔ ”من

تھر آئین وایتھو راجا (بہرامہ آئرن پروین)

نسیم نسیم نے اردو اور پنجابی قلموں کے علاوہ ہندکو زبان کی قلم ”قصہ خوانی“ میں بھی نین گانے گائے تھے۔ یہ قلم بہت تاخیر سے ریلیز ہوئی تھی۔ 1980ء میں ان کی

وفات کے کئی سال بعد یہ قلم ریلیز ہوئی تھی اور یہی ان کی ریلیز شدہ آخری قلم قرار پائی۔

نسیم نسیم کی پنجابی قلموں کا ذکر آیا تو اس بارے میں بھی کچھ باتیں ہو جائیں۔ لاہور میں ہر زمانے میں پنجابی قلمیں بنائی گئیں۔ اس دور میں بھی جب برصغیر کا بواڑہ نہیں

ہوا تھا، اس زمانے میں بھی لاہور میں اردو قلموں کے ساتھ پنجابی قلمیں بنا کرتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی بنی

رہیں۔ نسیم نسیم کے دور میں بھی بنیں اور اردو قلموں کی گلوکارہ ہونے کے باوجود انہوں نے بے شمار پنجابی قلموں کے لیے

بھی گایا اور اردو قلموں کی طرح ان کی پنجابی قلموں کے گانوں کو بھی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئیں۔ ان کی کچھ

پنجابی قلموں کے جو نام یاد آ رہے ہیں درج ذیل ہیں۔

کرتار سنگھ، چڑھ دا سورج، مرزا جٹ، امبی حویلی، دن درتے زمین، چائن اکیلاں، دا دکھ بھال دے،

کوچوان، غیرت مندہ سوہنا پتر، گل پکاؤلی، بائل داویڑا، محرم دل دا، بدناموں بدنام برا، جن دیر، چتر، ناجی، میرا

دیر، مھڑا، پیار دا پلا، دشمن، بجن دشمن، لہودی اگ، دریا م، پیار دے چلیجے، جاگدے رہنا، جاگیر دار، ماں پتر، بچہ

پورا، سورما، بیکن بھرا، کھجوس، دیساں دا راجا۔

اس سب کچھ پنجابی گیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جن میں کچھ تو آج بھی مقبول ہیں۔

☆ دیساں دا راجا میرے بائل دا پیار (قلم کرتار سنگھ)

☆ سارنوں وی لے چل تال دے۔ باؤ سوتی گڈی والیا (قلم چن پتر)

☆ جاویں نہ تڑپاویں نہ، ضمیر ذرا (قلم بجن دشمن)

☆ کھیرے تھماں تال کراں میں سلام (قلم لہودی اگ)

☆ مینوں دیوڈو ہائیاں نہ سیدنی (قلم دریا م)

☆ تمہوڑا جیہا کوئی تک لے آئیں۔ بہتاں سارا پیار کراں گے (قلم امبی حویلی)

☆ دس مئی دل وچ میرے اکھ تیری مستانی (قلم مرزا جٹ)

☆ حضور ذرا ٹھہرا دل والی کلی تے نہیں سنی (قلم چڑھ دا سورج)

☆ آہ میوں کسے دا نہیں ڈر۔ چا شکایت ہو رک (قلم دن درتے زمین)

☆ مای مای ڈھول مای۔ اسان دستاریں تیرے کول مای (قلم دکھ بھال دے)

☆ مل کے اک دار بچاں دے دے دیدار بچاں
(قلم کوچران)

☆ اکھ ماہی دے نال پہلی وار لڑی (قلم غیرت مند)
☆ میں ہن انگریزی پڑھ گئی آں۔ جو دل کہہدا اسی
کر گئی آں (قلم چائن اکھیاں دا)

☆ بلے تلے تیرے سوئے سکھ دا نکھار (مہراہ مسعود
راناقلم باہل دا ویڑا)

☆ رت بہاراں دی موسم پیاراں دی (قلم بدنا لوں
بدنام برا)

☆ چھلا دے جانشانی تیری میرانی (قلم چن ویر)
☆ میری جھانجھن جھن جھن (قلم چوہدری)

☆ میوں غصے نال کوئے حضور (قلم بچ ریا)
☆ جے میں کہہ دیاں کہ تیرے نال پیار ہو گیا (قلم
گل بکاؤلی 1971ء)

☆ اراج پیاردی جھولی ہوئی خالی (قلم جاگیر دارا)
☆ مکی مکی نیندراں چکا یا اے میوں (قلم باب بتر)

☆ ونی گھٹ کے پھر تک ٹوٹ جائے گی (قلم مینی
کہارن)

☆ غزل ہو یا گیت، اردو زبان میں ہوا پہنچانی، بلوچی یا
ہندکو میں خیم بیگم اس کو گہرائی میں جا کر گائی کا حق ادا کرتی
تھیں۔ مختار بیگم کی تربیت نے ان کو الفاظ کی شگفتہ و شائستہ

انداز میں ادا گئی کا ہر شکایا تھا۔ جو ہر گیت گانے اور غزل
کی گائیکی کے وقت ان کے کام آتی۔

خیم بیگم کی دو ماں تھیں۔ ایک جنم دینے والی اور
دوسری پال پوس کر دے سے آفتاب بنانے والی۔ جنم

دینے والی ماں بدھا بانی تھیں (ان کو بہت سے کہنے
والوں نے بدھا بانی کے نام سے یاد کیا ہے لیکن حقیقت کے

بعد بدھا بانی ہی درست معلوم ہوتا ہے) ذرے سے
آفتاب بنانے والی ماں مختار بیگم تھیں۔ مختار بیگم اپنے دور کی

ایک بڑی مغنیہ تھیں۔ انہوں نے بڑی فلموں کے بہترین دور
میں گانے گائے اور اداکاری بھی کی۔ ایک فلم میں موسیقی بھی

ترتیب دی۔ انٹرنیشنل سٹیج پر اور شاعر آغا حشر کاشمیری جو اپنے
وقت کی بڑی دیگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا دل ان پر

آگیا اور انہوں نے ان کو محبوب سے بیوی بتایا مگر ہمیشہ محبوبہ
ہی کی طرح چاہا اور ناز برداری کی جن دنوں مختار بیگم آغا

صاحب کے بیٹے اور اموں میں اداکاری اور گلوکاری کرتی
تھیں اور حسن و شباب کا پیکر تھیں انہی دنوں وہ ان کی چاہت

کورس گیت

خیم بیگم نے گائیکی کے فن کی بلند یوں کو اچانک
نہیں چھوڑا۔ اس کے لیے بڑی محنت کی بہت جدوجہد

کی۔ وہ اچھا خاصا گائیکی تھیں اس کے باوجود فلمی لیے
بیک سنگل ایک دم شروع نہیں کر دی۔ ان کی اتالیقی

مختار بیگم نے پہلے انہیں کورس گانوں میں شریک کیا پھر
اکیلے یا کسی کے ساتھ گانے کا موقع ملا۔ پہلی بار خیم بیگم

نے جس فلم میں کورس گانے میں شرکت کی اس کا نام
نکھار تھا۔ اسے نور جہاں لیڈ کر رہی تھیں اور اس کے

بول تھے۔ ”بولوری بولو گوری پیار سے“ خواجہ خورشید
انور نے پاکستان آ کر جس پہلی فلم کی موسیقی ترتیب دی

وہ انتظار تھی اس فلم کے لیے خیم بیگم نے نور جہاں کی
قنات میں تین کورس گیتوں میں حصہ لیا جن کے بول

تھے آگھ سے آگھ ملا لے، ساون کی گھنگھو گھٹاؤں اور
آگے جن پر دسی بلم پر دسی خیم بیگم کے دیگر کورس

گانے ان فلموں کے تھے۔ خاتون، شہری، بابو، ترپ،
لیلیٰ بجنوں اور خوب جگر۔

قلم میں شامل نہیں ہوا

قلم ”سلام محبت“ کے لیے موسیقار خواجہ خورشید
انور نے خیم بیگم سے ایک گیت گویا تھا جس کے بول

تھے ”میرے سیان برا جو تو نہ مانے“ یہ قسٹ شغاف کی تحریر
کر دہن تھا جو اس قلم میں شامل نہیں کیا گیا، کیوں؟ اس

کی وجہ نہیں بتائی گئی۔

سب بڑے

قلم ساز ہدایت کار اور نغمہ نگار شیون رضوی کی
قلم ”میری زندگی ہے نغمہ“ ایک نغماتی اور روانوی قلم

تھی جس نے کوئلن جوہلی کا سیلابی حاصل کی تھی۔
موسیقار مختار بڑی نے اس قلم میں ایک کورس گیت

ریکارڈ کیا تھا جسے خیم بیگم نے لیڈ کیا تھا اس کی قابل
ذکر بات یہ تھی کہ سامگی گانے والوں میں سب بڑے

اور نامور تھے۔ خیم بیگم کی قنات میں گانے والوں میں
خورشید بیگم، شوکت علی، قصور خانم، ناز علی اور نیر

حسین شامل تھے۔ اس کورس گیت کے بول تھے ”ناز
کرنا تو کر حسن ہے یوں ناز نہ کر“ حسن فانی ہے تیرا۔“

میں جلا ہوئے اور پھر جلد ہی انہیں زندگی بھر کے لیے اپنی زندگی کا ساتھی بنالیا۔

نیم بیگم جب چھوٹی تھیں اور عذرا نسیم کے نام سے پکاری جاتی تھیں جب ہی اپنی والدہ بدحاں بائی کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ نامور مخدعہ عذرا نسیم یہیں لاہور میں رہتی ہیں تو ایک دن اپنی کسمن بیٹی کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا تعارف کرایا۔

”میں امرتسر سے لاہور آئی ہوں۔“

”کیا کرتی ہو؟“ عذرا نسیم یہ سوچ رہی تھیں کہ اس خاتون کو کسی کام دھندے کی تلاش ہے۔

”جی میں گاتی ہوں مردوں امرتسر میں گانے بجانے والوں کی کوئی قدر نہیں۔“

”چلو اچھا کیا لاہور چلی آئیں۔ یہاں کچھ قدر دان تو ہیں۔“

”میں اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی کہ اس بچی.....“

”اس کا پاپ کیا کرتا ہے؟“ عذرا نسیم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”وہ زمرہ نہیں ہے جی۔“

”اوہ!“

”میں اب اپنا بوجھ ہی بڑی مشکل سے اٹھاتی ہوں۔“

عذرا نسیم کا دل جذبہ ہمدردی سے خوب اٹھا۔ ”ٹھیک ہے بدحاں! تم اس بچی کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میں اس کی پرورش اور تربیت کروں گی۔“

بدحاں بائی نے عذرا نسیم کو تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا اور ان کے آنسو ٹپک پڑے۔ عذرا نسیم نے آگے بڑھ کر انہیں دلاسا دیا۔ ان کے آنسو پونچھے اور کہا۔ ”اب یہ میری بیٹی ہے۔“ انہوں نے عذرا نسیم کو اپنی گود میں بٹھالیا۔

عذرا نسیم کی سفارش پر بدحاں بائی کو گانے کا چانس بھی ملے گا۔ وہ کوگوں کی فرمائش پر علاحدہ اقبال کی نظم ”شکوہ“ جو اب شکوہ“ بنا کر بہت داد وصول کرتی تھیں۔ عذرا نسیم خاموشی کے ساتھ ان کی مالی معاونت بھی کرنے لگیں۔

قدرت کو اس بچی سے آنے والے دنوں میں بڑا اصول کام کرانا تھا اس لیے اسے ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں اس کی بیچ پرورش اور تربیت ہوئی۔ عذرا نسیم بڑی فنکارہ ہی نہیں تھیں عظیم انسان بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی چھوٹی بہن فریدہ خانم اور اپنے ڈاڑھیور کی بیٹی رانی کی پرورش اور تربیت جس

محبت اور شفقت سے کی تھی، غریب گانے والی بدحاں بائی کی بیٹی کی بھی اسی طرح پرورش کی، اسے چونکہ ماں کو گاتی دیکھ کر خود بھی گانے سے دلچسپی ہو گئی تھی اس لیے عذرا نسیم نے اس کے لیے ایک استاد کا بندوبست کر دیا۔ جب تک استاد عاشق علی خان زندہ رہے عذرا نسیم کو موسیقی کی تعلیم دیتے رہے۔ ان کے بعد عذرا نسیم نے خود ہی ذمہ داری بھائی شروع کر دی اگر یہ کہا جائے کہ نیم بیگم کو بڑی گلوکارہ بنانے میں بڑا ہاتھ عذرا نسیم کا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ انہوں نے اس ابھرتی ہوئی موسیقی کی دلداد لڑکی کو ہر طرح سے موسیقی کے اسرار و محو سے آگاہ کرنے میں کسی محل سے کام نہیں لیا تھا۔ دوستوں جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح عذرا نسیم نے جو کچھ دیکھا تھا جو کچھ وہ جانتی تھیں اسی شوق اور جذبے سے سکھایا جس طرح اپنی حقیقی بہن فریدہ خانم کو سکھایا۔ جب تک نیم بیگم کی آواز کا جادو زندہ رہے گا۔ نیم بیگم کے حوالے سے عذرا نسیم کا نام بھی زندہ رہتا بندہ رہے گا۔

اس تحریر میں آپ بڑھ چکے ہوں گے کہ ملکہ ترن مادام نور جہاں کو کچھ ناپسند کرنے والوں نے (جن میں موسیقار شہر یار سرفہرست تھے) نور جہاں کی قبول گلوکارہ سامنے لانے کی جدوجہد شروع کر رکھی تھی اور جب نیم بیگم کی آواز انہیں نور جہاں سے مشابہ لگی تو انہوں نے نئی نور جہاں یا نور

جہاں ثانی کے طور پر انہیں خوب اچھالا۔ اس طرح ملکہ ترن کی حیثیت میں کوئی فرق پڑا یا نہیں پڑا۔ نیم بیگم کو آگے بڑھنے اور مقبولیت کی بلند یوں کو چھوٹے کا سنہری موقع ملا۔ ان تمام باتوں کے باوجود نیم بیگم بھگت خود کیا کرتی تھیں۔ سنے اور سرنوٹیں۔ ”میرا نور جہاں اور عذرا نسیم کی گائیکی کا سنگم ہے کیونکہ میں نے موسیقی کی تعلیم عذرا نسیم سے حاصل کی جب کہ گیت گانے کا شوق نور جہاں کے گانے سن کر ابھرا۔“

بدحاں بائی کی بیٹی بچپن ہی سے نور جہاں کی آواز اور گائیکی کے انداز سے بے حد متاثر تھی۔ جب یہ لڑکی لاہور کی رہائشی ہوئی اور عذرا نسیم کے زیر سایہ پرورش اور تربیت کے مرسلے سے گزرنے لگی تو اس کے دل میں اپنی پسندیدہ گلوکارہ ملکہ ترن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

”اے اللہ! میری بڑی خواہش ہے کہ کبھی میڈم نور جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ عذرا نسیم کے دل سے نکلتی یہ خواہش اللہ رب العزت نے جلد ہی پوری کرا دی۔ ایک دن عذرا نسیم کو معلوم ہوا کہ یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ

جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ عذرا نسیم کے دل سے نکلتی یہ خواہش اللہ رب العزت نے جلد ہی پوری کرا دی۔ ایک دن عذرا نسیم کو معلوم ہوا کہ یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ

جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ عذرا نسیم کے دل سے نکلتی یہ خواہش اللہ رب العزت نے جلد ہی پوری کرا دی۔ ایک دن عذرا نسیم کو معلوم ہوا کہ یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ

جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ عذرا نسیم کے دل سے نکلتی یہ خواہش اللہ رب العزت نے جلد ہی پوری کرا دی۔ ایک دن عذرا نسیم کو معلوم ہوا کہ یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ

جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ عذرا نسیم کے دل سے نکلتی یہ خواہش اللہ رب العزت نے جلد ہی پوری کرا دی۔ ایک دن عذرا نسیم کو معلوم ہوا کہ یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ

جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ عذرا نسیم کے دل سے نکلتی یہ خواہش اللہ رب العزت نے جلد ہی پوری کرا دی۔ ایک دن عذرا نسیم کو معلوم ہوا کہ یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ

جہاں سے ملنے کا موقع ملے۔“

ملکہ ترنم نور جہاں سے ملنے کی تمنا ہی ہے۔ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس مصحوم لڑکی کی خواہش پوری نہ کر تیں۔ ایک دن وہ اسے نور جہاں کے گھر لے گئیں اور اس لڑکی کا تعارف اپنی شاگرد کی حیثیت سے کرایا اور کہا۔ ”یہ لڑکی آپ کی پرستار ہے۔ اسے آپ سے بہت پیار ہے۔“

مادام محبت بھری نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”کچھ گاتی والی بھی ہو؟“

”جی ہاں۔“

”تو کچھ سناؤ نا۔“

اور کسن عذرا نسیم نے مادام ہی کا گایا ہوا مشہور پنجابی گانا ”ترے کھڑے داکالا کالال وے“ سنایا۔ جسے سن کر مادام نور جہاں بے حد خوش ہوئیں اور لڑکی کو شاباشی دی اور عیار بیگم سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”اس کی کچھ اور تربیت کے بعد اسے فلموں کی بے بیک بھی کروائیں۔“

تاہم عیار بیگم نے عذرا نسیم کو فلموں میں لانے کی جلدی نہیں کی۔ وہ اس بچی کو ہر لحاظ سے ایک مکمل گلوکارہ بنانا چاہتی تھیں۔ لہذا انہوں نے اسے پہلے ریڈیو پر تصارف کرایا۔ اس وقت عذرا نسیم کی عمر 14 برس تھی۔ یہ 1950ء

کی بات ہے۔ پانچ سال تک ریڈیو میں گانے کے بعد جب عیار بیگم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس لڑکی کو اب فلمی گیتوں کی گائیکی کی طرف لانا چاہیے تو اس تجربہ کار منتقد نے اسے ڈائریکٹ کوئی سولو گیت گانا بہتر نہ سمجھا۔ وہ چاہتیں تو اپنے اثر و رسوخ سے ایسا کر سکتی تھیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اسے کورس گیتوں میں حصہ دار بنانا شروع کیا۔ عذرا نسیم کا پہلا کورس گانا فلم ”کھنار“ کا تھا۔ جس کے بول تھے۔

”بولو دی بولو گوری پیارے“ حسن اتفاق دیکھئے کہ اس کورس کو ملکہ ترنم نور جہاں ایڈ کر رہی تھیں۔ ”کھنار“ کے بعد بھی عذرا نسیم نے متعدد فلموں کے لیے کورس گانوں میں حصہ لیا۔ ان فلموں میں خاتون، شہری باپ، تڑپ، لکٹی جتوں، نخت جگر اور انتظار شامل ہیں۔

”انتظار“ عظیم موسیقار خواجہ رشید انور کی پاکستان میں پہلی فلم تھی جو اپنے دور کی بہترین میوزیکل فلم تسلیم کی گئی۔ جسے پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں کلاسک کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس فلم کے لیے عذرا نسیم نے نور جہاں کی قیادت میں جن کورس گیتوں میں حصہ لیا وہ یہ ہیں۔

☆ آنکھ سے آنکھ ملالے
☆ سادوں کی گھنٹ گھنٹاؤ

☆ آگے بڑھ کر نسیم بیگم پر دیکھی فلم پر دیکھی عام طور پر نسیم بیگم پر لکھنے والوں نے یہی لکھا ہے کہ انہیں (نسیم بیگم) پہلی بار گیت گانے کا چانس موسیقار میاں شہریار نے دیا مگر یہ بات درست نہیں۔ حقیقت کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ موسیقار جی اے چشتی نے نسیم بیگم کی آواز اور گائیکی سے متاثر ہو کر انہیں اپنی پنجابی فلم ”گڈی گڈا“ میں گانے کا موقع دیا۔ نسیم ساز عاشور کا فلمی کی فلم ”بے گناہ“ بعد کی فلم ہے۔ اس کا واقعہ بھی کچھ یوں ہے کہ موسیقار میاں شہریار نے ”بے گناہ“ کے لیے زبیدہ خانم کے ساتھ نسیم بیگم کا ایک دو گانا ریکارڈ کرایا۔ جس کے بول تھے۔ ”کبھی رات ریشمی آئی“ اس فلم کے بقیہ تمام گانے زبیدہ خانم کو گانے تھے۔ ایک دن کسی وجہ سے زبیدہ خانم اسٹوڈیو نہ آئیں تو موسیقار شہریار نے نسیم بیگم کو آواز بنانے کا فیصلہ کیا اور یوں انہیں پہلی بار سولو گانا گانے کا موقع ملا۔ جس کے بول تھے۔ ”نینوں میں جل بھرائے سورکھ سن نرنائے۔ روکھ کیا مورا پیار“ نسیم بیگم جو اس وقت تک عذرا نسیم تھیں۔ اس خوب صورتی سے گایا کہ شہریار نے فلم ساز عاشور کا فلمی سے مشورے کے بعد اس نئی گلوکارہ سے اس فلم کے جدید دو گانے گوائے اور پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ جب اس گیت ”روکھ کیا مورا پیار“ کو جن لوگوں نے بھی سنا۔ یہی کہا۔

”اے یہ تو بالکل نور جہاں جیسی آواز ہے۔“

”نینی گانے والی تو ہی نور جہاں ہے۔“

”یہ تو نور جہاں ثانی ہے۔“

اور یوں عذرا نسیم اپنے پہلے ہی سولو گانے سے ایک بڑی فلمی گلوکارہ بن گئی۔ نسیم بیگم بن کر فلمی دنیا کے افق پر چمکتا دمکتا ستارہ بن گئی۔

اس گیت کے مقبول عام ہوتے ہی نسیم بیگم کو مسلسل فلموں میں گائیکی کے مواقع ملنے لگے۔ کھواہ امتاز، پناہ پریا، جا بجا، بکھ جھور، کرنا رنک، نیند، ساحتی، عالم آرام اور بہت سی فلموں کی مختار نگ گئی۔ نسیم بیگم کو اگرچہ باہمی اے چشتی نے دریافت کیا تھا مگر انہیں صحیح معنوں میں عوام سے روشناس شہریار نے کرایا بعد میں رشید عطرے نے ان کے فن کو عروج پر پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

نسیم بیگم نے فلمی گائیکی پر تو بہت سے لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے مگر اس بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے کہ انہوں نے قومی لغات بڑی کامیابی کے ساتھ گائے۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر انہوں نے جو بھی قومی گیت

گائے انہیں بھی زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں ذرا تفصیل سے بتانے کی ضرورت ہے۔
 نسیم بیگم نے قومی نوعیت کے نفحات گانے کی ابتداء فلم ”اولاد“ کے گانے سے کی۔ ان کا یہ پہلا قومی نغمہ 1962ء کی فلم ”اولاد“ کے لیے تھا۔ یہ ہدایت کار ایس ایم یوسف کی فلم تھی اور نغمہ ”تم قوم کی ماں ہو سو چو ذرا“ یہ نامور نغمہ رانیض ہاشمی کا تحریر کردہ نغمہ تھا جس میں انہوں نے قوم کی خواتین کو مخاطب کیا تھا۔

تم قوم کی ماں ہو سو چو ذرا

مورت سے ہمیں یہ کہنا ہے

اولاد تمہاری دولت ہے

تعلیم تمہارا گہنہ ہے

اس نغمے میں اولاد کی تربیت اور انہیں ملت کے لیے

کارگر بنانے کا درس شامل تھا جسے سننے والوں نے دل سے سنا اور یہ نغمہ کافی اثر انگیز ثابت ہوا۔ یہاں سے نسیم بیگم کے قومی نفحات کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد 1963ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”اک تیرا سہارا“ میں نسیم بیگم نے آئرن پروڈین کے ساتھ مل کر ماسٹر عنایت حسین کی قومی دھن پر حمایت علی شاعر کا جو نغمہ ریکارڈ کروایا وہ بھی اپنے جوش و جذبے میں مثالی نغمہ بن گیا بلکہ جنگ جبر کے دوران جب قومی نفحات کی قلت تھی تو ابتدائی کوئی نغمے والے نفحات میں یہ بھی شامل تھا۔ نسیم بیگم نے آئرن پروڈین کے ساتھ گایا تھا مگر ان کی آواز حادثی تھی۔ یہ نغمہ تھا

اپنے پرچم تلے ہر سپاہی چلے

ہاں سپاہی ہیں ہم یوں بڑھائیں قدم

چھتے تاروں کے جبرمست میں چندا چلے

اس نغمے کا آخری بند یا انٹرو گویا بھارت پر شدید ضرب لگا رہا تھا جسے نسیم بیگم نے جوش و انداز میں گایا تھا۔

وقت آئے گا بن جائیں گے تیرم

لے کے اک دن دکھائیں گے کشمیر ہم

اس کی خاطر کٹا دیں گے اپنے گلے

اپنے پرچم تلے ہر سپاہی چلے

جنگ جبر کے دوران اس کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ اس کے خصوصی ریکارڈ بھی جاری ہوئے جس میں فلمی دنیا کے چار جنگلی ترانے شامل تھے۔

نسیم بیگم کا فلمی سفر جاری رہا اور جنگ جبر سے قبل تک وہ پاکستان کی معروف فلمی گلوکارہ بن چکی تھیں پھر اچانک

رن کچھ کی جنگ شروع ہو گئی تو بھارت کی جانب سے حملے کا تاثر پھیلنے لگا۔ ادھر آریٹین جبر اللہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ حکومت پاکستان نے جمیل الدین عالی اور فیصل شٹانی کی قیادت میں دس قومی نفحات ریکارڈ کروانے کا منصوبہ بنایا۔ دونوں شاعروں نے نفحات تحریر کیے تو اگست 1965ء میں نسیم بیگم نے لاہور میں فیصل شٹانی کا تحریر کردہ ایک جوش و نغمہ ریکارڈ کروایا جس کی موسیقی شہر پار نے ترتیب دی مگر اس کی گراموفون ڈسک بننے کراچی آئی تو جنگ شروع ہو گئی اور دوران جنگ ہی وہ نغمہ ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشنز سے مشہور ہوا تو یادگار جنگی ترانہ بن گیا۔ نسیم بیگم کی مملکت پاکستان کی عظمت کا بیان اور اپنے مجاہدوں کے لیے ایمان و اہقان سے بھرپور جذبات شامل تھے اور ساتھ ہی ایک فنکار کا نذرانہ بھی۔ جو کہتی ہیں کہ

لائی ہوں میں تمہارے لیے پیار کا پیام

اے پھول سے مجاہدو! تم کو میرا سلام

اے مادر وطن! اونچا ہو تیرا نام

یہ نغمہ بھی جوش و جذبے سے معمر تھا اس لیے فوجی

بھائیوں میں مقبولیت حاصل کیا۔ اس نغمے کو بھی سننے والے

ملکہ ترنم نور جہاں کا نغمہ سمجھتے رہے اس کا یہ بند تو کمال کا تھا

طارق ہے تم میں اور کوئی خالد ولید ہے

غازی ہے تم میں کوئی تو کوئی شہید ہے

روشن تم ہی ہو گا جہاں میں وطن کا نام

اے پھول سے مجاہدو! تم کو میرا سلام

نسیم بیگم نے یہ نغمہ محاذ جنگ پر جا کر بھی فوجی بھائیوں کو سنایا تھا۔

یہ 18 ستمبر 1965ء کی بات ہے۔ پاک بھارت

جنگ اپنے عروج پر تھی۔ آج پاکستانی فوج کی 25 ویں

کیوریل چھڑا کے میدان میں داد و تجاہت دے رہی تھی جس کو

ٹینکوں سے صرف دوسو ٹینکوں کا مقابلہ تھا بلکہ ہم تھا۔ پاک

فوج میجر جنرل امیر حسین کی قیادت میں محاذ پر لڑتی ہوئی

تھی۔ رن میں گولوں کی بارش اور گرد و غبار کا طوفان تھا۔

پاک فوج اللہ کے آسرے پر میدان میں صف اڑھی تو قومی

فنکاروں کی جانب سے بھی کئی ترانوں کی شکل میں سلام

حقیت بھی ریڈیو سے نشر ہو رہے تھے۔ اسی دن لاہور

ریڈیو میں ایک فنکارہ ریکارڈنگ میں مصروف تھی۔ اسلام

شاہ صاحب نغمے کی ریکارڈنگ کر رہے تھے۔ ادھر سلیم

حسین اور اقبال حسین (سلیم اقبال) کی جوڑی نغمے کی

کس کو معلوم تھا

اپنے وقت کے نامور فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا کی ایک کامیاب فلم تھی ”گمنام“ اس کے موسیقار ماسٹر عاتق حسین تھے۔ انہوں نے اس فلم کے ایک کورس گیت میں گلوکارہ کوثر دین کی قیادت میں کئی غیر معروف اور ابھرتی ہوئی گانے والیوں سے ساشی گلوکاراؤں کا کام لیا تھا۔ انہی میں ایک کس لڑکی عذر ختم بھی تھی۔ اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ ایک مشہور مغنیہ بنے گی۔ یہ کورس گیت تھا ”جہم جہم جہم ناچ اٹھا انگ میرا“۔

علی تھہری شجاعت پر جموتے ہوں گے
حسین پاک نے ارشاد یہ کیا ہو گا
تمہیں خدا کی رضا میں سلام کہتی ہیں

اس نغمہ کے نشر ہوتے ہی ریڈیو لاہور میں ٹیلی فون کالوں کا تانا باندھ گیا۔ لاہور میں معروف فوجی جوانوں نے اپنے پیغامات ریکارڈ کرنا شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سیالکوٹ کے فوجی سب ہیڈ کوارٹر سے فون آتا ہے کہ یہ نغمہ بار بار نشر کیا جائے تاکہ چوڑا کے میدان میں ہمارے فوجی جوانوں کا حوصلہ بلند رہے اور اسے خصوصی ریڈیو اسٹیشن کے ذریعہ بائیکرد فون سے میدان میں پہنچایا جائے۔

حکم کی تعمیل ہوتی ہے اور چوڑا کے میدان جنگ میں یہ نغمہ گونجا رہا۔ ہماری فوج جو پہلے ہی پسپائی اب پاک فوج کے تازہ دم حوصلے کا کہاں مقابلہ کر سکتی تھی؟ وقتی تھکاوٹ سے بڑھ کر حال فوج میں ایک جذبہ تازہ اٹھ آیا اور شام تک چوڑا کا میدان ہماری ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔ ملک بھر میں اس نغمے کی گونج نے ہر سننے والے کو متاثر کیا۔ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ آواز ملکہ ترنم مادام نور جہاں کی ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ امیر جنسی صورت حال میں یہ نغمہ بغیر اناؤنسمنٹ ہی نشر ہو گیا تھا اس لیے سب کو ملکہ ترنم نور جہاں ہی کا گمان ہوا مگر پھر انڈسٹریل صاحب نے گانے والی کا نام بتانا شروع کیا۔

”اب آپ قسیم بیگم کی آواز میں قومی نغمہ اے راہِ حق کے شہید و وفا کی تصویر دینے۔“

شاعر موسیقی ترتیب دے چکے تھے جو میدان جنگ میں گلوں کی خاموشی کے بعد کا منظر صوفی رنگ میں یکسر ری تھی جس میں نہ خوف و ہراس تھا نہ اداسی کی فضا۔ موسیقی تیار ہو چکی تھی اور گلوکارہ طرز کے ساتھ آواز ملانے میں مصروف۔ صدر مملکت فیضان مارشل جنرل محمد ایوب خان کے لیے سیاسی جلسوں میں تعہد خوانی کرنے والے شاعر مشیر کاظمی نے نغمہ بھی خوب لکھا تھا جو اپنے شہیدوں کو سلام تھا۔ گلوکارہ کی آواز بھی عقیدت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سلیم اقبال جواب تک ملکہ ترنم نور جہاں کے فغان کی موسیقی ترتیب دے کر اس جنگ میں ملی ترانوں کی موسیقی میں نمایاں مقام بنا چکے تھے۔ یہ نغمہ ان کے لیے چنچ تھا اس لیے انہوں نے اس پر بھرپور محنت کی تھی۔ ریڈیو سے وابستہ افراد بتاتے ہیں کہ مشیر کاظمی کا نغمہ سننے ہی ایک دن پہلے ہی دونوں بھائی موسیقی کی ترتیب میں لگ چکے تھے اور اس رات کمر بھی نہیں کھتے تھے۔ دوپہر کو ترانہ مکمل ہو گیا اور اس کو اسپڈ شپ پر محفوظ بھی کر دیا گیا جو کبھی بھی وقت بتر ہونے کے لیے تیار تھا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر مس الدین بٹ نے نغمہ سنا تو اس کی شپ اسٹوڈیو پہنچا دی کہ جیسے ہی محاذ کی خبر آئے خبروں کے فوراً بعد ہی اسے نشر کر دیا جائے۔ دوپہر میں بجے کے قریب ریڈیو سے آواز آئی۔ ”پاک فوج نے چوڑا کے میدان میں ہندوستانی فوج کے فنگے چھڑا دیئے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق بھارت کے سو سے زائد ٹینک تباہ ہو چکے ہیں اور دشمن پچاس ٹینکوں سمیت ہماگ رہے ہیں۔ ان کے چھپنے ہوئے ٹینک بھی اب پاک فوج کے پاس ہیں۔ چوڑا میں تمکھان کی جنگ کے نتیجے میں پاک فوج کے کئی جوان بھی جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔“

”اللہ اکبر“
اسٹوڈیو میں ریڈیو کا عملہ نغمہ یکسر بلند کرتا ہے اور خبروں کے بعد بمیردیں راگ میں نغمہ گونجتا ہے جو سننے والوں کی آنکھیں نم کر دیتا ہے۔

اے راہِ حق کے شہید و وفا کی تصویر
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
سبحان اللہ کیا کلام ہے۔ نغمہ آگے بڑھتا ہے اور دوسرے انترے میں اپنے شہیدوں کی رگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

چلے جو ہو کے شہادت کا جام لی کے تم
رسول پاکؐ نے بانہوں میں لے لیا ہو گا

اس نغمے کی موسیقی بھی سلیم اقبال نے مرتب کی۔ نیم بیگم کی آواز میں ریکارڈ ہو کر نشر ہونے والا یہ نغمہ بھی مقبول جنگلی ترانوں میں شمار ہوا۔ یہ نغمہ ہر اہل وطن کا اپنے وطن کے لیے پیغام تھا۔

اے ارض وطن تیرے پرستار رہیں گے
تیرے لیے مرشے پر تیار رہیں گے
دوران جنگ امریکا اور دیگر یورپی ممالک نے
پاکستان کی فوجی امداد بند کر دی تھی اس تناظر میں نیم بیگم نے
اپنے ترانے میں واضح اشارہ کیا۔

غیروں کے سہارے ہمیں جینا نہیں آتا
ہم اپنے سدا آب مددگار رہیں گے
اور پھر پاکستان کو قلم اسلام بنا کر نیم بیگم نے اس
نغمے میں صوفی جوش سے بھر پور ہم مدد سایا

اے ملت بیضا تیرے ناموس کی خاطر
ہم بن کے جتنی ہوئی کھوار رہیں گے
جب جنگ کے شعلے سرد ہوں تو دیگر قوی فنکاروں
کی طرح نیم بیگم بھی قوی نغمات کی ایک معروف گلوکارہ بن
چکی تھیں۔ جبکہ فوجی شوق میں ان کو مدعو کیا جاتا اور ان سے
”اے راویج کے شہید دو قاتل قصور“ شنانے کی فرمائش کی
جاتی اور جب نومبر 1965ء میں پاک فضائیہ نے اپنے
شہداء کے لیے خصوصی شوشہ عقد کیا تو نیم بیگم سے خصوصی طور پر
یہی نغمہ مانگا۔ اس موقع پر ایئر مارشل نور خان کی آنکھیں
بھی ہوک نکلیں۔ انہوں نے اس نغمہ کو پاک فضائیہ کے
شہیدوں کے لیے سرکاری نغمہ کے طور پر اپنانے کا اعلان کیا
جب کہ اس موقع پر اس نغمے کے شاعر موسیقار اور گلوکارہ کو
خصوصی اعزاز بھی دیئے گئے۔

یہ ترانہ اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ جنگ کے بعد اسٹریٹ
سوگ بن گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب قلم ساز و
ہدایت کار سیف الدین سیف نے جنگ تبر کے پس منظر
میں اپنی قلم ”مادر وطن“ بنائی تو اسے اپنی قلم میں شامل کر لیا۔
”مادر وطن“ میں پاک فوج کے سپاہی کی اداکاری کرنے
والے اداکار مجرمل پر یہ نغمہ چلایا گیا تھا۔ اس قلم میں جب مجر
ملی کا جسد خاکی آتا ہے تو گھر کی خواتین کے جذباتی مناظر
کے ساتھ یہ نغمہ اسکرین پر گونجتا ہے۔ جسے دیکھ کر دیکھنے
والے بھی اٹھکارتا ہو جاتے ہیں۔

قلم کے لیے اس نغمے کو دوبارہ کمپوز کیا گیا اور اس میں
کورس آوازیں بھی شامل کی گئیں جس نے اس نغمے کو یلہ

جب پہلی بار امین صاحب نے نیم بیگم کا نام ظاہر کیا تو
وہ کچھ یوں تھا۔ ”ہماری فلمی دنیا میں چپکے والی پہلی نیم بیگم
نے بھی آواز کا محاذ سنبھال لیا ہے اور اپنا پہلا صوفی واری
شاعر اکر گیا ہے۔“

نیم بیگم کا نام سن کر سننے والے حیران ہوتے تھے
کیونکہ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ اتنی پختہ گلوکاری ملکہ ترنم ہی
کر سکتی ہیں جس کے بعد نیم بیگم تک سوائی کلمات پہنچتے
گئے۔ سننے والے انہیں اتنا خوب صورت گانے پر مبارک
باد دینے لگے تو انہوں نے اس پذیرائی پر رب رحیم و کریم کا
تہ دل سے شکر ادا کیا اور ریڈیو کے اسلام شاہ صاحب
سے کہا۔ ”شاہ صاحب! مجھے اور بھی موقع دیں تو میری ترانے
گانے کا۔“

اسلام شاہ صاحب کو نیم بیگم کا یہ جذبہ اچھا لگا۔ یہ
بات پسند آئی لہذا انہوں نے جہادی جذبات سے بھر پور
اقبال کا انتخاب کیا کیونکہ قوی شاعر کے کلام کو بھی جنگلی
ترانوں میں وحالاً جاریا تھا اور نور جہاں نے ”ہر لحظہ ہے
مومن کی نفی شان نبی“ آن ریکارڈ کروا دیا تھا۔ جلد ہی نیم بیگم
کے لیے اقبال کی نظم منتخب کر کے سلیم اقبال کے سرور کردی
گئی جس کی طرز بیتانے میں انہوں نے دیر نہیں لگائی اور اسی
دن نیم بیگم نے یہ نغمہ ریکارڈ کروا دیا جو فریاد انداز کا تھا جس
میں وہ اپنے مجاہدوں کو اقبال کے الفاظ میں یاد دہانی
کرواتے ہیں۔

وہی جواں ہے قلعے کی آنکھ کا تارہ
شباب جس کا ہے بے باغ شرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ قاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رہا غزالِ تاتاری
خدا نے جس کو دیا ہے گھوہ سلطانی
کہ اس کے غر میں ہے حیدری و کمراری
اس قوی ترانے کو ریکارڈ کرانے کے اگلے روز انہیں
ٹی وی دی لاہور سے بلاوا آیا وہاں کئیں تو میاں شہر یار نے
کہا۔ ”ایک قوی نغمہ آپ کو یاد راست ریکارڈ کروانا ہوگا۔“
اور شہر یار کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں نیم بیگم نے
اسے گاراکہ ایک بار پھر سننے والوں سے داد وصول کی۔ یہ بات
قابل ذکر ہے کہ میاں شہر یار کی ٹی وی کے لیے مرتب کردہ
یہ پہلی دھن تھی جو غزل کے اعزاز کی تھی۔

20 جنوری 1966ء کو ایک بار پھر لاہور ریڈیو اسٹیشن
بلوایا گیا اور ریڈیو آفیسر حمید نسیم کا تحریر کردہ نغمہ دیا گیا۔

کی ریکارڈنگ سے تصویر مختلف بنا دیا تھا۔ فلمی ورژن میں
اترے کے اشعار کو دہرایا نہیں گیا تھا۔
اسی فلم میں نسیم بیگم نے فلم ساز و ہدایت کار سیف
الدین سیف کا تحریر کردہ قوی نغمہ
سونے کا یہ دور نہیں، تجھ کو آگے جانا ہے
جاگ میرے لال تو نے قوم کو جگاتا ہے
بھی ریکارڈ کروایا تھا۔ یہ نغمہ بھی بہت مقبول ہوا جس
میں ایک ماں اپنے بیٹے کو لوری دینے کی بجائے جاگنے پر
آبادہ کرتی ہے۔

1966ء میں جنگ خیر کے موضوع پر بننے والی
ایک اور فلم ”وطن کا سپاہی“ بھی تھی جس کے فلم ساز اے حمید
اور ہدایت کار شایب کیرالوی تھے۔ اس فلم میں شامل چھ
نغمات میں سے چار قوی نغمے تھے۔ جب کہ ایک نغمہ۔
نغمہ شریف کا متن بھی قوی نغمے ہی کا تھا اس طرح اس فلم
میں شامل نغمات وطن کی تعداد باوجود تھی ہے۔ ان نغمات میں
سے تین میں نسیم بیگم کی آواز شامل ہے۔ حبیب جالب کا تحریر
کردہ ایک نغمہ جنگ خیر کے فوراً بعد ہی لاہور ریلوے پر ریکارڈ
ہوا تھا جسے منظور اشرف نے موسیقی سے سجایا تھا۔ نسیم بیگم کی
آواز میں اس نغمہ کے ساز، دوران فلم میں پردہ ساز ڈھ
الکٹ کے طور پر بھی سنائی دیتے رہے۔ حبیب جالب کے
تحریر کردہ اس نغمہ وطن میں فوجیوں کی پیگمات کی آواز میں
بن کر گئی ہیں

وطن کی شان میرا میرا
وہ بالکا شیر جوان سپاہی
میری دنیا ہے میرے سر کا تاج ہے
اور پھر غازیوں کی پیگمات کے جذبات کی ترجمانی
بھی خوب کرتی ہیں

میں جتنا کروں ناز کم ہے
وہ میرا جیالا بہادر صدم ہے
یہ نغمہ فوجی بھائیوں کے پروگرام میں بھی بہت مقبول
ہوا اور تقریباً پانچ سال تک اس کی صدا میں گونجی رہی۔
اسی طرح نسیم بیگم نے اس فلم میں آئرن پرودین اور
سکسویں کے ساتھ مل کر حبیب جالب ہی کا ایک اور نغمہ گایا تھا
جس کے بول کچھ یوں تھے

ہائے سپاہی میرے
جاؤں میں صدقے تیرے
تیری نظر یہ کیا کر گئی رہے

اس فلم میں رسول کریمؐ کے حضور وطن کے مجاہدوں
کے لیے ایک مناجات بھی شامل ہے جس میں نسیم بیگم کے
بمراہ معروف نغمہ خواں اعظم چشتی اور آئرن پرودین بھی
شریک ہیں۔ یہ مناجات حضرت احمد رضا خان بریلویؒ کے
نغمہ کلام ”یا نبی سلام علیک“ کی تحصین ہے جس کی طرز بھی
وہی ہے۔ تاہم منظور اشرف نے اس میں موسیقی کارنگ بمرا
ہے اور مناجاتی اشعار بھی خوب ہیں جس میں فلم کا ٹائٹل
وطن کا سپاہی بھی شامل ہے

میں وطن کا ہوں سپاہی لڑوں میں حکم الہی

میرے دین پر میری ضرب غازیانہ

یا نبی سلام علیک۔ صلوٰۃ اللہ علیک

اس زمانے میں چونکہ مشکل وقت میں محروم میں
مختل نغمہ خوانی کا اہتمام ہوتا تھا، جسے مختل میلاد بھی کہا جاتا
ہے اسی لیے اس فلم میں بھی یہ مختل اس وقت آراستہ کی جاتی
ہے جب فلم کے مرکزی کردار محمد علی جنگ میں بھارت کے
خلاف برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔

معروف شاعر و ادیب اور فلم ساز فضل احمد کریم فضل
کی فلم ”وقت کی پکار“ مارچ 1967ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ فلم
پاکس آفس پر کامیابی تو حاصل نہ کر سکی لیکن اس میں شامل
نغمات مقبول ہوئے جن میں نسیم بیگم کے حصے میں پاکستانی
صحافی برادری کے لیے پہلا نغمہ آیا۔ جس میں شامل ملی
جذبات کی بدولت ہم اسے قوی نغمہ کہہ سکتے ہیں۔ فلمی
چویش کی وجہ سے اس میں رومانیت سے محروم اشعار بھی
شامل ہیں تاہم یہ سارا رداس قوی جذبات سے آگیا ہے
جب نسیم بیگم اپنے محبوب کو قوم کو راہ دکھانے والا کہتے ہوئے
نغمہ سرا ہوئی ہیں ”میرے دل کو بھایا اک اخبار والا“ یہ نغمہ
انفرادیت کے باوجود گوشہ نگامی میں ہے جسے دوبارہ ذمہ
کرنے کی ضرورت ہے تاکہ میڈیا کی چکاچوند میں صحافی اپنا
مقام نہ بھولیں اور اہل صحافت کے لیے تو نسیم بیگم کا گایا ہوا یہ
نغمہ سبقت کا منفرد اعزاز رکھتا ہے جس سے انہیں کوئی محروم
نہیں کر سکتا۔

1967ء ہی کے ماہ جولائی میں فلم ساز صدیق فتح
اور حنیف چوہدری کی فلم ”کافر“ بھی ریلیز ہوئی۔ اس فلم
کے ہدایت کار ارم سلیم تھے اس فلم میں نسیم بیگم نے مسود رانا
کے ساتھ خوب نقوی کا تحریر کردہ نغمہ الیاس صاحب کی وطن پر
کا کرکمال کر دیا جو مل جملی صورت حال پر مبنی تھا۔ استقامتی
نسیم بیگم گاتی ہیں اور اترے کے درمیان مسود رانا کی

پرجوش آمد ہوتی ہے۔ نغمہ کے راگ بھڑک اٹھتے ہیں جس میں قوم کے غازیوں سے کہا جاتا ہے
حق کا پرچم لے کر اٹھو باطل سے ٹکراؤ
سر سے لٹکن باندھ کے نکلو مارو یا سر جاؤ
اس زمانے میں عرب اسرائیل جنگ بھی جاری تھی
جس میں پاک فضا یہ بھی شریک تھی۔ پاکستان کے لیے
بھارت کی گٹھڑ بچکیاں بھی عروج پر تھیں اس لیے یہ نغمہ
روزانہ ریڈیو سے سنائی دیتا جس میں نسیم بیگم قومی غیرت کو
ابھارتے ہوئے کہتی ہیں۔ ”عزت والو، غیرت مندو، خالد
طارق کی شمشیر و ظلم کی اوچی دیواروں کی اینٹ سے اینٹ
بجاؤ مارو یا سر جاؤ۔“

اور ترانے کے آخر میں ”اللہ اکبر“ کی صداؤں نے
اسے اور پرجوش بنا دیا تھا۔ 1969ء میں فلسطین کے
موضوع پر بننے والی ریاض شاہ کی سپر ہٹ فلم ”زرقا“ نے تو
پاکستان سمیت عرب دنیا میں بھی مقبولیت حاصل کی اور اپنی
کہانی اور اس کے پیغام کے اعتبار سے سب کے دل جیت
لیے۔ اس فلم میں شامل حبیب جالب کے نغمے بھی عوام کے
دلوں پر جذبہ الوطنی کے تاثر چھوڑ گئے۔ پاکستان چونکہ
قلعہ اسلام ہے اس لیے یہاں کفر سے سرسبز بیکار اپنے پرادر
ملکوں کے لیے بھی جنگی حالات میں کچھ نفیات بنے ہیں جن
میں فلسطین پر بنائے گئے نغمے جتنا ہمارے ہی ملی نفیات ہیں
کیونکہ الحمد للہ ہم مسلم اسلام سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور
یہ چونکہ پاکستانی قومی زبان میں پاکستانی ننگاروں ہی نے
پیش کیے ہیں اس لیے بلاشبہ ہمارے ہی نغمے ہوئے۔
”زرقا“ میں نسیم بیگم کی آواز میں ”میں پھول بیچنے آئی“
بھی جذبہ حب الوطنی سے معمور ہے جسے موسیقار رشید
عطری نے عربی موسیقی کے سازوں سے بھی سکایا اور نسیم
بیگم اپنے پھولوں کو اہل وطن کے ضمیر سے چھپھیر دیتے
ہوئے کہتی ہیں۔

1۔ پھول میرے زرد ہیں اور سرور دم وطنوں کا خون۔
2۔ اے وطن! میں تیری بربادی پہ کیسے چپ
رہوں۔

3۔ لٹ چکا ہے جو چمن اس کو چمن کیسے کہوں؟
اس کے بعد قومی ضمیر کو بھنجوڑتے ہوئے حبیب
جالب کے الفاظ میں کہتی ہیں۔

ایک دن تم سب سے پوچھے گی وطن کی آبرو
کس نے کٹوایا ہے سر، کس کس نے بیچا ہے لہو

کون سا منہ لے کے جاؤ گے خدا کے رو برو؟
نسیم بیگم کا یہ نغمہ ملکی سیاست کا نقشہ بھی کھینچتا ہے۔ اسی
طرح اس فلم میں منیر حسین کے ہمراہ نغمہ ”اے فلسطین! اے
فلسطین“ بھی شامل ہے جسے عرب اسرائیل جنگ کے
دوران مصری گلوکارہ بنت نیل ام کلثوم نے عربی ترجمہ کے
ساتھ بھی گایا تھا۔ یہ نغمہ آج بھی اپنے فلسطینی بھائیوں سے
اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ہمیں یقین ہے ڈھلے کی ایک دن ستم کی یہ شام اے فلسطین
ہر ایک مظلوم سن چکا ہے ہمارا پیغام اے فلسطین
ستم کروں گا نشانہ ہو گا ہمارا خون رائیگاں نہ ہو گا
شہید ہو کر بھی اپنے لب پر ہے تیرا ہی نام اے فلسطین
1971ء میں نسیم بیگم نے پاکستان نئی دہلی لاہور
مرکز کے لیے ناصر کاظمی کا تحریر کردہ نغمہ ”قومی ہماری جان
ہے تو ہی دولتِ ایمان ہے“ ریکارڈ کروایا جو انہوں نے
جنگِ ختم کے دوران براہِ راست بھی گایا تھا اس کی موسیقی
خلیل احمد نے مرتب کی تھی۔ نسیم بیگم کی آواز میں آخری
قومی نغمہ ثابت ہوا۔ پھر کسی فلم کے قومی نغمے میں ان کی آواز
شال نہ ہو سکی اور ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بھی مصروفیت کی
وجہ سے وقت نہیں نکال سکیں۔ اسی وجہ سے پاکستان پر ایک
بار پھر آزمائش کا وقت آنے سے دو ماہ پہلے ہی وہ اللہ کو
پجاری ہو گئیں مگر ان کی آواز میں قومی نغمے ہماری تاریخ اور
ہماری موسیقی کی جہت میں ہمیشہ باوصف کا جھونکا رہیں
گے اور جب بھی ”اے راہِ حق کے شہیدو!“ گونجنے کا تو بے
اختیار نسیم بیگم کی یاد تازہ ہو جائے گی۔

نسیم بیگم کے گائے قومی نغموں کا ذکر تو دوسرے لکھنے
والوں نے بھی کیا ہے لیکن اتنی تفصیل سے کم ہی لکھا ہوگا۔
ان کے کچھ قومی نغموں کا سرسری ذکر یہ زیادہ تر بے نکیا ہے۔
اسی وجہ سے میں نے ان کی گائیکی کے اس پہلو پر تفصیلی توجہ
دی تاکہ میرے پڑھنے والوں کو نسیم بیگم کے قومی جذبات کا
بھی مکمل طور پر ادراک ہو سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ نسیم بیگم
ایک خوش گلو مغنیہ تھیں جن کی آواز کا کالم والوں نے بھرپور
فائدہ اٹھایا ان کی آواز ملکہ ترنم مادام نور جہاں سے ملتی جلتی
تھی جس کا فائدہ موسیقاروں نے بھی خوب اٹھایا اور نئی
بات تو یہ ہے کہ اس حوالے سے نسیم بیگم کو بھی بڑی کامیابی
نصیب ہوئی۔ نسیم بیگم کی خوش نصیبی یہی نہیں تھی کہ ان کی آواز
ملکہ ترنم سے مشابہ تھی بلکہ اس سے بڑی خوش بختی یہ بھی کہ
انہیں مختار بیگم جیسی تجربہ کار اور ماہر موسیقی کی اتالیقی حاصل

پہلا اور آخری

قلم تو کوئی خاص نہیں تھی۔ نام تھا اس کا ”کھل جا سم سم“ جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیسی قلم ہو گی مگر اس کے موسیقار رشید عطرے جیسے پہچنے ہوئے باہر موسیقی تھے۔ انہوں نے اس قلم میں ایک انوکھا تجربہ کیا اور وہ تھا ایک کورس گیت میں نور جہاں، زبیدہ خانم اور نسیم بیگم کو ایک ساتھ گوانے کا۔ یہ گیت تھا ”اس کی کہیں مت چٹو جانا تاکہ ہے“ قتیوں مہمان گلوکاراؤں کو ایک ساتھ ایک ہی گیت میں سامی بنانا بہت اہم بات تھی یہ کام رشید عطرے جیسے ہی موسیقار کر سکتے تھے۔ ان تینوں کا ایک ساتھ گایا ہوا یہ گیت پہلا اور آخری تھا۔

موسیقار، نغمہ نگار

اداکار، ہدایت کار اور قلم ساز ریحلا کی ایک قلم تھی ”میری محبت تیرے حوالے“ اس قلم میں ریحلا نے نسیم بیگم کے ہمراہ یہ ڈونٹ گایا تھا

میرا پیار بھر استار لٹا
منزل پہ سامی چھوٹ گیا
قسمت یہ بتا

میری کیا ہے خطا

اس گیت کی دھن موسیقار کمال احمد نے کمپوز کی تھی اس میں کمال کی بات یہ تھی کہ اس کی خوب صورت نغمہ نگاری بھی کمال احمد ہی نے کی تھی۔

قلمی ساتھی ہیں۔ وہ بھی ممبئی سے ہجرت کر کے آنے والوں میں تھے۔ موسیقار نے ان سے کہا۔

”ہاشمی صاحب، ایسے گانے لکھیں جو.....“
”گلوکار کے کس سے؟“
”نسیم بیگم اور.....“

”بس آپ مطمئن ہو جائیں۔ گانے بھی انشاء اللہ ہٹ ہوں گے اور قلم بھی۔“

نسیم بیگم کی گائیکی پر سب کو اعتماد تھا۔ انہوں نے ”اولاد“ کے لیے جو گایا وہ سب کو بہایا۔

☆ نام لے لے کے ترانہ تو جے جائیں گے

☆ تم قوم کی ماں ہو، سو چوڑا

☆ تم ملے پیارا، اب کوئی لڑمان نہیں (ہمراہ نسیم حسین)

جنوری 2019ء

تھی۔ بخیر نسیم کے قدم قدم پر نسیم بیگم کی صحیح رہنمائی کی جس کے نتیجے میں وہ ہر اس حق میں پوری اتریں۔ نسیم بیگم کو گانے بجانے سے دلچسپی چونکہ بچپن ہی سے تھی اس لیے بہت عمری ہی سے انہوں نے باضابطہ گلوکاری شروع کر دی تھی۔ جب انہوں نے ریڈیو پر گانا شروع کیا تو ان کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ جب ریڈیو سے قلمی دنیا تک ان کی رسائی ہوئی تو اس وقت وہ 19 سال کی تھیں متحدہ کورس گیتوں میں شریک ہونے کے بعد انہیں اپنی اکیلی آواز کا جادو چکانے کا موقع ملا۔ قلم والوں کو جب پتا چلا کہ یہ نئی نوبلی اور نوجو گلوکارہ تو غضب کی گانے والی ہے اس کی آواز میں جادو اثر نہیں، وہ تو ہر طرح کے گانے اور گیت پوری خوبی کے ساتھ گا سکتی ہے تو جس قلم والے کو جتنا موقع ملا اس کی قلمی آواز سے اپنی قلم میں کامیابی کا سزا کا گلوکار۔ سینئر ہدایت کار ایس ایم یوسف نے اپنی قلم ”سبکی“ بنائی تو اپنے موسیقار اے حمید کو کہا۔

☆ ہم بھول گئے ہر بات مگر تیرا پیار نہیں بھولے
☆ ہم نے جو بھولنے والے دل میں جیسے جاتے ہیں
☆ کہیں دودل جو مل جاتے بڑتا کیا زمانے کا
(ہمراہ سلیم رضا)

☆ کمزورے پہم ڈالے آ جاؤ آنے والے
☆ چاندی بنو میری تیری حوالے
☆ سبکی جن لے اپنا سامی آگوری جن لے اپنا
ساتھی (ہمراہ آرن برڈن کورس)

”سبکی“ کی کہانی بہت اچھی تھی اس پر ایس ایم یوسف کی ہدایت کاری جب کہ اس کے گانوں نے بھی اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

ایس ایم یوسف نے اپنی دوسری قلم ”اولاد“ بنائی تو اسی کامیاب گلوکارہ کو اپنی اس نئی قلم کی کامیابی کے لیے بھی ضروری تصور کیا۔ یوسف صاحب کوئی عام ہدایت کار نہیں تھے۔ ممبئی میں تھے تب بھی کامیاب قلمیں بناتے تھے، پاکستان آنے تو یہاں بھی بڑی اور کامیاب قلمیں بنائیں۔ اس قلم میں بھی ان کے موسیقار اے حمید تھے۔ ان سے انہوں نے کہا۔ ”مجھے اس قلم میں بھی اسی بلبل کی چکار چاہیے۔“

نغمہ نگار فیاض ہاشمی بھی یوسف صاحب کے پرانے

ماہنامہ مسرگشت

☆ لے دل تجھے دے چکے
کہہ دے منم ہم ہیں تیرے
وہی دہلی

”اولاد“ سدا بہار محاشرتی اور نغماتی قلم ثابت
ہوئی۔ اس نے کوئلن جوہلی کی۔

اس قلم کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ حیدر مراد پبلی
بار اداکار کی حیثیت سے اس قلم میں حعارف کرائے گئے
تھے۔ یہ ایک مختصر اور ثانوی کردار تھا۔

بمیل پاکستان کی چپکار قلم ”شہید“ میں بھی نمایاں طور
پر سن گئی۔ اپنے دور کے مجوز ڈائریکٹر غلط قیصر نے بھی اپنی
اس قلم کی کامیابی کو جتنی بتانے کے لیے نسیم بیگم سے کئی
کیفیات کے گیت گوائے اور ہر گیت کو نسیم بیگم کی طلسمی آواز
نے یادگار نغمہ بنادیا۔

☆ میری نظریں ہیں نکوار
کس کا دل ہے روکے دار (بول خور نقوی)

☆ جیہی حیا حیا
نقاب جب اٹھایا

شاب رنگ لایا (بول خور نقوی)

☆ جب سانوئی شام ڈھلے
اور چاند کی شمع جلے (بول قیس شفا)

☆ اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو (بول سیر نیازی)
خود غلط قیصر کا بھی یہ کہنا تھا کہ ”شہید“ کی کامیابی میں
نسیم بیگم کے گائے ہوئے گیتوں کا بھی بہت اہم کردار ہے۔

نجم نقوی کی قلم ”اک حیرا سہارا“ کو بھی نسیم بیگم کے
گانوں نے بڑا مضبوط سہارا دیا۔ ماسٹر حیات حسین اس قلم
کے موسیقار اور قیس شفا کی گیت نگار تھے یہ قلم آپ نے
دیکھی ہو یا نہ دیکھی ہو مگر اس کے یہ گیت آپ نے ضرور سنے
ہوں گے جن کے گانے والی نسیم بیگم تھیں۔

☆ اسے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں

☆ مگھو مگھو گھٹا ہوا ہے

☆ پھر یاد کسی کی آئی ہے

☆ میرا سہمی میرے ساتھ نہیں

☆ بادلوں میں چھپ رہا ہے چاند کیوں

☆ اپنی زلف کی گھٹا ہے پوچھو (میرا سلیم رضا)

ایک گیت یا ایک گانا کئی فنکاروں کی قلمی صلاحیتوں
سے تخلیق ہوتا ہے۔ شاعر شاعری کے روپ میں انسانی
جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ موسیقار اس شاعری کے لیے

مدد دہن کہہ دیتا ہے اور گانے والا یا گانے والی اپنی دلکش
آواز سے اسے آراستہ کرتا یا کرتی ہے۔ اس طرح جو نغمہ
سامنے آتا ہے وہ تین کلاکاروں کے فن کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ہر
گانا یا ہر گیت مقبول نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کبھی
دہن اچھی ہوتی ہے مگر گانے والا اچھا نہیں ہوتا یا اچھی گیت
کے بول بے اثر ہوتے ہیں۔ نسیم بیگم کے کچھ گانے ہوئے
گانے بھی مقبول نہیں ہوئے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ ان
کے بول یا دھن اچھی نہ ہوں۔

قلم ”لیبرا“ کا یہ گیت جب موسیقار سیف چٹائی
نے نسیم بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیا تو ایک پھل ہو گئی۔ ہر
جانب سانسوں سے اس گیت کی صدا گرائی رہتی تھی۔ آج
بھی اس گیت کی تازگی برقرار ہے۔

☆ گاہیں ہو گئیں پر ہم ذرا آواز تو دیتا

شاعر اختر رضا تو لباش کے اشعار جتنے اثر انگیز تھے
اس کی دہن بھی اتنی ہی دلکش تھی۔ ایسے میں نسیم بیگم کی جادو
بھری آواز نے اسے ناقابل فراموش گیت بنادیا۔ اس گیت
کی بہترین گائیگی پر نسیم بیگم کو سال کی بہترین گلوکارہ کا نثار
ایوارڈ بھی ملا۔

☆ نگار ایوارڈ پاکستان کا سب سے بڑا پبلک ایوارڈ
ہے۔ اسے حاصل کرنے والے اپنے آپ کو بہت خوش
نصیب سمجھتے ہیں ان کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے۔
نگار ایوارڈ کی بات چلی ہے تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ نسیم بیگم کو
ان کی بہترین گائیگی پر جو دیگر نگار ایوارڈ ملے ہیں یہ بھی بتا
دیا جائے۔

☆ سو پار چمن مہکا سو پار بہار آئی (قلم شام ڈھلے
1960ء)

☆ اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو (قلم شہید
1961ء)

☆ چندا توری چاندنی میں جیا جلا جائے رے (قلم
بانی 1963ء)

☆ گاہیں ہو گئیں پر ہم ذرا آواز تو دیتا (قلم لیبرا
1964ء)

☆ پہلا نگار ایوارڈ جس نغمہ پر ملا اس کے شاعر اردو
ادب کے نامور شاعر صوفی غلام مصطفیٰ نسیم تھے یہ پورا شعر
یوں ہے

☆ سو پار چمن مہکا سو پار بہار آئی
☆ دنیا کی وہی رونق دل کی وہی نغمائی

دوسرا نگرار ایوارڈ یافتہ فنم "اس بے وفا کا شہر ہے" یہ بھی اردو ادب کے جس منفرد شاعر کا قہادہ ہے تیرے نیاز۔ تیرا نگرار ایوارڈ حاصل کرنے والا گیت جو فلم "ہاجی" کا تھا اس کے نگرار احمد راعی تھے۔ یہ بھی اردو اور پنجابی ادب کے معروف شاعر تھے۔ اس گیت کی موسیقی سلیم اقبال نے کمپوز کی تھی جب کہ یہ ہدایت کار ایس سلیمان کی بطور ہدایت کار دوسری فلم تھی۔ چوتھا نگرار ایوارڈ حاصل کرنے والا فنم نگار ہیں ہوئیں پر ہم ذرا آواز تو دینا" کے شاعر اختر رضا قزلباش تھے۔ یہ بھی ادب کی دنیا سے ہی فلم کی دنیا میں آئے تھے۔

اس تناظر میں یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ جب تک ہمارے فلم والوں نے متعدد شاعروں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کیں ان کی فلموں کا معیار بلند رہا، ان کی فلموں کے گیت اور گانوں نے زبردست عوامی مقبولیت حاصل کی۔ جب فلم سکرز نے تک بندوں کو فنم نگاری کی ذمہ داری دی۔ فلمی گانوں کا معیار بس ایس وی سی رہا اور اب تو اللہ رحم کرے، ہر گانے والا خود ہی اپنے لیے گانے لکھنے لگا ہے۔ ایسے گانے ویڈیو طور پر برداشت کر لیے جاتے ہیں کہ ان میں "سننے" سے زیادہ "دیکھنے" کا انکم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے گانے اور گیت زیادہ دلوں تک نہ پہنچ رہے۔ اس تحریر میں متعدد نامی کے فنکاروں کے حوالے دیے گئے ہیں جو نصف صدی گزارنے کے باوجود آج بھی تروتازہ ہیں۔ زندہ ہیں۔

نیم بیگم کے گانے ہوئے پنجابی فلموں کے نام تو چکا ہوں اس لیے اردو فلموں کے نام بھی بتانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کچھ اردو فلموں کے نام تو مختلف گانوں اور گیتوں کے حوالے سے سامنے آچکے ہیں۔ اس کے باوجود جو کوشش کروں گا دیگر فلموں کے نام بھی ظاہر ہو جائیں۔ آخری داؤ، جان بہار، رخسانہ، رسوائی، اپنا اپنا، تیرے بغیر، ساتھی، عالم آراء، محل جاسم، ہمت، بھائی، شیریں، دل نادان، ڈاکٹر کی لڑکی، اسٹریٹ 77، سسلی، ساحل، شہزادی، شہباز، عزت، کالا پانی، ممتاز، نوکری، نیلوفر، وطن، تین بھول، شریا، جادو گر، زمانہ کیا ہے گا، دور راستے، نوکری، نیلوفر، وطن، تین بھول، شریا، جادو گر، زمانہ کیا ہے گا، دور راستے، سب کچھ شام کہیں، قازی بن عباس، محل بکاؤ، گلغام، منگول، ہایو، اجنسی، ایک منزل دور ہیں، دروازہ، درینہ، سکھ کا پنا، سرال، فدا، قیدی، موسیقار، مہتاب، محبوب، بارات،

ملہنا مسرگوشٹ

تیرا انداز، خون کی پیاس، خاندان، دھوپ جھاؤں، دلہن، سمیرا، حلق پر زور نہیں، گھوٹ، نتیجہ، ہمیں بھی جینے دو، اندھی محبت، آزاد، میں دن، بیٹی، عورت کا پیار، فرنگی، گہرا داغ، میکانہ، ماں کا پیار، نائیکہ، ایسا بھی ہوتا ہے، تماشا، تیرے شہر میں، چھوٹی امی، رقصہ، دیو داس، زمین، ساز اور آواز، جنم، عورت، فیشن، کنیر، مجاہد، یہ جہاں والے، ناچے ناگن، ہاچے بین، ہزار داستان، الہلال، آگ کا دریا، انسان، ہاٹی سردار، پائل کی جھنکار، تصویر، جانا، رسوائی، کون کی کا، کوہ نور، مگر کی لاج، مگر کا اجالا، مجبور، فنم صحرا، وطن کا سپاہی، البیلا، الفت، چٹان، حاتم طائی، دوست دشمن، رشتہ ہے پیار کا، شب بخیر، شطراں اور جنم، کافر گناہ گار، لاکھوں میں ایک، میں وہ نہیں، وقت کی پکار، اشارہ، افسانہ، باہم، بزدل، پاکیزہ، پرستان، جان آرزو، جھین لے آرزوی، دو بھائی، دھوپ اور سائے، شہنشاہ جہانگیر، صاعقہ، ظالم، عصمت، عاشق اللہ رخ، محل، میں کہاں منزل کہاں، مجھے جینے دو، ناخدا، ہامید، نادر خان، ولی محمد، آج، خون ناحق، دیا اور طوفان، دل بے تاب، زرقا، زندگی کتنی حسین ہے، سزا، سالگرہ، تخت اور تاج، ریشماں، کوثر، نجمہ، ہم لوگ، یہ راستے ہیں پیار کے، العاصفہ، انس، پرائی آگ، تیری صورت میری آنکھیں، دل اور دنیا، دنیا نہ مانے، دو باغی، سلام محبت، غرناطہ، گڑھی، پردیسی، زندگی ایک سفر ہے، زندگی کے میلے، سپہ سالار، سوداگر، میری زندگی ہے فنم، میری محبت تیرے حوالے، میں اکیلا، دلہن رانی، عفت، محبت، کئی سال پہلے، ملاپ اور نشاندہ غیرہ۔

نیم بیگم کی اردو اور پنجابی فلمیں سو سے زائد ہیں جن کے لیے انہوں نے چار سو سے زیادہ گیت گائے ہیں۔ وہ چونکہ گائیکی، نغمہ نگاری اور ہلکے ہلکے گیتوں، طرے اور ترنہ گانوں اور غزلوں کی گائیکی میں مہارت رکھتی تھیں اس لیے ہر موسیقار کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنی فلم کے گانے اور گیت نیم بیگم سے ضرور گوائیں۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ نیم بیگم کا گایا ہوا فنم عوامی مقبولیت حاصل کرے گا اور ان کی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہوگا۔ 1950ء کی دہائی کے وسط سے 1960ء کی دہائی کے وسط تک نیم بیگم کی گائیکی کافی عروج پر تھا۔ اس زمانے کے ہر بڑے چھوٹے موسیقار نے ان سے اپنی فلموں کے لیے گانے گوائے۔ سب ہی ان کی کارکردگی کے معترف تھے جب کہ وہ سننے والوں میں بھی بے حد مقبول تھیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس قدر

مقبولیت، عزت اور شہرت کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کبھی غرور نہیں کیا۔ وہ نہایت سادہ حراج اور پُر خلوص خاتون تھیں۔ اپنے پیشے اور کمزور زندگی سے بہت مطمئن تھیں۔ ان کے شوہر دین محمد کا تعلق قلموں انڈسٹری سے نہیں تھا۔ وہ لاہور کے ایک معروف پبلشر تھے۔ انہوں نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش گوار زندگی گزاری۔

نسیم بیگم نے یوں تو اپنے دور کے تمام ہی موسیقاروں کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں اپنی آواز کا جادو جگایا، جن میں بابا جی اے جتئی، خواجہ خورشید انور، رشید عطرے، ماسٹر عیادت حسین، شہر یار، اے حمید، مصلح الدین، دیو، بھٹہ چارہ، ثار یزدی، سکیل رحنا، ایم اشرف، سلیم اقبال، ماسٹر عبداللہ، خلیل احمد اور ناشاد کے نام نمایاں ہیں لیکن انہوں نے سب سے زیادہ گانے رشید عطرے کے بنائی ہوئی دھنوں میں گائے اور ان میں متحدہ نے زبردست مقبولیت حاصل کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رشید عطرے ایک ماہر فن موسیقار تھے اور جو منفرد تھیں کہ پوز کرتے تھے ان کے لیے نسیم بیگم جیسی بھی ہوئی گلوکارہ ہی کو ان کی گائیکی کے لیے بہترین تصور کرتے تھے۔

نسیم بیگم کو اس بات کا عراز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے تمام بڑے شاعروں کے تیتوں اور غزلوں کو اپنی آواز سے سجایا۔ ان میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، فیض شغالی، سیف الدین سیف، بھڑا کھنوی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، نسیم نیازی، حفظ ہوشیار پوری، حمایت علی شاعر، آغا حشر کاشمیری، تنویر نقوی، وارث لدھیانوی اور احمد راہی جیسے بلند پایہ شاعر شامل ہیں۔ نسیم بیگم نے اپنے ہم عصر گانے والوں کے ساتھ بھی گانے گائے۔ ایسے گانوں کو کبھی اصطلاح میں ڈبلٹ سوئنگ کہتے ہیں کہ ایسے نمونے جیٹ ٹنڈت ہیں۔

☆ جیادھڑ کے کسمی رکی جوڑے
نیماں بڑے جت جوڑ (مراہ نور جہاں، قلم بخت)
☆ مای نے تیتوں لے جانا، لے جا جانی (مراہ زبیدہ خانم قلم کرتا رسک)
☆ کہیں دودل جوں جاتے بگڑتا کیا زمانے کا (مراہ سلیم رضا قلم سہیلی)
☆ بادلوں میں چھپ رہا ہے چاند کیوں (مراہ سلیم رضا قلم اک تیرا سہارا)
☆ ہم نے تو تجھیں دل دے ہی دیا منم (مراہ سلیم رضا قلم پائل کی جھنکار)

☆ تیری بات سمجھ نہ آئے (مراہ احمد رشدی قلم دیوانہ)
☆ دل میں یوں یوں ہوتا ہے (مراہ احمد رشدی قلم خدا)
☆ تم ملے پیار لاپ کوئی ارمان نہیں، شکر یہ آپ کا (مراہ نسیم حسین - قلم اولاد)

☆ دل گئی آسمان سے زمیں۔ مجھ کو آنا نہیں ہے یقین (مراہ مہدی حسن - قلم پرانی آگ)
☆ دے گا نہ کوئی سہارا ان بے درد فضاؤں میں (مراہ مسدود رانا - قلم کون کی کا)
☆ وفاؤں کی ہم کو سزا تو نہیں دو گے۔ وفا تو نہیں دو گے (مراہ ملا بیگم - قلم پیغام)
☆ ہائے اللہ پانی میں آگ نہ اچھالیے (مراہ ناہید نیازی - قلم تیرا انداز)
☆ آئی جھوٹی بہار چھایا نیوں میں خمار (نذیر بیگم - قلم تانگے والا)
☆ شیخ زندگی تو نے جلائی کالی راتوں میں (مراہ عیادت حسین - قلم وطن)

☆ ہم بن گئے آج سوالی۔ یہاں اپنا نہیں کوئی (مراہ کوثر پروین - قلم نوکری)
☆ ہم منزلوں کی خاک ہیں۔ ہم راستوں کی دھول (مراہ عذرا سلطانہ - قلم تیری صورت میری آنکھیں)
☆ کسی رات ریشمی آئی۔ تاپے مورمان ہر جاگی (مراہ زاہدہ پروین - قلم بے گناہ)
☆ قدموں نے رک کے نگاہوں نے جھک کے۔ کہو کیا کہا ہے؟ (مراہ محبوب عالم - قلم مکمل قلم وصیت)
☆ مجھ سے تجھ کو پیار ہے کتنا۔ میری جان بتا (مراہ رجب علی - قلم پرانی آگ)

☆ نسیم بیگم کے گانے گانے یوں تو ان کے دور کی تمام ہی اداکاراؤں پر قلنائے گئے مگر ان کے نیر سلطانہ پر بیکرا اثر ہونے والے نغمے زیادہ پسند کیے گئے جن میں چند یہ ہیں۔
☆ ہم بھول گئے ہر بات مگر تیرا نہیں بھولے (قلم سہیلی)
☆ نام لے لے کے تیرا ہوتو جے جائیں گے (قلم اولاد)
☆ تم قوم کی ماں ہو سو چو ذرا۔ عورت سے ہمیں یہ کہتا ہے (قلم اولاد)
☆ چپکے چپکے کوئی تاروں سے صدا دیتا ہے۔ کوئی دنیا میں وفاؤں کا صلہ دیتا ہے (قلم ڈاکو کی لڑکی)
☆ کیسے کہوں تم کر میں تجھ سے یہ فسانہ (قلم نادر خان)

☆ میری انگلیاں نہ کہتا مورمانیں (قلم دیوداس)
☆ چمن چمن میری پاکی کی دھن گائے تیرا ترانہ
(قلم گوگشت)

جن دیگر ہیر و خیز پر ان کے گیت عکس بند ہوئے ان
میں سرست نذیر، صبیحہ خاتم، یلنہ، بہار، فردوس، دیبا، عالیہ،
آسیہ، رانی، رخسانہ، فہیم آرام، حسہ، زمرہ، سلونی، صوفیہ
بانو، زریا، غزالہ، شیریں، ایچی میٹولا، رجحانہ، آشا جھوسلے،
صابرہ سلطانہ، مینا شوری، نسرین، کبھت سلطانہ، طلعت
صدیقی، یاسمین، شعی، نیلی، پنا، جہم جہم، سیما، حنا،
صافقہ، ممتاز کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کچھ پر
پچھراڑھونے والے گیتوں کے نمونے پیش کروں گا۔

☆ سرست نذیر۔ میری نظریں ہیں تھوڑا کس کا دل
ہے رو کے دار (قلم شہید)

☆ نیلو۔ محبت کے دم سے یہ دنیا حسین ہے۔ محبت
نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے (قلم پرستان)

☆ فہیم آرام۔ ٹھنڈی گھٹا لہرائی ہے۔ پھر یاد کسی کی
آئی ہے (قلم اک تیرا سہارا)

☆ مینا شوری۔ سن عرض مری نبیوں کے نبی۔ محبوب
خدا (قلم سفید خون)

☆ زریا۔ میرے بچے میں بھی دل ہے کوئی اتنا سچے
(مہرا احمد رشدی قلم ہالم)

☆ رانی۔ ناچ رہی جو کن بین کی دھن پر۔ پریت مگر
کو جانا ہے (قلم ناچے ناچن باجے بین)

☆ دیبا۔ نہ ناب وہ سال ہے نہ ہے وہ فضا نہیں۔ بس
اک یاد ان کی ہے دل میں یاسمین (قلم پردیس)

☆ نسرین۔ اک میرا چاند اک میرا تارا۔ اسی کی
لاڈلی بابا کا پیارا (قلم شکر ہے)

☆ زمرہ۔ سائوں دی لے چل نال وے۔ پاؤں سونی
گڈی والیا (قلم چن چتر)

☆ صابرہ سلطانہ۔ میرے دل کا بگڑ خالی ہے۔ اور
اس کا کرایہ کوئی نہیں (مہرا احمد رشدی قلم شکر ہے)

☆ بہار۔ واہ جی واہ، مجھ بھر کے نظر کتنے ہوا دھر۔ کھو
دل میں ہے کیا؟ (قلم سلمیٰ)

☆ کبھت سلطانہ۔ تقدیر کے ظالم ہاتھوں میں انسان
ہے ایک کھلونا (قلم مکمل جاسم)

☆ سلونی۔ چوٹ ہم نے جو دل پہ کھائی ہے (قلم
چچین لے آزادی)

فدوی لاہوری، ہندو سے مسلمان ہو گئے
تھے۔ جوانی میں انہوں نے ایران کا سفر کیا اور
اصفہان میں چار برس قیام کیا۔ زیادہ قیام دہلی میں
رہتا تھا۔ احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے
ہزار روپیہ، گھوڑا اور گوارا انعام میں دی۔ سودا اور
فدوی کے (بنگال) ادبی معرکے بہت مشہور ہیں۔
تذکرہ نویس ان کی شاعری کے مداح ہیں۔ فدوی کا
دیوان نہایت دلچسپ ہے، مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔
اس لیے ہر غزل کے قطع میں حضرت رسالت مآب
اور حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کی ہے۔ پچاس سال
سے زیادہ کی عمر پر 1780ء میں فدوی نے وفات
پائی۔

مرسلہ: عکاس ترمذی، ملتان

☆ ناہید۔ پیار کے بدلے ہمیں پیار دیں گے۔ ہمیں
اور کیا سرکار دیں گے (قلم سپہ سالار)

☆ غزالہ۔ گدگدائی ہے کیوں بہار جنہیں۔ ہو گیا ہے
کسی سے پیار جنہیں؟ (قلم باغی سردار)

☆ آسیہ۔ میں تم سے کیسے کہوں مرادوں کیوں جموے
گائے (قلم میں اکیلا)

☆ نیلی۔ آئے گا مہم جب نظریں لبس کی (قلم سرال)
صوفیہ بانو۔ مجھ سے تجھ کو پیار ہے کتنا (مہراہ رجب
علی قلم پرانی آگ)

☆ شعی۔ مو ہے چھوڑا بلم اس پار گئے۔ تک تک نیناں
ہار گئے (قلم ساحل)

☆ حسہ۔ رنگ مٹھل ہے اور تنہائی۔ زندگی کس جگہ
چلی آئی (قلم جاوید)

☆ نغمہ۔ جیہہ دال دل ٹٹ جائے۔ جیہہ دی گل مک
جائے (قلم میرا دی)

☆ رخسانہ۔ ڈولے میرے پاؤں، جموے میرے
جھیکے۔ اونچی نیچی راہوں میں (قلم سلمیٰ)

☆ بقول شاعر۔ کہاں تک بنو گے کہاں تک سناؤں۔ نیم
بیک نے اپنے 16 سالہ مختصر فلمی کیریئر میں بہت کچھ کیا۔

بہت فلمی کارنامے انجام دیے۔ ان کے بے شمار گیت اور
گائے مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچے۔ ان کے دور کی تقریباً
تمام ہی اداکاراؤں پر ان کے گائے ہوئے نغمے عکسید کیے

گئے۔ اداکاراؤں کی خواہش ہوتی تھی کہ اس ملکہ موسیقی کے گائے ہوئے کسی کیت، کسی گانے، کسی غزل پر انہیں پر قارم کرنے کا موقع ملے تاکہ اس کیت کے حوالے سے وہ بھی ہمیشہ یاد رکھی جائیں۔

موسیقاروں کی بھی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنی ہر فلم میں اسی بلبل کی چکار شامل کریں تاکہ ساعت کے راستے دلوں میں اتر جانے والی اس کی رس بھری اور دلنشین آواز ان کے کہوڑے ہوئے گیتوں کو یادگار بنادیں۔

نسیم بیگم کی ہمعصروں میں بڑی بڑی اور نامور پہلے بیک نگر تھیں۔ جن میں ملکہ نرتم اور جہاں بھی شہرہ آفاق مغنیہ کے علاوہ ذبیحہ خانم، مالا، بیگم، نازیدہ نازی، نجمہ نازی، نذر بیگم، رودا، لیلیٰ، کوثر پروین، زاہدہ پروین، آئرن پروین بھی گانے والیاں موجود تھیں۔ ان کی موجودگی میں اپنے آپ کو منوانا اور بہتوں سے بہت آگے نکل جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ

اس سعادت پر دروازہ نہایت

تازہ ہنغہ خدائے بخشندہ

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ نسیم بیگم کی اپنی کوششیں اور کاوشیں بھی کم نہیں تھیں۔ نسیم بیگم کی سب سے پہلی کامیابی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملکہ نرتم اور جہاں کی موجودگی میں 1970ء تک انہوں نے بہترین گلوکارہ کی حیثیت سے چار گار ایوارڈز حاصل کیے جب کہ 1970ء تک نور جہاں کو بہترین گلوکارہ کے باجے ٹیٹا ایوارڈ ملے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ نور جہاں کو خود اس بات کا احساس تھا کہ نسیم بیگم نے ان کی سادہ کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایک دن مختار بیگم سے نور جہاں کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے مختار بیگم سے کہا۔ ”نی نی! آپ نے نسیم کو کیا تیار کیا، ہمارے لیے سیاسی چوس پیدا کر دیا۔“

آج کی نئی نسل سیاسی چوس سے نا آشنا ہے جس زمانے میں فوٹین چین استعمال ہوتے تھے یا فلم دوات میں ڈیکر لکھا جاتا تھا۔ ان دنوں کا فخر جب روشناسی زیادہ آجانی تھی تو ایک مخصوص کاغذ پر رکھ کر روشناسی یا سیاسی شک کر لی جاتی تھی۔ اس کاغذ کو سیاسی چوس یا لاڈا نگ بھی کہا جاتا تھا۔ بال چین کا رواج عام ہو جانے کے بعد جہاں فلم دوات اور فوٹین چین کو لوگ بھول گئے وہیں سیاسی چوس یا لاڈا نگ بھی ابھی عائب ہو گئے ہیں۔

نور جہاں کا نسیم بیگم کو سیاسی چوس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ جمعہ آٹھ دن کی لڑکی ان کی مقبولیت اور مانگ پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ جس طرح سیاسی چوس روشناسی کو چوس لیتی ہے اسی طرح یہ لڑکی مجھے چوس رہی ہے۔ میری اہمیت اور افادیت کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔

انہی چھوٹی عمر میں اتنا عروج حاصل کرنا بڑی بات ہے، بہت بڑی بات ہے صرف 35 سال کی عمر میں وہ فلمی دنیا کے نمبرے پہلے سے اٹھ کر اٹھ کے اس پار چلی گئیں۔ تقریباً سارے ہی کھٹے والوں نے ان کے انتقال پر ملال کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بچے کی پیدائش کے وقت دنیا سے رخصت ہو گئیں جس سے اس بات کا تاثر ملتا ہے جیسے یہ ان کے پہلے بچے کی زندگی تھی لیکن حقیقت کے بعد جو بات سامنے آئی ہے وہ چھ اور ہے۔ یہ ان کے پہلے بچے کی زندگی نہیں تھی بلکہ چھٹے بچے کو جنم دینے کے ایک مہینے بعد ان کے دماغ کی شریان پھٹ جانے سے ان کا انتقال ہوا۔ ہاں تاریخ وفات اور عرب نے درست لکھی ہے۔ تاریخ وفات 29 ستمبر 1971ء اور موت کے وقت ان کی عمر صرف 35 سال سب نے تحریر کی ہے۔ اللہ اہل غریب رحمت کرے۔ ایسے نابینا روزگار فنکار بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو اپنی مختصر زندگی میں اپنے بچے زندہ جاوید کارنامے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کو اپنے چاہنے والوں سے چھڑے 47 سال ہو گئے ہیں مگر ان کے گانے ہوئے کیت آج بھی ترناتازہ ہیں اور انے والے دنوں میں بھی زندہ و تابندہ رہیں گے۔ نسیم بیگم کی مختصر زندگی کی طرح ان کی فنی زندگی بھی بہت مختصر تھی۔ انہوں نے صرف اور صرف 16 برسوں تک اپنے فن کی جوت چمکائی اور پاکستانی فلمی صنعت میں دھوم مچائی۔

نسیم بیگم ایک پہلے بیک نگر تھیں جنہوں نے پاکستانی فلمی صنعت کو اپنی فلمی آواز کے حوالے سے بے اندازہ فائدہ پہنچایا۔ ان کا نام پاکستان فلم انڈسٹری کی تاریخ میں سنہری حروف میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اپنی سولہ سالہ فلمی کیریئر میں انہوں نے کامیابی کے حوالے سے جو کارنامے نمایاں انجام دیئے ہیں انہیں کسی فراموش نہیں کیا جاسکتا گا۔ ہم اپنی اس عظیم گلوکارہ کو اپنے چاہنے والے قارئین اور اپنے ادارہ کی جانب سے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دست پر دعا ہیں کہ رب العالمین ان کے درجات کو بلند سے بلند تر کرے، آمین ثم آمین۔





دیویداس کی پلار

www.upur.com

شہرت چند دن چترجی کا نام بنگلہ ادب میں نمایاں ہے۔ ان کے تقریباً تمام ناولوں پر مختلف زبانوں میں فلمیں بنیں، انہی ناولوں میں ایک ناول دیویداس بھی ہے، اس ناول پر دس سے بارہ زبانوں میں فلمیں بنیں۔ گویا اس ناول کے ایک کردار ہارو کو بہت سی اداکارائوں نے پیش کیا لیکن سچترا سین نے جس انداز سے اس کردار کو نبھایا کہ لوگ دم بخود رہ گئے۔ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اس سے بہتر انداز میں اس کردار کو کوئی پیش ہی نہیں کر سکتا۔

ایک نامور اداکارہ کا احوال زیست

حالات کا احساس چکانی تھی۔ ایک سادہ سی ساڑی میں لپٹا، سانچے میں ڈھلا ہوا نیم، سر و قد ہادقار اور پردہ دار، مدد بھری بولتی آنکھیں، تصنع سے عاری، سادگی میں پرکاری، فطری اداکاری، فن کی سحر طرازی، موثر کردار نگاری، دھیمادھیمیا ٹھہرا ٹھہرا سا لہجہ، میٹھی اور ملائم آواز میں سوز و گداز، جس

بنگلہ فلموں کی ساحرہ جس نے مغربی اور مشرقی بنگال کو اپنے سر میں کچھ ایسے بکڑا کر جس سے یہ دونوں حصے آزاد ہو کر بھی آزاد نہ ہو سکے۔ گندی رنگت، من موٹی صورت، کالی دراز زلفوں سے ابھرتا، دھیمی دھیمی سی لو دیتا ہوا حسن جس کی تپش قلب میں حرارت اور نگاہوں میں

والے رقص و موسیقی سے بھرے ڈرامے) کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ دہراپور جا میں ہر اس جگہ جہاں مورنی بٹھائی جاتی وہاں رقص و موسیقی کی خاص تکمیلیں مستند ہوتیں۔

پتھر کے سسرال میں بھی مورنی بٹھائی جاتی۔ ایک سال اس نے بھی درگاہ کے سامنے رقص پیش کیا۔ اس کے سر سے تعریف کرنے کے ساتھ اسے مشورہ دیا کہ وہ فلموں میں اپنا کیریئر بنائے۔ وہ ایک جوہری کی نگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس ہیرے کو پہچان لیا تھا۔ اس کے شوہر دیب ناتھ نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ شروع میں اس سے ہر طرح سے تعاون کیا چنانچہ پتھر اسٹین نے حوصلہ کے کھلتے کی فلم اظہر شری میں قدم رکھ دیا اور پھر بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

پتھر اسٹین کی پہلی فلم شیش کھائے 1952ء میں بنی جو بد قسمتی سے کبھی ریلیز نہ ہو سکی۔ اگلے سال اوپر تلے اس کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں سے ایک فلم ”ساڑھے چوتھر پاس آفس پر ہرٹ ہوئی“ یہ ایک کامیڈی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار نرمل ڈے (پیدائش 1913ء، ممبئی سنگھ، موجودہ بنگلہ دیش) تھے۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب ہدایت کار بلکہ ممتاز افسانہ نویس تھے۔ مذکورہ فلم کی کہانی بھن بھنا چارے (پیدائش 1911ء، فرید پور، موجودہ بنگلہ دیش) نے تحریر کی تھی۔ اس فلم میں بنگال کا اہم نواز خواہر واداد کار نامہ لکھا۔ پتھر اسٹین کے مقابل بطور ہیرو جلوہ گر ہوا اور یہیں سے اتم کمار اور پتھر اسٹین کی ایک ایسی روایتی جوڑی بن گئی جنم لیا جو اس سے پہلے بنگال کی فلم اظہر شری میں ناچے تھی۔

اس روایتی جوڑی کو عوام نے ایک تازہ ہوا کا جھونکا سمجھ کر ان کا نہایت خوش دلی سے استقبال کیا اور ان کی مقبولیت میں دن دوئی رات چوٹی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ جوڑی بیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک فلم بینوں کے دلوں پر راج کرتی رہی۔ ان دونوں کے درمیان وہی کیمسٹری تھی جو لپ کمار اور مدھو بالا کے درمیان تھی۔ اتم کمار ایک دراز قامت، پرکشش، خوش لباس اور باوقار ہیرو تھا۔ اس سے پہلے ایسا کوئی اداکار بنگال کی فلم اظہر شری میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ اس کی فطری اداکاری کی وجہ سے اسے بنگلہ فلموں کا دلپ کمار کہتے تھے اور یہ بے جا نہ تھا۔ خود دلپ کمار اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ بنگلہ فلموں میں جو مقبولیت، شہرت اور پڑائی اتم کمار کو ملی اس کا عنصر عیش بھی کسی اور ہیرو کو نصیب نہ ہو سکی۔ وہ بنگال

نے فلم بینوں کو مسحور کر لیا تھا اور مغربی بنگال فلمی صنعت میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ بھی پتھر اسٹین۔

اس سے پہلے بنگال کی فلمی صنعت میں ایسی کسی اداکارہ کا کوئی وجود نہ تھا جسوں فن کی یکجائی کی ایسی جیتی جاگتی مثال ہو کر جس پر لوگ دل و جان سے فریفتہ ہو جائیں۔ اس کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آئی، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا۔ اس بے مثال فن کارہ کی فلموں نے ایسی دھوم مچائی کہ مغربی اور مشرقی بنگال میں ہر سو اس کے چرچے ہونے لگے۔ وہ بنگال کے فلمی افق پر چھا گئی۔ لوگ اس کی فلمیں دیکھنے کے لیے سینما ہال پر ٹوٹ پڑتے۔ اس کی ہر فلم مقبولیت کی ایک نئی تاریخ رقم کر دیتی۔

مغربی اور مشرقی بنگال میں یکساں مقبول فلم بینوں کے دلوں پر راج کرنے اور دیوبی کا درجہ پانے والی یہ بحر طراز فن کارہ 6 اپریل 1931ء کو مشرقی بنگال، موجودہ بنگلہ دیش کے پندرہ ضلع میں واقع ایک گاؤں تل جی میں پیدا ہوئی۔ اس کا اصلی نام واداس پیتا تھا۔ اس کے والد مقامی اسکول میں ہیڈ ماسٹر اور داد بنگال کے مشہور شاعر بنی کانت تھے۔ پتھر اسٹین کے پندرہ گورنمنٹ اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنے بھائی بھنوں میں پانچویں اور ستویں میں تیسری تھی۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے وقت وہ سولہ سال کی تھی۔ قیام پاکستان کے نتیجے میں یہ فیملی مشرقی پاکستان سے کلکتہ ہجرت کر گئی اور اسی سال یعنی 1947ء میں کلکتہ کے ایک نہایت امیر و کبیر صنعت کار وادی ناتھ کے بیٹے دیا ناتھ سے اس کی شادی ہو گئی۔

اس طرح پانچ برکری بیت گئے۔ اس دوران وہ ایک بچی مٹن مٹن سین کی ماں بنی جوڑی ہو کر اپنی ماں کی طرح اداکارہ بنی لیکن اس سے پہلے اس نے اوکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی اور کلکتہ کے ایک کالج میں بطور لیکچرار انگریزی پڑھاتی رہی۔ پتھر اسٹین کو فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بھی بھمار کوئی فلم دیکھ لیتی تھی۔ اس نے فلموں میں کام کرنے کا تو بھی سوچا تھا۔

بنگالی معاشرے میں رقص و موسیقی کو اہمیت حاصل ہے۔ وقاص و شہزادوں کو، گلوکاروں کو خاص عزت دی جاتی ہے۔ مندروں میں بھجن گانے والیوں اور بھگوان کی ارادہ نماں رقص کرنے والی لڑکیوں کو تو سر آکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ بنگالی معاشرے میں ”جاترا“ (ساری رات چلنے

شرابی لیڈی آری آفسر، ریٹا براؤن کا کردار ادا کرنے پر دیا گیا تھا۔ یہ فلم دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ مذکورہ فلم کو اتم کمار نے پروڈیوس کیا تھا۔ اس کی کہانی ایک بنگلہ ناول، پتاپ پرتی می جو 1958ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مصنف ممتاز ادیب تارا شکر تھے۔ فلم کا منظر نامہ بھی ان کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے دوسری عالمی جنگ کے دوران پیش آنے والے ایک سچے واقعے کو ناول کا روپ دیا تھا۔ مذکورہ فلم میں اتم کمار نے ہلور ہیر و جیمز اسٹین کے مقابل ایک ڈاکٹر پاری کا کردار ادا کیا تھا جو کلکتہ اور صوبہ بہار کے درمیان واقع ایک گاؤں پٹیکورا میں ملٹری اسپتال چلاتا ہے۔

ایک دن اس کے اسپتال میں ایک اینگلو انڈین شرابی لیڈی آری آفسر علاج کی غرض سے لائی جاتی ہے جو بے ہوش ہے۔ جنگل کا ویرانہ، رات کا وقت اور اسپتال میں ناکافی روشنی کے باوجود ڈاکٹر پاری، ہوش میں لاتے وقت پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیتا ہے اور اس پر سکتہ ساعاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی کلاس لیڈ اور سابقہ محبوبہ ریٹا براؤن تھی۔ کبھی وہ کلکتہ کے میڈیکل کالج میں ساتھ پر دھا کرتے تھے۔ ہوش میں آنے پر ریٹا براؤن بھی ڈاکٹر کو پہچان لیتی ہے کہ وہ ڈاکٹر کوئی اور نہیں بلکہ اس کا محبوب کرشن تھا۔ کالج کے زمانے میں دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن جب وہ شادی کا فیصلہ کرتے ہیں تو مذہب آڑے آ جاتا ہے۔ کرشن ریٹا براؤن کا باپ مسٹر براؤن اس شرط پر ان کی شادی پر آمادگی ظاہر کرتا ہے کہ اگر کرشن اپنا دھرم چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ کرشن ایک بے دھرم نوجوان تھا۔ وہ بنگوان کو نہیں مانتا لیکن اس کا کنز ہندو باپ (بھپی بسواس) اس شادی کی شدید مخالفت کرتا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر ایک اینگلو انڈین لڑکی کو اپنے گھر کی بیوی بناسکتا۔ بے دھرم کرشن اپنے باپ سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کی خاطر عیسائیت قبول کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ریٹا براؤن کو حاصل نہیں کر پاتا۔ نتیجتاً دونوں کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتی ہیں اور اب ایک طویل مدت کے بعد وہی ریٹا براؤن شراب کے نشے میں دھت ایک لیڈی آری آفسر کی حیثیت سے اس کے سامنے ہے ہوش پڑی گئی۔

پتہ پتہ اسٹین اور اتم کمار کی ایک شاہکار فلم تھی۔ اس کا ایک فلم میں پتہ پتہ اسٹین کو اس کی کہانی سے موثر کردار نگاری پر

کا مہمان تک تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پتہ پتہ اسٹین اور اتم کمار بنگال کے لیڈنگ فنکار تھے۔ ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو کبھی کوئی چیلنج نہ کر سکا۔ پردہ سیمیں پر ان کے درمیان نظر آنے والی دھنسی ہم آہنگی، رنگت اور اپنائیت، جذباتی وابستگی اور بے ساختگی، ان کی فکشن اور وارگری، ان کا دالہا نہ پن اور دل موہ لینے والی فطری اداکاری دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہوں۔ یہ دلپسند کمار اور مدھو بالاکا طرح کا دھرم سورج کی جوڑی تھی۔ یہ سن کا وہ مقام ہے جہاں اداکاری جیسے بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور دو دلوں میں پلنے والے فطری جذبات اور احساسات کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ جہاں خاموشی زبان میں نظر آتی ہے اور تاثرات کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ جہاں من و تو کا رشتہ ایک ابدی اکائی میں بدل جاتا ہے۔ ہر چند کہیں کہ اداکاری ہے نہیں ہے۔ دلپسند کمار اور مدھو بالاکا فلمیں اس کی عمدہ اور اعلیٰ مثال ہیں جہاں اداکاری حقیقت میں بدل جاتی ہے۔ اتم کمار اور پتہ پتہ اسٹین کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔

بہت سے فلم بین سمجھتے تھے کہ یہ دونوں حقیقی زندگی میں مایا بیوی ہوں گے لیکن جو جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہے، ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ کاش ایسا ہوتا جب کہ ایسے ماحول اور پرستاروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی جو اس جوڑی سے اتنا پیار کرتے تھے کہ چاہتے تھے، ان کا کوئی اسکینڈل منظر عام پر آئے تاکہ ان کی حسرت حقیقت میں بدل جائے لیکن..... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ کے مصداق ان کی حسرت بھی پوری نہ ہو سکی۔ پتہ پتہ اسٹین حقیقی زندگی میں بھی اتنی ہی باوقار اور مرد بارگشی تھی جتنی وہ پردہ سیمیں پر نظر آتی تھی۔ اداکارہ ہونے کے علاوہ وہ ایک بیوی بھی تھی اور اس نے اپنا یہ کردار بھی بہت خوبی سے نبھایا۔ اسی طرح اتم کمار بھی پہلے سے شادی شدہ اور ایک سلیبا ہوا، سنجیدہ اور ڈنٹے دار شخص تھا۔ پتہ پتہ اسٹین نے ایک موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اتم کمار میرا دوست ہے اور یہ دوستی بہت گہری ہے۔ وہ ایک ریزروم، کم آئیز اور مرد بارگشی ہے۔“

☆.....☆

پتہ پتہ اسٹین پہلی بھارتی اداکارہ تھی جس نے 1963ء میں تیسرے ماسکو انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں بہترین اداکارہ کا غیر ملکی ایوارڈ حاصل کیا۔ یہ ایوارڈ اسے 1961ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”پتاپ پتہ“ (سات قدم) میں ایک اینگلو انڈین

غلام“ جسے 1962ء میں دوبارہ ہندی میں صاحب، بی بی اور غلام کے نام سے بنایا گیا۔ اس کی کاسٹ میں گردوت، رحمان، دینا کماری اور وحیدہ رحمان شامل تھے اور اس فلم نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ مذکورہ ہندی ورژن میں گردوت نے اتم کمار اور دینا کماری نے سحر ادیوی کا کردار ادا کیا تھا۔ صاحب بی بی غلام کی کہانی ممتاز بنگالی ادیب کل ستر کے اسی نام کے ناول پر مبنی تھی جو 1953ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا موضوع بھارت میں دم توڑتا ہوا جاگیردارانہ نظام تھا۔ سترادو واحد ناول نگار اور افسانہ نویس تھے جنہیں بنگلہ اور ہندی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا اور وہ دونوں زبانوں میں ناول اور افسانے لکھتے تھے۔ ان کی ہندی تحریروں میں ”بنیم ہری و خوش“ سب جموٹ ہے اور ”گل مہر“ وغیرہ شامل ہیں۔

1992ء میں اعزازی آسکر ایوارڈ اور اسی سال بھارت کا سب سے بڑا سولین ایوارڈ بھارت رتن حاصل کرنے والے عظیم ہدایت کار، افسانہ نویس، فلمی کہانی نویس اور نقاشی ستہ جیت رائے (پیدائش 1921ء، کلکتہ وقات 1992ء، کلکتہ) کی بنگلہ فلم ”ٹانک“ میں اتم کمار کے مقابل شرمیلا ٹیگور نے ہیروئن کا کردار نبھایا تھا۔ یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کی کہانی ستہ جیت رائے کے زور قلم کا نتیجہ تھی۔ ستہ جیت رائے کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس کی کہانی اتم کمار کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی۔ اس فلم نے تین ملکی اور تین بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کیے جن میں بہترین ہدایت کار اور بہترین اداکار کے ایوارڈز بھی شامل تھے۔

1970ء میں بننے والی بنگلہ فلم ”نیشی پدی“ میں اتم کمار کے مقابل سادری چڑی ہیروئن کے کردار میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ فلم کی کہانی تجو بوشن کے اسی نام کے ایک افسانے پر مبنی تھی۔ یہ فلم 1972ء میں امر پریم کے نام سے ہندی میں بنائی گئی جس میں رامیش کھنہ اور شرمیلا ٹیگور نے اتم کمار اور سادری چڑی کا کردار نبھایا تھا۔ اس فلم نے دو فلم فیئر ایوارڈز اور ایک فیملی ایوارڈ حاصل کیے۔

1971ء میں ریلیز ہونے والی ”مجمد بیشی“ میں اتم کمار کے مقابل بادھادی سکریتی نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی بھی ایک افسانے پر مبنی تھی۔ اسے 1975ء میں ”چپکے چپکے“ کے نام سے ہندی میں بنایا گیا جس کی کاسٹ میں دھرمیندر، شرمیلا ٹیگور، اجیتا بھجین اور جیا بچن شامل تھے۔ مذکورہ فلم میں دھرمیندر نے اتم کمار اور

غیر ملکی ایوارڈ سے نوازا گیا اور اس فلم نے انٹرنیشنل فیسٹیول میں بہترین فلم کا ایوارڈ حاصل کرنے کے علاوہ شوقیت آف میٹ بھی حاصل کیا۔ اس کے لگ بھگ بیس سال بعد مذکورہ فلم کاردی سیک ٹیلگو میں اور بھر پیتھالیس سال بعد 2006ء میں پرنیشا (انتظار) کے نام سے ہندی میں پیش کیا گیا جس میں دھرمیندر نے ستر اسین کا کردار ادا کیا لیکن یہ دونوں ہی فلمیں ہاس آفس پر ناکام رہیں اور فلمی نقادوں اور تجزیہ کاروں کے مذاق کا نشانہ بن گئیں۔ دیا مرزا کا کہنا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر چپا نہیں دیکھی تھی کہ کبھی ستر اسین کی کردار نگاری اس کے حوصلے بہت نہ کر دے اور وہ ریٹا براؤن کا کردار بخوبی ادا نہ کر سکے لیکن شاید یہی اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔ اگر وہ مذکورہ فلم دیکھ لیتی تو اسے بہت کچھ سیکھنے اور کھینچنے کا موقع مل جاتا اور وہ ریٹا براؤن کا کردار بہتر طریقے سے نبھانے کے قابل ہو جاتی۔

1955ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”شاراوپرے“ (سب سے بالا) ستر اسین اور اتم کمار کی ایک اور شاہکار فلم تھی۔ اس کی کہانی بھی ایک ناول پر مبنی تھی۔ یہ ایک عورت کے قتل کی بہت ہی عجیبہ، پراسرار اور سنسنی خیز فلم تھی جس میں اتم کمار کے بے گناہ باپ (پچھی بسواس) کو قتل کے الزام میں بارہ سال کی سزا ہو جاتی ہے۔ اتم کمار بڑا ہو کر وکیل بنتا ہے۔ وہ بارہ سال پرانے قتل کے کیس کی ازسرنو تحقیق کر کے اپنے بے گناہ باپ کا مقدمہ لڑتا ہے اور اس مجرم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ اس پراسرار اور سنسنی خیز فلم کا ہندی ری میک فلم ”کالا پانی“ تھی جو 1958ء میں پیش کی گئی۔ اس میں دیو آنند اور دھوبالا نے اتم کمار اور ستر اسین کا کردار نبھایا تھا۔ ”شاراوپرے“ کا چرچہ 1979ء میں جاپانی میں ”توکی اشیتا“ اور 1979ء میں پاکستان میں ”سلاٹھیں“ کے نام سے بنایا گیا جس میں محمد علی نے پچھی بسواس کا کردار ادا کیا تھا۔



اگر یہ کہیں کہیں ستر اسین اور اتم کمار کی جوڑی ان کی کامیابی کی ضامن تھی تو یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ اتم کمار نے دوسرے زائد بنگلہ اور پندرہ ہندی فلموں میں شرمیلا ٹیگور، تنوید، دیپا سنہا، سلکھہ پنڈت، موکی چڑی، سمرتا دیوی، سپریا چودھری اور وحشی ملا وغیرہ کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا اور یہ سب یادگار فلمیں ہیں مثلاً 1956ء میں ریلیز ہونے والی بنگلہ فلم ”صاحب بی بی

سونے پر سہاگاتھی۔

1963ء میں ریلیز ہونے والی بھگہ فلم ”سات“ کے باعدھا۔ (سات گرہ میں بندھا) میں پتھر اسین کے مقابل موہتر چڑھی نے ہیر ورن کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی مشہور بنگالی ادیب اشوٹوش کمرتی (پیدائش 1920ء ڈھاکہ، وفات 1989ء کلکتہ) کے اسی نام کے ناول پر مبنی تھی۔ یہ پتھر اسین کی ایک یادگار فلم ہے جسے دس سال بعد 1974ء میں کورا کاغذ کے نام سے ہندی میں بنایا گیا۔ اس ہندی ورژن میں جیا بھن نے پتھر اسین اور بچے آئندے سو تیرا چڑھی کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ جیا بھن کی بہترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ جیا بھن نے مذکورہ فلم میں بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔

”اتر چھائی“ بھی ایک ایسی ہی بھگہ فلم تھی جس میں پتھر اسین اور اتم کمار کی جوڑی نہیں تھی۔ 1963ء میں ریلیز ہونے والی اس ٹکاسی فلم کا فلم ساز اتم کمار تھا لیکن اس نے اس فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ مذکورہ فلم کی کہانی مشہور بنگالی ادیب ڈاکٹر نہار رجن پتا کے اسی نام کے ناول پر مبنی تھی۔ اس فلم میں پتھر اسین نے پہلی بار ماں اور بیٹی کا ڈبل رول ادا کیا تھا۔ اتر چھائی کے ہدایت کار ایست سین (پیدائش 1922ء ڈھاکہ، وفات 2001ء کلکتہ) تھے۔ انہوں نے اپنی اس فلم کو تین سال کے بعد 1966ء میں دوبارہ ہندی میں ”متا“ کے نام سے بنایا تھا۔ اس ہندی ورژن میں بھی پتھر اسین نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔ اس کے مقابل اشوک کمار اور دھرمیندر تھے۔ مذکورہ فلم نہ صرف باکس آفس پر ہٹ ہوئی بلکہ اس نے بہترین فلم کا فیمل فلم ایوارڈ بھی حاصل کیا جب کہ ہندی ورژن متا باکس آفس پر ہٹ ہونے کے ساتھ ہی روس میں بھی ہلاک بسر ثابت ہوئی۔ مذکورہ فلم میں پتھر اسین کے تین روپ تھے۔ پہلا روپ ایک غریب لڑکی کا جو ایک دولت مند وکیل سے محبت کرتی ہے اور وہ وکیل ہیر سٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ دوسرا روپ ایک طوائف کا جو اپنے ادباز، بلیک میلر شوہر کو گولی مار دیتی ہے اور تیسرا روپ ایک جوان بیٹی کا (ڈبل رول) جو لندن سے ہیر سٹری کی ڈگری کے لیے آئی ہے اور اس طوائف کا مقدمہ لڑتی ہے جس نے اپنے شوہر کا قتل کیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہی طوائف اس کی سگی ماں ہے۔ مذکورہ ہندی ورژن ”متا“ کو بہترین فلم، بہترین ہدایت کار (ایست سین)، بہترین اداکارہ (پتھر

شرمیلا ٹیگور نے مادھادی کمرتی کا کردار نبھایا تھا جب کہ اچھا بھنچن اور جیا بھن نے سائیل رول نبھائے تھے۔ یہ ایک کامیڈی فلم تھی۔

1967ء میں ریلیز ہونے والی اتم کمار کی ذاتی ہندی فلم ”چھوٹی سی ملاقات“ میں چھٹی مالا نے اس کے مقابل ہیر ورن کا کردار نبھایا تھا۔

1975ء میں بننے والی ہندی فلم ”اناش“ میں اتم کمار اور شرمیلا ٹیگور نے ہیر ورن اور ہیر ورن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار شتی سامنت تھے اور اسے بہترین فلم کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

1977ء میں بننے والی ہندی فلم ”کتاب“ میں اتم کمار کے مقابل دیپا سنہا نے ہیر ورن کا رول نبھایا تھا۔ اس فلم کے کہانی نویس اور ہدایت کار گھوار تھے۔ اس فلم کو بھی بہترین فلم کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

1977ء ہی میں ریلیز ہونے والی ہندی فلم ”آئندہ آشرم“ میں اتم کمار اور شرمیلا ٹیگور ہیر ورن اور ہیر ورن جلوہ گر ہوئے جب کہ اشوک کمار نے اتم کمار کے باپ کا رول ادا کیا۔ مذکورہ فلم کی کہانی ایک ناول سے ماخوذ تھی۔

1979ء میں ریلیز ہونے والی ہندی فلم ”دوریاں“ میں اتم کمار کے مقابل شرمیلا ٹیگور نے ہیر ورن کا رول ادا کیا تھا۔

1982ء میں بننے والی ہندی فلم ”دیش پریمی“ کے ہدایت کار سن موہن ڈیسیائی تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں اتم کمار، اچھا بھنچن، ہیمامانی اور شرمیلا ٹیگور شامل تھے۔ فلم ”میرا کرم میرا دھرم“ 1987ء میں ریلیز ہوئی تھی جس میں اتم کمار، دھرمیندر، لوسی چڑھی اور جانی واکر نے اپنے فن کے جوہر دکھائے تھے۔

☆.....☆

اس طرح پتھر اسین نے اپنے پچیس سالہ فلمی کیریئر میں ساتھ میں سے تیس فلموں میں اتم کمار کے ساتھ اور باقی تیس فلموں میں دیگر بنگالی اداکاروں کے علاوہ سات ہندی فلموں میں دیپ کمار (دیو داس)، دیو آئندہ (سردھ)، بھتی کا (بابو)، بھارت بھوشن (چچا گلی)، دیپ کمار اور ششمیر (مسافر)، اشوک کمار اور دھرمیندر (متا) اور سنجیو کمار (آندھی) کے مقابل ہیر ورن کا کردار ادا کیا۔ ان فلموں نے نہ صرف بے پناہ مقبولیت حاصل کی بلکہ ان کا شمار کلاسیکی فلموں میں ہوتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ان کی جوڑی

کردار ادا کیا تھا۔ اگلے سال 1936ء میں سی بی بروانے ”دیوداس“ کو ہندی میں قلمبیا جس میں کے اہلی سہگل نے ”دیوداس“ اور جتنا بروانے پارتی کا کردار ادا کیا۔ اس کے لگ بھگ انیس سال بعد (جس کے دوران دیوداس بنگلہ سمیت مختلف زبانوں میں ہندی میں بقی رسی) مشہور ہدایت کار پٹیل رائے (پیدائش 1906ء ڈھاکا، وفات 1965ء بمبئی) نے 1955ء میں دیوداس کو ہندی میں قلمبیا جس میں دلپ کمار نے دیوداس جب کہ جتھرا سمن نے پارتی اور دھننی والا نے طوائف، چندرا پٹیل کا کردار ادا کیا تھا۔

☆.....☆

سرت چندر چڑجی (پیدائش 1876ء بمبئی، مغربی بنگال، وفات 1938ء کلکتہ عمر 61 سال) کے لگ بھگ پچاس ناولوں اور افسانوں کو قلمبیا چاچکا ہے۔ ان کے ناولوں پر پٹیل فلموں نے بھارت کی فلم انڈسٹری پر انہیں نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ سب کی سب شاہکار فلمیں ہیں جو کلاسکس کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان فلموں نے نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی ایوارڈز بھی جیتے لیکن جو مقبولیت، دیوداس کو حاصل ہوئی، وہ برصغیر میں کسی بھی ناول کو حاصل نہ ہو سکی اور مقبولیت اور شہرت اس کے مرکزی کردار کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آتی۔ دیوداس فنکشن کی دنیا کا ایک اچھوتا اور منفرد کردار ہے جسے دلپ کمار نے عکس و آئینہ کی دنیا میں امر کر دیا۔ سرت چندر کے اس لافانی ناول نے نہ صرف برصغیر کے ماحول میں محبت میں ناکام ہونے والوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ کسی نے بھی ایسی محبت نہیں کی ہوگی جیسی دلپ کمار نے دیوداس میں پاروہ کی اور کسی بھی کردار سے لوگوں نے اتنی محبت نہیں کی ہوگی جتنی دیوداس سے کی۔

جب سرت چندر نے یہ ناول لکھا تھا اس وقت ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ انہوں نے 1901ء میں یہ ناول مکمل کیا جب وہ چوبیس سال کے تھے۔ ناول ”دیوداس“ 1917ء میں شائع ہوا تھا۔ جب سے اب تک سو سال کا عرصہ یعنی پورے ایک صدی گزرنے کے باوجود یہ کلاسیکی ناول اور اس کا مرکزی کردار زبان زد عام ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اعزاز صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک بنگلہ، ہندی، اردو سمیت ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کے 16 ورژن ریلیز ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سمن) اور بہترین کہانی (ڈاکٹر نہار رنجن کپتا) کے لیے فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ”منا“ کا رومی میک 1970ء میں تامل میں، 1972ء میں ملیالم میں پیش کیا گیا اور اس کا چرچہ 1970ء میں پاکستان میں ”انسان اور آدمی“ کے نام سے بنایا گیا جس میں زیانے جتھرا سمن، محمد علی نے اشوک کمار اور طلعت حسین نے دھرمیندر کا کردار ادا کیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کہانی کار پر شاب کیرانوی کا نام تھا۔

☆.....☆

کلکتہ میں بننے والی بنگلہ فلموں کو ملن کے اچھوتے، منفرد حقیقت پسندانہ اور انتہائی موضوعات کی بناء پر بھارتی فلم انڈسٹری کی ناک کہا گیا ہے۔ بے شمار بنگلہ فلموں کو ہر طرح کے بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی قدر افزائی اس حقیقت سے عیاں ہے کہ بہت سی بنگلہ فلموں کو بعد میں ہندی سمیت ہندوستان کی مختلف زبانوں مثلاً تامل ملیالم وغیرہ میں دوبارہ بنایا گیا جسے ری میک کہتے ہیں۔ وہ بنگلہ فلم ”دینا پاؤنا“ (دین دین) جی جو 1931ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسے 1936ء میں دوبارہ ”پجارجن“ کے نام سے ہندی میں بنایا گیا۔ اس کی کہانی بنگال کے مایہ ناز ناول نگار اور افسانہ نویس سرت چندر چڑجی کے اسی نام کے ناول پر مبنی تھی۔ ”دینا پاؤنا“ میں سرت چندر نے جیمز کی لخت اور عورت کی بے بسی اور مظلومیت کو بہت ہی موثر طریقے سے پیش کیا تھا۔ فلم ”پجارجن“ کی کاسٹ میں مشہور ٹھوکار اور اداکار کے ایل سہگل، چندراواتی، کے سی ڈے اور پہاڑی سانیا شامل تھے۔ یہیں سے بنگلہ فلموں کے ری میک کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ ہنوز جاری ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال 2017ء میں بننے والی، دوبابائلی کی فلم ”بیکم جان“ ہے جو 2015ء میں بننے والی بنگلہ فلم ”راج کہانی“ کا ری میک ہے۔ فلم ”دینا پاؤنا“ برصغیر کی تیسری بولی فلم تھی۔ پہلی فلم ”عالم آرا“ تھی جو اسی سال بنی تھی۔ سرت چندر چڑجی کے مشہور زمانہ کلاسیکی ناول ”دیوداس“ کو سب سے پہلے 1928ء میں قلمبیا کیا گیا تھا۔ یہ ایک خاموش فلم تھی۔ بولی فلم ”دیوداس“ پر تیش چندر بروا (بی بی بروا) نے 1935ء میں بنائی تھی جس میں خود اس نے ”دیوداس“ اور اس کی بیوی جتنا بروا نے پارتی کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم میں کے ایل سہگل نے طوائف کے کونٹھے پر ہارمونیم بجانے والے کا

کے کردار کے لیے محذرت کر لی۔ تاہم دھمکوش کا کہنا ہے۔ ”ہم بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ ہمارا بجٹ بہت کم تھا اور کوئی بھی اداکارہ چندرا رمی کے کردار کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ سب پارٹی کے رول کے لیے آپس میں لڑ رہی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اداکارہ نکل داکو مناسب نہیں لگ رہی تھی۔ ان کے ذہن میں کون سی اداکارہ تھی، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف چندرا رمی کے کردار کے لیے پریشان تھے۔ ان حالات میں ایک دن چنتی مالا کل داسے ملے آئی۔ وہ ایک انجینیئر تھیں اور رفاہی ادارہ طور اداکارہ میرے لیے ناقابل قبول تھیں لیکن اس نے ہمیں اس مشکل سے نکال دیا۔ اس نے کہا۔ ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں چندرا رمی کا کردار ادا کر سکتی ہوں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔“ ہم نے بہت مجبوری میں اسے قبول کر لیا کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور جب کل داسے پارٹی کے کردار کے لیے اسے انتخاب کا اعلان کیا تو ہم لوگ حیران رہ گئے، وہ بھی ہجر امین۔“

☆.....☆

کل داسے کی بیٹی رنگی رائے کا کہنا ہے۔ ”ہجر امین ہمارے لیے غیر معمولی بلکے ہماری فیملی کا ایک حصہ تھی۔ وہ باپو (ابا) کوکل داس کے بیٹے تھے۔ جیسا کہ سب لوگ کہتے تھے بلکے کل داسوں کو بھی تھی۔ واصل اس کے سرسادی ناتھ میرے پھوپھا تھے۔ ان کی شادی باپو کی بڑی بہن روشن آراء سے ہوئی تھی لیکن وہ زیادہ عمر زدہ نہ تھیں رہیں۔ ان کی وفات کے بعد پھوپھا اوی ناتھ نے دوسری شادی کر لی تھی پھر بھی ہمارے گھر کو تعلقات ہمیشہ پہلے جیسے ہی رہے اور ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کی دوسری بیوی سے دیپا ناتھ پیدا ہوا، جس سے ہجر امین کی شادی ہوئی۔ میں نے ہجر امین کو اپنے ہاں ایک ڈز پارٹی میں دیکھا اور حیران رہ گئی۔ اس میں فلم ایکٹریس والی کوئی چمک دمک نہیں تھی۔ نہ ذوق برق لباس، نہ غارہ، نہ پاؤں پر بھی ہلائی ٹرکشن۔ وہ ایک طرف کھڑی امی سے ہاتھیں کر رہی تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر بھی سمجھتا کہ وہ کوئی بڑوں کی پامیری سہیلی ہوگی۔ وہ سر سے پاؤں تک پارو بھی مکمل پارو۔ جب ابو نے اسے فلم ”دیوداس“ کے لیے دیپ کمار کے مقابل پارٹی کے کردار کی پیشکش کی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے پہلی بار کسی ہندی فلم میں کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس فلم کے ہیرو دیپ کمار تھے جن سے وہ

دیوداس 1928ء سے اب تک جب سے پہلی فلم ریلیز ہوئی تھی، فلم سازوں کا سب سے پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ 1936ء میں دیوداس اس کے پہلے ہندی ورژن کے پونٹ میں بھی رائے، اپنی سی پردا کے چٹائی فوٹو گراف کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس وقت انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ انہیں جب بھی موقع ملا، وہ دیوداس ضرور بنائیں گے۔ انہیں یہ موقع انیس سال کے بعد نصیب ہوا۔ اس سے پہلے وہ 1953ء میں دو ہیکڑ زمین (بلواج رافٹی، نواب رائے رتن کمار) اور 1954ء میں ”بھراج بھو“ (کاشی کوٹل، ابھی بھٹا چاریہ) جیسی انقلابی سوشل فلمیں بنا کر ملکی اور غیر ملکی ایوارڈز حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے 1955ء میں جب دیوداس بنانے کا اعلان کیا تو مرکزی کردار کے لیے کسی کا انتخاب ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان کا پہلا اور آخری انتخاب دیپ کمار تھا جو بنانا دیوداس تھا۔ اصل مسئلہ پارٹی (پارو) اور طوائف چندرا رمی کے کردار کے لیے ہیروئن اور سائڈ ہیروئن کے انتخاب کا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے پارٹی کے کردار کے لیے مینا کماری اور چندرا رمی کے کردار کے لیے فرنس کا انتخاب کیا لیکن مینا کماری کے لاکھ چاہنے کے باوجود اس کے شوہر کمال امر دھوی نے کچھ ایسی کڑی شرطیں عائد کر دیں جنہیں پورا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کمال امر دھوی نے بہت زیادہ معاوضہ طلب کیا تھا۔ کل داکو پونٹ بہت بڑا لیکن بجٹ بہت کم تھا۔ کل داکو کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی فلموں کے معاملے میں بھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ فرنس بھی چندرا رمی کے کردار کے لیے راضی نہیں ہوئی۔ اسے پارو کا رول چاہیے تھا لیکن کل داکو اس پر تیار نہیں ہوئے۔ گمان غالب ہے کہ وہ مینا کماری کی طرف سے انکار کے بعد پارٹی کے کردار کے لیے کسی اداکارہ کا انتخاب کر چکے تھے اور انہیں پریشانی صرف چندرا رمی کے لیے کسی اداکارہ کے انتخاب کی تھی۔ لہذا انہوں نے چندرا رمی کے کردار کے لیے مینا رائے سے رابطہ کیا لیکن مینا رائے کو بھی چندرا رمی کے کردار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں وہ پارو کے کردار کے لیے تیار تھیں لیکن کل داکو اس پر راضی نہیں ہوئے۔ مشہور بنگالی ادیب اور دیوداس کے اسکرپٹ رائٹر تاندو دھمکوش نے کل داکو مشورہ دیا کہ ٹریا سے بات کی جائے لیکن جب ٹریا سے بات کی گئی تو اس نے بھی پارو کے رول میں دلچسپی ظاہر کی اور چندرا رمی

بہت متاثر تھی اور دلپ صاحب کے کیا کہنے، وہ تو بنے بنائے دیوداس تھے۔ ابو کا پارہی کے لیے پتھر اسین کا انتخاب سونی مدد دست تھا۔ جب ہم نے دیوداس دیکھی تو قلم کے سحر میں ڈوب گئے۔

☆.....☆

ابھی پتھر اسین کو گلکھ کے قلم اڑسری میں داخل ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔ اس دوران وہ چودہ بگلہ قلموں میں جلوہ گر ہو چکی تھی۔ ”دیوداس“ اس کی پندرہویں اور پہلی ہندی قلم تھی۔ کھل دانے یہ کہہ کر اسے دلپ کمار سے متعارف کرایا کہ یہ بہت باصلاحیت فنکار ہے۔ دلپ کمار کا کہنا ہے۔ ”وہ نام صرف باصلاحیت بلکہ ایک ذہین فنکارہ تھی۔ اس کی خرابی آنکھیں ہوتی تھیں۔ وہ اسکرپٹ پر ایک نظر ڈال کر منظر قلمانے کے لیے تیار ہو جاتی۔ میں جتنی پرورد نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہ بھی اتنی ہی پرورد نظروں سے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتی۔ ایسے ہی ایک منظر میں جب ہم دونوں پرورد نظروں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے تو اس کے ہونٹ بگلے سے قہر خراٹے گویا وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن جذبات کی شدت سے کہ نہ پاری ہو۔ یہ ایک اضافی چیز تھی جس کا اسکرپٹ میں ذکر نہ تھا۔ اس چیز نے نام صرف مجھے بلکہ کل دا کو بھی بہت متاثر کیا اور ہم نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ میں اپنی پارو کو بھی نہیں بھول سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی جوڑی اتم کمار کے ساتھ بہت کھلی لگتی تھی۔“

سرت چندر چترجی نے ناول دیوداس میں طبقاتی اونچ نیچ کو جس خوب صورتی سے روئاس کے ساتھ جوڑ کر گلے سڑے جاگیر دارانہ نظام کے کردہ چہرے کو بے نقاب کیا تھا اور کل رائے نے حقیقت پسندی سے کہانی کی روح کو اس کے ماحول کے ساتھ جس موثر طریقے سے سلولائیڈ میں منتقل کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دیوداس کی محبت میں ناکامی اور اونچی اور چچی ذات کا شائبہ نہیں تھی کیونکہ دیوداس بھی برہمن تھا اور پارہی بھی برہمن تھی۔ فرق صرف امیری اور غریبی کا تھا۔ دیوداس گاؤں کے زمیندار کا بیٹا تھا جب کہ پارو ایک غریب برہمن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ طبقاتی اونچ نیچ تھی جس نے دو محبت کرنے والوں کو ایک نہیں ہونے دیا اور دیوداس سے اس کے خواب بچیں کر شراب کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھادی۔ دیوداس اپنے غم کو شراب میں ڈبو کر پینے لگتا ہے۔ چونکہ اس میں سماج اور اس کے

مضبوط جاگیر دارانہ نظام سے ٹکرانے یا اسے لٹکانے کی ہمت نہیں تھی لہذا وہ اس کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنی محبت کو قربان کر دیتا ہے۔ وہ گاؤں کی تہذیب اور روایت پر کوئی حرف نہیں آنے دیتا، اپنی محبت کو رسوا نہیں کرتا، پورے گاؤں میں سوائے پارو کی ایک راز دار سبکی کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ دیوداس اور پارو ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ ادھر پارو کی شادی ایک قہریمی گاؤں کے بوڑھے زمیندار سے ہو جاتی ہے اور ادھر دیوداس اس خاموشی سے گلکھ چلا جاتا ہے کیونکہ اس میں وہ منظر دیکھنے کی تاب نہیں لگتی۔ وہ کسی سے کوئی لگہ، کوئی شکوہ نہیں کرتا اور اپنی ہی ذات سے انتقام لینے پر تل جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے پارو کی یاد میں کسی کھلی گودی کی مانند ملٹتا رہتا ہے اور اپنے آپ سے ایک بھی ختم نہ ہونے والی جنگ لڑتا رہتا ہے۔ وہ سماج کا ایک معصوم اور مظلوم فرد ہے جس کے بس میں کچھ نہیں۔ لہذا وہ وہی کرتا ہے جو اس کے بس میں ہے یعنی محبت میں ناکامی اور خودی کا اپنی ہی ذات سے انتقام لینا۔ دیوداس کو شراب نے نہیں بلکہ طبقاتی اونچ نیچ نے دیوداس بنایا تھا۔ پارو کا غم اسے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے اور وہ یہ جنگ لڑتے لڑتے ایک دن پارو کی دلیہ پر اپنی زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔

دلپ کمار، دیوداس کے کردار میں پوری قلم میں سراپا ورد کی تصویر بنانے کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس بی بی بردا کا دیوداس، سبھی، گلکھ پیچ کر شہری بالوبنے کے چکر میں پڑ کر نئے نئے سوٹ سلواتا ہے، ٹائی اور بیٹ پہنتا ہے، بھرے کی انگوٹھی خریدتا ہے، مسکرا مسکرا کر اپنے نئے سکرٹ کس میں سے سکرٹ منتخب کر کے حے حے سے کش لیتا ہے۔ قلم بین حیرت سے اس دیوداس کو دیکھتے ہیں جسے پارو سے چمڑنے کا کوئی غم نہیں، جو نو جوان نہیں جس کی تو عذراں ہاں ہے اور جب وہ گاؤں میں پارو سے ملتا ہے تو ہنس بھس کر اس پر طر کر رہا ہے، جو شکاری سوٹ اور بیٹ پہن کر پردوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ اسی طرح بی بی بردا کی پارہی، جتنا بردوا، نسوانیت اور نسوانی کشش ہے۔ سکر عاری، انتہائی معمولی شکل و صورت کی حامل ہے جسے بڑی آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے جب کہ کھل دا کی پارہی، پتھر اسین، حسن بنگال کی جیتی جاتی تصویر نظر آتی ہے۔ بی بی بردا کے دیوداس کے آخری مناظر قلم میں پڑ کر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتے جب کہ کھل دا کے دیوداس کے آخری مناظر

اداکارہ پارٹی کے کردار میں پتھر اسٹین کی جگہ لے سکتی ہے۔ فلمی دنیا کے اعلیٰ پائے کے نقادوں، معصروں، تجزیہ کاروں، مصنفوں اور ہدایت کاروں نے جہاں دیپ کمار کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، اس کی کردار نگاری کو غیر معمولی، ہوش رہا اور ناقابل فراموش قرار دیا ہے، وہاں پتھر اسٹین کی کردار نگاری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے کہ وہ پارٹی کا کردار ادا کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔

☆.....☆

گلتہ میں بننے والی بلکھ فلمیں شروع ہی سے آرٹ اور اوپ کے سامنے میں پروان چڑھتی آتی ہیں۔ ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ بیشتر فلم ساز اور ہدایت کار چونکہ ادبی ذوق کے حامل تھے، لہذا وہ اعلیٰ پائے کے ناولوں اور افسانوں کو لیول لائیڈ میں منتقل کرنے کو ترجیح دیتے آئے ہیں جن میں معاشرتی ناہمواری، انسانی جذبات اور احساسات، ظلم اور نا انصافی، انسانیت، ذات پات، فرقہ پرستی، جہالت اور استیصال جیسے سکتے ہوئے سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہو۔ عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار ستیجیت رائے جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین ہدایت کاروں میں ہوتا ہے، نے اعزازی اسکرین پلے سیت بے شمار بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کیے۔ ان کی ایک فلم ”پوئیم پچالی“ کو 1955ء میں گیارہ بین الاقوامی ایوارڈز سے نوازا گیا۔ انہوں نے خریشلا فاکر (ٹیگور) اور اداکار سوسرا چڑتی کو 1959ء میں اپنی فلم ”آپو کا سنسار“ میں متعارف کرایا جس نے ملکی اور کئی بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کیے۔ اس فلم نے پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے اور آج بھی عظیم ترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ ستیجیت رائے نے زندگی میں صرف ایک اردو فلم ”شہر خج کے کلاڑی“ 1977ء میں بنائی تھی جس کی کاسٹ میں شانہ اعظمی، سنجو کمار، سعید جعفری اور ہانی دوڈے کے مشہور اداکار رچرڈ انجین بروئے برطانوی جہاز کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی منشی پریم چند کے اسی نام کے ایک افسانہ پر مبنی تھی اور یہی رچرڈ انجین بروقا جس نے 1963ء میں دوسری عالمی جنگ کے موضوع پر بننے والی سکرینڈ الارٹلم ”ڈی کریٹ اسکپ“ میں جرسن قیدی اسکوارڈن لیڈر کا کردار ادا کیا تھا، جو جرسن کپ سے ڈھائی سو جتنی قیدیوں کے عظیم فرار کی نہ صرف منصوبہ بندی کرتا ہے بلکہ اس فرار کو سپر وائز بھی کرتا ہے، جسے سارے قیدی بک ایکس کہتے ہیں۔ اس عظیم الشان اور ناقابل

اس قدر دلہن ہیں کہ فلم بینوں پر سکتہ سالاری ہو جاتا ہے اور انہیں پتا بھی نہیں چلتا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ان کے گالوں کو نم کر رہے ہیں۔ اسکرپٹ رائٹر نابندو مکوش کے مطابق جب دیپ کمار کے مرنے کا منظر فلما جا رہا تھا تو یہ منظر اتنا حقیقی اور دفرشا تھا کہ ہمیں ایسا لگا کہ جیسے یوسف بھائی ہم سے بچ بچ جدا ہو رہے ہوں۔ اس احساس کے ساتھ ہی ہم لوگوں کی حالت غیر ہو گئی۔ میں نے ایسا چافٹکارا پیڑی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔

فلم دیوداس کو چار فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا۔ کل رائے کو بہترین ہدایت کار، دیپ کمار کو بہترین اداکار، موتی لعل کو بہترین معاون اداکار اور چنتی مالا کو بہترین معاون اداکارہ کا جب کہ پتھر اسٹین کو بہترین اداکارہ کا فیصل ایوارڈ ملا لیکن چنتی مالا نے بطور معاون اداکارہ فلم فیئر ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی اداکار نے فلم فیئر ایوارڈ لینے سے انکار کیا تھا۔ چنتی مالا کا موقف یہ تھا کہ وہ فلم کی ہیروئن تھی اور اس کا کام بھی پتھر اسٹین کے مقابلے میں زیادہ تھا، لہذا اسے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ چاہیے اس کی وہ سختی ہے۔ اسے یہ پاور کرانے کی کوشش کی گئی کہ فلم کی ہیروئن وہ نہیں بلکہ پارٹی (پتھر اسٹین) تھی۔ طوائف چندرا سمی کا کردار معاون اداکارہ کا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ وہ واضح طور پر پتھر اسٹین سے حسد کا شکار ہو گئی تھی جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس نے لگ بھگ بیس سال کے بعد 1974ء میں دیوداس تامل زبان میں پروڈیوس کی جس میں خود اس نے پارٹی اور اس کے شوہر ڈاکٹر کرشنا نے دیوداس کا کردار ادا کیا۔ ایسے ہی وقت میں تیلوڈ زبان میں بھی دیوداس بنی اور دونوں فلمیں ایک ساتھ ریلیز ہوئیں۔ دونوں میں تمہان کا مقابلہ ہوا۔ نتیجتاً دونوں ہی بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ چنتی مالا کی پارٹی کا کردار ادا کرنے کی دیرینہ آرزو تو پوری ہو گئی لیکن گوہر مراد ہاتھ نہ آیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ہندوستان کی اب تک کی تاریخ میں دیوداس کے 16 ورڈن بن چکے ہیں لیکن جو شہرت اور مقبولیت کل دا کے دیوداس کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی کیونکہ نہ تو کوئی ہدایت کار کل دا کی طرح اسے اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے، نہ کوئی اداکار دیپ کمار کی طرح دیوداس کے کردار میں ڈوب کر فطری اداکاری کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی

فراموش قلم کی کاسٹ میں اسٹیو میک کوئن (ہیو ہیرو)، چارلس برڈسن، جمو کارنر اور جمو کو برن جیسے چوٹی کے اداکار شامل تھے۔ واضح رہے کہ ”دی گرینٹ اسکپ“ پال برک ہل کی اسی نام کی نان فکشن کتاب پر مبنی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس فلم کے ہیرو اسٹیو میک کوئن 1963ء میں تیسرے ماسکو انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں بہترین اداکار کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا جس میں پطرسین نے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

ستہ جیت رائے بھارت کے واحد آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والے ہدایت کار ہیں۔ ان کے علاوہ نعل رائے تن بوس، اسیت سین، رشی کشن کرجی، شام بھنگل، رتیک گھنگ، مزال سین اور تپن سہتا جیسے اعلیٰ پائے کے ہدایت کاروں اور فلم سازوں نے ہمیشہ سماجی مسائل کو رومانس اور انسانی جذبات و احساسات اور انداز کے ساتھ جوڑ کر حقیقت پسندانہ انداز میں نہایت موثر طریقے سے اپنی فلموں میں اجاگر کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

1913ء میں ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے شہرہ آفاق شاعر، ادیب، افسانہ نویس اور ڈراما نگار، رابندر ناتھ ٹاگور (نیگور) کے تمام ادبی شہ پاروں کو تسلیم کرنے میں مہتمل کیا جا چکا ہے مثلاً تین کتیا، چاروکتا، کالمی والا، ڈاک گھر، درپیشی دان، نو کا ڈوبی، دیوبی اور گوند پھر۔ ان کے ایک ناول نو کا ڈوبی پر مبنی ہندی فلم ”بہن“ بھی جو 1944ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس میں دیپ کمار اور میرا سبراشرانے ہیرو اور ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ دیپ کمار کی تیسری فلم تھی۔ مذکورہ ناول 1956ء میں تھن داسی کے نام سے ٹیلگو میں 1960ء میں گھوگھٹ کے نام سے

ہندی میں اور 2011ء میں ناڈ کا ڈوبی کے نام سے بنگلہ میں قلمبایا گیا۔ ملن ایک دلچسپ سٹیج اسٹیویشن خیر فلم تھی جس میں ایک طوفانی رات کو بارشوں سے بھری دو کشتیاں ایک دوسرے کی موجودگی سے لاعلم رہ پائیں ڈوب جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کشتی میں دو لہلا دیپ کمار اور اس کے گھر والے سوار تھے۔ دیپ کمار کی زندگی میں تیرہ سال پر پھنچتا تو اسے ایک دلہن بے ہوش کی حالت میں پڑی ملتی ہے۔ وہ اسے اپنی دلہن سمجھ کر گھر لے آتا ہے اور اسے ہوش میں لاتا ہے لیکن جب وہ اسے سوٹایا کے نام سے مخاطب کرتا ہے تو دلہن جواب دیتی ہے کہ وہ سوٹا نہیں، اس کا نام کلمبا ہے۔ یہ سن کر دیپ کمار کے ہیروں تلے سے زمین ٹھل جاتی ہے۔

یہ کس کی دلہن ہے؟ اس کی دلہن کہاں ہے؟ کیا اس طوفانی رات کو بارشوں سے بھری کوئی اور کشتی بھی دریا میں اٹنی تھی؟ وہ بارش کی کون تھے؟ اس کا دلہا کون ہے؟ اب وہ کیا کرے؟ وہ کسی اور کی دلہن کو اپنی دلہن بنا کر کیسے رکھ سکتا ہے؟ وہ اس معصوم لڑکی کو کیسے بتائے کہ وہ اس کا شوگر نہیں ہے؟ اگر اسے اصلیت کا پتا چل گیا تو کیسے یہ خودکشی نہ کر لے لیکن وہ اس جھوٹ کو کب تک بھاسکتا ہے؟ اور کیسے؟ اگر دنیا والوں کو پتا چل گیا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسے ہر قیمت پر اس کے دلہا کو ڈھونڈنا پڑے گا۔ پتا نہیں، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں ہے؟ یہ فلم شروع سے آخر تک فلم بینوں کو اپنی گرفت میں جکڑے رکھتی ہے۔ اس کے ہدایت کار تپن بوس (پیدائش 1897ء، کلکتہ، وفات 1986ء کلکتہ) تھے اور موسیقی مشہور موسیقار اٹل بھوسا (پیدائش 1914ء، باریال شرقی بنگال موجودہ بنگلہ دیش وفات 2007ء دہلی) نے ترتیب دی تھی۔ اس کے گیت نگار آرزو لکھنوی تھے اور بے بیک منگر گیتاوت (پیدائش 1930ء فرید پور، شرقی بنگال موجودہ بنگلہ دیش، وفات 1972ء بمبئی، عمر 41 سال) بھی جو کردار کی بیوی تھی۔

رابندر ناتھ ٹاگور کے ایک شاہکار افسانہ ”کالمی والا“ کو بے پہلے 1957ء میں اسی نام سے بنگلہ میں اور پھر 1961ء میں ہندی میں قلمبایا گیا جس کے فلم ساز نعل رائے تھے۔ یہ بلا تقربق مذہب و ملت، انسانیت پر مبنی، انسانی رشتوں سے گھڑی ہوئی، ایک بہت ہی حساس اور جذباتی فلم ہے جو فلم بینوں کے دل کے تاروں کو چھیرتی اور ان کے احساسات کو ہنجوز کر رکھ دیتی ہے۔ اس فلم میں چوٹی کے بھارتی اداکار بلراج سہتی نے ایک کالمی پٹھان کا مرکزی کردار ادا کیا تھا جو اپنی ماں کی ایک بیٹی کو اپنی بڑھاپاں کے پاس چھوڑ کر روزی کمانے نکلے آتا ہے اور محکم پھر کر ڈرائی فروٹ اور گرم شال بیچتا ہے۔ اسی دوران اسے ایک ادیب کی بیٹی سے بے حد انسیت ہو جاتی ہے جو اسے اپنی بیٹی کی یاد دلاتی ہے۔ وہ اسے روز ڈرائی فروٹ لا کر دیتا ہے۔ بیٹی بھی اس سے بے حد مانوس ہو جاتی ہے اور روزانہ اس کی راہ بھی ہے۔ بیٹی کا ادیب باپ (تپن) بھی اس کالمی والے سے بہت متاثر ہوتا ہے جو بھی اس سے ڈرائی فروٹ کے پیسے نہیں مانگتا اور جب بیٹی ایک مرتبہ بیمار پڑ جاتی ہے تو وہ اس کے گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر ساری رات جاگ کر

گزار دیتا ہے اور وہیں فجر کی نماز پڑھ کر خدا سے بچی کی صحت یابی کی دعا کرتا ہے کہ خدا اس کی جان لے لے اور اس بچی کو صحت یاب کر دے۔ بچی کا پاپ یہ سب دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔ بچی صحت یاب ہو جاتی ہے۔ کالمی والا پھر اپنے وطن سے لگ جاتا ہے لیکن اسی دوران اس کے ہاتھوں ایک شخص کا قتل ہو جاتا ہے جس نے اس سے ادھار شامل خریدی تھی اور پیسے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کالمی والے کو دس سال کی سزا ہو جاتی ہے۔ جب وہ سزا کاٹ کر باہر آتا ہے تو بچی سے ملنے جاتا ہے۔ اب وہ بچی جوان ہو چکی ہے اور اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا اس نے اسے پہچانا؟ وہ لڑکی اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ کالمی والے کے دل پر ایک قیامت سی گزر جاتی ہے اور ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی ہیں۔ اسے اپنی بچی یاد آ جاتی ہے جسے وہ وطن چھوڑ آیا تھا۔ وہ سوچتا ہے، اس کی بچی بھی اب بڑی ہوئی ہوگی۔ کیا وہ اسے پہچانے گی؟

کالمی والا، بلراج ساسی کی ایک ناقابل فراموش قلم ہے۔ اس کلاسیک فلم نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ رابندر ناتھ ٹیگور (پیدائش 1861 کلکتہ، وفات 1941 کلکتہ) کی زندگی کا ایک سچا واقعہ ہے اور وہ ادیب وہ خود تھے جس کا کردار فلم میں بجن نے ادا کیا تھا۔

☆.....☆

ہجر اسین کی ناقابل فراموش فلموں میں ”دب چلے جانی“ (دیا جلا جاؤں) ایک منفرد فلم ہے۔ یہ فلم 1959ء میں بنی تھی اور اس کے ہدایت کار اسیت سین تھے جو بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ فلم کی کہانی صاحب طرز بنگالی ادیب اشوتوش کرمی کے ایک افسانہ ”نرس میتر“ پر مبنی تھی۔ یہ اشوتوش کرمی کا پہلا افسانہ تھا اور ایک رسالے میں شائع ہوا تھا۔ ”دب چلے جانی“ اسیت سین کی بہترین فلموں میں بہترین مانی جاتی ہے۔ یہ انتہائی حساس، سنجیدہ اور دعوت نگر دیتی ہوئی شاعرانہ مزاج کی حامل ایک اچھوتی اور منفرد قلم تھی جس کا موضوع نفسیات تھا۔ لوگ آج تک اس فلم کو فراموش نہ کر سکے حالانکہ یہ کوئی روایتی فلم نہیں تھی اور اس پر ہجر اسین کے مقابل کوئی روایتیک ہیرو بھی نہیں تھا۔

ذکورہ فلم کی کہانی کلکتہ کے ایک مشہور سائیکل ٹرک

سرت چند چٹرجی کے ناول ”پریشیتا“ کو سب سے پہلے 1942ء میں بنگلہ میں پھر 1953ء میں ہندی میں (اشوک کمار، مینا کمار) نقلایا گیا، اس کے بعد پھر 1969ء میں ہندی میں (سوی چٹرجی، سوترا چٹرجی) نقلایا گیا۔ ایک بار پھر 1976ء میں ہندی میں منوچ کے نام سے (ہیرمانی، جیتندر) نقلایا گیا۔ اسے پانچویں مرتبہ ”پریشیتا“ کے نام سے ہندی میں (سیف علی خان، دوپا بان، نغمہ دت) 2005ء میں نقلایا گیا۔ اسی طرح ان کے ناول ”میراج بہو“ 1946ء میں پہلے بنگلہ پھر 1954ء میں ہندی میں (کامنٹی سوشل ایمری جانیہ) اسی نام سے نقلایا گیا۔ ناول ”بیج دیدی“ کو 1950ء میں پہلے بنگلہ پھر 1967ء میں ہندی میں (مینا کمار، دھرمیندر) ”مجمعی دیدی“ کے نام سے نقلایا گیا۔ ناول ”چندت مشائے“ کو پہلے 1951ء میں بنگلہ میں پھر 1975ء میں ہندی میں (ہیرمانی، جیتندر) ”خوشبو“ کے نام سے نقلایا گیا۔ اس کے ہدایت کار رگزار تھے۔ ناول ”چندرا ناتھ“ کو 1957ء میں اسی نام سے بنگلہ میں (ہجر اسین، اتم کمار) نقلایا گیا۔ ناول ”راج کشی کانت“ کو 1958ء میں اسی نام سے بنگلہ میں (ہجر اسین، اتم کمار) نقلایا گیا۔ ناول ”مگر یہاں وہاں“ (انکاروں کا گھر) کو 1967ء میں اسی نام سے بنگلہ میں (ہجر اسین، اتم کمار) نقلایا گیا۔ اس فلم کو اتم کمار نے پروڈیوس کیا تھا۔ ناول ”کسل دتا“ کو 1969ء میں اس نام سے بنگلہ میں (ہجر اسین، اتم کمار) نقلایا گیا۔ ناول ”بندور چیلے“ (بندو کا لڑکا) کو 1971ء میں ہندی میں ”چھوٹی بہو“ (راجیش کھن، شرمیلا ٹیگور) کے نام سے نقلایا گیا۔ ناول ”دیت“ کو 1976ء میں اسی نام سے بنگلہ میں (ہجر اسین، سوترا چٹرجی) نقلایا گیا۔ ناول ”سوامی“ (شوہر) کو 1977ء میں اسی نام سے ہندی میں (شبانہ اعظمی، گریش کرناڈ) نقلایا گیا۔ ناول ”تھکر جی“ (نجات) کو 1980ء میں ہندی میں ”اپنے پرانے“ (شبانہ اعظمی، امول پالیکر) کے نام سے نقلایا گیا۔

ہسپتال کی ایک جوان اور خود رز جس (جرا) (جرا اسمن) کے گرد گھومتی ہے۔ وہ ہسپتال کی اس ٹیم کا ایک حصہ ہے جو ایسے مریضوں کی قمرانی کے لئے طریقے وضع کرتی ہے جو کسی شدید ذہنی اور جذباتی صدمے یا محرومیت کا شکار ہو کر نفسیاتی مریض ہو گئے ہوں۔ اس ٹیم کی تجویز یہ ہے کہ ایسے ذہنی مریضوں کو ذہنی اور جذباتی سکون پہنچا کر ہی ان میں بھری لائی جاسکتی ہے۔ اس تجرباتی قمرانی سے گزرنے کے لئے ٹیم کا سربراہ ماہر نفسیات کرنل (پہاڑی سانپال)، نرس جرا کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ مریض سے قریب ہونے کے لئے بیک وقت اس کی دوست محبوبہ حتیٰ کہ ماں کا فرضی اور عارضی کردار ادا کرتے ہوئے اس کی دلجوئی کرے اور اس کی ذہنی روح پر پیار کا مہم رکھے لیکن اس عمل میں اس کے اپنے جذبات کسی طرح بھی لوٹ نہ ہوں۔ اسے صرف اداکاری کرنی ہوگی اور سیمیں سے نرس رادھا جرا کا کردار شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک دوست اور محبوبہ بن کر ایک ذہنی مریض (اجیت چرجی) کے قریب ہو جاتی ہے اور اس کی حصار داری کرتی ہے لیکن اس تجرباتی قمرانی کے دوران اس مریض کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ مریض اس کی خصوصی توجہ اور محبت پاکر محبت یاب ہو جاتا ہے اور گھر چلا جاتا ہے۔ اس کے رخصت ہوجانے پر نرس رادھا جرا کو سخت جذباتی دھچکا لگتا ہے لیکن وہ کسی طرح خود کو سنبھال لیتی ہے۔ ابھی وہ اس صدمے سے گزر رہی رہی تھی کہ ایک اور خطرناک مریض (بنت چودھری) کو ہسپتال میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ کیس پچھلے کیس سے مختلف نہیں ہے لیکن اس کی شدت زیادہ ہے۔ نرس رادھا جرا، کرنل کے حکم اور دباؤ کے باوجود اپنے پچھلے تجربے کی بناء پر یہ کیس لینے سے انکار کر دیتی ہے۔

یہ خطرناک ذہنی مریض ایک شاعر اور ناول نگار ہے۔ اس کی محبوبہ نے اسے اتنے کچھ کے لگائے تھے کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ ہر عورت کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور کسی بھی نرس کو اپنے قریب برداشت نہیں کرتا۔ وہ ان پر تشدد کرنے سے بھی باز نہیں آتا اور توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ نرسیں اس کے کمرے میں جانے اور اس کی حصار داری کرنے سے انکار کر دیتی ہیں لیکن اس مریض کو اس کے حال پر کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔ یہ سنگین صورت حال دیکھ کر نرس رادھا جرا یہ کیس لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے وہ اس مریض کی کیس ہسٹری معلوم کرتی ہے اور اس کی پچھلی زندگی

کی جھان بین کر کے اس کے مرض کے وجوہات کا پتا چلاتی ہے۔ وہ اس کے گھر پر ملے ملازم سے مل کر اس کی پسند اور پسند سے آگاہی حاصل کرتی ہے، بازار سے اس کے لکھے ہوئے ناول اور گیتوں کے ریکارڈ خرید کر لاتی ہے اور پھر اپنے مخصوص انداز سے بہت خوب صورتی اور پیار سے اس خطرناک مریض کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اب وہ مریض ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرتا۔ نرس رادھا جرا راتوں کو جاگ کر اسے تھک تھک کر سلاتی ہے بھی وہ سوتا ہے لیکن اس پورے عمل کے دوران نرس جرا ایک بار پھر اس مریض کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ مریض بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے اور اسے اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہے لیکن کرنل سمیت کوئی بھی فرد نرس جرا کے دل کی جذبات سے واقف نہیں۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ نرس جرا کی اداکاری نے ان کے تجربے کو کامیابی سے ہلکا کر دیا اور ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔

مریض مکمل طور پر محبت یاب ہو کر ہسپتال سے رخصت ہونے لگتا ہے اور رخصت ہونے سے پہلے ہی رقیبت پر نرس جرا سے ملنا چاہتا ہے لیکن نرس جرا کا کہیں پتا نہیں ہے۔ مریض، کرنل سے ملتا ہے اور نرس جرا سے ملنے پر اصرار کرتا ہے۔ جب کرنل اسے بتاتا ہے کہ وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔ نرس جرا اس سے محبت نہیں کرتی۔ وہ محض محبوبہ ہونے کی اداکاری کر رہی تھی اور ان کے تجرباتی ٹیم کا ایک حصہ تھی۔ مریض کو یقین نہیں آتا لیکن اسے نرس جرا سے ملے بغیر جانا پڑتا ہے۔ نرس جرا اپنے پیشے کا تقدس برقرار رکھنے کی خاطر اپنی محبت اور خوشیاں قربان کر دیتی ہے لیکن اس مرتبہ یہ جذباتی دھچکا اتنا شدید تھا کہ وہ خود کو سنبھال نہیں پاتی اور پاگل ہو جاتی ہے۔ اسے اس وارڈ میں داخل کر دیا جاتا ہے جہاں سے وہ مریض محبت یاب ہو کر نکلتا تھا۔

تب سانچا فرسٹ کرنل کو اپنی اس بھیا نیک غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے ایک جوان اور خود رز نرس کو اپنے تجربے کی جیمینٹ چڑھا دیا۔ وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ اس نرس کے سینے میں بھی ایک دل تھا جو چاہنے اور چاہے جانے کا آرزو مند تھا۔ وہ اس نرس کے اندر بھی ہوئی لڑکی کو کیوں نہ دیکھ سکا۔ اس کے جذبات اور احساسات کو کسی بے دردی سے نظر انداز کیا گیا اور اسے اس کی خوشیوں سے محروم کر دیا گیا جن پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کسی اور کا ہے۔ اس کا

یہ تجربہ کامیاب ہو کر بھی ناکام ہو گیا۔

اس فلم کے آخری مناظر اس قدر دلہوز ہیں کہ کسی کے لیے بھی ایسے آنسوؤں کو روکنا ممکن نہیں۔ سچر اسٹین کی کردار نگاری فن کی نئی بلندیوں کو چھوئی نظر آتی ہے۔ اس نے پوری فلم کو اپنے کانٹوں پر اٹھا رکھا ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر زبردست مہم ہوئی اور اس نے مغربی بنگال اور مشرقی بنگال (سابقہ مشرقی پاکستان) میں ہر طرف صوم بچا دی۔ اداکار اتم کمار نے یہ فلم دیکھ کر سچر اسٹین کو ایک گلدستہ کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا۔ ”را (سچر اسٹین) کی انفرادی فتح۔“

اس فلم کو بعد میں ٹیٹکو میں بھی بنایا گیا لیکن وہ باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے دس سال بعد خود اسٹین نے اپنی یہ فلم 1969ء میں دوبارہ ہندی میں خاموشی کے نام سے بنائی جس میں وحیدہ رحمان نے سچر اسٹین کا نرس جڑا کا جب کہ دھرمیندر نے بطور مہمان اداکار پہلے مریض اور رامیش کھنہ نے دوسرے خطرناک مریض شاعر اور ناول نگار کا کردار نبھایا۔ اگرچہ اسٹین نے اس خیال سے کہ ہندی فلم بنیں۔ بنگالی فلم بنیں کی طرح اولیٰ ذوقی کے حال نہیں ہوتے، اس ہندی ورژن کو ہنگامہ ساز کیشن ریج دیا تھا تاہم لوگ اس سنجیدہ فلم کو ہضم کر سکیں پھر بھی فلم ”خاموشی“ باکس آفس پر مہم ہونے کے باوجود دھوپ چلے جاتی کے آگے مات کھائی حالانکہ اس وقت راجیش کھنہ کا طوطی بول رہا تھا اور اس کی ہر فلم پر مہم ہو رہی تھی۔ اسی طرح وحیدہ رحمان صف اول کی ایک درامائٹ اداکارہ تھی اور اس کی بہت سی فلمیں مثلاً بیاسا، کانڈ کے پھول، صاحب بی بی اور غلام، سولہواں سال، دی گائڈ، چودھویں کا چاند، رام اور شام وغیرہ ہلاک بسمر ثابت ہوئی تھیں لیکن فلم خاموشی کی ریلیز کے بعد خود وحیدہ رحمان نے اپنے ایک بیان میں اعتراف کیا کہ وہ تو سچر اسٹین کی کردہ کو بھی نہ پاسکی۔

☆.....☆

مشہور فلم ساز، ہدایت کار، شاعر، گیت نگار اور کہانی نویس گلزار کی فلم ”آدمی“ سچر اسٹین کی ایک اور ناقابل فراموشی فلم ہے جس میں اتم کمار اس کے مقابل ہیرو نہیں تھا۔ یہ فلم 1975ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کا موضوع سیاست تھا اور یہ سید طور پر اس وقت کی بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی زندگی پر بنائی گئی تھی۔ گلزار کے مطابق انہوں نے سچر اسٹین کی یادگار اور برو بار شخصیت کو مد نظر

اڑتی ہوئی ٹرے

لندن میں ایک ہوٹل نے ویٹروں کے بغیر کامیوں کو کھانا پیش کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس ہوٹل میں آپ بیکل پر لگے ہوئے ایک کمپیوٹر سسٹم پر اپنی پسند کا کھانا آرڈر کریں گے، کمپیوٹر دیر بعد آپ کا پسندیدہ کھانا ایک اڑتی ہوئی ٹرے میں آپ کی بیکل تک پہنچ جائے گا۔ یہ ٹرے دراصل ایک چھوٹا سا ڈرون ہے جس کے اوپر کھانے کی ٹرے نصب ہے۔ جب آپ کھانا کھا چکیں گے تو اسی ٹرے میں قلی ہوئی ایک پاکٹ کے ذریعے اپنا بل بھی ادا کر سکیں گے۔ یہ ٹرے آپ کو کرڈنٹ کارڈ استعمال کرنے کی سہولت بھی مہیا کرے گی۔ کھانے سے لہدی اڑتی ہوئی فطرتیوں کی آمدورفت ہوئی کے مرکزی نظام سے خشک ہوگی جس کو صرف ایک شخص آپریت کر رہا ہوگا۔

مرسلہ: ناہیدہ علی۔ فیصل آباد

رکھتے ہوئے یہ کردار تخلیق کیا تھا۔ یہ ایک رومینک لیکن سنجیدہ فلم تھی۔ اس فلم کو بنانے کا خیال 1960ء کی دہائی میں گلزار کے ذہن میں آیا تھا لیکن جب وہ اسکرپٹ لے کر سچر اسٹین کے ہاں کھلتے گئے تو سچر اسٹین نے اسکرپٹ میں ردوبدل کرنے کا مطالبہ کیا جس پر گلزار تیار نہیں ہوئے اور یہ منصوبہ کھاتی میں بڑھ گیا لیکن پھر گلزار نے فلم کے مرکزی کردار کے لیے وجنتی مالا سے بات کی لیکن جب وجنتی مالا کو یہ معلوم ہوا کہ یہ فلم اندرا گاندھی کی زندگی پر مبنی ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں خشک پڑ گئے اور اس نے فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس فلم کا منصوبہ لگ بھگ چودہ سال تک التواء کا شکار رہا پھر اس کے فلم ساز نے اوم پرکاش نے اصرار کیا کہ گلزار دوبارہ سچر اسٹین کے ہاں کھلتے جائیں اور اسے رضی کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ گلزار ایک بار پھر کھلتے پہنچ گئے۔ اس مرتبہ سچر اسٹین نے اسکرپٹ دیکھے بغیر ہی فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے کی ہائی بمری۔

مذکورہ فلم میں سنجیدہ کمار نے سچر اسٹین کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم ہندی کے دوران ہی یہ افواہ گرم ہوئی کہ یہ فلم اندرا گاندھی کی زندگی پر مبنی ہے جب کہ گلزار نے اس بات کی مجرور تردید کی۔ ان کے مطابق یہ جزدی طور پر

لہذا اس وقت کی بھارتی حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ پابندی اٹھائی گئی۔ یہ فلم باکس آفس پر سہ ماہی ہوئی۔ اسے سال کی بہترین فلم اور سنجیدہ کار کو بہترین اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ سچرا سین نے نہایت خوبی اور مہارت سے ایک خاتون سیاست داں کا کردار ادا کیا تھا۔ اسے بہترین اداکارہ اور گزرا کو بہترین ہدایت کار کے لیے نامزد کیا گیا۔ یہ سچرا سین کی آخری ہندی فلم ثابت ہوئی۔

☆.....☆

مغربی بنگال ہو یا مشرقی بنگال، سچرا سین ہر اداکارہ کا آئینہ مل گئی۔ ایسی کوئی اداکارہ نہ تھی جو سچرا سین جتنا نہ جانتی ہو۔ 1950, 60, 70ء کی نصف دہائی تک اس کی مقبولیت اور شہرت کا سورج نصف النہار پر چمک رہا۔ وہ برصغیر کی واحد اداکارہ تھی جو فلمی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے شادی شدہ اور ایک بچی کی ماں بھی تھیں وہ بے پناہ مقبول ہوئی اور اس کا شادی شدہ ہونا اس کے فلمی کیریئر پر اثر انداز نہ ہو سکا جب کہ بیشتر ایکٹریں اس خوف سے شادی نہیں کرتیں کہ ان کی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو جائے گی یہاں تک کہ بڑھاپا ان کے ور پر دستک دینے لگتا ہے اور تب وہ بچھڑاتی ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا سہرا اور فلمی کیریئر کے چکر میں گنوا دیا۔

سچرا سین ایک گھریلو عورت تھی۔ وہ ایک امیر ترین صنعت کار کی بیوی تھی، لہذا سب اس کی بہت عزت کرتے تھے اور اسے سزیمین کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سوائے اتم کمار کے جو اسے ماکہ کہہ کر پکارتا تھا کیونکہ دونوں شروع ہی سے ایک دوسرے کے مقابل کام کرتے آئے تھے لہذا ان میں گہری دوستی ہو گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کے حراج آشنا تھے۔ اتم کمار نے ایسی کئی فلمیں پروڈیوس کیں جن میں سچرا سین اس کے مقابل ہر وقت تھیں اور ایسی فلمیں بھی پروڈیوس کیں جن میں سچرا سین ہر دور تو تھیں لیکن وہ اس فلم کی کاسٹ میں شامل نہ تھا۔ وہ صرف پروڈیوسر تھا۔ کون جانتا تھا کہ یہ گھریلو عورت جو نہ چاہتے ہوئے بھی محض اپنے سر اور شوہر کی خوشی کی خاطر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئی تھی، بنگال کی فلم انڈسٹری کی تاریخ رقم کرے گی اور بھڑکھلائے گی۔

سچرا سین نے سوائے ستیہ جیت رائے کے بنگال کے تقریباً تمام چوٹی کے ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ ستیہ جیت رائے کے ساتھ کام نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں

اندرا گاندھی پر مبنی ضرورت تھی لیکن یہ دراصل صوبہ بہار کی معروف خاتون سیاست داں، جواہر لعل نہرو اور پھر اندرا گاندھی کی کابینہ کی رکن ترشیوری سنہا کی زندگی پر بنائی گئی تھی جو نوجوانی میں ایک ہوٹل مینجری محنت میں گرفتار ہو گئی تھی اور انہوں نے شادی کر لی تھی لیکن شادی کے بعد جب ترشیوری کی سیاسی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں اور کامیابیاں قدم چومنے لگیں تو ازدواجی زندگی میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ ایسے میں ترشیوری نے اپنے سیاسی کیریئر کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دینے سے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس طرح نو سال بیت گئے اور پھر ایک دن کسی شہر میں احتجاجی ہجم کے سلسلے میں ایک ہوٹل میں قیام کے دوران اس کی لمبے بھیر اپنے شوہر سے ہو گئی اور محبت کا خوابیدہ جذبہ پھر سے ابھرائی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی کشش کی ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ حالات نے اسے ایک بار پھر ایک دورا پے پر لا کھڑا کیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جائے۔ ایک طرف اس ہوٹل کا مینجر اور اس کا شوہر تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی اور دوسری طرف اس کا سیاسی کیریئر تھا جو اس ہوٹل مینجری کی وجہ سے واڈ پر لگا ہوا تھا جسے لوگ اس کے سابق شوہر کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے اور سیاسی مخالفین اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی کردار کشی کر رہے تھے۔ ہر طرف سے اس پر لعن طعن ہو رہی تھی۔ خود اس کی پارٹی کے لوگ اس کے مخالف ہو گئے تھے اور انتخابات میں اس کی مہرت ناک شکست سب کو نظر آ رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ آندھی اسے اور اس کے سیاسی کیریئر کو اڑانے لے جاتی، وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور اس آندھی کا رخ موڑ دیتی ہے۔

ہدایت کار گزرا نے ایک خاتون سیاست داں کی ڈرامائی داستان حیات اس کے شب و روز اس کی شادی اور اس کی ناکامی کے وجوہات اور پھر نو سال کے طویل عرصے کے بعد اپنے شوہر سے اتفاقہ ملاقات کو موضوع بنایا تھا جس کے نتیجے میں حالات نئی کر دین بدلے ہیں۔ گزرا کا فوکس اس نکتے پر تھا کہ ایک خاتون سیاست داں کی ذاتی زندگی کیسی ہوتی ہے، اس میں کیسے کیسے شیب و فراز آتے ہیں۔ اس کی ازدواجی زندگی سیاست سے کس طرح متاثر ہوتی ہے اور وہ کیا کھوتی ہے اور کیا پاتی ہے۔ چونکہ فلم ”آندھی“ کے بارے میں افواہیں گرم تھیں

قلموں میں کام کرنے کے باوجود ابھی اداکارہ بن سکیں جب کہ پتر امین نے بھی ستیہ جیت رائے کی قلم میں کام کیا اور نہ ہی یہی قلم میں مستقل رہائش کی۔ وہ بنگال میں اپنی شہرت اور مقبولیت سے مطمئن تھی۔ اگر وہ چاہتی تو بالی ووڈ سے وابستہ ہو کر ملک گیر شہرت حاصل کر لیتی لیکن اسے اس کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کی شہرت دے دیے بالی ووڈ تک پہنچی ہوئی تھی اور وہ بنگال کی فلم انڈسٹری کی خاتون اول مانی جاتی تھی۔ اسے ہندی فلموں کی پیمائش ہوتی بھی تھی تو وہ اسے قبول نہیں کرتی تھی۔

ایک مرتبہ راج کپورہ اسے اپنی قلم میں مرکزی کردار کی آفر کرنے اس کے گھر آیا اور جیسے ہی وہ آکر بیٹھی، راج کپورہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قدموں میں آ بیٹھا اور اس نے اسے گدہ پٹن کر کے ساتھ ہی قلم کی آفر کر ڈالی۔ پتر امین نے اس وقت اس کی پیشکش ٹھکرا دی۔ اسے راج کپورہ کا یہ طور طریقہ بہت ناگوار نظر آ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا ”ایک مرد کو اپنا دھار کا قلم رکھنا چاہیے۔ یہ کیا کردہ میرے قدموں میں آ بیٹھا۔ مجھے اس کی شخصیت پسند نہیں آئی۔“ اس نے مزید کہا۔ ”میں فلمی دنیا میں سب سے زیادہ ولیب کماری کی عزت کرتی ہوں۔ وہ بلاشبہ ایک عظیم فنکار ہے۔“ سنجیو کمار کے بارے میں اس کا کہنا تھا۔ ”میں نے قلم ”آندھی“ میں سنجیو کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس سے میری ابھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ وہ جب بھی ملکتے آتا ہے، مجھ سے ملنے ضرور آتا ہے۔“

پتر امین نے چند ہندی فلموں میں کام ضرور کیا تھا لیکن لکنا بھی ہے کہ یہی قلم انڈسٹری کا ماحول اسے پسند نہیں تھا اور ہندی فلمیں اس کے مخصوص حراج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں جن میں ڈوبے سارے ناچ گانے ہوتے تھے۔ یہ کہنا کہ اس کا بنگلہ دلچسپ دلچسپ ہندی فلموں میں کام کرنے میں آڑے آتا تھا اور اسی وجہ سے وہ ہندی فلمیں سنان نہیں کرتی تھی، درست نہیں۔ وہ شرمیلا ٹیگور اور راج کپورہ کے مقابلے میں بہت صاف ہندی بولی تھی جب کہ شرمیلا اور راج کپورہ کی ہندی میں ان کا بنگلہ دلچسپ دلچسپ تھا اور وہ مستقل طور پر بمبئی میں ہی رہتی تھیں۔ اگر پتر امین مستقل طور پر بمبئی میں رہتی اور بالی ووڈ کی فلموں میں کام کرتی رہتی تو اس کی ہندی میں مزید نکھار آ جاتا۔ جس طرح اشوک کمار، کشور کمار اور پردیپ کمار جن کی ہندی، اردو زبان اتنی ہی صاف تھی جتنی کسی کی ہو سکتی ہے اور کوئی سوچ بھی نہیں سکا کہ ان کی مادری

تھی، محض قلم کے شیڈول کا مسئلہ تھا۔ ستیہ جیت رائے اپنی ایک قلم دیوی چودھرائی شروع کرنا چاہتے تھے جس کی کہانی کا مرکزی کردار انہوں نے پتر امین کو ذہن میں رکھ کر لکھا تھا اور چاہتے تھے کہ پتر امین مذکورہ قلم کے لیے انہیں پورا وقت دے لیکن اس وقت پتر امین کی کئی فلمیں سیٹ پر تھیں اور وہ بھی کسی حال میں ان فلموں کو ادھر اچھوڑ کر ستیہ جیت رائے کے لیے پورا وقت نہیں نکال سکتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان ہدایت کاروں کو انکار نہیں کر سکتی تھی جنہوں نے اسے پتر امین بنایا تھا۔ اس نے ستیہ جیت رائے سے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ ان فلموں کو مکمل کر کے ان کی قلم سائن کرے گی اور پورا وقت دے گی لیکن ستیہ جیت رائے نہیں مانے اور انہوں نے یہ کہہ کر قلم ”دیوی چودھرائی“ کا منصوبہ ہی ترک کر دیا کہ پتر امین نہیں تو کوئی نہیں۔ پتر امین کا کہنا تھا کہ جب وہ نہیں مانے تو میں کیوں مانتی؟

☆.....☆

ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بننے والی فلمیں صرف اپنے سرکٹ میں ریلیز ہوتی ہیں۔ ان کی ملک گیر نمائش نہیں ہوتی جب کہ بالی ووڈ کی فلموں کی نمائش پورے بھارت میں ہوتی ہے لہذا اس کے فنکاروں کو راتوں رات ملک گیر شہرت حاصل ہو جاتی ہے جب کہ علاقائی زبانوں میں بننے والی فلموں کے فنکاروں کو ان کے سرکٹ سے باہر شہرت نہیں مل پاتی، چاہے وہ کتنے ہی بڑے فنکار کیوں نہ ہوں جیسی جنوبی ہند (تامل ناڈو، کرناٹک، کناڈا) کی تیلگو، تامل، ملیالم فلموں سے وابستہ اداکارا میں وحیدہ رحمان، دھنتی مالا، ہوما مانی، سری دیوی اور مغربی بنگال کی قلم انڈسٹری سے وابستہ شرمیلا ٹیگور، جیا ہمادری اور راج کپورہ وغیرہ بالی ووڈ کی فلموں میں چانس ملنے پر پہنچی جا بیٹھیں اور وہیں کی ہو رہیں۔ ان کی فلمیں سپر ہٹ ہوئیں اور پورے برصغیر میں ان کے نام کے ڈنکے بجتے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وحیدہ رحمان، دھنتی مالا اور جیا بھجن وراٹھیاں فنکارا میں تھیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منوایا اور انہیں ان کا جائز مقام مل گیا جب کہ شرمیلا ٹیگور، ہوما مانی، سری دیوی اور راج کپورہ جی اپنے آپ کو اچھی اداکارہ ثابت نہ کر سکیں۔ ان کی فلمیں باکس آفس پر سپر ہٹ ضرور ہوئیں لیکن اس کا سبب ان فلموں کی عمدہ کہانی اور عمدہ ہدایت کاری تھی۔ اس میں ان کا کوئی کمال نہ تھا۔ شرمیلا ٹیگور، ستیہ جیت رائے کی متحدہ

زبان بنگہ ہوگی کیونکہ وہ شروع ہی سے بمبئی کی فلم انڈسٹری سے وابستہ رہے تھے اور ہندی فلموں میں کام کرتے آئے تھے۔ البتہ اشوک کمار کو بنگلہ فلم ”ہاپنل“ میں پچرا سین کے مقابل بطور ہیرو بنگلہ بولتے ہوئے سن کر حیرت ہوئی ہے جو 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ مذکورہ فلم میں اشوک کمار نے ایک سرجن اور پچرا سین نے لیڈی ڈاکٹر کا کردار ادا کیا تھا جو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یہ ایک منفرد اور یادگار فلم ہے جس میں ان دونوں کی کردار نگاری نہایت متاثر کن تھی۔ فلم کی کہانی ڈاکٹر ہار جین پیتا کے اسی نام کے ناول پر مبنی تھی جس میں ایک لیڈی ڈاکٹر (پچرا سین) سرجن (اشوک کمار) سے محبت اور تعلقات کے نتیجے میں بن بیاضی ماں بن جاتی ہے اور سرجن اپنی بدنامی کے ڈر سے اسے اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔

پچرا سین عام طور سے ہندی فلم سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس نے سلیم جاوید اور نیش جو بڑا کی آفرمی ٹھکرا دی تھی جن کی خواہش تھی کہ وہ ان کی فلم ”دیوار“ میں اہم رول ادا کرے جس کی کاسٹ میں ایجا بھین، ششی کپور، پروین بونی اور نیتو سنگھ شامل تھے۔ وہ فلموں کے انتخاب کے معاملے میں اپنے معیار کو ملحوظ نظر رکھتی تھی ساتھ ہی وہ کسی ایسے ہدایت کار کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتی تھی جسے وہ اچھی طرح جانتی نہ ہو یا جو اس کا مزاج آشنا نہ ہو۔

☆.....☆

1953ء سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے والی مہما نالگہ پچرا سین نے 1978ء تک اپنے پچیس سالہ فلمی کیریئر کے دوران بہترین اداکارہ کے نوا ہوارڈ حاصل کیے جن میں ایک غیر ملکی ایوارڈ کے علاوہ 1972ء میں پدما شری کا ایوارڈ 2012ء میں لائف ٹائم اچيومنٹ ایوارڈ 1967ء اور 1976ء میں فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزدگی نیز 2014ء میں بعد از مرگ فلم فیئر ایسٹ لائف ٹائم اچيومنٹ ایوارڈ اور 2005ء میں سب سے بڑا ادا صاحب پھالکے ایوارڈ جو اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

1953ء میں شروع ہونے والا یہ فلمی سفر 1978ء میں اس وقت اختتام پذیر ہوا جب اس کی ایک فلم فلاب ہو گئی اور اس نے نہ صرف فلمی دنیا کو اس وقت اچانک خبر باد کہہ دیا جب راجیش کھنہ کے ساتھ اس کی ایک فلم ڈیر جیمیل تھی بلکہ مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ یہ گوشہ نشینی پورے پینتیس سال اس کی موت تک برقرار رہی جس کے دوران

وہ بنگال کی وزیر اعلیٰ متا بھرجی کے سوا جو اس کی زبردست مددگار تھی، باہر کے کسی بھی فرد سے نہیں ملی۔ اتم کمار سے بھی نہیں جس نے 1980ء میں اپنی موت سے صرف ایک ہفتہ پہلے فون پر اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ پچرا سین نے اسے ایک ہفتے کے بعد فون کرنے کو کہا تھا لیکن وہ اس سے ملے بغیر ہی 14 جولائی کو دار فانی سے کوچ کر گیا۔ شاید اس نے اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کی چابک سنبلی ہو اور اپنی واحد گہری دوست سے آخری ملاقات کرنا چاہتا ہو جس سے وہ دو سال سے نہیں ملا تھا لیکن نقصانے اسے مہلت نہیں دی اور وہ اس سے آخری ملاقات کی آرزو لیے اس جہاں سے چلا گیا۔ پچرا سین پر اس کی موت کا گہرا اثر ہوا۔ وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ اب میں کس کے ساتھ کام کروں گی۔ اس طویل گوشہ نشینی کے دوران 17 جنوری 2014ء کو اسپتال میں دل کا شدید دورہ پڑنے کے باعث وہ زندگی کی باڑی ہار گئی۔

اس کی موت کی خبر نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ بنگلہ دیش میں بھی جھلکی کی آگ کی طرح پھیل گئی جو اس کی جنم بھومی تھی۔ کلکتہ کی سڑکیں اور گلیاں لوگوں سے بھر گئیں جو اس کا آخری دیدار کرنے کے لیے ہر طرف سے اٹھ آئے تھے۔ پولیس کے لیے اس هجوم پر قابو پانا مشکل ہو گیا حالانکہ وہ پینتیس سال پہلے فلمی دنیا کو چھوڑ چکی تھی مگر بھی پچرا سین کا مداح تھا اور اس سے پیار کرتا تھا۔ یہ اس کا سکرین ایجن تھا۔ نئی نسل کلکتہ ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی اس کی فلمیں بیوقوف سے دیکھا کرتی تھی۔ موت کے وقت وہ بیاسی سال کی تھی۔ بنگال کی وزیر اعلیٰ متا بھرجی نے اس کی آخری رسومات کی ادائیگی کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے جنازے کو گارڈ آف آنر پیش کیا گیا اور ایک ٹوپ کی سلامی دی گئی۔

اس کی موت پر بھارت کے موجودہ صدر پرناب کمرہی، سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی نیز بنگلہ دیش کے صدر عبداللہ، سابق وزیر اعظم خالدہ خیام اور موجودہ وزیر اعظم حسینہ واجد نے اپنے گھرے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے تعزیتی پیغامات بھیجے۔ کلکتہ اور چٹا میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور یوں بنگال کی فلم انڈسٹری کا ایک روشن باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

۞



URDU ایجابات

محمد یاسر اعوان

نئی نئی ایجادات نے زندگی کو آسان تر بنایا لیکن یہ ایجادات کس طرح سامنے آئیں اسی کا تذکرہ مختصر مختصر انداز میں چند ایجادات کا ذکر۔

معلومات حاصل کرنے کے شوقین حضرات کے لیے تحفہ

اگر آپ کسی سے دنیا کے مشہور ترین مہل کے متعلق پوچھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ بروکلین برج، گولڈن گیٹ برج یا پھر جارج واشنگٹن برج کا ہی نام لے۔

ان تینوں پلوں کا دیو قامت ہونے کے ساتھ ساتھ مطلق ہونا محض ایک اتفاق نہیں۔ مطلق ہمارے جدید ذرائع آمد و رفت کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ سلطنت رومانیہ مہل کے ڈیزائن کو بہتر بنانے میں کافی کردار ادا کیا لیکن قرون وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے دوران بہت کم ترقی ہوئی۔ 17 ویں صدی کے وسط میں چیزیں تبدیل ہونے لگیں۔ 1747ء میں یورپ میں ایک انجینئرنگ اسکول

قائم ہوا جس کا مرکزی کام پلوں کی تعمیر پر کام کرنا تھا۔ یہاں پڑھنے والے طلباء نے رومن "محرابی پل" ڈیزائن کو بہتر بنا کر کافی مضبوط اسٹرکچر بنائے۔ ان پلوں کی وجہ سے کشتیوں کے گزرنے کے لیے زیادہ جگہ مل گئی۔ انھار ہویں صدی میں پتھر کے ساتھ ساتھ لوہا بھی پلوں کی تعمیر میں استعمال ہونے لگا۔ لکڑی کے پل اب بھی عام تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں امریکا میں 40 فٹ طویل پل بنایا گیا۔ اس دور میں امریکا پڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا اور اس کی آبادی بھی بڑھ رہی تھی۔ جلد ہی عیاں ہو گیا کہ ہڈن، اوہائیو اور مسیسیپی جیسے دریاؤں پر جلد یا بدیر پل بنانے پڑیں گے۔

ان بحری گزرگاہوں کے اوپر ہزاروں فٹ طویل پل بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے علاوہ ریلوے کے آغاز نے بھی لکڑی کے پلوں کو بیکار بنادیا کیونکہ وہ ٹریلوں کا وزن نہیں سہار سکتے تھے۔ ریلوے انجنوں کا وزن 70 ٹن اور رفتار 60 میل فی گھنٹہ تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں لوہے کے پل بننا شروع ہوئے لیکن پل ٹوٹنے کے باعث اکثر حادثات پیش آتے رہتے۔ پھر طویل پلوں کی تعمیر میں چلک دار کیلو کا اصول استعمال کرنے کے متعلق سوچا جانے لگا۔

کیونکہ لگھدار کیلو کی مدد سے فضا میں متعلق پل درمیان میں سے گزرنے کا راستہ مہیا کرتا ہے۔ یہی یہی کیلو کو دور تک پھیلاؤ ممکن ہے۔ اسٹیل کی تاروں پر مشتمل کیلو بٹا ہرگز زور کٹنے کے باوجود پڑی طاقتور اور مضبوط ہوتی ہیں۔ متعلق پل کے حوالے سے منجندہ تحقیق کا آغاز

1801ء میں ہوا جب جمہوریت نے یونین ٹاؤن پنسلوانیا کے مقام پر ایک 70 فٹ Twin Tower پل کو سپورٹ کرنے کے لیے لوہے کی زنجیریں استعمال کیں۔ 1826ء میں تھامس ٹیلورڈ نے ویلز میں 580 فٹ طویل پل ڈیزائن کیا اور تعمیر کیا۔ اس میں بھی لوہے کی زنجیروں سے کام لیا گیا تھا۔ یہ پل جلد ہی دنیا بھر میں مشہور ہوا اور آج اتنی مدت بعد بھی زیر استعمال ہے۔ امریکا نے متعلق پل بنانے کا کام انیسویں صدی کے وسط میں شروع کیا تھا۔ 1849ء میں 1010 فٹ طویل متعلق پل مغربی درجینا میں بنایا گیا۔ 1854ء میں ایک طوفان کے دوران اس پل میں شگاف پڑ جانے پر جان اسے روہنگ نے اسے دوبارہ ڈیزائن کیا۔

روہنگ نے ہی متعلق پل کی ٹیکنالوجی کو کافی آگے بڑھایا۔

روہنگ 1806ء میں بروڈیا کے مقام پر پل اہوا اور 1826ء میں برلن سے سول انجینئرنگ میں ڈگری لی۔ 5 سال بعد وہ امریکا آیا اور پنسلوانیا میں ایک قارم کی تعمیر میں مدد کی۔ 1837ء میں وہ پنسلوانیا اسٹیٹ گورنمنٹ میں سول انجینئر بنا۔ نہری منصوبوں پر کام کرتے ہوئے اس نے بادبانی کشتیوں میں ان کے رے کی بجائے تارے بنا ہوا رے استعمال کیا۔ اس نے 1849ء میں نیوجرسی میں کئی تاروں پر مشتمل رے کی تیاری شروع کی۔

پل ازیں وہ ایک چوڑی نہر پر متعلق پل تعمیر کر چکا تھا۔ اس طرح جلد ہی اس نے متعلق پل بنانے کے دیگر منصوبے بھی حاصل کیے۔ اس دور میں زیریں مین پلین اور بروڈین کو ملانے کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ کشتیاں اور جہاز ٹانگانی، مینے اور خطرناک ہوتے جارہے تھے لیکن ایسٹ دریا پر بننے والا پل ہزاروں میل طویل ہونا تھا۔ 1867ء میں روہنگ کو بروڈین پل تعمیر کرنے کے لیے چیف انجینئر مقرر کیا گیا۔

اس کے تیار کردہ ڈیزائن کے مطابق پل کی لمبائی 1595 فٹ تھی یعنی دنیا کے تمام پلوں سے زیادہ۔

منسوب 1889ء میں شروع ہوا لیکن روہنگ ایک حادثے میں مارا گیا۔

تاہم اس کا بیٹا منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ اسے مکمل ہونے میں چودہ برس لگے۔

1872ء میں روہنگ کے بچے دانشمن کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ وہ بروڈین پل کی تعمیر کے دوران بستر سے لگا رہا۔ تاہم اس نے طویل زندگی گزارنے کے بعد

1926ء میں وفات پائی۔

خوب صورت اور عملی اعتبار سے مفید بروڈین پل پر جلد ہی کموڑوں اور گاڑیوں کے علاوہ ٹریلوں کی آمدورفت بھی شروع ہو گئی۔ یہ بیسویں صدی میں متعلق پلوں کی تیز رفتاری سے تعمیر کا تھلا آغاز تھا۔ 1931ء میں Othmar Ammann کے تعمیر کردہ جارن دانشمن پل نے نیویارک سٹی کو نیوجرسی سے ملا دیا۔ یہ پل 3500 فٹ طویل ہے۔

تھرہنگ مشین کا ہونی مکدم کی فصل کی بالیوں اور ڈنشلوں کو الگ

کرنے کا عمل قریب تک کہلاتا ہے۔ اس کے بعد اسے ڈنڈے سے کوٹ کر گندم کے دانوں اور چٹکوں سے علیحدہ کر لیا جاتا۔ اس عمل کو چھوڑتے کہتے ہیں، یعنی جھانج میں چھٹ کر بمبوسے کو علیحدہ کرنا۔ کچھ علاقوں میں اگائی ہوئی گندم کو زمین پر بچھا کر اوپر بھاری بھر کم جانوروں مثلاً بیلوں کو چلایا جاتا تھا۔

اور اس سارے پر دھیر میں تقریباً دو ماہ لگ جاتے تھے۔

1830ء میں 15 یوکندم صاف کرنے کے لیے تقریباً 200 سے 300 گھنٹے کی محنت درکار ہوتی تھی۔ 1834ء سے پہلے ک کوڑک رہبر پینٹ نہیں کروایا گیا تھا۔ اسی سال جان لین نے لوہے کے آری نما پلیٹوں والے ہل بنانے کا کام شروع کیا اور اتفاقی طور پر تقریباً 100 مشین بن گئی۔

جان دیری اور لیو نارڈ آندرس نے 1837ء میں لوہے کے ہل بنائے اور اسی سال قریب تک مشین پینٹ بھی کروائی گئی۔

اس سے پہلے 1786ء میں ایڈریو میک نے اسکاٹ لینڈ میں ایک قریب تک مشین ایجاد کی۔ اس کے باپ نے گندم کاٹنے والی ایک مشین 1710ء میں بنائی تھی لیکن اسے زیادہ پذیرائی نہ ملی کیونکہ اس دور میں مشین آلات کو خشک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بچے کا قریب کا مہیا ثابت ہوا۔ وہ مشرقی لوگوں میں جان رہنے کی جاگیر پر کام کرتا تھا۔ رہنے نے ایڈریو کے ساتھ مل کر اپنی مشینوں کو دیگر ملوں میں بھی نصب کیا۔ شروع شروع میں قریب تک مشین ہر کسی کے پاس نہیں تھی۔

چھوٹے کسان انجرت پر ہی قریب تک کر داتے تھے لیکن قریب تک کے عمل میں بہت زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لیے انجن کی وجہ سے قریب تکیت یا کسان کی مرضی کی جگہ پر لگانا ممکن ہو گیا۔ جب مشین اشاعت ہو رہی ہوئی تو مزدوروں کی ایک فہم کھیتوں میں جاتی اور گندم کے ٹھوڑے چھڑے پر لا کر لے آتی۔

چھڑے کے اوپر کھڑے آدمی ان ٹھوڑوں کو مشین کے فیر تک والے حصے میں ڈالتے۔ گندم آگے قریب تک مشین کے پلیٹوں میں جاتی جہاں اناج ڈھنسلوں سے الگ ہو کر مشین کے نیچے حصے میں گرے لگتا۔ ایک پچھلا بمبوسے کو اور گرد و آلودہ اناج اور قریب پر لگا ایک الٹیویر اناج کو قریب

ہی کھڑے چھڑے یا پوریوں میں بھرنے لگتا۔

اس عمل کو بار بار دہرانے سے کسان کا سارا غلہ پوری طرح صاف ہو جاتا تھا۔ قریب تک مشین کے استعمال میں کافی محنت لگنے کے باوجود اس نے قریب تک کے سابقہ طریقوں کے مقابلے میں بہتری پیدا کی۔

اب ہمتوں کا کام گھنٹوں میں کیا جاسکتا تھا۔ 1840ء کی دہائی میں فیکٹری کی تیار کردہ مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال نے کسانوں کی کیش (نقد رقم) کی طلب میں اضافہ کر دیا۔

نتیجہً انہیں تجارتی بنیادوں پر فصلیں اگانے کی ضرورت پیش آئی اور زراعت کا سارا ڈھانچا ہمیشہ کے لیے بدل گیا۔

پاکستان بالخصوص کشمیری کے موسم کے دوران پنجاب کے بیشتر علاقوں میں قریب تک مشینوں کا استعمال بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ سیالکوٹ ڈسٹرکٹ کی بنی ہوئی قریب تک مشین کا مہیا اب جاری ہے اور اب اس مشین کی افادیت کپان کم کرتی نظر آتی ہے۔

ایکسرے مشین ٹیلی ویژن اور فلم میریز کے مشہور فرضی کردار سپر مین کی ایک طاقت ایکسرے بصارت بھی تھی۔ انسان نے سپر مین کی یہ طاقت اتفاقی طور پر دریافت کر لی، کیسے؟ یہ ملاحظہ کریں۔

ہم سپر مین کی طرح انہیں سکتے اور نہ ہی اس کی طرح ہاتھوں سے لوہے کو توڑ کر مڑ سکتے ہیں لیکن ایکسرے مشین کی مدد سے انسانوں کے جسم اور بندوبست کے اندر تک دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرح ایکسرے کی دریافت بھی انیسویں صدی کے نصف آخر کے دوران ہونے والی وسیع تحقیق کا نتیجہ تھی۔

سرولیم کروکس نے 1870ء کی دہائی کے آخر میں برقیاتی تابکاری پر کام کی بنیاد ڈالی۔ اس کا پہلا اہم کارنامہ کیٹھوڑے ٹیوب تھی۔ کروکس نے خشے کی ایک ویکیم ٹیوب میں دو دھاتی الیکٹروڈ رکھے اور ان پلیٹوں کو ہائی وولٹیج دی۔

اس نے (مٹی) الیکٹروڈ کے قریب تاریکی اور (ثبت) الیکٹروڈ کے پاس روشنی ہوتے دیکھی۔ اس نے ٹیوب کے اندر کیٹھوڑے شعاعوں کی رفتار اور حرکت کا بھی

مشاہدہ کیا۔ تجربہ گاہ میں اور تعلیمی مقاصد کے لیے اب بھی کروکس کی ایجاد کردہ یہ ٹیوب استعمال ہوتی ہے۔

جرمن طبیعیات دان، قلم لیا رڈ نے اس وقت ایک قدم آگے بڑھایا، جب اس نے ایک الیٹیم وغیرہ والی کیٹھوڑے ٹیوب بنائی۔ شعاعیں اس کٹھری کے راستے ہوا میں منتشر ہو جاتی تھیں۔ جب کنٹریارڈ نے ان شعاعوں کا رخ فاسفورس سے لپک کر ہوئی اسکرین کی جانب موڑا تو پتا چلا کہ شعاعوں نے اسکرین کو روشن کر دیا تھا۔

1892ء میں مشہور طبیعیات دان ہارز برنز نے دکھایا کہ کیٹھوڑا لہریں باریک دھاتی جلی میں سے گزر سکتی ہیں۔

ایکس ریز اور ان کے خواص کی حقیقی دریافت 1895ء میں ولیم کونرڈ رونتجن نے اتفاقاً کی۔ رونتجن پریشیا میں 1845ء میں پیدا ہوا۔ اس نے جرمنی کی مختلف یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل کی۔ اپنے استاد کا مذاق اڑانے کی یادداشت میں اسے اسکول سے نکال دیا گیا اور اس کی پادشاہی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس نے کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا کر مشینوں کے پارے میں غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آخر کار رونتجن کو پورچوینوورشی کے پولی ٹیکنیکل اسکول میں داخلہ مل گیا لیکن وہ انجینئرنگ کے بجائے کیمیا، طبیعیات، کیمسٹری اور فزکس میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی ملاقات اسکول میں طبیعیات کے ایک باصلاحیت طالب علم آگسٹ کٹ سے ہوئی۔ اس نے رونتجن کو اپنی تجربہ گاہ میں بطور معاون کام کرنے کی اجازت دے دی۔ یوں وہ آہستہ آہستہ طبیعیات میں دوبارہ دلچسپی لینے لگا اور ایک ماہر طبیعیات کے طور پر ابھرا۔ ممتاز سائنس دانوں کی سفارش پر اسے چونتیس برس کی عمر میں لیپن کی ہینس یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیا گیا۔ وہ 1885ء میں ویزبرگ یونیورسٹی میں سنے قائم شدہ فزیکل انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر مقرر ہوا۔ یہاں اس نے وہ تحقیقات کیں جن کی وجہ سے اس کا نام لافانی بن گیا۔

رونتجن کیٹھوڑا شعاعوں کے اضافی خواص دریافت کرنے کی فکر میں تھا۔ یہ رونتجن ہی تھا جس نے ان کو الیکٹرون کا نام دیا۔ اس نے سائنسی اصولوں سے غفلت اور بے پروائی برتنے کے نتیجے میں دنیا کی عظیم ترین اتفاقہ دریافت کی یعنی ایک نئی قسم کی شعاع۔

اپنی تاریک تجربہ گاہ میں اس نے ایک عجیب و غریب تماشا دیکھا جو صرف اس وقت وقوع پذیر ہوتا تھا جب کروکس ٹیوب میں سے کیٹھوڑا شعاعیں گزرتی تھیں۔ اس کی تجربہ گاہ والی میز پر ٹیوب سے چارٹ سے کچھ ڈانڈا فاسلے پر ایک سبز رنگ کی روشنی نکلنے لگی اور بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ رونتجن اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ روشنی ایک چھوٹے سے پردے سے خارج ہو رہی ہے جس پر اس نے بیگزیم پلاٹینو کالب کر رکھا تھا۔

دراصل یہ پردہ اس نے پہلے کسی تجربے میں استعمال کیا تھا اور اسے بنانا بھول گیا تھا۔ کیمیا دانوں میں ڈیوکر خلک کیا ہوا پردہ کسی غیر مرئی اور انجمنی شعاعوں کو جذب کر کے انہیں مرئی (نظر آنے والی) روشنی میں خارج کر رہا تھا۔ اس نے پردے کو ٹیوب سے دور رکھا کر اپنا تجربہ ہرایا۔ ہر مرتبہ چمکدار روشنی نمودار ہوئی۔ وہ بہت حیران تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ روشنی کیٹھوڑا شعاعیں خارج نہیں کر رہی ہیں کیونکہ وہ ہوا میں سے گزر رہی نہیں سکتیں۔ اس نے ان عجیب و غریب شعاعوں پر کئی تجربات کیے اور ان کا نام X-RAYS رکھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ شعاعیں بکے سے سواہی ششخصوں، داؤں میں سے گزر جاتی ہیں۔

رونتجن کا کیا ہوا کام اس قدر مکمل تھا کہ آئندہ سترہ برسوں میں ایکس ریز کے کوئی نئے خواص دریافت نہ ہو سکے۔ 1901ء میں رونتجن کو پہلا نوبل پرائز ملا کیونکہ وہ واقعی اس کا سچا تھیں۔ اس نے ایک اتفاقاً واقعہ کی اہمیت کو شناخت کر لیا تھا اگر وہ اپنی دریافت کو پینٹ کروا لیتا تو کروڑ پتی بن سکتا تھا لیکن اس کو اپنے پیٹرو جوزف ہنری کی طرح اس بات پر یقین تھا کہ سائنسی دریافتیں نوع انسانی کی ملکیت ہیں اور ان پر پینٹ کے پھرے نہیں بٹھانے چاہئیں۔ وہ 1920ء تک میونخ یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔ شعبہ طبیعیات کو اس نے ایک تیار خانہ بنا دیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور 10 فروری 1923ء کو انتقال کر گیا۔ اس کی موت کینسر سے ہوئی جس کا علاج ایکس ریز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

ایکس ریز کا حلق صرف شعبہ طب سے ہی نہیں، سائنس اور صنعت کے دیگر شعبوں میں بھی ایکس ریز استعمال ہوتی ہیں۔ فیکٹریوں کے اسٹریکچر میں کسی نقص کا ان کی مدد سے

جنگ لایا جاسکتا ہے۔ کمپوزر جیسے آفٹر ٹانگیر واسکوپ کے حصول کو بتاتے وقت ایکس ریز سے اسکرین کیا جاتا ہے۔ ایئر پورس پر مسافروں کے سامان میں ایسٹے وغیرہ کا سراغ لگانے کے لیے بھی ایکس ریز استعمال ہوتی ہیں۔

رائفل

دور تک مار کرنے والے ہتھیار یعنی رائفل کی ترقی اور بہتری کا مکمل صدیوں پر محیط ہے۔ اگرچہ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کے خیال میں ایک ہی گن رائفل ہوتی ہے جبکہ رائفل کا اصل مطلب **بندوق کی نالی** ہے جس کے اندر چکر وار پٹرن ہو۔ ابتدا میں گن یا توپ کی نالی اندر سے ہموار تھی، جس کی وجہ سے گولی یا گولہ کو آسانی سے اور فوری طور پر لوڈ کرنا ممکن تھا تاہم چکر دار نالی کی وجہ سے گولے کی رینج اور دورنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دسی توپ یعنی رائفل 1400 کی دہائی میں میدان جنگ میں نمودار ہوئی۔ اس کا وزن 25 پاؤنڈ تھا اور فائر کرنے والے کو ٹیک لگنا پڑتی تھی۔ گولے کو نالی میں بارود کے اوپر ڈالا جاتا تھا۔ بارود کو ہاتھ سے آگ لگائی جاتی جس کے نتیجے میں گولہ فائر ہوتا۔ جرمنوں نے بارود کو آگ لگانے کا عمل خود کار بنانے کے لیے کچھ بہتریاں متعارف کروائیں پھر نالی اور بیٹ (دستے) کی لمبائی میں بھی اضافہ ہوا جس کی وجہ سے فائر کرتے وقت کم ہچک لگتا تھا۔ یہ ترقی یافتہ صورت توڑے دار بندوق کہلاتی۔

سپاہی یہ بندوق ٹوٹا چماتی کے ساتھ لگا کر چلایا کرتے تھے لیکن بارودی طاقت میں بہتری آنے پر یہ کام مشکل اور تکلیف دہ ہو گیا لہذا وہ چماتی کے بجائے کندھے کو استعمال کرنے لگے۔

اختراعات کی وجہ سے آہستہ آہستہ جنگ کا انداز بدلنے لگا کیونکہ گولی ڈھال اور زہرے بھی پار ہو جاتی تھی۔ چمکتی ہوئی زہروں کا دور ختم ہونے لگا۔

1500ء دہائی میں رائفل میں چمکتی کھوڑا استعمال کیا گیا، جس کی بدولت ڈیزائن آسان اور بہتر ہو گیا۔ اس میں چمکتا کا ایک گھڑا فولا سے ٹکرا کر شعلہ پیدا کرتا اور بارود کو آگ لگ جاتی۔

مصلحتی انقلاب کے دوران پروڈکشن کے بہتر طریقے متعارف کرواتے جانے کے بعد ہی رائفل نے میدان جنگ میں مرکزی حیثیت حاصل کی۔ چمکا کر چمک والے ڈیزائن کی سادگی نے پیٹرنز کو معیاری بنایا جس کی وجہ سے

ایک رائفل کے پارٹس دوسری میں بھی لگا نامکن ہوا۔ یورپ کی افواج میں اضافہ ہونے پر جنگ کی صنعت کاری نے یہ نیا ہتھیار مہیا کیا۔ یہ طاقتور، درست، نشانہ لگانے اور دور تک مار کرنے والا ہتھیار تھا۔

اگلا مرحلہ چھوٹے سائز کی گولیاں بنانا تھا جو رائفل میں آسانی سے فٹ ہو جائیں۔ اس کے لیے مختلف طریقے آزمائے گئے۔ پہلی کی بہتری گولی بنانے کے تجربات کرنے والے ایک فرانسیسی کمپنن کلاؤڈ ایلی مٹی نے لوڈنگ کے مسائل حل کیے۔ اور گولی کی مجموعی کارکردگی کو بھی بہتر بنایا۔ اس کی ڈیزائن کردہ گولی ایک غول اور لوہے کے پلگ پر مشتمل تھی۔ فائر کیے جانے پر لوہے کا پلگ پھیل کر نالی میں چپس جاتا اور گولی کا سیلینڈر (جس کے اگلے سرے پر پھوس دھات لگی ہوتی) نالی میں تیزی سے کھوٹا ہوا نہایت زبردست طاقت اور دورنگی کے ساتھ نشانے کی طرف جاتا، بعد میں بہت سے لوگوں نے اس اختراع کو بہتر بنایا۔

1851ء میں برطانویوں نے اس کا ایک نمونہ شاہی اسلحہ فیکٹری کے لوہاروں کو بھیج دیا۔ 1854ء میں کریمائی جنگ کے دوران اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ روایتی توڑے دار بندوقوں سے مسلح روسی فوج ان گولوں کے آگے بڑھ سکی اور منتشر ہو گئی۔

برطانیہ اور روس کی جنگ میں BREECH LOADING سسٹم وجود میں آیا۔ اسی دور میں امریکا میں سول جنگ شروع ہوئی۔ 17 جنوری 1862ء کو فیری لینڈ شارپز برگ کے مقام پر یو این افواج نے کنفیڈریٹ فوج کا حملہ پسپا کیا۔ اس روز 26 ہزار ہلاکتیں ہوئیں، جن میں ترقی یافتہ رائفلوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ رائفل کی بہتری کا مکمل جاری رہا اور اس میں آٹو ٹیک خوبیاں پیدا کی گئیں۔ اب سپاہی یکے بعد دیگرے متعدد راؤنڈز فائر کر سکتا تھا بغیر مشین گن کی ایجاد نے میدان جنگ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا اور رائفل متروک ہو گئی۔

فائر سپر ٹنکر (پانی چمکانے کا نظام) اٹھارہویں صدی میں اگر کہیں آگ لگتی تو مخصوص عمل جو جگہ جگہ لگے ہوئے تھے ان کا پانی کھول دیا جاتا تاکہ وہ پانیوں سے گزرتے ہوئے سوراخوں والے پائپوں میں سے گزرتے اور اوپر سے کی صورت اختیار کر لیتے۔ نمونہ دوں نے 1860ء کے قریب آٹو ٹیک نظاموں پر تجربات شروع کیے۔ پانی چمکانے کا پہلا آٹو ٹیک

نظام 1872ء میں میساچوسٹس کے فلپ ڈیلیو پراٹ نے پیش کر دیا تھا۔

ہنری ایس پارمائی کو کارآمد اور مفید چمڑکاؤ نظام کا مؤجد قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے 1874ء میں اپنی پٹانو فیکٹری کو آگ سے محفوظ بنانے کے لیے یہ نظام لگایا۔ تب سے لے کر 1940ء اور 1950ء کی دہائی تک صرف دیگر ہاؤسز اور فیکٹریوں میں ہی یہ نظام نصب کیا جاتا تھا، اس طرح فیکٹری مالکان کے انشورنس کے اخراجات گھٹ جاتے پھر عمارتوں میں بھی آگ بجھانے والا چمڑکاؤ نظام متعارف کروایا گیا جس کا مقصد انسانی زندگی کو تحفظ دینا تھا۔ تحقیق کرنے والوں نے دیکھا کہ جن عمارتوں فیکٹریوں اور گوداموں میں آٹومیک چمڑکاؤ نظام لگا تھا۔ وہ دوسری عمارتوں کی نسبت زیادہ محفوظ ہوئی تھیں کیونکہ آگ بھڑکتے ہی اسے بجھا دیا جاتا تھا۔

لہذا حکومت نے اسپتالوں، سرکاری عمارات اور دیگر پبلک عمارات میں یہ نظام نصب کرنے کی ہدایت کی۔ ہینڈو بالا عمارتوں میں آگ سے موثر طور پر نمٹنے کے لیے ایک بھی بہترین طریقہ تھا۔

آج کل کے چمڑکاؤ نظام (فائر ایئرنگ) میٹرز اور ان کو جوڑنے والی ٹیوبز پر مشتمل ہیں۔ فائر ایئرنگ عموماً عمارت کی چھت میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگائے جاتے ہیں پھر انہیں پائپوں کے نیٹ ورک اور پانی کی سپلائی سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔

عمارت میں کسی جگہ آگ لگنے پر پیدا ہونے والی حرارت آس پاس کے ایئرنگ کو چلا دیتی ہے۔ اصل میں آگ کی حرارت ایئرنگ میٹرز کے اندر لگے ہوئے ایک ٹانکے کو کھلا دیتی ہے اور فوراً براہ راست آگ پر پانی چھڑکنے لگتا ہے۔ کچھ ایئرنگز میں ٹانکے کی جگہ ٹانخ سے بھرا ہوا شیشہ کا بلب لگایا جاتا ہے جو حرارت سے ٹوٹ کر پانی جاری کر دیتا ہے۔

چمڑکاؤ نظام کی کامیابی اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں پوری عمارت متاثر نہیں ہوتی اور صرف آگ سے متعلقہ جگہ پر ہی ایکشن ہوتا ہے۔ ایئرنگز 13 سے 24 سینٹی گریڈ پانی فی منٹ چمڑکتے ہیں۔

جدید چمڑکاؤ نظام کو باقاعدگی سے چیک کیا جاتا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی درست کارکردگی کو یقینی بنایا

جاسکے۔

پلیٹنگ سسٹم کی طرح ہرنگر کے باپ بھی عموماً دیواروں کے اندر فٹ کیے جاتے ہیں۔ یہ شاذ و نادر ہی لیک ہوتے ہیں۔ مغربی دنیا میں ان کا استعمال 200 برس سے ہو رہا ہے اور انہیں نہایت قابل بھروسہ اور محفوظ خیال کیا جاتا ہے۔

نظر کا چشمہ

عیسوی دور کی ابتداء سے پہلے تک نظر کے چشمے ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ خراب نظر والے رومنوں کو ان کے نام آئے ہوئے مراسلے غلام بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

ڈراما نویس ارسٹوفین نے بھی ایک قسم کے آتش چشمے کا ذکر کیا، جس کو دوپ میں رکھ کر پڑے وغیرہ میں سوراخ کرنا یا موم کو لوحوں سے کچھ مٹانا ممکن تھا۔ یہ آتش شیشہ اندازاً 1000ء میں ایجاد ہوا اس وقت اہل ویش نے اس قسم کا شیشہ بنانا سیکھ لیا تھا جسے قرقر کے اوپر رکھنے سے الفاظ بڑے ہو کر نظر آتے تھے۔

نظر کے چشموں یا عینکوں نے 1268ء اور 1289ء کے درمیان اپنی موجودہ صورت اختیار کی۔

1268ء میں نظر کے چشموں کا ذکر سائنسدان راجر بیکن کے ہاں ملتا ہے۔ اس نے لکھا۔ ”کرسٹل شیشے یا کسی اور شفاف شے کے ذریعے حروف یا بہت چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دیکھا جاتا ہے۔“

پھر 1269ء میں سائنس راوی لوپوز دنامی شخص نے لکھا۔ ”میں اس قدر ضعیف ہو چکا ہوں کہ نظر کے چشموں کے بغیر کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا، انہیں حال ہی میں کمزور بصارت والے بوڑھے افراد کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔“

انفوس کے موجد کے نام کا حوالہ نہیں ملتا لیکن 1306ء میں پیا شہر میں ایک راہب نے خطبہ دیتے ہوئے اس شخص کا لپکا سا ذکر کیا۔ ”نظر کے چشمے کوئی تیس برس پہلے ایجاد ہوئے۔ میں بذات خود ان کے موجد سے ملا اور اس سے بات چیت بھی کی۔“

ابتدائی چشمے (ایک معدنی پتھر) Quariz لینزوں پر مشتمل تھے کیونکہ ابھی تک شیشہ سازی کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ عینکوں کی ایجاد کے بعد ب سے بڑا مسئلہ انہیں لگائے رکھنے کا تھا۔ درحقیقت یہ مسئلہ

تھے۔ انہیں بیڑی کی ٹوبہ کے اندر رکھا گیا تھا اور متواتر نگہداشت کی گئی۔

ایک موقع پر میں نے نرس سے پوچھا اگر اکلیم بیڑی نہ ہوتا تو اس قسم کے بچوں کا کیا ہوتا؟ اوہ، وہ مر جاتے، نرس نے جواب دیا۔ اس بارے میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ تمام تو نہیں مگر زیادہ بچے مر جاتے۔ 1888ء میں کل از وقت پیدا ہونے والے تمام بچوں میں سے تقریباً 68 فی صد مر گئے لیکن اسی دور میں اکلیم بیڑا ایجاد ہوا اور تمام بچوں پر استعمال میں آنے لگا۔

1824ء میں ایک مصنوعی اکلیم بیڑی مد سے مرغی کے اٹھروں کوئی کراٹھنڈ کی شہزادی کو کنوڑیہ کو چڑے پیش کیے گئے۔ حرارت نے منجھ کر دکھایا تھا لیکن تب تک کسی نے بھی بچوں کے لیے ان کے استعمال کا نہیں سوچا تھا۔

1878ء میں ہیرس کے ایک چلڈرن اسپتال کے ڈاکٹر اسٹیفن نے تارنیر نے قریبی چڑیا گھر کا دورہ کیا اور چڑیا گھر کے منتظم اوڈیل مارٹن کا ڈیزائن کردہ آلہ دیکھا جس میں وہ چھڑوں کو حرارت دیا کرتا تھا۔

آلے کوئل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کے لیے استعمال کرنے کا خیال اسی ڈاکٹر کو سوجھا۔ ڈاکٹر تارنیر کے پاس ایک کسان کا ڈیزائن کردہ ڈبہ تھا۔ اس نے 1883ء میں اپنا ڈیزائن برٹش میڈیکل جریدے دی لانسٹ کو پیش کیا۔

جریدے نے تارنیر کے ڈبے کے متعلق تفصیلی مضمون شائع کیا اور اس ڈبے کو بچوں کے لیے استعمال کرنے کی رائے دی گئی۔

اس ابتدائی اکلیم بیڑی کو گرم پانی سے گرمائش دی جاتی تھی۔ یہ پانی ڈبے کی دیواروں میں گردش کرتا رہتا۔ ڈبے میں دو بچوں کو رکھنے کی گنجائش تھی اور اس کا درجہ حرارت 30 سینٹی گریڈ رکھا جاتا۔

اکلیم بیڑی کو ہیرس میڈیسن اسپتال میں استعمال کیا گیا اور وہاں پیدا اس کے وقت دو کلو گرام یا کم وزن بچوں کی شرح اموات 66 فی صد سے کم ہو کر 38 فی صد رہ گئی۔ یہ تو محض ایک ابتداء تھی۔ 1893ء میں ڈاکٹر تارنیر کے ایک سامی جی بیڈن نے ایک خصوصی یونٹ بنایا۔

فرائیسی اپنی کامیابی کو دیگر اقوام کے لیے بھی فائدہ مند بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ 1896ء میں انہوں نے اپنے کچھ اکلیم بیڑی زایک نمائش میں بھیجے۔ نمائش کے منتظم اعلیٰ نے

350 برس تک حل طلب رہا۔ بینکوں کو گھمراہنے کے لیے مختلف قسم کے فریم بنائے گئے اور 1730ء میں لندن کے ایک چشمہ ساز، ایڈورڈ سکارلیٹ نے شیشوں کے اطراف میں بازو لگے جو کانوں تک جاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد رنگین لینز بھی استعمال کیے گئے کیونکہ کچھ موجدوں کا خیال تھا کہ شفاف شیشے میں سے بہت زیادہ روشنی گزرتی ہے، چنانچہ پہلے بڑیا نیلے لینز بنائے گئے۔

مختلف شفافوں نے بینکوں کے بارے میں مختلف رویے اپنائے، مثلاً فریج اور انگش لوگ دوسروں کے سامنے ٹینک نہیں لگاتے تھے جب کہ اسپین والوں کا طرز عمل قطعی مختلف تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ٹینک لگانے والا شخص زیادہ نمایاں اور پروقار ہو جاتا ہے۔

امریکا میں ٹینک استعمال کرنے والے کی مناسبت سے ہی قیمت مقرر ہوتی تھی، مثلاً 200 ڈالر کی قیمت مخصوص بینکوں کو بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل رسائی بنا دیتی، جنہیں فریٹنگن کے بہت سے کارنامے لوگوں کو یاد ہیں مگر چند ایک لوگ ہی جانتے ہیں کہ وہ شیشوں والی نظری کی عینکس اسی نے بنائی تھیں۔

کنکٹ لینز کی تاریخ حیرت انگیز طور پر بہت طویل ہے۔ پہلی مرتبہ یہ تصور 1845ء میں جان ہریشل بنائی شخص نے پیش کیا۔ 19 ویں صدی کے اواخر میں ایک شخص کی آنکھوں کی چٹلیاں کینسر کے باعث خراب ہو گئیں اور ایک جرمن ایف ای مولر نے اس کی آنکھوں پر کنکٹ لینز لگائے وہ آدی میں سال بعد اپنی موت تک یہ لینز لگائے رہا۔

شروع میں کنکٹ لینز کافی بڑے اور غیر آرام دہ تھے لیکن وقت گزرنے پر وہ ہارک جھوٹے یا سہولت اور مقبول ہو گئے۔ 1964ء میں ساٹھ لاکھ سے زائد لوگوں نے جن میں 65 فی صد عمر میں تھیں۔ کنکٹ لینز لگا رکھے تھے۔ انسان کی درست بصارت بہت قدر و قیمت رکھتی ہے۔ ذرا سوچیں کہ نظری بینکوں کے بغیر کتنی ہی ایجادات ممکن نہ ہوتیں وہ حقیقت ان کی حیثیت بھی پیچھے نہیں ہے۔

اکلیم بیڑی آلہ
ایک شخص لکھتا ہے۔ میرے چھ پوتے پوتیوں میں سے دو قبل از وقت ہی پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا وزن تین پاؤنڈ اور دوسرے کا دو پاؤنڈ تھا۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مارکیٹ میں بیٹے والے چڑے ہوں۔ وہ ننھے ننھے جھریوں والے اور لال ٹانگی طرح

ایک قریبی اسپتال سے قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے اکیو میٹرز میں رکھے۔

اس نے اعزاء کو گایا کہ بچوں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ بہر صورت ان کا زخمہ بچنا محال تھا مگر وہ سبھی زندہ بچ گئے۔ اکیو میٹرز نے کرشمہ کر دکھایا۔

اگلے برس برٹش اکیسپوزیشن میں بھی یہی تجربہ دہرایا گیا لیکن کسی بھی برطانوی ماں نے اپنے بچے کو ایک فرانسیسی ایجاد کی سمیٹ چڑھانے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اکیو میٹرز میں رکھنے کے لیے فرانس سے بچے منگوانا چاہتے تھے۔

اکیو میٹرز کی مقبولیت ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ 1897ء میں دی لانسٹ جریدے نے تبصرہ کیا کہ ابھی تک انگلینڈ میں اکیو میٹرز عام استعمال میں نہیں لائے جاسکے ہیں۔

ان ابتدائی اکیو میٹرز کے بارے میں ایک شکایت یہ تھی کہ ان کا درجہ حرارت کنٹرول کرنے کے لیے کوئی آٹو میک طریقہ نہیں تھا اس لیے نرس کو مسلسل نظر رکھنا پڑتی تھی کہ کہیں درجہ حرارت کم زیادہ نہ ہو جائے۔

کئی لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایجاد صرف امیر والدین کی خدمت کر رہی تھی لیکن ترقی اور بہتری کا عمل جاری رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے اندر درجہ حرارت معلوم کرنے والا لکھی لگایا جانے لگا جو درجہ حرارت کو خود بخود ایڈجسٹ کر دیتا تھا اور اس طرح یہ ہر چھوٹے زمرہ کی اہم ضرورت بن گیا۔

لکڑی کے بحری جہاز، کشتیاں

لکڑی کے چھوٹے بڑے جہاز اور کشتیاں آج ہمیں فالتو چیز لگتی ہیں لیکن تجارت، دور دراز علاقوں کی سیاحت اور بد قسمتی سے جنگوں کے لیے بھی انہی کا استعمال ہوتا رہا۔ انیسویں صدی کے وسط تک لکڑی کے بحری جہاز اور کشتیاں ہی سفر اور تجارت کا بنیادی ذریعہ تھیں۔

دنیا میں جہاں بھی پانی اور آبادی تھی وہاں کسی نہ کسی قسم کی کشتیاں ضرور بنائی گئیں۔

دنیا کے مختلف علاقوں میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران بڑے بڑے درختوں کے تنے ملے ہیں جنہیں اعدہ سے کھرج کھرج کر خالی کیا گیا تھا۔

1950ء کی دہائی میں KON-TIKI مہم سے ثابت ہو گیا کہ لوگ اس قسم کی قدیم کشتیوں میں ہی پیشہ کر ایشیا سے جنوبی امریکا آئے ہوں گے۔

کرسٹوفر کولمبس نے 1492ء میں تین کشتیوں پر اٹلانٹک سمندر پار کیا لیکن اس بات کی ٹھوس شہادت موجود ہے کہ اس سے کئی برس پہلے ہی یف ایبرکس نامی بحری بیانیہ وائیکنگ کشتیوں پر شمالی امریکا پہنچ چکا تھا۔

بہر حال لکڑی کے جہازوں نے ایک نئی دنیا کے دروازے کھولے اور ساری دنیا کی سیاحت کا ذریعہ مہیا کیا۔ لکڑی کی کشتیاں ایک ایسی ایجاد تھیں جنہوں نے دنیا کو بدلا بھی اور بنایا بھی۔

اولین کارآمد کشتیوں کا سراغ تقریباً 4000 ق م کے فیجیا میں ملتا ہے۔ قدیم فیجیا کی جگہ اب لبنان اور شمالی اسرائیل ہے۔ فیجیوں نے 200 فٹ کی BIREMES اور TRIREMES کشتیاں بنائیں۔ ایک کے دو طرف اور دوسری کے تین طرف چھو چلانے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ہوا سازگار ہونے کی صورت میں وہ بادبان بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ یوں وہ بحیرہ روم میں تمام مقامات تک جانے اور تجارت کرنے کے قابل ہوئے۔ روم میں اعلیٰ طبقے کی نشانی بن جانے والا سرخ رنگ فنی ہی برآمد کرتے تھے۔ فنی لکڑی، لبنانی صویر، جہاز سازی کے لیے زبردست خوبیاں رکھتی تھی اور قدیم دور میں مصر لکڑی در آمد کیا کرتا تھا۔

1954ء میں غزوہ والے اہرام کے قریب کھدائی میں ایک تقریباً صحیح سالم جہازہ کشتی نکلی جو غالباً فرعون کی مینائی ہوئی لاش کو مسمس سے اہرام تک لانے کے لیے استعمال ہوئی تھی۔

کشتی 145 فٹ لمبی اور 20 فٹ چوڑی تھی۔ اسے لکڑی کے تختوں کو اندرونی ریسوں کے ذریعے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اسے چلانے کے لیے دونوں طرف چھوڑوں کی پانچ پانچ قطاریں تھیں۔

فیجیوں اور مصریوں کے بعد قدیم یونان نے جہاز سازی میں مہارت حاصل کی اور تجارتی و جنگی برتری پائی۔ یونانی تجارتی جہاز، فینی اور مصری کشتیوں سے چھوٹے تھے۔ ان کی لمبائی عموماً 100 فٹ سے کم تھی اور درمیان میں مستول لگا تھا۔ بچوں کے بل بیٹھے ہوئے طارح اسے چھوڑوں کے ذریعے چلاتے تھے۔

یونانی کشتیاں شدید موسم میں یارات کے وقت نہیں چلائی جاتی تھیں۔ یونانی بحری ساحل سے قریب قریب ہی رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ بحیرہ روم کی تہ میں سے ڈوبے

ہوئے قدیم یونانی جہاز طے ہیں جن پر رکے ہوئے مرتبان
آج بھی سلامت ہیں۔ یونانیوں نے گھڑی کے جہازوں کو
جہلی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا۔ ان کی بحری کشتیاں
تجارتی جہازوں کی نسبت کچھ لمبی تھیں۔ عیسوی دور کی ابتدائی
صدیوں میں دایمیکل کشتیوں کو کافی بہتر بنایا گیا۔

دایمیکلو کے وطن (موجودہ ناروے) میں جہاز
سازی کے لیے میٹرل دستیاب تھا۔ اس مقصد کے لیے
سیکنڈے نیو باکے وسیع جنگل مفید ثابت ہوئے۔

دایمیکلو، سورج اور ستاروں کے مقام کو دیکھ کر بھی
سمندر میں اپنی سمت متعین کیا کرتے تھے۔ وہ سارے
یورپ، گرین لینڈ اور عالمی شالی امریکا تک بھی پہنچے اور یہ
سب کچھ گھڑی کے جہازوں اور کشتیوں سے ممکن ہوا۔
گھڑی ڈائے لیس مشین (گردوں کی صفائی والی

مشین)

اگرچہ ڈائے لیس مشین کسی کے گردے تو تبدیل
نہیں کر سکتی لیکن یہ گردے کے فراسطانت ہونے تک
مریض کو زخمی رہنے کا ذریعہ بھیہا کر دیتی ہے۔

جب کوئی گردہ نکل ہو جائے تو دوسم کے علاج ہوتے
ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے ڈائے لیس ہی کر دیا ہے۔

ڈاکٹر مریض کے خون کی وردوں میں رسائی حاصل
کرنے کے ساتھ آغاز کرتا ہے۔ یہ کام ٹانگ، بازو یا کبھی
کبھی گردن میں خفیف سی سرجری کے ذریعے کیا جاسکتا
ہے۔ جلد میں لگائے گئے شکاف کے اندر دوسو نیان ڈالی
جاتی ہیں۔ ایک وردہ اور دوسری شریان والی طرف تب
خون صاف ہونے کے لیے ڈائے لیس میں داخل ہوتا
ہے۔ مشین کے دوسم ہیں۔ ایک حصہ ڈائے لیس مواد اور
دوسرا خون کے لیے۔

ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ایک باریک سی
جہلی یا چھتی لگی ہوتی ہے۔ جب خون اس جہلی کی ایک طرف
اور ڈائے لیس مواد دوسری طرف سے گزرتا ہے تو خون
میں سے فاضل مادے کے ذرات چمن جاتے ہیں اور ڈایا
لیسٹ انہیں دھو ڈالتا ہے۔

چھاتی میں سے نہ گزرنے والے سیل واپس خون
میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ چھاتی کے سوراخ
خوردہ بنی ہوئے ہیں اس لیے آٹھ سے دھائی نہیں دیتے۔

دوسرا کم اور عام طریقہ، جیڑیوٹیل ڈائے لیس
ہے۔ جس میں مریض کو اپنی جیڑیوٹیل جہلی کو بطور قطر استعمال

کیا جاتا ہے۔ یہ جہلی پیٹ کے اندرونی جانب ہوتی ہے۔
ڈائے لیس مشین کی خوردہ بنی جہلی کی طرح یہ بھی چھاتی کا
کام دے سکتی ہے۔ اس کے سوراخوں میں سے فاضل ذرات
تو گزر جاتے ہیں لیکن خون کے بڑے سیل نہیں گزر سکتے۔

سب سے پہلے سرجری کے ذریعے ایک پلاسٹک
ٹیوب پیٹ کے اندر ڈالی جاتی ہے پھر تقریباً آدھ گلو کے
قریب ڈائے لیسٹ لیکوڈ (مائع) اس نالی سے گزر کر پیٹ
میں جاتا ہے۔ جب مریض کا خون، ڈائے لیسٹ لوٹن کے
ساتھ ٹکراتا ہے تو اس کی آلائشیں جہلی میں سے چمن کر لوٹن
میں شامل ہو جاتی ہیں تین سے چار گھنٹے بعد ڈائے لیسٹ
لوٹن کو نکال کر اس کی جگہ تازہ لوٹن ڈالا جاتا ہے۔ اس عمل
میں تقریباً آدھ گھنٹا لگتا ہے اور اسے روزانہ چار سے پانچ
مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔

جیڑیوٹیل ڈائے لیس کے فوائد یہ ہیں کہ مریض کو کسی
خصوصی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اور ڈائے لیس میں باہر فیض باقاعدگی سے یہ کام
کرتا رہتا ہے۔ جب کہ جیڑیوٹیل ڈائے لیس کی صورت
میں مریض کو کئی گھنٹے تک میں نہیں گزارنا پڑتے۔

ڈائے لیس کسی بھی روشن اور صاف ستھری جگہ پر
کیا جاسکتا ہے اور اس میں تکلیف نہیں ہوتی۔ آج کل تو
تقریباً تمام ایسے اسپتالوں میں ڈائے لیس روم بن چکے
ہیں جہاں کئی مشینیں ایڈجسٹ ہیں اور بیک وقت پانچ سے
آٹھ مریضوں کا ڈائے لیس آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ ڈائے لیس گردوں کی بیماری کا علاج نہیں
اور ڈائے لیس مشین کی ٹیکنالوجی تقریباً جوں کی توں ہے
لیکن ڈائے لیس مریض کی آسانی کے لیے کئی بہتریاں
پیدا کی گئی ہیں۔

اگر کوئی شخص گردے کی مہلک اور شدید بیماری میں
جلا ہو تو فراسطانت واحد طویل البعدا عمل ہے جو مریض کو
ڈائے لیس سے نجات دلاتا ہے۔ تاہم کسی فریبی عزیز کا
کردہ گلو لینے کے بعد بھی مریض کو مسلسل ادویات لینا پڑتی
ہیں تاکہ جسم کا مدافعتی نظام نئے لگائے گئے عضو کو مسترد نہ
کر دے۔

اس وقت گردوں کے امیدوار مریضوں کی تعداد
دستیاب گردوں کے مقابلے میں تین گنا ہے۔ لہذا بہت سے
لوگوں کے لیے ڈائے لیس ایک ذمہ کی بچانے والا طریقہ
ہے۔ البتہ کچھ مریض ڈائے لیس کو فراسطانت پر ترجیح

دیتے ہیں۔

متحدہ ماہرین کے خیال میں ٹرانسپلانٹ کے بعد زندہ رہنے کی شرح ڈائالیسیس کروانے والے مریضوں سے بہتر ہے لیکن ڈائالیسیس کی افادیت بھی اپنی جگہ درست ہے آج کل کی شیشوں میں مزید بہتری کی توقع ہے۔

قلم

قلم ان ایجادات میں سے ایک ہے جن کی انسانیت کے لیے اہمیت کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ عموماً اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن اگر کیمبرج میں قلم کے استعمال پر غور کریں تو ہم بہت متاثر ہوتے ہیں۔

مثلاً قانون نافذ کرنے والے اداروں کو پھر محرم کی تصاویر لینے میں کامیابی نہ ہوتی یا پھر اس کے عسکری اور سائنسی استعمال کے بارے میں سوچیں، قلم سائنسی تحقیقات اور فوجی کارروائیوں کو فوری طور پر ریکارڈ کرنا ممکن بنا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں اور رسائل کی تخلیق میں بھی اس کا کردار بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔

آج ہم تصاویر سے محروم رسائل اور کتب کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور ہماری ذاتی قاعدائی یادوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ذرا سوچیں کہ ہم اپنے پرانے دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کے ساتھ خوشی و غم منانے کی یادگار کو کیسے محبت سے دیکھتے ہیں۔

قلم میں استعمال ہونے والے کیمیکلز روشنی کے لیے حساس ہوتے ہیں۔ روشنی الیکٹرومیکینک تابکاری کی وسیع رینج کا دکھائی دینے والا حصہ ہے۔ اس الیکٹرومیکینک تابکاری میں نظر آنے والی توانائی شامل ہے۔

ریلیو لہریں گیمما اور ایکس ریز، انفراریڈ اور الٹرا وائلٹ تابکاری الیکٹرومیکینک لہروں کا نسبتاً بہت کم حصہ انسانی آنکھ کو نظر آتا ہے اسے نظر آنے والی دھنک کہتے ہیں۔ اس کا عام نام رنگ ہے۔ انسانی آنکھ زیادہ سے زیادہ سرخ اور کم سے کم بنفشی (وائلٹ) رنگ کو دیکھ سکتی ہے۔ اس کے درمیان میں نارنجی، پیلا، ہبز اور نیلا رنگ ہوتا ہے۔ قوس قزح ان رنگوں کو دکھا دیتی ہے۔

خصوصی سلور مرکبات یا خصوصی سلور نائٹرائٹ اور سلور کلورائیڈ کی Photosensitivity (روشنی سے فوراً متاثر ہونے کی صلاحیت) کو 1700ء کی دہائی میں شناخت کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں انگلینڈ میں تھامس ویننگٹھ اور سر ہنری ڈیوی نے سلور نائٹرائٹ

استعمال کرنے کے پینٹ کی معنی تصویر کو چھوے یا کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کی وہ ایک امیج تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہ زیادہ پائیدار نہیں تھا کیونکہ مسلسل روشنی میں رکھے پر اس کی سطح تاریک ہو گئی۔

فرانس میں جوزف نے 1826ء میں پہلی کامیاب فوٹوگرافی کی جس نے جست کی جگہ تانبے کی پلیٹس اور سلور کلورائیڈ استعمال کیا۔ 1839ء میں جوزف کی موت کے بعد لوئی بریگری نے اس طریقے میں بہتری پیدا کی اور اس کا نام درگوری ٹائپ رکھا گیا۔ درگوری ٹائپ کے تحت بنائے جانے والی تصاویر ایک چھلدار تانبے کی پلیٹ پر ہوتی تھیں۔ 1850ء میں ان کی جگہ انگلینڈ کے ولیم ہنری فاکس ٹالیوٹ کے وضع کردہ نیگیٹو پازٹیو نظام نے لے لی۔ ٹالیوٹ نے سلور نائٹرائٹ والے حساس کاغذ پر روشنی ڈالی اور پھر اس پر مختلف کیمیکلز لگا کر تصویر حاصل کیں۔ اس نیگیٹو سے متعدد پازٹیو تصاویر لیا جاسکتی تھیں۔ 1850ء کے بعد کاغذی نیگیٹو کے بجائے شیشے کا نیگیٹو استعمال ہونے لگا جس سے بننے والی تصاویر بہت واضح تھیں اسے ویٹ پلیٹ پروسس کہا جانے لگا۔ اس طریقے میں تصویر لینے سے قبل شیشے پر کیمیکل لگانا پڑتا تھا۔ جلد ہی ڈرائی پلیٹ پروسس سامنے آیا۔ 1878ء میں شیشے کے کئی ٹکڑوں پر پہلے سے کیمیکل لگا کر کھل لیا جاتا تھا۔

اس کے بعد امریکی جارج ایسٹ مین نے زیادہ آسان نظام وضع کیا۔ شیشے کی پلیٹ کی جگہ کاغذ کی ایک پٹی نے لے لی۔ 1889ء میں ایسٹ مین نے کاغذ کے بجائے سیلولائیڈ نای پلاسٹک آزما کر دیکھا۔ یہ دنیا کی پہلی فوٹو گرافک فلم تھی۔ اس نے مستقبل کی تمام فلموں کی بنیاد رکھی جو پولیسٹر، ایسیٹٹ پلاسٹک سے بنائی جاتی ہیں۔

بیسویں صدی سے پہلے رنگین فلمیں استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ رنگین تصاویر بنانے کے لیے تجارتی لحاظ سے کامیاب میٹرل آئو کروم 1907ء میں دستیاب ہوا۔

حقیقت میں رنگین فوٹوگرافی کا آغاز 1935ء میں کوڈروم اور 1936ء میں اکیواکس کے ساتھ ہوا۔

فوٹو گرافک فلمیں ایسے کیمیکلز استعمال کرتی ہیں جو نظر آنے والی روشنی کی مختلف Wavelengths کا مختلف رد عمل دیتے ہیں۔ موجودہ دور کی عام فلمیں نظر آنے والی روشنی کے تمام رنگوں کو ریکارڈ کرنے کے قابل ہیں۔



پرسی۔ خطوط کے آئینے میں ان کی دلی کیفیت ملاحظہ کریں۔
 پہلا خط پاکل کا ہے، پیار کی آگ میں جلتی یہودی لڑکی کا۔ وہ
 مکتبی ہے۔

106-E جرمن کالونی

ایلین بی سٹریٹ

آگ اور خون کی ہولی جہاں آئے دن کھلی جاتی
 ہے۔ جہاں مسلمانوں کو لوگ نظر بھر کر نہیں دیکھتے۔ جیسے ہی
 کسی مسلمان پر نظر پڑتی ہے وہاں کے لوگ نفرت سے نظر
 پھیر لیتے ہیں۔ مگر یہی وہ دونوں ایک ہونا چاہتے تھے۔ ایسی
 خواہش رکھتے تھے۔ اس کا ادراک مجھے تب ہوا جب میں سفر

بارود کے ڈھیر پر آگ کی پیار کی داستان



سلمیٰ اعوان

صیہونیت کو ایک بڑی طاقت بنانے میں کئی ممالک کوشش
 کرتے رہے ہیں لیکن اسرائیل کے عام شہری، ایسے شہری جو
 مانتے ہیں کہ اسرائیل نے ظلم کی انتہا کر دی ہے وہ ان ریشہ
 دہنی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ دونوں بھی ظلم و جبر کے
 خلاف تھے۔ ان میں ایک مسلمان تھا اور دوسری یہود۔ ان
 دونوں کے دل ایک دوسرے کی تال پر دھڑکتے تھے مگر مذہب
 کی دیوار کو پہلانگنا آسان نہ تھا۔ اس عشق کا انجام کیا ہوا؟



یاد محمد خاموش رہنے کی بجائے ان پر خوب ہوتی ہوں۔
گزشتہ دنوں میری پھوپھی پوچھتی تھیں کہ یہاں شفٹ ہوئی
ہیں۔ مغربی بروخلم کی ماسیلا کالونی میں انہیں مگر ملا ہے۔
وہی ماسیلا جہاں بروخلم کے مسلمانوں کا قدیمی تاریخی
قبرستان تھا۔ بے شمار علماء اور صوفیاء سے بھرا ہوا۔ جس پر
بلڈوزر چلے اور شاعر ابنتی تعمیر ہوئی۔ وہاں شفٹ ہونے
سے قبل وہ ایک ماہ ہمارے پاس رہیں۔ مئی ڈیڈی تو خیر تم
جاننے ہی ہو بڑے لبرل اور سیکولر لوگ ہیں۔ پر ہماری وہ
پھوپھی جن کا ایمان اس بات کے بغیر عمل نہیں ہوتا کہ دنیا بھر
کے یہودیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ارض موجود پر یروش
کریں۔ یہ ان کے باپ دادا کی میراث ہے۔ جب میں
نے ان سے بحث کرنی چاہی تو انہوں نے تین ہزار سال کی
تاریخ کا میرے سامنے ڈھیر لگادیا۔

”اے فلسطین کب ہے؟ یہ تو کھانا ہے۔ ہم
اسرائیلی جنہیں یہ فلسطینی میراثی کہتے ہیں۔ یہ تو سج سے بھی
کہیں پہلے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ کتنا در بدر بھرے
ہم۔ اکتے غلے ہے۔ کس کس قوم نے ہماری نسل کشی نہیں کی؟
صدیوں پر پہلی تاریخ کھول کر دیکھ لو۔ کہیں فرانسیسیوں
نے، کہیں ان اچھے دوستوں نے۔ یہ منحوس مارے انگریز
جنہوں نے ہمیں زمین خریدنے اور کاشت سے روکا۔
ہنری دوم اور سوم نے ہم سے لاکھوں پاؤنڈ بھی لیے اور
ہمارے ماتھے پر شناخت کا ٹیکا لگا کر ہمارا عام لوگوں کے
ہاتھوں بڑا بھی کر دیا۔ یہی اس کہنے فرانس کے شاہ قلب
نے کیا۔ یہودیوں کو جلیوں میں بھی غوطہ۔ ان سے پیسا بھی
لیا اور انہیں دیس بدر بھی کیا۔ پرنگالیوں کے بھی روپے ایسے
ہی تھے۔ جرمینوں کہینوں نے ہسٹل کو مات دے دی۔ ان
کے عیسائی پادری تو حلیفہ بنا کر اکر داتے۔ ”میں نجس یہودی
ہوں۔ میرے آباء نے مجھے مسیح کو صلیب پر چڑھایا۔“ یہ
بدخو پولش بھی آڈل درجے کے بدحرام۔ پیسا بھی ہم سے
لیتا، ادائیگی بھی نہیں کرتی اور نذرہ بھی سارا یہودیوں
پر۔ ایسے بد بخت اوپر سے نعرے کہ یہ یہودی ہمارا خون
چوس رہے ہیں۔ دیکھو تو کیسے عالیشان گھروں کے مالک
بنے بیٹھے ہیں۔ جلاؤ ان کے گھر۔ تباہ کر دینا کی کالونیاں۔
اگر بے لاگ بات کروں تو یہ ہمارے عظیم سائنسدان
ڈاکٹر ہیم وین من کا احسان ہے ہم پر کہ جس نے اپنے کیمیائی
رازوں کی برطانیہ سے سودے بازی کی۔ جنگ سے غڑحال
برطانیہ کو تو جیسے خزانہ مل گیا۔ ایسے ہی اسے جنگ میں برتری

دو ماہ بعد بھی گھر کا پتہ لگانا مشکل ہو جائے۔ اب میرا بھی تو
بڑا سیسا ہے کہ جب تک ارد گرد کے سارے کچے ختم نہیں
نہ سناؤں کھانا ہی بھنم نہیں ہوتا۔ یہ تیسرا ماہ جا رہا ہے۔ مانا،
تم بڑے پڑھا کو ہو۔ اب فون پر بھی اتنی لمبی باتیں نہیں ہو
سکتیں۔ مئی ڈیڈی کو بل کا بڑا ہوا کارہتا ہے۔ خط لکھوں تو لگتا
ہے جیسے کتاب لکھ رہی ہوں۔

لو تیار ہو جاؤ اب میری داستان سننے کے لیے۔
منصور، پچھلے دنوں ہمارا ایجوکیشنل ٹرپ ویلی رینج گیا تھا تو
وہاں کیلی بیت اللہم کے گاؤں میں سی بات پرا لبرٹ، لیزا،
زیربان، جوڈی ملائک اور جوئن سموسٹل میں جھگڑا
ہو گیا۔ دراصل سارا دراملا مصیبت مارے احساس برتری اور
تاریخ پر غلبے کا ہے۔ ہزاروں سال قبل کے اس گاؤں کے
ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے میں لیزا کی قوم کا حصہ
ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ نہ مسلمانوں، نہ عیسائیوں اور نہ
آرمیناؤں کا۔ نجی منصور یہ لیزا اتنی فضول اور متعصب ہے
کہ اگر جوڈی آکر اس مسئلے میں مداخلت نہ کرتی تو وہاں سر
پھول ہو جاتا تھا۔

میں نے چلا کر کہا تھا۔ ”لیزا تم ہر بات میں مذہب کو
کیوں کھینچتی ہو؟“

جواب اس نے میرے اور تہارے متعلق اتنی کھلیا اور
فضول باتیں کیں۔ ”مکوئی سے محبت کی چنگیں ڈالی ہوئی
ہیں تمہیں معلوم نہیں کہ وہ یہودی نہیں ہے۔“ میں نے بھی
وہ سنائیں کہ پوتی بند ہو گئی۔

منصور تمہیں یقیناً عربی میں لکھے گئے میرے اس خط کو
دیکھ کر قہقہہ ہوا ہوگا۔ مجھے اس زبان کو تحریری طور پر لکھتے
ہوئے حرہ آیا۔ عبرانی بھی تو سیکھنی تھی۔ دونوں میں کچھ
چیزیں مشترک ہیں۔ کاش کہ دونوں کے بولنے والوں میں
بھی بہت زیادہ نہ کیسی تھوڑی سی محبت اور تھوڑا سا اشتراک
ہو جائے۔ یوں ابھی کچھ خاص مہارت تو نہیں ہوئی، بس
وال ولید والی بات ہے لیکن اخبار پڑھنے سے میں عام آدمی
کی سوچ سے ضرور آگاہ ہو رہی ہوں جو شاید دوسری صورت
میں ممکن نہ ہوتا۔

ہاں منصور، انسانی رویوں کے تضادات سمجھنے کی طرح
اب بھی مجھے بہت متاثر کرتے ہیں۔ مہما کے سمجھانے کے

نہیں ملی تھی۔ کاروباری فرصت ہماری قوم کو قدرت ختم
ودیعت کی ہے۔ تو جو اس کی گھٹی میں ہے۔ غیر معمولی
ذہانت و صفات یہودی قوم کے انعام ہیں۔ من و سلوی جیسا
تختہ بھی یہودی قوم کے لیے ہی آسمانوں سے اترا۔ اب
قومیں جلتی ہیں تو بھی جلے۔ کج تو بھر مکی ہے کہ ہم ہیں ہی
خدا کے لاڈلے۔

اف منہور بھلا مجھ سے صبر کیسے ہوتا۔ میں بول اٹھی
تھی۔

”اگر گنجی بات کہوں ڈھوڑا (عبرانی میں خالدہ چچی،
ممانی، پھولی) تو سن لیجئے۔ برا نہیں مانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ
بروزم نہ تو آپ کا ہے اور نہ مسلمانوں کا۔ ہاں آپ اسے
عیسائیوں کا کہہ سکتی ہیں۔ یہودیت نے صحرائے سینا میں جنم
لیا۔ اب کوہ سینہ کیسے معتبر ہو گیا؟ کوہ سینا کیوں نہیں جہاں
کتاب ملی اور خدا سے کلام بھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں کا تو براہ
راست نقل جاز سے ہے۔ بس ایک یاد کا واسطہ ضرور
ہے۔ البتہ عیسائیت یہاں پیدا ہوئی۔

ڈھوڑا تو تھلا اٹھی۔ ”یہ تم تاریخ دان کب سے ہو گئی
ہو؟“

”مجھے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔“ ان کے تھلانے
تھلانے سے محفوظ ہو گئی۔

گنجی بات ہے مگر میں عذاب آیا ہوا ہے۔ یوم کپور کو
بھی انہی دنوں آنا تھا۔ ہم نے تو یہی اس کا خصوصی اہتمام
نہیں کیا تھا۔ اب می تھوڑا بہت تو خال کرنے لگ گئی ہیں کہ
وہ لوگوں کی فضول بحث و تکرار سے گھبرانے لگی ہیں۔ ڈیڑی
کی اس بات کی وہ اب قائل ہی ہو گئی ہیں کہ دنیا داری بھی
ضروری ہے مگر قاعدہ قرینہ اور ترہیبی عناصر کا ابھی بھی نقصان
ہے۔ ہم یہودیوں کے عقیدے کے مطابق یہ تو یہ استغفار کا
دن ہے۔ ماضی کے گناہوں سے توبہ کا دن، حال کے لیے
زیادتی اور ظلم نہ کرنے کا عہد۔ گناہوں اور اپنی زیادتیوں کا
اعتراف۔ میری زبان تو تم جانتے ہی ہو سدا کی کتری ہے
بولنے سے باز نہ رہ سکی۔

”ساری یہودی قوم کو ان بھارے فلسطینیوں سے
معافی مانگنی چاہیے جنہیں انہوں نے دس لاکھ لاکھ دیا ہوا ہے اور
ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگی چاہیے جنہیں انہوں نے
کولیوں سے بھون دیا۔“ دیو دیا سین ابھی بھی میری
یادداشتوں میں محفوظ تھے۔
میری پھولی تو جیسے سان پر چڑھ گئیں۔

”ارے ہم نے اپنا حق لیا۔ زمینوں پر ناجائز قبضہ
نہیں کیا بلکہ اس کی قیمت دی اور یوں بھی ہمارے مذہب
میں غیر یہودی کا کھل جائز ہے۔“

میں جواباً کچھ سنانا چاہتی تھی مگر مجھے گھور رہی تھیں۔
مجھے ان پر شدید غصہ آیا۔ انہوں نے انگوٹوں کے اشاروں
سے میری مت مادی۔ میری پھولی نے مجھ پر دہریے
ہونے کا ٹیلی چپاں کر ہی دیا۔ کس عمر سے انہوں نے می کو
غائب کیا۔

”یہ ڈیٹا تم نے تو اس کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ ایٹم بوم
کیسا ہے؟ وہ بھی اس جیسے خیالات کا ہی مالک ہو گا؟ تم
لوگوں نے تو گنجی لیا ہی ڈھودی۔ اپنے مذہب کو کوڑا
کر دیا ہے۔ ابھی تو شکر ہے کہ ان کے قیام کے دوران
ضالیہ آگنی کے ہاں سے کوئی نہیں آیا اور نہ ہی ہم لوگ اولڈ
خندہ کھنڈے کر نہ تو سارا الزام یوسف فلی پر دھرا تھا۔
میرے فائل ٹیٹ سرہتے۔ پھر در را جز تو دیسے ہی مجھ
سے شدید نالائی ہیں۔ میری صورت پر نظر پڑے ہی ان کی
لعن طعن میں اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔“

”تمہارا تو دیدہ ہی پڑھائی میں نہیں۔ فزیالوجی کے
نمبروں کو دیکھو۔ سرمر کے پاس ہونے والی بات ہے۔ یوں
تمہاری ماں کو نہیں ڈاکٹر بنانے کی شدید تمنا ہے۔ یا بل تم
فعلی مجیدہ نہیں۔ تمہارے می ڈیڑی سے بات کرنے کا بھی
کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بھی کسی بات کو ڈھکے سے نہیں لیتے۔“
اب ایسے میں کتابیں پکڑتی ہوں پر سارے گھر میں
ادھم مچا ہوا ہے۔ سفید پینٹ پاش۔ گھر کے باہر تعویذ کی
موجودی تھی۔ سفید کپڑوں کا اہتمام۔ چڑے کے بغیر
جوتوں کی فراہمی۔ ہمارے پاس گزشتہ سالوں کے خریدے
ہوئے کچھ چڑے پڑے تھے۔ ایک پر کھیں چڑے کی پھولی
ی پٹی بھی تھی۔ ماما سے ہی جڑوں میں اڑس لیتی تھیں۔
”اف“ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی لائسی ناک نخوت
زدہ انداز میں سکڑی اور اسے اٹھا کر کوڑے دان میں
پھینک دیا کہ ہم ایسے ممنوعہ کاموں سے اپنے دین کو بھر شت
کرتے ہیں۔

میں اپنے ڈیڑی ڈیوڈ کی اس بات سے سونی صد
اتفاق کرتی ہوں کہ یہودیوں نے بہت سی فضول پابندیاں
اپنے اوپر از خود ہی مسلط کر لی ہیں مگر اب میری پھولی کو یہ
سب کون سمجھائے۔ یہ تعویذ کہ میں یہ سب باتیں پہلی دفعہ
کر رہی تھی یا اپنے گھر میں ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بس

اجداد اہمیت سے نکالے جانے کے بعد تپس آئے۔ وہاں سے شام، شام سے فلسطین کے شہر نفدہ۔ پتھارے وہاں بھی ٹھوکر کیں ہی کھا رہے تھے کہ کسی نے ٹھٹھکی جانے کا مشورہ دیا۔ دیکھتے ٹھٹھکی میں اجتماعی زرعی فارموں میں کام کرنا شروع کیا۔ انہی مشقت کے باوجود بھی غربت جان نہیں چھوڑی تھی۔ کارمیلا کا پردادا کیتولک مشنری کی پُرکشش مراعات کا جان کر عیسائی بن گیا مگر دادا نے یہودیت کی طرف پھر واپس کی۔ کارمیلا کا باپ پڑھنے لکھنے کا شوقین عربی کانگلی کارسیا۔ ابتدا و رہے کا عضیلا، گانا شروع کرتا تو لگتا جیسے کوئی سردی نغمہ جن راؤڈی میں لپٹا دل کی دیا زبرد زبرد کرتا، کہیں بلند یوں سے دھیرے دھیرے ٹیپ میں اترتا آ رہا ہو۔ وہ شنی گانگ میں عود بجاتے ہوئے حمد یہ نظمیں، نعش پڑھتا تو موسیقی میں تال کے درمیانی وقفوں میں لہراتے بل کھاتے سرن کر لوگ گنگ سے ہو جاتے۔ اس باپ نے بیٹی کے لیے جولا کا پسند کیا وہ بھی ایسے ہی مزاج کا تھا۔ غریب سا نون لطف کا شیدائی۔

کارمیلا سترہ سال کی عمر میں جس کے پلے بندھی وہ قاہرہ میں ایک بک شاپ پر پیکر بن تھا۔ کتابوں کا رسیا جس نے بیوی کو بھی اس چال میں شامل کر لیا تھا۔ کارمیلا تو پہلے ہی اس ماحول کی عادی تھی۔ شوہر اور اس کا مزاج ملاؤ زندگی کا لطف بڑھ گیا۔ تنگ و تار یک چھوٹا سا کرائے کا کھر۔ اوپر تلے تین بچے پیدا ہو گئے تھے۔ کارمیلا کی صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ دو دوں میاں بیوی زندگی سے لطف اٹھانا جانتے تھے۔ روٹی سوکھی کھاتے مگر کتابیں پڑھتے، گیت گاتے، پلی پلی جوڑ کر بھی تھیرا اور کبھی اوجیرا ضرور دیکھتے۔

پھر یروشلیم آ گئے۔ یہاں لندن جیوز ویلفیمر سوسائٹی نے انہیں لندن کے ایک نئے سمروز موٹی فوئیرے کے غریب یہودیوں کے لیے بنائے گئے خیراتی گھروں میں سے ایک الاٹ کر دیا۔ کارمیلا نے سوچا بچے اب بڑے ہو گئے ہیں خود اسے بھی کچھ باتھ پلہ ماننا چاہیے۔ انہی سوچ و بھاری انہی چکروں میں تھی کہ ایک شام تینوں لڑکے اٹھکڑی کالونی کے عقب میں واقع گراؤڈ میں فٹ بال کھیلنے گئے۔ مخالف ٹیم عیسائی لڑکوں کی تھی۔ چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ سر پھٹل ہوئی۔ معاملہ شدی بلدیہ کے قاضی کے سامنے پیش ہوا جس نے فیصلہ یہودی لڑکوں کے حق میں دیا۔ مگر عیسائیوں کے مشتعل نونوں نے رات کو یہودی کواٹروں میں آگ لگا دی۔ ایسی خوفناک آگ تھی کہ جس

اس کی اس درجہ شدت اور میری ذہنی بلوغت مجھے بار بار سوال جواب پر کاسائی تھی۔ جب ہم سب Kittel (سفید لباس) پہنے ٹھٹھکی گانگ میں پاس پاس گھڑے نرنگے کی آواز سننے اور کتاب احبار Leviticus میں سے باب نمبر 23 کی آیت نمبر 27 پڑھتے تھے، اور خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ ”اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو کھارے کا دن ہے۔“ میں نے خود سے پوچھا تھا کہوں یہودی یوم کپور منار ہے ہیں۔ کیا وہ خود سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

شنی گانگ جانے سے قبل ہمارے دوسم ہٹاں چلا کر کمرے میں رکھ دی تھیں۔ کھڑکی کا ایک ہٹ جانے کیسے کھلا رہ گیا اور جب وہ شنی گانگ میں آنکھیں بند کیے دعا سنیں مانگی تھیں یکدم وہ میری طرف مٹھی میں اور مضطرب سے لہجے میں بولی تھیں۔ ”پائل مجھے کھڑکی بند کرنی یاد نہیں رہی تھی۔ تیر ہوا سے موسم ہٹاں بچھ نہ جائیں۔“

میں نے اپنی ماں کو دیکھا تھا، سفید لباس میں وہ کس قدر دلکش لگ رہی تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ دھایا اور دھیرے سے سرگوشی کی۔ ”تو کیا ہوا۔ قیامت آجائے گی۔ ریلیکس رہیں۔“

یوم کفارہ کی تاریخ سنی اور کول ٹڈی کی بھی۔ کچھ قاعدہ نہیں۔ ڈیڈی ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے اور چن چن میں اہتمامی کھانا پک رہا تھا اور روزہ رکھنے میں اگر خدا کو صبر و قناعت کا کوئی سبق دینا مقصود ہے تو اس سبق کو حاصل کرنے کے لیے مبالغہ کی طور پر بیزار اور کوفت زدہ نظر آتی تھیں کہ انہیں بھوک بہت لگ رہی تھی اور وہ بہتر پر لٹی ہوئی بار بار وقت دیکھتی تھیں۔ کچن میں کام کرنی کارمیلا سیوتا (دانی دادی) حریب کی چھلیاں کاٹنے ہوئے میری پھوپھی کی کن ترانوں کے ساتھ ساتھ خود پکھنے والے لست اور بے پردا جیسے اعتراضات و الزامات بھی خاموشی سے منتی چلی جاتی تھی۔ اندر کمرے میں ماما میری طرف دیکھتے ہوئے دکھ سے کہتی تھیں۔

”اب کتنی بار اسے بتاؤں کہ ڈھائی پہلی کی یہ عورت جس کی اندر کو دھنسی آنکھوں میں زمانے بھر کی دیرانیاں ڈیرے ڈالی بیٹھی ہیں۔ کیسی مظلوم اور بے بس عورت ہے؟ منصور تم ابھی کارمیلا سیوتا سے نہیں ملے۔ اسے ہمارے پاس آئے ابھی سال نہیں ہوا۔ بڑی دل خراش داستان ہے پتھاری کی۔ سفاردی یہودی ہے۔ آباؤ

انجیر کے باغوں کی دید سے لطف اٹھایا۔ گھروں پر انگوڑوں کی سبز پتیلیں آنکھوں کو لہجاتی تھیں۔ انجیروں کے درختوں تلے کئی انجیروں کی چادر میں سی پھٹی ہوئی تھیں۔

کئی بات ہے۔ یروشلیم کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ میلوں لمبی مورچہ بند اور خاردار تاروں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ مشرقی یروشلیم اردن کے پاس اور مشرقی اسرائیلیوں کے پاس۔ جگہ جگہ دونوں کی قائم کردہ فوجی چوکیاں جن کے اندر بند و قید تھے بیٹھے فوجی۔ کئی بات ہے۔ عیسیم کے اس یہود اور غیر انسانی مظاہرے پر مجھے شدید دکھ ہوا تھا۔ منصور انہیں یقین دہانہ دیا کہ وہ جلد کیٹ کے سامنے بڑی سی ٹنگریٹ کی دیوار دیکھ کر میرے آنسو نکل آتے تھے۔ مجھے آنٹی ایما یاد آتی تھیں۔ ہم اسی کیٹ سے نکل کر ان کے گھر جاتے تھے۔

”ہم کیا امن سے نہیں رہ سکتے تھے۔“ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

دونوں حصوں میں جانے کا واحد ذریعہ میٹرو ہاؤس تھا۔ بار بار کاغذات کی چابی پڑنا کوفت میں جھلا کرتی تھی۔ ہمارے یروشلیم والی کئی میں لیانہ جو ہمارے ساتھ ہو چکا تھا۔ کھلا کرتی تھی اور میں اس سے ہمیشہ ہی ہارتی۔ وہ مجھے کمرشل سینٹر میں لے کر سڑکی میں اس لیانہ کو تو میں پہچان ہی نہ سکتی۔ اس نے پاس آ کر مجھے ہتھوڑا دیا تو میں بھی خوش ہوئی۔ بہت خوبصورت اور گھری ہوئی تھی۔ کوئی تین ماہ پہلے بیاہ ہوا تھا۔ سسرالی گھر گھورتا تھا۔ میں تھا جس کا عقیقہ تقسیم میں اسرائیلی علاقے میں چلا گیا۔ اس تقسیم نے خاندانوں کو کیسے متاثر کیا اس کی لمبی چوڑی تفصیلات اس نے مجھے سنائیں۔

بن گوریاں بھی کم بخت ایک نمبر کا ضدی، بہت دھرم اور تعصب کی غلامت سے اٹا انسان ہے۔ یروشلیم کو تو سموچا نکل جانا چاہتا ہے۔ جہاں تمام دفاتر یروشلیم منتقل کرنے کی ہدایات جاری کرنے کی کیا تکلیف۔

ڈیڑی ایک دن بائیں کر رہے تھے کہ غیر ملکی سفارت کار پریشان ہیں اور ابھن میں جھلا ہیں کہ اگر وہ اپنی اسناد مغربی یروشلیم جا کر پیش کرتے ہیں تو گویا یہ یروشلیم کی متنازعہ حیثیت کو ختم کرنے کے برابر اقدام ہوگا۔ منصور، مجھے تو دکھ کے ساتھ ہنسی بھی آتی ہے۔ تین مذاہب کے پیر و کار جن کے دین انہیں پہلا سبب انسان سے محبت کا دیتے ہیں اور وہ ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور ایک دوسرے کا ختم مارنے میں جی جان سے مصروف ہیں۔

نے بیٹوں، شوہر سہوں کو نکل لیا۔ وہ بھی میٹروں اسپتال میں زیر علاج رہی۔ اسپتال کے بعد سڑک پر لے آئے اپنے گھر رکھا، وہ آسٹریا جانے لگی تو ماما کو فون کیا۔ سویت ماما فون پر ہی رونے لگیں۔

”بیچ دو اسے۔ چاہے آنے والی گاڑی میں بیٹھا دو۔ ڈیوڈ لے آئیں گے۔“

ہاں منصور، سب سے اہم باتیں تو میں تمہیں سناتا ہی بھول گئی۔ میرے خیال میں جو بہت دلچسپ بھی ہوں گی اور مزے کی بھی۔ اپنے گھر میں ہونے سے قبل میری پھولی کا یروشلیم، پیکل سلیمانی کے دیدار اور دیوار کریمہ پر جانے کی شدید خواہش میرے خیال میں ہر اس عام یہودی کی طرح ہی تھی جس کا ایمان ان کی دیدار اور نظارے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا مگر ان کی یہ خواہش میرے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ ”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“ اس دن وہ بڑے موڈ میں تھیں۔ ان کی اس پیشکش پر میں نے سوچا۔ اگر جانی ہوں تو جلدی سے ملاقات ہو جائے گی۔ کتنے سال ہو گئے ہیں انہیں دیکھوئے۔ ماما سے تنہائی میں بات کی تو انہوں نے کہا۔

”دفع کرو یا نکل۔ تم ملے جاؤ گی تو فضول باتوں کے پلندے کھڑے کر دے گی اور ڈارنگ تم جانتی ہو کہ اس سے اچھے سے میری جان جاتی ہے مگر میں کیا کرنی میرا تو اپنا دل بھی جانے کو پھٹنے لگا تھا۔“

”ارے ماما آپ کیوں گھبراتی ہیں؟ مجال ہے جو اس کے فرشتوں کو بھی خبر ہو۔ میں واپسی پر ان کے پاس جاؤں گی۔“

چلتی اور گھر کے ملازموں کے لیے میں کچھ تحائف لے کر جاتی تھی مگر پھولی نے جانے کی اتنی افراتفری مچادی کہ مجھے خط کو پوسٹ کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ میں نے خط اٹھا کر سنبھال لیا کہ یروشلیم جا کر اسے مکمل کر کے پوسٹ کروں گی۔ مجھے یروشلیم آئے ہوئے ہفتہ ہو گیا ہے۔ تھوڑی سی تفصیل اس سزاور یروشلیم کی بھی سن لو۔

ٹرین جگہ سے یروشلیم جاتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ٹرین کا سفر مجھے ہمیشہ بہت مسرور کرتا ہے۔ علی الراعی ہم جینے سے بس کے ذریعہ جگہ اسٹریٹ پہنچے۔ ٹرین اچھی تھی۔ سڑک کی تین کھٹے کا تھا۔ درمیانی فاصلہ تو کوئی 60 کلومیٹر کا ہے مگر چونکہ علاقہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے گاڑی سست رفتاری سے چلی۔ تاہم میں نے جی بھر کر سبز پہاڑوں اور زیتون و

دیکھو میں نے جنہیں کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ میں چند دنوں تک جدی کی طرف جاؤں گی۔
(تمہاری بائیں)
اس نے بائی کی منظر نگاری ایک دوسرے خط میں کی تھی۔

میں جھانکتی کہیں کہیں کوئی کھڑکی اڑندہ وسطی کے قہقہری اعداد کا ساتھ چھوڑتی، دیکھنے والے پر رعب داب اور ہیبت کا سا احساس پیدا کرتی ہے۔ میں نے اک ذرا رخ بدل کر بالفاظیل والے گھر پر نظر ڈالی ہے۔ دفر جذبات سے میری آنکھیں بند ہو گئی ہیں۔ تمہارے اس گھر میں اور سامنے والے گھر میں میرا اور تمہارا بچپن قید ہے۔ کچھ گھنٹوں بعد میں چوبی کھڑکی سے اندر داخل ہوتی ہوں۔

منصور، مجھے محسوس ہوا تھا جیسے کسی میکینٹ بار پر میں نے قدم رکھ دیئے ہوں کہ وہ ہماری مشترکہ یادوں کا بڑا سا آئینہ میرے سامنے تھا۔ شرقی دیوار پر انگوڑوں کی پتیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تالاب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ہاں کنواں مجھے خشک لگا۔ گلاب فہر رہے تھے اور پتیلی کی خوشبو سارے میں بکھری تھی۔

ایک خوبصورت منظر چھلاک مار کر سامنے آ گیا ہے۔ سات آٹھ سالہ لڑکی جھولے میں لپٹے ایک شیر خوار بچے کو شوق و تجسس کی بلند یوں سے دیکھتی اسے اٹھانے کی کوشش میں ہے۔ ”پائل نہیں نہیں قاسم گر جائے گا۔“ یہ لپٹی تھی قاسم کی میڈ۔ تم اور ایڈمنڈ جن میں سائیکل پر جھگڑتے تھے۔ لپٹی کے تیز لپچے سے موٹے موٹے آنسو ابھی میرے گالوں پر ٹپکے نہیں تھے کہ ضالیہ آئی نے آکر مجھے اپنے سینے سے چٹالیا۔ کس رنج اور پیار سے انہوں نے قاسم کو میری ہانہوں میں تھمایا تھا۔ یادوں کی یہ یوندا باندی جانے کب تک جاری رہتی اور میں اس میں نہایتی رقتی کہ اس گھر کے بوڑھے ملازم سالم رجانے نے دیکھا اور جوش مسرت سے گھر سر پر اٹھالیا۔

لٹنے لانے کے بعد پتا چلا کہ جدی کے کچھ پرانے دوست اہا ایوان شلائی عراق کے یہودی یوین ولیم اور انور براکی دونوں قاہرہ کے یہودی جن کے خاندان بھی انیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین آئے تھے۔ یہ سب جوانی عربی شناخت پر نازاں فلسطین کے سرگردہ کاروباری سیاسی اور علم دوست گھرانے جن کا شمار فلسطین کی اہر سوسائٹی میں ہوتا تھا۔ مغربی بروکھم میں جنہیں ان کے خوبصورت گھروں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ ان کی صدیوں کی شناخت ختم ہو گئی تھی۔ وہ اب مہاجر تھے۔ مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے، اپنے دنوں پر فلسطین کا داغ لیے ہوئے۔ ابو ذریع، یہ سب افسردہ سے لپچے میں بتاتے ہوئے دکھ ہے۔ اتنے پیارے اتنے لوگ جو آج کھانے پر انکسے ہو رہے ہیں۔

شارع صلاح الدین، بروکھم منصور! مجھ گئے ہونا کہ یہ خط ہمیں کہاں سے لکھ رہی ہوں؟ اسی گھر سے جس کے چپے چپے ہماری یادوں کے چراغ جلتے ہیں۔ یہاں آنے کے لیے میں جیف گیٹ کی طرف نہیں بڑھی کہ ڈیوڈ اسٹریٹ سے سیدھی چلی آئی۔ دراصل منصور میں باب دمشق سے اندر آکر ان راستوں پر پل پل ٹھہر ٹھہر کر اپنے بچپن کی یادوں کی فہمی اپنے اندر اتارنے کی سعی تھی۔ سالوں بعد دمشق گیٹ کو دیکھ کر جذباتی ہو گئی ہوں۔ ٹائیس روڈ پر میرا کنڈر کارڈن اب وہاں نہیں ہے۔ ہاں تمہارا اور ایڈمنڈ کا سینٹ جارج اسکول اسی شان بان سے قائم ہے۔ مارچ کی خوشگوار صوب تیز ہواؤں کے جھلا رہیں، خاصے تہہ پل شدہ ماحول پر بکھری بہت دلربا سی نظر آتی ہے۔ میں نے رک کر اس تاریخی دروازے کو دیکھا ہے۔ اف منصور وہ سہ پہر مجھے یاد آتی ہے، جب شہر میں بلوہ ہو گیا تھا۔ فلسطینیوں کی مصافقاتی بشتیاں شیخ جراح اور قاسم شاندہ بنی تھیں۔ تم اور ایڈمنڈ اسکول سے بھاگے بھاگے مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ ڈیڈی ان دنوں چیغہ اٹھاتی ڈیوڈی پر لپکے ہوئے تھے۔ میں بہرہ کے پاس کی، وہ کتنا ناراض ہوئی تھی میری پاپا پر کراتے غیر ذمہ دار ماں باپ ہیں۔ خوف زدہ کبھی ہوئی جیسے میں تمہاری آواز سنتے ہی بھاگی تھی اور تم سے لپٹ گئی تھی۔ تم مجھے سائیکل کی راڈ پر بٹھاتے تھے اور میں موٹی پمپس پہن جاتی تھی۔ افراتفری، شور، بھاگ دوڑ، غمرے بازیاں۔ میں بھی بالوکی چسپی تھی۔ روتی اور جلاتی تھی۔ دو بار تو سائیکل سے گری۔ ایڈمنڈ سے ڈانٹ کھاتی۔ تمہارے ہاتھ دوڑتی کیا۔

چلتے چلتے دائیں بائیں دیکھتے چتے دنوں میں جھانکتے میں شارع صلاح الدین کی مشرقی بروکھم کی اس آخری گلی میں آکھڑی ہوئی ہوں جو تنگ تنگ گلیوں اور بلند و بالا عمارات کے سہارے میں جھپتی اور آخری سرے پر جا کر مغربی بروکھم سے جاملی ہے۔ اس گھر کا دیوہ قاسم مرکزی چوبی دروازہ عربائی غموں میں سایا اپنی بیرونی فیصل نما دیوار جس

اور ان کی چھتر چھاؤں تلے پناہ میں عافیت جانی، اس امر کے باوجود کہ ان ترکوں نے تم جیسے ذہین انسان اور کام کرنے والے سمجھ کی پیٹھ میں خنجر گھونٹا اور خالد یوں کو نیچا دکھانے کے لیے حسینیوں کو بالادست کیا اور اب بھی اندر خانے اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔ ترک پارلیمنٹ کے عربوں سے حلقہ روئے اور طرز عمل بھلا تم سے زیادہ کون جانتا ہے؟ وہ ہمیشہ سے عربوں کو خود سے کتر سمجھتے ہیں۔ مجھے بتاؤ انہوں نے ہماری زبان جو ان کی بھی ذہنی زبان ہے اسے کبھی ترکی کے برابر درجہ دیا؟ نہیں کبھی نہیں۔ مقامی پتھائیس قائم کرنے کا ہمارا مطالبہ بھی رد کیا گیا۔ اب اگر عرب انسرفوج میں منظم ہو رہے ہیں تو کیا غلط کر رہے ہیں؟ باہر سے آنے والے یہ مہسہونی لبنان اور شام میں رہنے والے فلسطینیوں سے منگے داموں زمینوں کی خریداری کر رہے ہیں۔ یہ اتنی فلسطینی زمینوں کی اتنی ہماری پتھائیس وصول کر کے بہت خوش ہو رہے ہیں اور نہیں جانتے ہیں کہ وہ کس مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں؟ بلدیہ القدس (یوٹیل کنسل) کے ارکان کی تعداد میں ہمیشہ سے یہودی رکن ایک ہوتا تھا اب تقاضا ہے کہ ان کی تعداد بڑھائی جائے۔

شاہراہ اہم کے اسی چھوٹے سے آفس جس میں بینک کر تم نے بڑے بڑے کام کیے تھے اسے بڑا کرنے پر اصرار ہے۔ ویسے آجکل شہر کو خوبصورت بنانے پر بھی بہت زور ہے۔ جیف ٹیٹ کے ساتھ نئے ٹیئر میں آجکل ترکی اور فرنج میں کمال کے ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یوٹیل اسپتال کو ہم لوگ بہت توجہ دے رہے ہیں۔ بالکل مفت علاج کیا جا رہا ہے۔ نئے تعمیر ہونے والے سینٹ لوئیس اسپتال میں علاج اور مریموں کی دیکھ بھال بہت عمدہ طریقے سے ہو رہی ہے۔ مسلمان اس اسپتال کی طرف بھاگے جاتے ہیں۔ مشنری لوگوں کے اپنے عزائم ہیں اور بہر حال یہ تو ماننا پڑے گا کہ ان یہودیوں اور عیسائیوں میں فلاحی کام کرنے کے جذبے جنوں کی حدود کو پہنچے ہوئے ہیں۔ تم سے زیادہ موٹی فوری کامدراج کون ہوگا کہ جس کے صحت کے اصولوں پر بنائے گئے گھروں نے یہودیوں کی کایا کلپ کر دی۔

جیوش کوادرز (جئے) کے ال سلسل میں رہنے والے مفلوک الحال لوگ جن کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، گال پچکے ہوئے، رنگت سرسوں کے پھولوں جیسی اور

”میرا تو جی چاہتا ہے ایسا لذت کھانا کھاؤں کہ ان کا جی خوش ہو جائے۔“ جذبی تو کہیں باہر تھے۔ قہوہ پیئے ہوئے میں گھر میں پچھلے اس ہنگامے کو دیکھ کر محفوظ ہوتی تھی۔ ریڈیو بج رہا ہے اور کوکب المشرق کے بچہ عینک (میں تم سے دور ہوں) کی سریلی گونج سارے گھر کو سناتی دراصل میرے دل کی ترجمانی کر رہی ہے۔

سالم رجبانی مصر ہے کہ میں کف کا ایک گلا تو کھا لوں۔

”ہنی اپیل تبا کو بھی لانا ہے اور سنو حاجی بھی کی دکان سے لانا۔“ گھر کا جذبی پیشی عمران اعلیٰ سالم رجبانی ملازموں کو کہیں چوڑی ہدایات دے رہا تھا۔

نزد کی صفائی ہو رہی تھی۔ وہ خرد (چھوٹی) کھلیں گے۔ انہیں یہ کھیل بہت پسند ہے۔ اسٹور سے باتریاں نکال کر انہیں بھی صاف کیا گیا تھا۔ تازہ مینہ ہونی کافی ابو ذریعہ پتھر کی کوڑی میں کوٹ رہا تھا۔ مجاورہ بتاتا ہے۔ سالم رجبانی بہت گھر مند ہے کہ اچھا نہیں جانتے۔

انہیں اپنے کاموں میں چھوڑ کر میں ضالیہ آئی اور جدوسارہ کے کمروں میں گھومتے گھاسنے لائبریری میں آگئی ہوں۔

منصور، یادوں کی جیسے وہاں برأت آرائشی تھی۔ جدوسارہ اور جدی یوسف نے اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کو کیسے سنبھالا ہوا تھا۔ ماہ سال کے حساب سے۔ گویا اس الماری میں خالدی خاندان کی تاریخ محفوظ تھی۔

میں نے الہم نکالا۔ اف منصور، بیسویں صدی کا پہلا سال جب جدی یوسف دی آنا یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور میری ثانی ایبوس قیود اور ہرزل کے آفس میں ان کی سیکرٹری کے طور پر کام کرتی تھی۔ منصور میری ثانی تمہارے بابا (انکل ڈاکٹر موسیٰ) جو اس وقت دوسالہ گل کوختنا سا بچہ تھے کے گالوں کو والہانہ انداز میں چوم رہی ہیں۔

مجھے محسوس ہوا میں ان سے بہت زیادہ مشابہ ہوں۔

الہم میں جدی یوسف کے بڑے بھائی کا لکھا ہوا خط بھی چسپاں تھا۔ یقیناً یہی وہ خط تھا منصور جس نے جدی کو دوا نہیں بردھم کرنے پر مجبور کیا۔

تم درس دہنہ ریس میں کم ہو اور مجھے وطن کی ہواؤں میں طوفانوں کی سرسراہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ تم نے ہمیشہ عرب قومیت کے نظریے کی مخالفت کی اور ترکوں کی حکومت

نئی اسرائیلی مملکت کا اعلان ہو گیا اور شاید تم لوگوں کو حیفہ
 بھیجے کا فیصلہ جدی نے اسی روشنی میں کیا تھا۔
 سہ پہر کے قریب جدی آئے۔ منصور تم ان کی مسرت
 کا اعزاز ہی نہیں لگا سکتے۔ مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوئے۔
 یہ رات اگر خوبصورت تھی تو میرے لیے حقیقی
 انکشافات سے بھی بھری ہوئی تھی کہ جیسے کی ان سے
 قنویزی بہت آگاہی ضرور رکھتا تھا۔

جدی نے بڑی تگ و دو سے چند اور دوستوں کو بھی
 اکٹھا کیا تھا۔ جدی عبداللہ ویسٹ چیک سے آئے تھے، ابھی عید
 ہیروٹ اور عبداللہ نور دشی سے۔

توینن ولیم اور انور برامی دونوں بہت ڈپریشن کی
 کیفیت میں تھے مغربی یروشلم سے ملحق علاقے پر قبضہ
 میں انور برامی اپنے گھر کو ڈھونڈتا رہا اور توینن تلبیس میں اپنے
 گھر کو۔ یہ جو جسمی فلسطینیوں کا گوشہٴ عافیت تھی آج انہیں
 یہاں دس چھپوں پر رکھا گیا۔ داؤمی مونچھوں سے بے نیاز
 نوجوان چھوکر سے چھوکر یوں نے ان کے کاغذات چیک
 کرتے ہوئے ان کے دماغ گھما ڈالے تھے۔

توینن نے اپنے گھر کو بچان لیا تھا۔ گیٹ اندر سے
 لاک تھا۔ اس نے کتنی بچائی۔ خادمہ نے دروازہ بھی کھولا مگر
 انہیں اندر ہی نہ جانے دیا۔ توینن نے التجا کی کہ یہ گھر اس
 کے پرکھوں کی نشانی ہے وہ اسے دیکھنے کے لیے کیوں دور
 سے آیا ہے۔ گھر کی مالک کے چہرے پر زمانے بھر کی درشتی
 پھیلی۔ زبان سے کچھ کہنے کی بجائے اس نے اس زور سے
 دروازہ بند کیا کہ توینن کا جی چاہا وہ نہیں کرے اور پھر گھر
 مرجائے۔

جدی نے اپنے گھر پر ان کا استقبال اسی محبت اور گرم
 جوش سے کیا جو ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ توینن اور انور
 دونوں بعد اس کر کے میں آکر بیٹھے تھے۔

ایمان شیلانی کتابوں سے محبت کرنے والا، کتابوں کا
 رسیا، کھڑا ایک ایک حلیت کو دیکھتا تھا۔ فرانس مارش کی
 ”عائشہ“ اور اس کا انگریزی ترجمہ The forest of
 truth دونوں پہلو پہ پہلو تھی تھیں۔ اس کی ریلٹ پارس
 دیکھتے ہی اس کی آنکھیں میچ کی سی لگیں۔ طلب جیسے علی اور
 ثقافتی شہر کا پاسی جب اپنے شہر سے نکل کر شہروں شہروں
 گھومتا طلب سے تریپو، جید، بمہون، قاہرہ، سکندریہ کو
 دیکھتا فرانس پہنچتا ہے۔ شہروں کو عمارتوں کو لوگوں اور ان کے
 رویوں کو اس نے کیسے دیکھا اور محسوس کیا۔ اس کے دلکش انداز

بدن ڈھانچے جیسے جو الم سلح کے ایک ایک کمرے پر مشتمل
 ہاڑے میں رہے رہے زندگی تمام کر دیتے تھے۔ کبھی کرا
 ان کا باورچی خانہ جہاں کلوپوں کے دھوپیں سے بھرے
 باحول میں کھانا پکنا۔ روشنی اور ہوا سے محروم اس جگہ میں
 انہیں تپ دق جیسا موزی مرض اپنے بچوں میں بکڑ کر ہلاک
 کر ڈالتا۔ موٹی فورے نے یہ جگہ تو ہسپتال بنانے کے لیے
 خریدی تھی مگر بعد میں ارادہ بدل دیا اور گھر بنائے۔ کن
 جنتوں سے اس نے ان لوگوں کو ان کے تنگ و تاریک
 گھروں سے نکالا اور کھلی نر فضا جگہ پر لے گیا۔ یہی حال
 اسکولوں کا ہے۔ جنہیں اب یروشلم آجاتا چاہیے۔ تعلیم اور
 صحت دو بنیادی مسائل ہیں جو ہماری بھرپور توجہ چاہتے
 ہیں۔ ان دینی مدرسوں کی جگہ ماڈرن اسکولوں کی اشہ
 ضرورت ہے اور ایسی ہی بے شمار باتیں تھیں جنہوں نے
 یوسف نیا کو وطن واپسی پر آدھ کیا تھا۔

منصور، جنہیں ایما آنتی تو یاد ہوں گی وہی یمنین
 موٹے میں رہنے والی۔ جاہدہ آنتی، مارگریٹ، بی اور ضالیہ
 آنتی ہم بچوں کے ساتھ جب بھی ان کے گھر جاتیں۔ ان
 کے گھر کے سامنے والی گراڈ میں ہم لوگ کتنا کھیلتے۔ ضالیہ
 آنتی نے وہ تصویریں الہم شاکر لگی تھیں۔ عرصے بعد انہیں
 دیکھ کر میں کتنا خوش ہوتی ہوں؟ تصویریں یہ بھی کیا چیز
 ہیں؟ انسان انہیں دیکھتے ہوئے کیسے اس دنیا میں جلا جاتا
 ہے۔ دیر یا سین میں جدی کی کرن کی بیٹی باسما سختی کی شادی
 ... میں جب تم دولہا کی طرح اپنی گھر میں تیار کی پٹی
 باندھے سر پر سرخ کفہ پہنے رقص کرتے تھے۔ منصور میں
 نے رقص کرتے کرتے جنہیں کہا تھا۔

”تم کتنے خوبصورت لگ رہے ہو۔ جب میں تمہاری
 دلہن بنوں گی تو باسما سختی کی طرح کے کپڑے پہن کر اسی کی
 طرح کا رقص کروں گی۔“ جنہیں یقیناً داد ہوگا۔“ اف منصور ان
 تصویروں نے مجھے دلا دیا ہے۔ یروشلم آئے ہوئے ابھی ماہ
 بھی نہیں ہوا تھا کہ اس خوبصورت دیر یا سین میں خون کی
 ہولی کھلی گئی۔ پورے گاؤں کو آکر سن کے گور ملا دستوں جن
 کی کمانڈ اسٹرن کے مرنے کے بعد اب جتا ہم بیگن کر رہا
 تھا۔ نئے گاؤں مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ ڈائنامیٹ سے
 گھر اڑائے گئے۔ معصوم بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور
 مردوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے بمون دیا
 گیا۔ وہ پیاری سی ذہن، اس کا دلہا اور گھر والے سب اس
 بریت کی سمیٹ چڑھ گئے۔ دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (جرٹ)

(دیسکی ملٹی یونائیٹڈ داخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
030 1-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

تحریر نے اس کے سب سے تاثرات کو اس قدر دلکش بنا دیا تھا کہ پڑھتے ہوئے آنکھیں نہیں جھپکتی جاتی تھیں۔ کوئی دس بار تو اس نے اسے پڑھا ہوگا۔ کتاب بھی اس کے پاس تھی پر ان ہجرتوں کے پکڑوں میں جانے کہاں رہ گئی۔

احمد فارس البدایق ماڈرن عرب لٹریچر کا باپ کی "ایک ہزار ایک راتیں" دیکھ کر شیلانی کو بہت محو یاد آیا تھا۔ اپنا کمر اپنا کمر، رات اور فارس کی کہانیاں۔ بائبل کو تصفیٰ اس نے احمد فارس کے ترجمے سے ہی پڑھا تھا۔ ایک پورا خانہ ابن رواندی پر تنقیدی کتب سے بھرا ہوا تھا۔ سلم ال بطلانی کی A Loss in the Levantine gardens بھی بہت سی یادوں کے درمیانے واقعے تھے۔ محمود ہیکل الباردی بھی شیف کے شیشوں سے تھانک الماری کے پت کھولنے کی دعوت دیتا تھا۔ یہ کمر اس کے لیے نیا تھا۔ پر مدت بعد دیکھنے سے ماضی کی یادوں نے جس طرح گھیراؤ لیا اس میں سانس لینا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

عمم حاضر کے شاعر کیا عراقی، کیا شامی، کیا مصری، کیا فلسطینی سبھی یہاں موجود تھے۔ شیلانی نے بی سانس بھری تھی اور صوفے پر بیٹھ کر جتنے کا جتن لگایا تھا۔ دیواری مونے مکدوں کی جگہ صوفوں نے لے لی تھی۔ کمرے کے قالین البتہ بدلے ہوئے تھے۔ یعنی انجیل جیسا کہ کی خوشبو تھی جس نے سارے کمرے کو مضطر سا کر رکھا تھا جس میں سانس لینا گویا عہد رفتہ میں جانے کے برابر تھا۔ جتنے کی لمبی نال سارے میں گردش کرتی تھی اور قبوسے کی سرس دینے پر انے ملازمین کے چہروں پر محبت بھری مسکرائیں تھیں اور وہاں بیٹھے ہوئے احساس ہوتا تھا کہ وہ پرانے وقتوں کے پُر لطف لوگوں میں کہیں موجود ہیں اور فلسطین ان کے اپنے فلسطین کے شب و روز میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ پر ان کیفیات کی مدت کتنی ہی بس چند لمحے۔ تھوے کا مگھنٹ بھرتے ہوئے برآمدی بولا تھا۔

ان خالوں نے تو نام و نشان مٹا دیے ہیں۔ وہ جگہیں جہاں ہم نے اپنا بچپن گزارا۔ جس کے چپے چپے پر ہماری دوستیوں، دشمنیوں، ملائی جھگڑوں اور محبتوں کے جذبات بکھرے ہوئے تھے ان جگہوں پر جرزی، پولینڈ اور روس کے لوگ آئے بیٹھے ہیں۔ ہمارے وقتوں کا سکون، گمروں کی ترتیب اور حسن، درختوں کی بہتات، خاموشی، خشک، عرب قہوہ خانوں کی کہانیاں اور

ماہنامہ سرگزشت

دہشت گرد قرار دے دی گئی مگر یہی کام جب ارگن مسکانا اور اسٹرن جیسی تنظیمیں کرتی تھیں تو کل و عارت کے بازار گرم ہوتے تھے۔ تب وہ یہودیوں کے نزدیک فدائی مجاہد، ان کے نجات دہندہ اور مائی باپ تھے تو بس انہوں اور دوسروں کے لیے ترجمان کے بنانے جب حلف ہوں تو پھر زمین پر دی سکھ ہوتا ہے جو یہاں ہو رہا ہے۔

”ڈیوڈ بن گوریاں اور بیتا بنکین سے بھی بڑے کوئی غنڈے ہوں گے جو اس نظریاتی مملکت کے ذریعہ عظم بنے۔“ انیان شیلانی نے دھواں فضا میں چھوڑتے اور اس کے نیگلوں غبار میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے کہا تھا۔

بہت مدت بعد یہ دھم کساہی اچل تمباکو کے کشوں نے جیسے ان میں سرشاری سی دوڑا دی تھی۔ شیپ ریکارڈ پر شہزادہ امراء اٹلیس کی شاعری کو سننا بھی بہت پرکلف تھا۔ دسترخوان پر بیٹھے تو بھی مجاہدہ کی ڈش پچھلے کھن اور دہی کے ساتھ تھی دیکھ کر سرور ہوئے۔ تو بین نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ہم فلسطینیوں کی کمزوری۔ وہ کیا کہتے ہیں۔

A hungry man would be willing to sell his soul for a dish of mojadaro:

”تو بھی آج ہم جو بکے اس ڈش کو ترے ہوئے اس سے انصاف کرتے ہیں۔“

کھانا بہت لذیذ تھا اور بہت روایتی بھی۔ کریم اور تلتے ہوئے اورک سے تھی جس کی ڈش کھاتے ہوئے تاسف سے انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ ”لوان کی دھٹائی دیکھو۔ زمین پر تو قابض ہوئے ہیں پھر کونسی ہائی جیک کر رہے ہیں۔ صدیوں پرانی یہ خاص منسپنی ڈش اب ان کی بن گئی ہے، کوئی پوچھتے یہ روٹیوں کی ہے، پولش دالوں کی ہے یا جرموں کی، آخر کن کی ہے؟ جو تم اسے اپنے ساتھ جوڑ رہے ہو۔

تو بین دلم نے پشت صوفے کی بیک سے نکالتے اور خود کو ڈھلا چھوڑتے اور لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہمارا گھرانہ عربی موسیقی کا کس قدر دلداد دے رہا تھا۔ سلامہ مجازی عمر العاشق کی شاعری کا پرستار۔ کس شاعری کو کون سی نئی نظم، غزل کہیں بھیجی ہے۔ کس نثر نگار نے کیا نئی چیز لکھی ہے؟ ایک دوسرے کو ملاقات پر فرمائے انی اور سنا جاتی۔“

میرے والد شام کے ڈھلنے کا انتظار کس بے چینی سے کرتے؟ جو نئی دھوپ کی تیش کم ہوتی۔ وہ باب دمشق کے

جہل پہل سب خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ جڈی نے آنکھیں اٹھائیں اور انہیں دیکھا ان آنکھوں میں انہیں محسوس ہوا تھا جیسے جہان لٹا پڑا ہے۔ جب وہ نرو کھلتے تھے اور امراء اٹلیس کی شاعری سننے تھے تو بین دلم ہنسا اور بولا۔ ”میرے بڑے بیٹے کے بچوں نے مدتوں ہمیں پریشان رکھا۔ وہ یہ دھم میں جو دیکھتے اور سنتے تھے اسے بہت سنجیدگی سے لیتے تھے۔ ایک دن جب وہ سب بیٹھے کھیل رہے تھے میری چھوٹی پوتی اچانک رونے لگی۔ شاید کوئی خوفناک سامعہ اس کی یادداشتوں میں ابھرا تھا۔“

بڑی بہن کے سامنے جب اس نے اپنے احساسات کا اظہار کیا تو وہ شفقت سے بولی۔

”فکر نہیں کرو۔ آٹو پر پچھ لو۔ کاودکی (سالویشن آری کا عرب سپہ سالار) آئے گا۔ اس کے ساتھ بہت سارے مجاہد اور جیالے سپاہی ہوں گے۔ وہ لبنان کی سرحد پار کر کے فلسطین آئیں گے اور ان سب یہودیوں کا بھرتا بنائیں گے۔“

پھر اکثر یہی کاودکی کی کہانی دہرائی جانے لگی۔ ایک دن میری بیوی نے بڑی پوری ایتار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا مسلمان اور کیتھولک عیسائیوں کی طرح جرنیلوں اور سپہ سالاروں کو آواز دیں دیتی رہتی ہو۔ نہیں ضرورت ہمیں ان کی۔ ان کے گھوڑوں کے ہم جس دھرتی پر پڑتے ہیں وہاں کی زمین اپنی پرتوں سے اکٹری جاتی ہے۔ عام آدمی کے خواب اور خواہشیں سب مچ جاتے ہیں اور وہ زمرہ درگزر ہو جاتے ہیں۔ تم یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ آؤ سفید جھنڈا لہرائیں۔ صلح اور امن کی بات کریں۔“

اس دن میں بھی گھر میں تھا یہ سب سن کر زور سے ہنسا۔ ”تم بھی نرمی اچھی ہو۔ بچوں جیسی خیالی باتیں کرتی ہو۔ امن اور صلح کی باتیں اگر حقائق کو دیکھ کر تیرے تب یہ اہمیت رکھتی ہیں۔ کمزور کے منہ سے اس کا اظہار اس کی کمزوری کی دلیل ہے۔ طاقت کو زنج کرنے اور کچلنے میں مرہ اور تنکین ملتی ہے۔ یہ انسانی جبلت ہے۔ تم کیسے اس کی نفی کر سکتی ہو؟

میری بیوی نے شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورا۔ ”اتنی سچائی کی حقیقت جانتا سیکو خواہ وہ کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو۔“ اب چھوٹی سی مثال سے ہی واضح کر دوں کہ یہ ایل او تنظیم آزادی فلسطین اپنے حقوق کے لیے کھڑی ہوئی۔ ان کے دھماکے کرنے اور بم بلاسٹ پر وہ

سالار کی ضرورت ہے۔ طین یا طین جیسے معر کے ہونے چاہئیں۔ بچی بات ہے مجھے ان جذباتی فردوں نے ذرا مٹا کر نہیں کیا۔ تندر اور فراست کا مظاہرہ دونوں قوموں کے لیے بہت ضروری ہے۔ امن کے لیے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانا اور دنیا کو قائل کرنا ضروری ہے۔ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ دیواریں گندی کی ہوئی ہیں۔ سڑکوں پر کاغذ اڑتے پھرتے اور بڑھتیوں پر دھرے سامان کو بیچنے کے لیے اونچی اونچی آوازیں مکیں۔ گو یہ سب میرے بچپن کے معر تھے مگر درمیان میں دوری اور میری ذہنی بلوغت کے بہت سال تھے۔ شاید اسی لیے میں ان کے ساتھ سمجھتا نہیں کر پا رہی تھی اور دیکھو منصور میں نے اپنے یہ سارے احساسات اور مشاہدات جذبی سے بھی گے۔ انہوں نے میری باتوں سے اتفاق کیا اور کہا تعلیم کی کی تعلیم و ضبط کا فقدان اور فلسطین کے لیے غلی محبت اور غلوں کا مظاہرہ۔ ایسے کتنے عناصر ہیں جو ہم میں نہیں مکر وہ سب اسرائیلیوں میں ہیں اور وہ اسی لیے کامیاب ہیں۔

میں جذبی کے ساتھ امریکن سوسائٹی گئی۔ منصور ان لوگوں سے ملنا کیسا پُر لطف تجربہ تھا؟ یہاں مختلف قوموں اور مذاہب پر مشتمل یورپی لوگوں کا ایک کلب club تھا جو عالمی بھائی چارے اور امن کے لیے ہمہ وقت سرگرم رہتا ہے۔

مجھے ترین پر سوار کرنے خود جذبی آئے۔ میں نے منع بھی کیا۔ منصور، تم یقین کرو گے میں ان رشتوں کی لذت سے نا آشناں کے اتنے محبت میرے اعزاز پر میری آنکھیں بھرا آئی تھیں۔ ایسے میں مجھے جلد و سارہ بھی بہت یاد آئیں۔ جلد میں تمہارے گھر کا ایک منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ ہم لوگ تمہارے گھر آئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کا دسترخوان جلد و سارہ کے کمرے میں ہی بچھا تھا۔ باہر بکھری سونے لگی دھوپ نے کمرے کی بلند بالا خردلی رنگین شیٹوں والی کرسیوں کے رنگوں کو بہت چمک دار اور خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ کمرے کے فرش پر چابھاس کی نقاشی کر دی تھی۔ اس کمرے کی سمت درمیان میں منبہ نما بھی۔ ادھا کرا ترکی کے شہزاد میر کے بیٹے جیلنگی رنگی زمین پر بکھرے رنگین پھول پتیوں سے سجے کالین سے بھرا ہوا تھا اور اسی پر ہم سب دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ ام حسان سبز یوپی کی مختلف انداز میں ڈھیں بنانے اور سجانے میں بڑی ماہر تھی۔ پتیل کی بڑی پلیٹ میں گوبھی

کپنے میں پختہ جاتے۔ سرکنڈوں کے بنے موزوں پر پیٹھے کھنے کے کس لگاتے اور نوجوان شوقین گائیکوں کو فریڈال اتر اپنی کی دھن گنگٹانے کو کہتے۔ اس باب دشمن کے کافی ہاؤس ان لوگوں کے ثقافتی اور تفریحی مرکز تھے جہاں ان کی شامیں گزرتیں۔ جہاں ان کے قہقہوں کے طوفان امنڈتے۔ یہیں عرب شاعری پر مبنی مختلف دھنیں بھی ترانے بن جاتے جو شبات کے دن گمروں اور دھننی گاؤں میں گانے جاتے۔“

انفرادی میں ڈو بی بڑی سی سی آہ تھی جو قومیں کے سینے سے کل کر ساری فضا میں پھیل گئی۔ انہوں نے کھٹوں نہروں کیلا۔ اسرائیلیس کی لافانی نظم آؤ ظہریں اور دوسریں سی۔ دیر تک اس پر سر دھتے رہے۔ منصور، میں کوئی گیارہ بجے اٹھ گئی تھی۔ مگر اٹھتے ہوئے میں کتنی افسردہ گئی کہ میرا بھائی چاہتا تھا میں ان میں سے ہر ایک کے گلے لگوں اور دعاؤں میں مار کر رو دوں۔

صبح بہت خوبصورت تھی۔ موسم تھوڑا سا ٹھنڈا اور اب آلود تھا۔ ناشتا جذبی نے میرے جاگنے کے بعد کیا۔ مدت بعد میں نے گرم تلوں والے طبون حاجی کی دکان کے کھائے۔ دوپہر کو میں جذبی کے ساتھ ریڈ کرہن کے دفتر گئی۔ جین کے کپڑوں کے لیے باہر سے کچھ بیجا جذبی کے پاس آیا ہوا تھا۔ وہ انہیں دینا تھا۔

وہاں سے سرکاری دوسرے میں حاضری دی کہ جذبی کو وہاں صدارت کرنی تھی۔ بچوں کے روپے، ان کی تقاریر، ان کی نقیص، ان کے پیش کردہ خاگوں سمجھوں نے مجھے مایوس کیا۔ نفرت کی دیواریں بہت اونچی اٹھتی جا رہی ہیں۔

منصور، میں نے چند چیزیں بہت شدت سے محسوس کی ہیں۔ مسلمانوں کے علاقے میں ایک افراتفری اور بدگلی کا احساس ملتا ہے۔ دیواروں پر پھرنے لکھے ہوئے ہیں۔ اب چونکہ میں عربی پڑھ لکھتی ہوں اس لیے انہیں پڑھنا اور سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ ناصر پر دھم کے گلی کوچوں میں ہیرو بنا ہوا ہے۔ اپنی قوم کے لیے وہ جو استقامت دکھا رہا ہے وہ بہت پسندیدہ ہے مگر اسے یوں مل ایبب اڑانے کے لیے آوازیں دینا کہاں کی عقلندی ہے؟ پرانے شہر کی دیواروں پر کہیں ناصر کو آنے اور مل ایبب کو اڑانے کی ترغیب بھی کہیں صلاح الدین جیسے جیلے

بادرچی خانے میں آگئی۔ قہودہ اس نے اسی لگن اور پریت سے بنایا تھا جو عرب محرت کا شیوہ ہے۔ منصور برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اس نے ٹرے پر تکی پر رکھے ہوئے ڈاکٹر موسیٰ کو آواز دی۔ ”ابو منصور میں نے اپنی قہودہ بنایا ہے ایک پیالے لے لو۔“

ڈاکٹر موسیٰ بروٹم سے آنے والا یوسف ضیا کافون سن رہے تھے۔ قہودہ غصنا ہو گیا تھا جب آکر انہوں نے پیالی اٹھائی۔ منصور نے پوچھا۔ ”خیریت۔ جذبی اتنی دیر فون پر بات نہیں کرتے ہیں۔ کیا کوئی خاص بات تھی؟“

ڈاکٹر موسیٰ نے گھونٹ بھرا اور بولے۔ ”ڈیٹیل سیون کا انتقال ہو گیا ہے۔“

منصور نے انا للہ پر دعا۔ وہ جانتا تھا ڈیٹیل بڑا کھرا اور سچا انسان تھا۔ اسرائیلی پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود کبھی مصلحت یا منافقت سے کام نہیں لیتا تھا۔ ہمیشہ فلسطینیوں کے حق میں آواز اٹھاتا۔ اس کے دادا کا گھرا دوست تھا۔

”کیا کچھ بیمار تھے۔“ منصور نے باپ کی طرف دیکھا۔

”ارے بھئی کہاں۔ یہ جو بروٹم میں دو دن پہلے سیکور یہودیوں اور ہماریوں (تھک نظر) میں فساد ہوا تھا۔ جسے کی شب بارائین اسٹریٹ پر ہماری یہودیوں کے خاندان سب کا گیت گاتے گاتے کمانے کی میز پر ابھی بیٹھے تھے جب باہر سڑکوں پر لڑکوں کے ٹولوں میں تیز گاڑیاں چلانے، گیت گانے اور ڈرنک کرنے کے مقابلے شروع ہو گئے۔ پوری لین کے مردوں کا غصہ اور اشتعال اپنے عروج پر تھا۔ وہ اکٹھے ہو کر ہاتھوں میں پتھروں کے ساتھ باہر آئے اور گاڑیوں پر پتھر اڑا شروع کر دیا۔“

بد قسمتی ڈیٹیل سیون کو زبردستی اس طرف لے آئی تھی۔ پتھروں کی اس بارش میں انہوں نے تیزی سے گزر جانے کی اپنی سی کوشش کی پر کامیاب نہ ہو سکے۔ پتھر وٹ اسکرین پر لگے اور شیشے کی پرچیاں ان کی آنکھوں، دماغ اور دل میں بیوست ہو گئیں۔ دو دن اسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد چل بسے۔ مغربی بروٹم میں ابھی تک کرفو لگا ہوا ہے اور حالات بہت ابتر ہیں۔

”خدا ان پر اپنی رحمتوں کا نزول کرے۔“
ڈاکٹر موسیٰ کے لہجے میں تعزیتی اور دعائیہ الفاظ ملے جلتے جذباتی انداز میں گل لے رہے تھے۔

کے پھول، بیگن کے پتے، گاجروں کی قاشیں، توریوں کی پچائیں، مدھی کے فرائی ہو کر چکی تھیں۔ پودے اور سلاخ کے پتوں کے ساتھ ہر سبزی اپنی اصلی رنگت کے ساتھ بھار دکھائی تھی۔ دوسری پلیٹ میں سبز یاں اجار میں بنائی گئی تھیں۔ چاندی کی بڑی سی ڈش جس کی کندہ کاری بغدادی کاریگروں کی مرہون منت مٹی سے تھی۔ پتیلے کی صورت لیے چادلوں اور گوشت کا یہ چوکور پہاڑ بھی اپنی صورت گری میں ایک انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ کبھی سنی کے گرد بیٹھے تھے۔ ضالیہ آئی اور مٹی کے درمیان میں تھی۔ منصور تم جزدوسارہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایلمنڈ اپنی پھولی کے پاس بروٹم کیا ہوا تھا۔ گھر کے ملازم بھی دسترخوان پر ساتھ ہی بیٹھے تھے مگر آج کچن میں اتارہتوں کا کھانا پڑا ہوا تھا کرام غسان اسے سینے میں رکھی۔

گھانے کے بعد گاڑے قہودے کی چمکی بھرتے ہوئے جزدوسارہ نے ضالیہ آئی کو دیکھا اور کہا۔ ”ضالیہ ڈیوڈ کا کھانا بھیجنا مت بھولنا۔“

وہ ہمیشہ مٹی کے ساتھ محبت بھری ہاں اور ہم لوگوں کے ساتھ پیار بھری نانی جیسا کردار ادا کرتی تھیں۔ جذبی نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر سیرا اٹھا چوہا، میرے گالوں پر بوسے دیے اور نئے چمکتے 500 فلسطینی پاؤنڈ کے پانچ نوٹ میری چمکی پر رکھ دیے۔

”جذبی خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ آپ انسانیت کا فخر ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔“

”ہاں ایلمنڈ کیا ہے۔ بہت ساری سہیلیاں بنائی ہوں گی اس نے۔ پڑھنے سے زیادہ ان چمکروں میں رہتا ہوگا اور تم نے تو اس کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھنے کی گویا حتم کھائی ہے۔ گاڈ فار دونا اس کے۔“
(تمہاری پائل)

☆.....☆
ان خطوط نے کہانی میں روز و رات کی طرح عیاں کر دی تھی پھر بھی میں ادھر ادھر سے واقعات جمع کرتی رہی اور پھر جو کچھ علم میں آیا وہ یہ ہے۔

یہ اپریل 1967ء کی صبح ہے۔ ام غسان نے چاندی کے اس خوبصورت سیٹ میں سے دو پیالیاں بڑی فطرتی میں رکھیں جو خاص مہمانوں کی آمد پر نکالی جاتی تھیں کھانے کے کمرے میں برتنوں کی الماری کے پت بند کیے اور

الفاظ ان کے ہونٹوں پر تھے اور وہ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ کہتے کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلے تو ایک بیکٹ ہاتھوں میں تھا۔ بیٹے کو کھاتے ہوئے بولے۔ ”تم قاہرہ جا رہے ہو۔ انرواؤں مارشل نجیب گدلی کو تھوڑا سادقت نکال کر یہ دے آنا۔“

منصور نے بیٹے سے بیکٹ کے ایک نظر دیکھا اور پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اس میں کیا ہے؟ وہ جانتا تھا اس میں نابلس میں ان کے باغات کا خالص ہاتھ سے نکالا ہوا زیتون کا تیل اور اسی تیل سے خصوصی تیار کردہ صابن ہوگا۔ یہ دونوں سوفا میں زانوں سے اس کے والد کے دوستوں کو بھیجی جاتی ہیں اور مصری احمد گدلی اس کے والد کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا۔

منصور چار سال بعد امریکا سے کوئی تین ماہ پہلے لوٹا تھا۔ امریکا میں فلسطین کے لیے کام کرنی انسانی حقوق کی مختلف تنظیموں سے اس کے مسلسل رابطہ تھے۔ ان دنوں وہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کام کرنے والے کمپنوں میں قائم عارضی اسپتالوں میں سے بعد معارف تھا اور دونوں پہلے کمر آیا تھا۔ ان کمپنوں کی حالت زار نے اسے بڑے رکھنا۔ ہم لوگوں کی آنکھوں اور رخساروں پر گواہی دیتے تھے مگر ان آنکھوں میں جھلکنا عزم بڑا تھا۔ وہ بھی وہ جہز تھی جس نے اسے پرامید کیا۔ مگر اس کی جھٹ سے بچوں کا سنے سنی پڑھنا، مداخلت کا سنی، محتاطی کا سنی اور ان سب کے ساتھ ساتھ اس اور اس کے جھٹ کی لوبھی ان کے سینوں میں روشن تھی۔

ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر اس نے پینٹنگ دیکھیں۔ اگلیوں اور رنگوں سے کیسے کیسے بچوں نے اپنے جذبات کو اظہار دیے تھے؟ دھوپ میں آنکھیں بچوں والے کیلیوں کی بجائے ظلم و تشدد، گولیوں اور جنگ و جدل کے کیلیوں میں مشغول پایا۔ ان کی سوچیں کیسے متاثر ہوئی تھیں؟ ان میں بچوں والی کوئی بات ہی نہ تھی۔

ٹوٹی پھوٹی جھوپڑیوں، کچے کچے ایک کمرے، ایک کچن اور ایک ہاتھ روم والے کمروں کے کینوں جن کی دندریاں مٹی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چلے پھرے ایک خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھی اور کچھ دنیا سے رخصت ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زمین اپنے کمروں میں نہیں جاسکتے تھے۔ بڑی طاقتیں ان کے وعدے، ان کی قراردادیں سب جھوٹ کے پلندے تھیں اور وہ یہ بات جان گئے تھے۔ ابھی

طرح سمجھ گئے تھے۔

کل صبح قاہرہ سے ڈاکٹر جبران کا فون آیا تھا۔ ہمدرد میں اس کے مصری کلاس فیلو جبران نے اس کے حید اسکول میں پڑھنے والے اس کے بچپن کے دوست احمد کا ذکر کیا تھا جو سینٹر کیرج کے بعد قاہرہ چلا گیا تھا اور جس نے قاہرہ آری کو جو ان کیا تھا اور اب آری ایلی جس میں میجر تھا۔ وہ بتا رہا تھا۔

”عجب ہی بیماری میں مبتلا ہے وہ، جس کی ڈاکٹروں کو بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ احمد تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اگر آسکو تو بہت اچھا ہوگا۔ تم سے مجھے لے ہوئے بھی کم بیش پانچ سال تو ہو گئے ہوں گے۔ عجب ہوتم بھی۔ امریکا سے واپسی پر بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔“

ڈاکٹر نمکی گرم تھوے کے ہر چھوٹے سب کے ساتھ ایک عدد خبر اپنے ہونٹوں سے باہر نکالتے تھے۔ ”بھال عبدالناصر اور شاہ حسین آپس میں ٹٹے ہوئے ہیں۔ شام کی سرحدوں پر اسرائیلی فوجوں کا اجتماع بدھتا جا رہا ہے۔“

منصور نے ان خبروں پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنا بیک اٹھایا۔ باپ کا زہا ہوا بیکٹ اس میں ڈالا۔ دادی سے دعا میں اور ماں باپ سے اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

جب وہ گھر سے نکلا روشن سی صبح، کشادہ گلی کے آفتابی رخ پر بے کمروں کے درو دیوار پر پھیلی پورے ماحول کو اجاگر سا بنا دے ہوئے تھی۔ الحمرا اسکوائر جسے اب Paris sq کہا جانے لگا تھا۔ اس کے گھر سے چار قدم پر تو تھا۔ منصور کو جیسے اجاگرا احساس ہوا تھا کہ اس کی وہ پرانی گلی کہیں نہیں ہے۔ گونے پر وہ قدیمی کتوں اس پر لہرائی مل کھائی چوٹی ضرور موجود تھی مگر جو صورت نظر آتی تھی وہ جیسے کسی بے ستورے ڈیکوریشن ہیں کی سی تھی۔ عورتوں، بوڑھوں اور لڑکیوں کا پانی کے لیے جھلکنا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ چمک میں ناک کی گاڑیاں بھی ایک آدھ کے سوا نظر نہ آئیں۔ ذرا قاصلے پر مسجد محمد نے اپنا پرانا چولا اتار پھینکا تھا۔ نئے رنگ اور نیاروپ اسے مغربی صورت دے رہا تھا۔ الحمرا اسکوائر جس اسکوائر میں تہذیب ہو کر زیادہ شاعر ہو گیا تھا۔ سامنے والی سڑک کربا ت رابن تم کھا کر غیر معمولی وسعت پکڑ رہی تھی۔

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے پر کرتے ہوئے

روک لی تھی۔ تعجب سے اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے خود سے کہنے لگا۔ ”میرا وہ پرانا چہرہ کہاں ہے؟“

یوں بڑے پیمانے پر چہرہ کو منحنی زون بنانے اور پورے شہر کا انفراسٹرکچر کو جدید اعمار میں تبدیل کرنے کے منصوبوں سے وہ غوراً بہت آگاہ و واقف تھی۔

اس نے اپنے کرد و پیش کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔ ”چلو اب خیر صلا قاہرہ کا نئی ہی جاؤں گا۔ چہرے اپنے گزرتے ہوئے شب دروڑ کو تو دوں۔“

یائل ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی سانسوں کی تاروں سے جڑی، دھڑکنوں میں بسی، شریانوں میں دوڑتے لہو میں گھلی۔ وہ خود کھایا کا عادی ہو گیا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے ساتھ کی سیٹ پر اسے بٹھا کر دن بھر کی تفصیل اسے سناتے لگتا۔ سونے سے قبل اس سے باتیں کرنا ضروری تھا۔ کسی عجیب سی محبت بالے پیشے تھے۔ آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح فوراً اندر سے نکل کر روپ سے ساتھ آکر بیٹھ گئی تھی۔ جازرہ ریلوے اسٹیشن پاس ہی تھا۔ بیٹوت کو لائی اسٹریٹ پر جا کر وہ مڑا۔ فیصل اسکوائر میں ایک طرف گاڑی پارک کی۔ انجنوں کی ٹھنگ گاڑیوں کی چمک چمک کی آوازیں کہیں... سے شور مچاتی یادداشتوں کے دوروازے کھولتی آمو جوڑ ہوئی تھیں۔

یائل کو گاڑیاں بہت محور کرتی تھیں۔ اپنے نوکیں میں دو تین بار وہ ایلمنٹ اور یائل کے ساتھ یہاں بھی آیا تھا۔ فیصل اسکوائر کی اس چھوٹی سی دکان سے فلافل کھانا بھی یاد تھا۔ عثمانیہ سلطنت کے سلطان عبدالحمید ثانی کا تیسرے کردہ بے حد خوبصورت اور وسیع عریض ریلوے اسٹیشن جہاں سے ”دبلی ٹرین“ شام کے شہر دمشق سے ہوتی ہوئی کھمدینہ جاتی تھی۔ یوسف فیا کو جب بھی عرب بائیر میٹی کے کسی اجلاس میں شرکت کے لیے جانا ہوتا وہ جلد آتے چند دن یہاں رہتے۔ منصور اور قاسم نوکروں کے ساتھ انہیں سوار کرانے جاتے۔ اس کا دل بوجھ ہونے لگا۔

اس وقت منصور کا دل چاہا کہ دو گاڑی دوڑاتا Hadar Ha Carmel جائے۔ ڈیوڈ وین کونسروڈیری میوزک اسکول کا گیت کھولے اور بھاگتا ہوا اندر چلا جائے۔ اسی انداز میں جیسے وہ اپنے زمانہ طالب علمی میں جایا کرتا تھا۔ ان سب مجبہوں پر رکے جہاں اس کی معصوم محبت کے نشان کھمبے ہوئے ہیں۔ یائل نے جب یہاں داخلہ لیا تو اسے بھی مجبور کرنے لگی۔ ماں اور دادی

دونوں بڑی روشن خیال تھیں۔ اسے اور قاسم دونوں کو داخل کروا آئیں۔ Choir میں ہمیشہ اس کی اور یائل کی آوازیں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتیں۔ میڈم گیتا ڈیوڈ میوزک اسکول کی مالک دونوں کو ہمیشہ اپنی نظروں کی محبت اور شفقت میں سموتے رکھتی۔ منصور نے Lute بجاتا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔

گیتا ڈیوڈ عرب موسیقی کی دلدادہ اس کی اصناف کی وسعت اور ہمہ گیری کی قائل۔ موسیقی کے متعلق اس کی فلاسفی رقبوں، اس کے ایک وسیع علاقے پر پھیلے حجر، جغرافیائی عوامل کا اس پر اثر و نفوذ اور اس کا شعور سمجھوں سے وہ نہ صرف واقف تھی بلکہ اس کی عظمت کی بھی قائل تھی۔

یقیناً یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر ممتا اور محبت کا ایک دریا بہتا تھا۔ جب وہ Lute بجاتا وہ ہنستے ہوئے کہتیں۔ اور وہ بطور قسطنطنیہ جلدی اس نے اس میں مہارت پیدا کر لی ہے۔ یعنی اس مغربی کلاسیکی موسیقی میں استعمال ہونے والے بیشتر آلات تو عرب آلات موسیقی سے ہی نکلے ہیں۔ یہ Lute ہے۔ داکٹر یہ گٹار وہ ایک لمبی چوڑی فہرست گٹاروں سے لگتی۔ یہ لڑکا موسیقی میں بڑا نام پیدا کرے گا اگر اسے سکے تو۔

بارہ بج چکی صبح میں اس نے دور تک نظریں دوڑائی تھیں اور خود کھائی کے سے اعزاز میں خود سے کہا تھا۔ یائل جنہیں یاد ہے جب ایک شام لان کے پاس وہ اپنی تین چار اسٹاف لمبرز کے ساتھ گھڑی تھیں۔ ہواؤں میں بہت تیزی تھی۔ ان کے ٹھنڈے بال بال اڑتے تھے۔ جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے بار بار پکیتی تھیں۔ میں اور تم کلاس لے کر باہر نکلے تھے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”منصور تم موسیقی سیکھو۔ اس میں نام پیدا کرو۔“ میں اس وقت انٹرسائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ باوجود ان کے بہت احترام کے میں نے فوراً کہا تھا۔

”میڈم گیتا آپ سے کچھ پوشیدہ ہے۔ ہلا۔ فلسطین کے لوگ بہت ڈرے ہیں۔ بہت غمناک ہیں۔ انہیں مسیحائی کی ضرورت ہے۔ موسیقی تو امن کے دلوں کا تحفہ ہے۔ میں اسے اپنا کیرئیر کیسے بناؤں؟“

تم میرے ساتھ گھڑی تھیں۔ شاید جنہیں یاد ہو۔ میں نے دیکھا تھا ان کے چہرے پر یاس کے بہت سے رنگ بکھر گئے تھے۔ جب کہ داس ٹریٹنگ کی ٹیچر مہزبان ڈالانے کچھ کوٹ اور بیزارگی سے مجھے دیکھا۔

دینی اور جوئے سے فرس بجائے ہوئے کہتی۔ ”مائی فٹ۔“
 ”کیا دن تھے وہ بھی۔“ منصور کے اندر سے بہت لمبی
 سانس نکلی تھی۔ اسی نے گاڑی اشارت کی اور تیز رفتاری
 سے اے جلا تاہم نرم روڈ سے بن گوریاں روڈ پر آگیا جس
 سے دو قدم آگے الین نی روڈ پر جرس کا لونی تھی اور پائل کا
 گھر تقریباً بن پری تھا۔ گھر کے سامنے رک کر اس نے کھائی
 پر نظر ڈالی اور خود سے کہا۔ ”ایک گھنٹے سے کہ تو کسی صورت
 ٹھن نہیں ہاں زیادہ کا ذہن میں رکھوں۔ دو ماہ کی باتوں کا
 ذخیرہ ڈھوڈا (جبرانی میں خالہ چچی) کو سنا ہے۔ کارمیلا
 سیوٹا (دادی نانی) کے بھی دکڑے سننے ہیں کہ ٹھنوں میں
 بہت درد رہنے لگا ہے۔ کان شائیں شائیں کرتے رہے
 ہیں۔ بھولنے کی بھی بیماری ہوگئی ہے۔“
 ڈیوڈ اکل آج آٹس میں ہوں گے۔ گھر ہوتے تو
 انہیں بھی چپک کر لیتا۔

اسے ہارن بجانے سے ہمیشہ کی چڑچڑی۔ خود ہی گیٹ
 کھولن۔ گاڑی اندر لاتا۔ اس دوران ریڈیا یا کارمیلا دونوں
 میں کوئی ایک باہر آجاتا یا دونوں ہی۔ اس پر نظر پڑتے ہی
 ان کے چہرے پھول کی طرح کھل اٹھتے۔ واری صدمے
 ہوتیں۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دو ٹھنوں میں بھی منصور کی
 جان چٹنی مشکل ہوگئی۔ ”کارمیلا سیوٹا آپ کو یہ گولیاں کھائی
 ہیں۔ آپ نے میری بات سنی۔“

”ہاں سنی۔“ کارمیلا نے سر ہلایا۔
 منصور ریڈیا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ڈھوڈا آپ ذرا
 فکر نہیں کرتی ہیں خود کا۔ ہڈیوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت تیزی
 سے ہو رہی ہے۔ دودھ آپ پیتی نہیں ہیں۔ ذہنی سے آپ کو
 الارجک ہے۔ پلیز ڈائنٹ ٹھیک کریں۔“

منصور جانے کے لیے اٹھا۔
 ”تم کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہو؟“ ریڈیا نے
 ہاتھ پکڑ لیا۔

”ڈھوڈا مجھے قاہرہ جانا ہے۔“ منصور ہنسا۔
 ”چلے جانا میں تمہیں کھانے کے بغیر کیسے بھیج سکتی
 ہوں۔ یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟ میں اسی وقت پائل کا فون آیا
 تھا۔ ریڈیا نے سنا اور ساتھ ہی خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔
 ”پائل منصور بھی یہیں میرے پاس ہے۔“

بڑا رک رکھا ڈالا ہونے کے باوجود منصور کا چہرہ
 اندرونی خوشی سے لوسا دینے لگا تھا۔ چند لمحوں بعد ریڈیا نے
 ریسپورس کے کانوں سے لگا دیا۔

ان دنوں کنسر ویڈیو میوزک اسکول سارے چھہ میں
 واحد جگہ جگہ جہاں پبلک کے لیے کنسرٹ بھی ہوتے۔
 مقابلوں کا اہتمام اور تہواروں کے خصوصی پروگراموں کے
 لیے بھی جی جگہ تھی۔ موسیقی کے اس شوق اور پرفارمنس میں
 بہترین کارکردگی نے ہم دونوں کو بطور جوڑا مشہور کر دیا
 تھا۔ دونوں کی شہرت اسکول سے نکل کر پورے چھہ اور قریب
 و جوار میں تب پہنچی جب اسکول میں تیرہویں صدی کی ایک
 لوا سنوری کو اونچ کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ کہانی کا وقوع
 انہی عہد تھا جب حال کا انجین انڈس تھا اور مسلمان اس پر
 قابض تھے۔ کہانی چند کرداروں پر مشتمل بنیاد شادی تا جرح کا
 خوبصورت پیٹار یا ایک تعلیم یافتہ غلام لڑکی جو انڈس کی وزیر کی
 ملازم تھی۔ وزیر کی بیٹی، ایک بوڑھی عورت جو بیٹوں سے بھی
 کہانی بیان کرتی ہے۔ بنیاد کے لیے منصور کو چنا گیا کہ وہ
 کردار کے لیے موزوں تھا مگر بنیاد کے لیے پائل موزوں نہ
 تھی۔ بڑے سر پڑی آنکھیں قدرے مڑی ناک بھرے
 ہونے وال اور ٹھوڑیاں اور چھوٹے پیروں والی عورتیں درکار
 تھیں۔

منصور تو ابھی گیتا ڈینو سے پائل کے لیے بات کرنے
 کا سوچ ہی رہا تھا۔ جب پائل سیدھی ان کے پاس پہنچی گی۔
 وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ”میری بچی تمہارے چہرے اور
 نقوش نے مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں میں اپنی ناک تو ذکر ذرا میڈمی
 کر لوں گی۔ آنکھیں اور سر بڑا کرنے کا نسخہ بھی مجھے معلوم
 ہے۔“

وہ بہت ہنسیں۔
 پس منظر میں موسیقی کی تانوں میں ابھرتی ڈویتی اس
 کہانی کے کرداروں نے اس دور کے مورخ (انجین میں
 مسلمانوں کو مورد کہا جاتا تھا) پھر میں سانس لینے عودور باب
 کے ساتھ ایسی اداکاری اور صدا کاری کی کہ ہاں میں بیٹھے
 ناظرین جن کی ایک اکثریت یورپی ملکوں سے ہجرت کر کے
 آنے والے یہودیوں کی تھی جنہوں نے آرٹ اور پھر کے
 ناناؤں رنگوں میں گندمی اس پیشکش کو موسیقی کے تال میل
 کے ساتھ دیکھ کر لطف اٹھایا تھا۔ ہاں بھگ نظر لوگوں کا
 اعتراض بھی تھا کہ آغراس کہانی کو کیوں چنا گیا؟

تاہم یہ مصمم سا جوڑا بہت مشہور ہو گیا۔ پائل اور منصور
 کو اپنے کلاس فیلوز اور اسکول فیلوز کی بھی جلی کٹی باتیں اور طریہ
 ہنکارے سننے پڑے۔ پائل تو چپے ہوئے تر تڑا نہیں جواب

آج دو سیدل چلی تو تمہارے ساتھ ڈیر ساری باتیں کیں۔ منصور کے چہرے پر دم مئی مسکراہٹ ابھری۔ آسمانوں میں جھٹو سے ٹھٹھائے۔ اس نے کہا ابھی تمہارے ساتھ چار ریلے اسٹیشن پر تھا۔ دیکھو تو پائل انہوں نے اسٹیشن پکپکس کو ریلے سے میڈیم بنادیا ہے۔ میں اندر نہیں گیا بس باہر سے دیکھا۔ میڈیک اسکول کی یادوں نے بھی گھیر لیا تھا کتنی دیر ان کے ساتھ رہا۔

اسے احساس تھا برڈیا نے بیٹی سے بات کرنے کی اپنی خواہش کو کبھی پشت ڈال کر اسے موقع دیا تھا۔ ابھی تو کامیلا سیوا بھی پُر امید نظروں سے کھڑی دیکھتی تھی کہ اس کی باری کب آتی ہے؟ پائل ڈھوڑا سے کہو اپنی صحت کی طرف سے پروا نہ کیا کریں۔ اور ساتھ ہی برڈیا سے کہا۔ ”بات کریں ڈھوڑا۔“

برڈیا سے اپنے رخساروں اور ماتھے پر بوسے لیتا وہ رخصت ہوا۔ برڈیا گیٹ پر کھڑی اسے اس وقت تک دیکھتی رہی تھی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کے اندر سے ہوک سی اٹھی تھی۔ ہائے کیے مایوسہ اسلاک کا پرے فیصہ میں نہیں ہے۔

☆.....☆

منصور نے دل میں دلی چنگاری کو ہوا دینے کے لیے گرم سنبال لیا۔

پائل۔
تمہیں میرا بچا درد عاتیں۔

میں کیا لکھوں اور تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے سارے جسم میں کس طرح کا دکھ اور پائ کھلا ہوا ہے۔ شب و روز میں کھٹنے والا وہ اضطراب اور بے چینی جو اس سرزمین کا مقدس رہتی ہوئی ہے اور شاید تمہیں پائل میرے خیال میں لفظ ”شاید“ خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ مجھے ”یقیناً“ کہنا چاہیے کہ اس میں ابھی اور رکھوں کا اضافہ متوقع ہے۔ اے اے یسے اندر باہر سرسراتے ہیں۔ آس، امید، مایوسی، ناامیدی سبھی جذبوں کی فراوانی ہے۔

گھروں، بچوں، ہازاروں، توجہ خالوں، بیشہ کھوں، مسجدوں، گرجاؤں، دفتروں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں غرض کون سی جگہ ایسی ہے جہاں حالات پر تبصرے اور حاشیہ آرائیاں نہیں ہورہی ہیں۔ لوگوں کے پاس کوئی اور موضوع ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ زندگی اور عافیت

سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ بی ایل او کی گوریلا سرگرمیاں جاری ہیں اور لوگ ان سے کتنی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اسرائیلی فوج نے کہاں نہ کھڑی کی اور کون سا گاؤں خالی کر دیا؟ کتنے گھر سہا ہوئے؟ کتنے لوگوں کو گولیاں لگیں؟ کتنے مرنے؟ کتنے زخمی ہوئے؟ کیسوں میں کون سی بیماری پھوٹ پڑی؟ پینے کے پانی کی کیا بنی کاغذ خاک مسئلہ کتنی خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ دواؤں کی قلت مریضوں کو تیزی سے اپنا بیج کر دار کا سانی سے ادا کر رہی ہے۔

کل شام میں کینے محفوظ میں کالی پیٹے چلا گیا۔ نوجوان جیسے لڑکوں کے جتنے شاہ حسین پر بیچ دتا تب اکھاڑے تھے کہ ابھی اس کا دل نہیں بھرا۔ اسرائیلیوں کا دلال۔ بی ایل او کو بروداشت نہیں کر رہا ہے۔ بے غیرت، تعمیر فروش، ہم پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے۔ اسے اس سے کیا غرض اس کی بادشاہی سلامت دینی چاہیے۔ ہم سب تو گمناشتے ہیں۔ اسرائیل نے تو ہمیں ٹارگٹ کرنا ہی ہے یہ اس نے پہلے ہمیں نشانہ بنادیا ہے۔ سارا شرقی حصہ جڑ پ کر گیا ہے۔

تو یہ ہے ہماری تو پہچان بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ سنجیدہ ملتے پریشان ہیں۔ ایک یہ اسرائیل ہے اس کے داؤ بیچ ہی انسان کو پاگل کیے دیتے ہیں۔

پوری دنیا میں شور مچا رہا ہے۔ ساری بڑی طاقتوں کو اپنی مظلومیت کی بھرتی دانتوں سے ان کی ہمدردیاں کہتے ہوئے خود کو طاقتور ترین کیے جا رہا ہے۔ اس کی بے پناہ تیاریوں پر بھی ساتھ ساتھ تبصرے ہوتے ہیں۔ کہیں ہم شیلرز بین رہے ہیں۔ خبریں کھودی جاری ہیں اور یہ کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت یہی دیکھاڑی دار مسلحین لڑکے اور مرد ہیں۔

پائل یہ کہنا الیہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو حفاظتی اقدامات کے طور پر پورپ کے قنفط گلوں میں بیچ رہے ہیں اور اسرائیلی بچوں کے لیے ان ہی کے ہاتھوں قبریں کھدوا رہے ہیں۔ جیٹ فائٹرز ڈاکٹر بھی مشن آپریٹ کرتے ہیں۔ فضا میں ان کے جہازوں کی من کرن سے کوئی اٹھتا نہیں۔ شام کے سرحدی ہارڈ گولان کی پہاڑیوں سے اسرائیل کی مسلسل جھپٹ جھاڑ جاری ہے۔ کیا اخبار اور کیا ٹی وی سب پر خون چلانے والی خبریں ہیں۔

میں نے اخبار کو پرے پھینکا ہے۔ ٹی وی کو بند کر دیا

ہے۔ اور باہر نکل آیا ہوں۔ آخر بندہ کہاں تک چلا جائے۔ وارڈ میں مریض کے سر ہانے بشری قہلی کی شاعری پڑی دیکھی تھی تو اب لایا تھا۔ رات کو اسے پڑھتا رہا۔ قدیم عربی شعراء کو بھی میں پہلی دفعہ پڑھ رہا ہوں۔ انہیں پڑھتا مجھے اچھا لگا ہے۔ امراء انہیں کو بھی بھی ٹی وی پر ہی سنتا تھا اور جانتا ہی نہیں تھا کہ کیا لافانی شاعر ہے؟ آپ خود سے پوچھتے ہیں کہ جو دکھ اور کرب آپ کے اندر ہے اور جس سے آپ گزر رہے ہیں شاعران سے کیسے آگاہ ہے۔ یاں تم کتنا یاد آتی ہو؟ میں نے چاہا جنہیں بتاؤں۔ کاغذ پر چھ بیٹے شعر لکھے تو مجھے احساس ہوا یہ میں نے کیا لکھا ہے؟ مذہبات کا اتنا علم نہ تھا۔ وہ بھی میں نے فوراً ان پر لکیر پھیر دی، پھر کچھ اور لکھا۔ وہ بھی میں نے پڑھی سا لگا۔ اسے بھی سہی کی نذر کیا۔ میں نے قلم رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔ آج کوئی بٹے بعد خط پوسٹ کر رہا ہوں۔

دیکھو زار محمود درویش کیا کہتا ہے؟
اپنی مسکراہٹ ہواؤں کے حوالے کر دو
یہ مجھ تک پہنچ کر مجھے حیات جاوداں بخشے گی
اپنے سانس ہواؤں کے حوالے کر دو
مجھے زندہ رکھیں گے

☆.....☆

پورے ساڑھے تین ماہ بعد منصور نے پھر اسے لکھا تھا۔
یاں۔
جنہیں میرا پیار۔

کیا تم اس صبح کا حال سنتا جا ہو گی جب یروٹم خون میں نہا رہا تھا۔ ذاتی دکھ اور غم کا تو کہیں احساس ہی نہ تھا۔ لکھنے کو کیا چیز باقی رہ گئی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

ان عرب حکمرانوں کی یوٹھوں کے غبارے اسرائیلی ہوا بازوں کے پھیلے پلے میں ہی پھٹ گئے تھے۔ مصری فضائیہ پوری عرب دنیا میں بہترین ہونے کے باوجود صرف دو گھنٹوں میں ہی اپنے تین سو طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ پائلٹ اسکندریہ میں پر ات مگر نیلے ڈالس دیکھنے اور ڈرنک کرنے کے بعد آٹھ بجے ناشتا کر رہے تھے اور دشمن مصری فضائیہ کی کمر توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا تو اب گریہ زاری اور رونا دھونا بیکار ہے۔

تو اس صبح بھی یروٹم کی دھرتی پار سے کی طرح کانپ گئی تھی۔ اردن اور عراق کی فوجیں دیوار گریہ کے اس پار

یہودی علاقے پر گولے برسار رہی تھیں اور میں خون میں ڈوبی لاشوں پر پچا ہے رکھ رہا تھا۔ تو پوں کی گولہ باری اور جہازوں کی بمباری سے درد دیوار دہلے جاتے تھے۔ میرا سر پھٹ رہا تھا اور آنکھیں لال ہوئی ہو رہی تھیں۔ مجھے اس کیفیت میں کام کرتے آج پانچواں دن تھا۔ سسر تھا مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آئی تھی۔ اس نے چائے کاکہ میرے ہاتھوں میں تھا کہ تھا کہ تھا۔ ”سر آپ کی حالت بہت خراب ہے۔ پلینے توڑی دیا آرام کریں۔“

یاں جن کھلون میں جھپکیں ہوتی ہیں جہاں زندگی ارزاں اور اس نایاب ہواں صبح کی لالی خون میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ یاں The Rock of Dome اور القدس تو مجھے لگا تھا مجھے خون میں نہایا ہوا ہے۔

یاں کے لیے یروٹم کیا شعر ہے؟ اسے مسکرانے اور ہنسنے کے لیے ہمیشہ خون چاہیے۔ اب ٹھوڑا سا ڈکراس مگر کا بھی سن لو جہاں تمہاری میری، تمہارے خاندان اور میرے خاندان کی مشترکہ یادوں کا خزانہ تھا۔

گلابی پتھروں والی گلی میں وہ بڑے بڑے عربانی دروازوں والا گھر جس میں واشی کا گہوارہ تھا اس کا آئینہ اور کمرے خون میں لت پت ہو گئے۔ انہوں نے گھر کے دروازے توڑے اور اندر گھسے۔ گھر میں نوکروں کے ساتھ جدی بھی موجود تھے۔ چیلے لوجوان ابو ذری نے چلائے ہوئے کہا تھا۔

”اندھے ہو کیا؟ معلوم نہیں کہ تم کس کے گھر میں داخل ہوئے ہو؟ اس گھر میں یروٹم کی بہت بڑی عالم ہستی رہتی ہے۔“

”کون یوسف ضیاء؟ کون ڈاکٹر سموی؟ کون ڈاکٹر منصور؟ وہ تو کسی کو نہیں جانتے تھے۔ یوسف ضیاء کو کیوں سے بھون دیا۔ چلنے لگتی گولیاں ان کے سینے میں اتار دی گئیں۔ ان کے خون میں اس کتاب کے اوراق بیگ رہے تھے جو اس وقت ان کے ہاتھوں میں تھی۔ جیسے دہلے کا سیاہ پانی کمرے میں مار کر تباہ ہوا آگیا تھا اور شیلوں سے کتابیں نکل کر اس میں گر گئی تھیں اور تاریخ پر اناسی دہرا رہی تھی۔ پیچھے غازی ٹولوں کے بوٹ نظروں کے امن و قوت کو روکنے ان کروں میں جماسکتے دیکھتے بھرتے تھے کہ ابھی کوئی باقی تو نہیں ہے؟

نیرنگی زمانہ دیکھو۔ جدی کے شہید جسم کو اٹھانے کے لیے جاتی ہو کون آیا تھا؟ نویل قراسو آخری کی بیٹی جواہتی

در اصل انسانی فطرت کا یہ البیہ ہے کہ لمحہ موجود میں جو کام پائی اس کے حصے آئی ہے اس کے خیال میں وہ صرف اسی کا مقدر ہے۔ یاں کہ مجھے تو اس کی بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ چلو غلبے کی جبلت انسانی فطرت میں ہے لیکن کیا غالب آنے والوں کے لیے بربریت اور وحشی پن کے مظاہرے ضروری ہیں۔

ہاں ایک بات اور بھی ہے کہ بہر حال اس کامیابی کے لیے محنت کی محنتی بہترین ترین بہترین منصوبہ بندی، سخت چھانسی اور دعا نہیں۔ قدرت کے فیصلے میرٹ پر ہوتے ہیں۔ انفرادی محاملات میں اس کی عنایات مل سکتی ہیں مگر اجتماعی محاملات میں نہیں۔

اب جمال ناصر سڑکوں پر روتا بھرے۔ شام اپنے دشمن
پٹے اور اردن اپنے کوٹی پوچھے کیا انہوں نے خود کو تیار کیا
تھا۔ اسرائیل نے جھاڑو پھیر دیا تھا۔ مصر سے جزیرہ نما
سینائی، غزہ کی پٹی، شام سے گولان کی پہاڑیاں، اردن سے
ویسٹ بینک اور مشرقی یروشلم سب اپنے قبضے میں لے کر
تقریباً ساڑھے تین لاکھ لوگوں کو پناہ گزین بنا دیا
ہے۔ نابلس، قباطیہ، نامرہ، رملہ، بھرم اور غزہ ہی کے کوئی
تین لاکھ لوگ ہوں گے جو کمر وں سے نکال دیئے گئے ہیں۔

☆.....☆

ہاں یاں کہیں میرا پیار
ہاں یاں کہیں میرے خط کتنے دنوں میں اور کتنی قسطوں
میں لکھا گیا مجھے تو اس کا حساب کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ہاں
بھئی اب ذرا ان یاں بھرے دنوں میں جو دلچسپ اور
مختلف واقعہ پیش آیا اسے سنو۔ یہ یقیناً کہیں بھی محفوظ
نہ کرے گا۔

میں آج کل دھیما ریفرمی کپ میں ہوں۔
جلیا، آئندہ اور دھیما میں بڑے کپ بنائے گئے ہیں۔
میں یورپی ملکوں اور ہائی دنیا سے اقوام متحدہ اور مختلف
قلمی تنظیموں کے تحت ڈاکٹر ز اور رضا کاروں نے ڈیرے
لگا دیے ہیں۔ یہ لوگ عیسائی، مسلمان اور یہودی سبھی ملے
جملے انسانیت کے لیے کمر بستہ لوگ ہیں۔ اسرائیلی مملکت
سے بھی چھ لوگ ہیں جو اسرائیل کی زیادتیوں کے ناقد اور

ماں اور باپ کے ساتھ اس گھر میں چند دن رہی تھی اور وقت رخصت جس نے اپنی پانچویں جڑی کے گلے میں ڈال کر کہا تھا۔ ”آپ تو مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔“

وہ ریڈ کر اس کے لوگوں کے ساتھ اس آنگن میں
کھڑی تھی اور بچپن کی خواب کی صورت میں اسے کچھ یاد
دلانا تھا۔ اس نے جب کرائسو بھائی آنکھوں سے جلدی
کے ماتھے کو چوما۔ انہیں حسل دلوایا اور سرد خانے میں محفوظ
کیا۔

تمہیں کریمین یاد ہوگا۔ وہ سنجیدہ، سادہ و عوامی
جرنلسٹ جسے بھی جگہ ہم جگہ اپنے اسکول کے گیٹ پر دیکھا
کرتے تھے۔ مکہ سے ریل میں بیٹھ کر آنے والی ایک
غریبی لڑکی بھی اکثر وہ میٹر اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ جنہیں
سنا تھا کہ وہ بچپن میں اس کی لاش لینے کے لیے اس کے
سامنے اسپتال آئے۔ مارتھا مجھے بتاتی ہے۔ ڈاکٹر منصور میں
نے لاشوں سے بھرے کمروں میں انہیں دیکھتے ہوئے کہا
تھا۔ ”آپ ایک لاش لینے آئے ہیں، یہاں تو انبار لگے
ہوئے ہیں۔“ لے جائے جتنی لے جاتی ہیں۔

تہا نہیں ہم اپنا فیاضی اتنی جلدی کیوں بھول جاتے
مرا مٹی حملہ جو تیرا دوسرا گھروں پر پھسل ہوگا جس میں
سیستانی، مسلمان، یونانی آرمیوں کو س اور اسرائیلی بھی ملے
ملے لوگ تھے۔ ان کی جاچاوی میں ضبط اور دو گھنٹے سے بھی کم
مدت کے نوٹس پر پروٹسٹ بند۔ اب کیا ہو رہا ہے؟ صرف ایک
اعلان فوری قانون اور مسلم علاقہ زور زدوں کی نذر۔ حرم
شریف کی املاک، البراق، سراغری حملہ اور باب سلسلہ
کے سامنے کا علاقہ اسی زور زدوں کی بیعت چڑھ گیا۔

ان کا اہم ترین ٹارگٹ یہ وٹم کے چہرے سے عرب
کے کتنا وحشی ہے۔ اس کے ہاتھ میں طاقت آجائے تو یہ آپے
میں نہیں رہتا۔

کیا یہ اس روزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ زمانوں کی تپسیا اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے بعد ہمیں غالب آنے اور اسی تاریخ کو دہرانے کا موقع تو ملا ہے۔ تو بس اب تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

یہودی معمر عورتوں کا ایک ٹولہ یرושلم کی گلیوں میں گیت گاتا نظر آ رہا ہے۔ ان کے لباس ان کے چہروں سے چمکتی خوشی، کیا انہوں نے عورتیں ہونے کے ناطے ایک نسل کے لیے رک کر ان ہزاروں بچوں، عورتوں، جوانوں اور

بھیں گے۔ تاریخ کے پچھلے پچھلے کی جانب گھومنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ اسے یاد رکھیے۔

ایم ارم ایلمان ہمارے ساتھ بہت مکمل مل گیا تھا۔ وہ سارا دن پھرتا اور رات کو ہمارے پاس ہوتا۔ قرآن کو دوسروں کے ذاتی معاملات میں جھانکنے کا بہت شوق رہتا ہے۔ ایک دن کھانے کی میز پر بیٹے ہوئے بولا۔ ”تمہارا کیا سلسلہ ہے؟ شادی وادی کر رہی ہے یا یونہی ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے ہو۔“

اس نے جواباً سارے واقعوں کی نمائش کی اور بولا۔ ”ارے پار ایک لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے بھائی سے میری دوستی تھی۔ کئی بھی یہودی مجھ کو کسی مسلمان کے عشق میں جھٹلائی اور مجھے بات کہتے وہ ہے بھی فلسطین کا۔“ اب جب بچہ پڑتا تھا اور کرید کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خیر سے پائل لگی تھی۔

تم جن دنوں اپنے ماموں کے پاس لگی ہوئی تھیں یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ یقیناً تمہیں کچھ آگئی ہوگی۔
موشے نے بیٹے ہوئے میری طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”بچی ہے وہ طرزم خان۔“

”اوہو! ایم ارم نے بغور مجھے دیکھا۔ ہنسی اس کی آنکھوں میں تیری۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ اس کی گالوں کی طرف بھاگی۔“ ارے واقعی او ایسے تم ہو تو ایسے ہی کرتی سے شدید محبت کی جائے اور تم پر مہربان ہو کر یا پائل بھی کمال کی لڑکی ہے۔ لعنت مجھ پر اور شادی کرو۔“

میں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے لہجے کی سادگی قابل توجہ تھی۔ لفظوں کے بین کہیں منافقت یا ریاکاری کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

ابھی موزز کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سرگیت کا دھواں ناک سے خارج کرتے ہوئے وہ پھر بول اٹھا۔ ”ہاں میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسرائیل میں بنیاد پرستی انتہا پر جاری ہے اور فلسطین اس وقت ہلکتی خوردہ کیفیت میں ہیں۔ تمہاری شادی سنگین واقعہ ہو سکتی ہے جس میں پہلا نشانہ تم اور ڈیجر سارے فلسطینیوں کے بننے کا ہے۔ یا پائل بھی نشانے پر ہوگی مگر قسمت اگر یاد دہی کرے تو پھر کبھی کچھ درست ہو سکتا ہے۔“

”قسمت کی یاد دہی کے امکانات محدود ہیں۔“ منزل ہنسا۔

”چلو پارمنسور اگر تم نے اپنی نہیں کرنی تو میری

اس کی پالیسیوں پر پرزور طریقے سے احتجاج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موزز منزل بیروت سے، ڈاکٹر فرمان الوان جیہ اور ڈاکٹر موشے یروشلیم سے ہیں اور ایسے کڑے لہجوں میں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔

اسی دوپہر ہواؤں میں دل کو چرتی دیرانی اور اعصاب کو کوشل کرنی ادا سی تیری تھی۔ ہم سب کھانے کی میز پر ابھی بیٹھے ہی تھے جب ایک درمیانی قامت کا نوجوان بیک کندھے سے لٹکائے ڈانکنگ روم میں داخل ہوا۔ دور دار آواز میں پہلے سلام پھر مظلوم کہا گیا اور ساتھ ہی تعارف کے چند جملے بھی بے نیازی سے اچھالے گئے۔

واشنگٹن پوسٹ کا نمائندہ، نام ایم ارم ایلمان، اخبار کی طرف سے اسرائیل کے لیے تیار ہوا تھا۔ گذشتہ ماہ سے وہ ان علاقوں میں پھر رہا تھا۔ یوں تو وہ یہودی تھا پر بڑا سچا کھرا اور بے باک تھا۔ مصدقہ کرتے ہوئے کھانے کی میز پر بیٹھ گیا کہ اسے بہت جھوک لگ رہی ہے۔ ڈاکٹر فرمان الوان نے اس کے تاثرات جاننے چاہے۔ ایم ارم نے منہ میں ڈالا بڑا سناٹا لہذا جلدی جلدی لگتے ہوئے کہا۔ ”کئی سیکور یہودی ہوں یا بنیاد پرست، وہ ہرے یا لہجہ، سکوتی نمائندہ یا عام لوگ سب خلاف توقع یروشلیم کے اس سنے اور خوشگوار تجربے سے دوچار ہوئے ہیں جس کی بہر حال انہیں توقع نہیں تھی۔ سرشاری میں بیٹھے ہوئے ان کے جذبات اس ہاتھ میں آنے والی لغت کو کسی قیمت پر کھونے کے لیے تیار نہیں۔“

”بھی نہیں اس کی واپسی ہوگی اور ہم اب بھی نہیں اسے چھوڑیں گے۔“ جیسے الفاظ ان کے ہونٹوں سے چپک گئے ہیں اور آنکھوں پر پٹی بندھ گئی ہے۔ تاریخ بھول گئی ہے۔ یہ یاد نہیں یا وہ اسے یاد رکھنا نہیں چاہتے کہ تم لوگوں نے اسے بزدل بازو جھینا ہے۔ یہ جو تمہارے ارد گرد کے ہمسائے ہیں۔ یہ معاش پرستی کب تک یونہی پیش و طرب میں ڈوبے رہیں گے؟ ایک دن تو انہیں بھی جاگنا ہے، اٹھنا ہے۔ تب کیا ہوگا؟

جنرل موشے دایان دیوار گریہ کے پاس کھڑے ہو کر کہتا تھا۔ ”ہم اپنے مقدس مقامات پر واپس آ گئے ہیں۔“ میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا تھا۔ ”منصور یہ اور قوموں کے بھی مقدس مقامات ہیں۔ وہ بھی اس کے لیے جان لڑائیں گے۔ پچاس سال“ سو سال، صدی، دو صدی بعد کسی بھی وقت بھی پھر مکمل جنگ

کروادو۔ میرا بھی دل اس لڑکی پر بہت ہے۔ میں جلد میں اس کے والدین سے ملا ہوں۔ مگر کیا تھا ان کے۔ اچھے لوگ ہیں۔ وہاں ان کی ایک یوڑمی عزیز کارمیلا تو یہ جان کر خوشی سے ہی نہال ہو گئی کہ میں نے پائل کے لیے پروپوزل دیا ہے۔ مذہبی سی عورت ہے۔ خطی بھی لکھتی ہے۔ مجھے یہ اصرار رات کے لیے ٹھہرا گیا کیا۔ ڈنر کے بعد میرے کمرے میں قبوہ لائیں تو یوں۔

”پائل بہت محبت اور خیال کرنے والی لڑکی ہے۔ یہ پورا گھرانہ ذرا مسلمانوں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ بروٹم اور جلد میں رہنے والا خالیدی خاندان تو ان کی ناک کا بال ہے۔“

آپ شاید منصور کی فیملی کے بارے میں بات کرتی ہیں۔ میں نے قبوہ کا کھونٹا بھرا اور کہا۔

وہ حیرت زدہ ہو گئیں۔ ”تم منصور کو جانتے ہو؟“
”جانتا تو نہیں پر اب اسے ڈھونڈنے لکھوں گا۔ ایٹہ منڈاس کا پوئلہذا تھا۔ اسی کی وساطت سے تھوڑی بہت عساکر شامانی ہے۔“

انہی میری بات جاری تھی جب اس نے ایک لمبی سی آہ بکچے سے نکالی۔ ”ہائے کاش مسلمان نہ ہوتا۔ لڑکا وہ میرا ہے۔“

”کارمیلا مسلمانا منصور اگر میرا ہے تو پھیل میں بھی نہیں۔ یوں اگر تمہارے اور مگر والوں کے خیال کے مطابق شادی یہودی سے ہو تو مجھ میں حقدار ہوں۔ ویسے میں صرف نام کا یہودی ہوں۔“

وہ عجیبی تو پیر پیر میرا نہ دیکھتی تھیں کہ یہ ہے کیا بلا؟ ہم سب تو ہنسنے ہنسنے لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔

منصور

☆.....☆

ڈاکٹر موزز منڈل نے آہستگی سے منصور کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر وہ میٹار پیو جی کپ سے باہر لے آیا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سکون اور صبر سے چلو۔ کوئی ایک دن کا رونا ہے یہ۔ تین ماہ سے تم گھر نہیں گئے۔ دن رات مریض، اسپتال اور تم۔ مرنے سے تمہیں۔“

موزز نے سنانے میں ڈوبی فضا پر نظریں ڈالنے ہوئے کہا۔ ”چلو ڈاکٹر ادا کر دیتے ہیں۔“

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر نکلی جگہ پر آ گئے تھے۔ اسی دوران ڈاکٹر موزز نے تیز قدموں

سے چلتا ہوا ان کی طرف آیا اور اس نے منڈل سے اس کی بیروت سے آنے والی کال کا کھانا اور خودہ منصور کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔

بڑے سے کھلے میدان کے عقب میں اونچے ٹیلوں پر اسرائیلی ٹینکوں میں بیٹھے جو کس فوجی گھرائی کر رہے تھے ان بے خانمان لوگوں کی جواہری جڑوں سے اکڑ گئے ہیں۔ جن کے صدیوں کے نام و نشان کو ملیا میٹ کیا جا رہا ہے۔ دونوں زخموں کے ان دور درختوں کے پاس رک گئے جو ایک دوسرے کے ساتھ شاخوں کے پھیلاؤ میں الجھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر موزز نے درخت کے ساتھ ٹپک لگاتے ہوئے خالی خالی لگا ہوں سے اپنے سامنے دور تک پھیلے اس کپ کی ٹین کی چھتوں، موٹے گیٹوں سے بنی چھوٹی لڑکیوں کے سلسلوں کے پھیلاؤ پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ”کوئی بھی انسان اپنے ماضی سے ہی نہیں کٹ سکتا ہے۔ یہ سائے کی طرح تعاقب میں رہتا ہے ہر قدم پر روکنا اور اسے متوجہ کرتا ہے۔ مجھے بتاؤ یہ جو دو بھرتوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں کیا یہ اپنی زندگی سے اس نئے کو نکال سکیں گے۔“

ڈاکٹر موزز خاموش ہو گیا تھا۔ کئی دیر وہ خالی خالی نظروں سے اپنے گرد و پیش کو دیکھتا رہا۔ مگر جیسے خود کلائی کے سے انداز میں بولنے لگا۔ ”اب ہم سیفاراؤی (عرب ممالک سے آنے والے یہودی) ان اعلیٰ نازیوں (یورپ سے آنے والے) سے کٹر روہ کے ہیں کہ ہم عرب اور یہودی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ ہم کیسے اپنا ماضی کاٹ کر دکھ دیں اور اس کی نفی کریں جو شعور کی آنکھ کھلنے کے ساتھ ہم نے دیکھا اور جو ہمارے ساتھ ساتھ چلا۔“

منصور تم جانتے ہو۔ ہم عراقی اور شامی یہودیوں کو بروٹم میں کہاں رکھا گیا؟ جنگ بندی لائن کے ساتھ چھاں کہیں ہم لوگ اردنی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بننے اور کہیں فلسطینیوں کے قاتل کا سرہ چکھنے اور انہیں چکھاتے۔ تمہیں میں کچھ بتاؤں ہم لوگ ان یورپی مہیوئوں کے لیے قاتل قبول ہی نہیں تھے۔ اس پر تم ہم ماضی کا ذکر بھی نہ کریں۔ اس ماحول، ان خوبصورتیوں، ان پھولوں، پرندوں، پھولوں، پہاڑوں، پانیوں سمیوں سے نانا توڑ لیں کہ ان کا تعلق عرب تہذیب سے ہے جو بہت کامیاب ہے۔ میرے اعدا والا دیکھنے لگتے ہیں جب میں سوچتا ہوں ان کہیوں میں جوان ہونے والی سل کو ہم کیا دے رہے ہیں؟

واج ثاور پر بیٹھے ہاتھوں میں بندوبست تھا ہے یہ

نوجوان چھوکرے گولی چلائے مکمل سمجھتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی قاعدہ کوئی اصول نہیں۔ جسے چاہیں روک لیں جسے چاہیں مار مار کر لہو لہان کر دیں جس کی چاہیں جان لے لیں۔ جس گھر میں چاہیں گھس جائیں۔ ماؤں کے سامنے ان کے ہجر گوشوں کو گولیوں سے بھون دیں۔ پناہ گزینی ان کا مقدر بنادیا گیا ہے۔

ڈاکٹر منصور نے دیر سے یہ کہا۔ ”موٹے چھوڑ دو ان سب باتوں کو۔ آؤ ذرا دیکھو۔ ہوائیں دھنوں کے درختوں اور سیبوں کے پتوں سے تھمتھمتی ہمارے چہروں کو چھو رہی ہیں۔ سورج کی تپش کو ہواؤں کی تیزی کا تھمتھمتی ہے۔“

تجلی منصور نے دیکھا تھا۔ مرکز کے پار چیک پوسٹ پر فوجیوں نے گرین لائن کی پرلی طرف ایک گاڑی کو روکا ہوا تھا۔ تین عورتیں اور ایک مرد کھڑے بائیں کر رہے تھے۔ منصور نے سوچا۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے لوگ مطمئن ہوتے ہیں۔ دور سے بڑے بڑے ڈبے بھی نظر آرہے تھے جو یقیناً دوا دہنوں کے ہوں گے۔

”پائل کا کیا پروگرام ہے؟ کیا اسے واپس آنا ہے؟“ موٹے نے پوچھا اور بھر خور عی کہا۔ ”یار منصور شادی کرو۔ شور شرابا ہوگا۔ خود ہی کچھ وقت بعد دب دیا جائے گا۔“

منصور خاموش تھا۔ مگر وہ کھڑا ہو گیا۔ دور اونچے ٹیلوں پر چڑھے اسراٹلی ٹیکوں کے اندر جھلکوں میں جھپٹے نوجوان فوجیوں کو جو گذشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے ایک جگہ ان پر نظریں جمائے بیٹھے تھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جسٹرانڈ انڈاز میں بولا۔ ”یارو جاؤ اب۔ بھاروں کی ہم پر جی آنکھیں پھراگئی ہوں گی۔ کچھ کا سانس لینے دو انہیں۔ سولی پر چڑھے بیٹھے ہیں کہ ہم جائے کیا سازشیں کر رہے ہیں؟“

منصور چند میریس مریضوں کو دیکھنے آئی سی یو وارڈ کی طرف جا رہا تھا جب وہ رک گیا۔ اس نے پائل کو دیکھا تھا۔ چند گھنٹوں کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ ایک مضطرب اور پھیپھی سی کیفیت میں وہ خود سے بولا تھا۔

”میری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے شاید۔ میں Hullycinated ہوا ہوں۔ بچی بات ہے قصور تو ان بھاری آنکھوں کا بھی نہیں کہ وہ بھی ایسے قصورانی سراب سوتے جاتے دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں۔“

مگر آج کچھ عجیب و غریب باتیں ہی تھیں۔ بہت ساری کیفیات اس پر وارد ہوئی تھیں۔ ہلن بھر کے لیے لگا چسپہ وہ کسی گھپ تاریک رات میں اندھیرا اوڑھے کھڑا تھا اور یکدم آسمان کے پتے پر جھجک جھجک کرتی لہکھٹان کی برسات نیچے اتر آئی ہے اور سارا ماحول ایک حسین روشنی سے بھر گیا ہے۔ دوسرے لمحے اسے محسوس ہوا جیسے وہ جانے کب سے صحرا میں بھگ رہا تھا آبلہ پا اور خستہ حال سا۔ یکدم اسے گلستان نظر آ گیا ہے جہاں درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور خشکے کا ٹیٹھا پانی اس کی پیاس بجھانے اور صحن مٹانے کو موجود ہیں۔ بارش کے بعد آسمان پر لہرائی تو س قزح کے رنگوں جیسی پائل کا نظر آنا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

وہ ٹھنک گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے پتھر سے بنے کھڑے تھے۔ کم و بیش چار سال بعد وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ گوان کے درمیان غلوں اور کھجی کھارون کا سلسلہ بہت باقاعدگی سے تھا مگر پائل نے اپنے آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ ایکا ایک ملنے والی اس خوشی اور سرشاری کی کیفیت کو کوئی منصور کے دل سے پوچھتا۔ اس کی آنکھوں میں جھلکتے دیکھتا۔ اس کے چہرے پر رقص مسرت کے رنگوں سے مسموم کرتا۔

اس کی آنکھوں میں بھی دینے ملتے تھے۔ پائل خفیف سا مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔

”منصور! منصور تمہیں لکھ نہیں سکی۔ فون بھی نہیں کر سکی۔ بس میں نے سوچا اس وقت فلسطین کے لوگوں کو ہماری ضرورت ہے۔“

منصور نے اسے اپنی ہاتھوں کے دائروں میں سمیٹا۔ اس کے بالوں پر بوسہ دیا اور ذرا سی ہیکلی پر چٹکی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کب آئیں؟“ ”ایک ماہ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اردن کے کیمپوں میں تھے۔ چند دن دمشق کے اسپتالوں میں بھی گزرے۔ اریٹا روتھ ند یارک فاکٹری کی نمائندہ بھی میرے ساتھ ہے۔ اسے اخبار کے لیے رپورٹیں تیار کرنی ہیں۔“

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے اس بڑے سے کمرے میں آگئے جو عارضی طور پر بنایا گیا ان سب لوگوں کا لیوگ روم تھا۔ کرسیوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے پائل نے اسے دیکھا اس کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔

”منصور میرے پاس جڑی کے لیے کچھ کہنے کو لفظ نہیں۔ تمہارے خط نے مجھے بہت رلا دیا۔ کئی دنوں پریشان

ری۔ میری آنکھیں میٹتی رہیں۔ ان کی شخصیت کے وہ سب
دلفریب پہلو ایک کے بعد ایک میرے سامنے آتے اور
میری آنکھوں کو جکھوتے چلے جاتے۔ ان کی محبتوں اور
شفقتوں کے واقعات کی لام ڈوریوں نے دنوں مجھے
جکڑے رکھا۔ انہوں نے بہت سے رشتوں کا ہمیں مان دیا
تھا۔ وہ بہت عظیم انسان تھے۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے
میں تم تک پہنچ جاؤں؟ پر یہاں آئے تو کیسوں کی حالت
زار دیکھ کر تو کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ ایسی بربریت اور ظلم۔

چندھوں تک وہ ایک دوسرے کو نناک نظروں سے
دیکھتے رہے، پھر منصور نے کہا۔ ”یہاں میرے ساتھ ڈاکٹر
موٹے اور ڈاکٹر موزد منزل بھی ہیں۔ میں ذرا رادھ لے
آؤں اور انہیں بھی اطلاع کر دوں پھر اکٹھے ہوتے ہیں۔“
رات کے کھانے پر وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ
تھے۔ انہوں نے دمشق کے اسپتالوں کے متعلق بتایا جہاں
نیام بھوں سے جھلے ہوئے لوگ تھے۔ محسوم بچے
تھے۔ قہقیرہ کے کسانوں کی کہانیاں تھیں۔ شام اور اسرائیلی
سرحد کے شامی گاؤں اسرائیلی فوجیوں کی اشتعال انگیز یوں
کے گواہ تھے۔ یاسل نے نزار قاسمی کی نظم کے کلمے سنائے۔

اے میرے غم زدہ وطن

بس ایک لمحے میں

تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ

خنجر تھما دیا ہے

جنگیں بھی، بھی جیتی جاتی ہیں

ملاؤس وہ باب کے ساتھ

اب اگر آسانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی

تو اسے کوسومت

خدا انہیں فتح دیتا ہے جنہیں وہ جانتا ہے

خدا کوئی تھما کر مرنے والا لوہا تو نہیں

وہ تو چوہنیوں کی طرح

ہماری کمزوریوں کے ذریعے آیا

پانچ تو وہ لوگ پہلے ہی تھے اور بقیہ تین بھی دیک
ایڈ پر آگئے تھے اور اب بیٹھے فیصلہ کر رہے تھے کہ یاسل کی
شادی ہونی چاہیے اور منصور کی بھی۔ دو تو ابھی بھی بھند تھے
کہ دونوں کو سول میرج کرنی چاہیے اور یہ اس بنیاد پرست
اور رجعت پسند معاشرے کے منہ پر ایک زنانے کا تھنر
ہوگا۔ آخر کسی کو تو ہارش کا پہلا قطرہ بننا ہے۔ وہ منصور اور
یاسل کیوں نہ ہیں۔ شاید یہ قدم اس مصعب اور محسن زدہ

معاشرے میں تازہ ہوا کا جھونکا ہو۔

بقیہ لوگوں کا خیال تھا کہ نہیں خصوصاً ان حالات

میں۔ مذہبی جنونیت کوئی بھی گل کھلا سکتی ہے۔ ان کی

زندگیاں سب سے زیادہ سختی ہیں۔

منصور کا چہرہ مکمل گیا ہے۔ ”چلو ہمارے لیے تو یہی

بات طمانیت لیے ہوئے ہے پر یار یہ کیسی محبت ہے

اساطیری کہانیاں جیسی۔ میری ٹھو پڑی میں تو اس کی فلاسفی

سمجھ نہیں آتی۔“

ڈاکٹر منزل ہنس۔ ”تمہاری ٹھو پڑی میں چربی چڑھی

عقل ہے جسے ذرا سی مشکل بات بھی سمجھ نہیں آتی۔ تم اس

مسکے پرسوں میں ہلکان مت۔ ہو۔“

ابراہیم ایلان اس انداز میں زیر بحث آیا کہ بہت

دنوں سے غائب ہے۔ معلوم نہیں کہاں ہے؟ اور ایک شام

جب وہ محبت بنے کے سنے راکھ و کپ سے واپس لوٹ

رہے تھے اور وہ دونوں ذرا پیچھے تھے، یاسل ذرا ٹھکی سے بولی

تھی۔ ”منصور! مچی ڈیڑی تم سے میری شادی کے بارے

میں جو باتیں کرتے تھے وہ تم نے کبھی نہیں لکھیں۔ کیوں؟“

منصور اس کے اس اعتقاد سے سوال پر خفیف سا

مسکرایا اور ضمانت سے بولا۔ ”یاسل تمہیں کیا لگتا؟ ان کے

ساتھ میرا اتنا بھی تو ایک تعلق ہے۔ ان کے دل کی باتیں

سننا، انہیں سلی دینا، ان کی ولداری کرنا ان کے کھار س

کے لیے کتنا ضروری ہے؟ یاسل انہیں تو کسی ڈاکٹر پر بھروسہ

عی نہیں رہا۔ کسی چھوٹی موٹی تکلف کے لیے اگر قرعہ ہی لھیک

پر چلے بھی جائیں اور ڈاکٹر نہ لگھ دے پر انہوں نے دوائی

نہیں خریدنی جب تک کہ نوں پر مجھ سے آدھ کھٹے بات چیت

نہ کر لیں، بھی ان کی تسلی ہوئی ہے کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھ سے

فوری رابطہ نہ ہو سکا۔ تکلف برداشت کرنا انہیں قبول مگر

دوائی نہ کھلائی ہے اور نہ کھانی ہے۔“ منصور چند منوں کے

لیے رک گیا۔ پھر دیر سے بولا۔ ”یاسل میرے لیے بھی

جھ جاکر انہیں اور انکل کو دیکھے بغیر چلے آنا نہیں ممکن ہے

اور تم نے یہ باہر والا پکا بھی فصول لیا۔ میڈیکل تو حیرت

میں بھی ہو سکتا تھا۔ ڈھوڈا (آخنی) نے تمہاری عدم موجودگی

کا بہت دکھ اٹھایا ہے۔ تم دیکھو گی وہ بہت کمزور ہو گئی

ہیں۔ ذرا سی بات پر ان کے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ جذبی

کی موت پر وہ جیسے تڑپیں۔ سچ تو یہ تھا کہ ہم سب اپنا غم

بھول کر انہیں سنبھالنے لگے۔“

اس وقت چاند اپنے جوبن پر تھا۔ چاندنی فوں

چہرے پر جذبات کا مدہ و جزر رہا۔ مہراس کی بھاری سی آواز جیسے کہیں پاتال سے کسی بوجھ تلے دہلی لگی ہو اسے سنائی دی تھی۔

”ابراہیم بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ تقریباً بیسے سے پچوڑا پڑھ رہا ہے۔ پسندیدہ عادات کا مالک ہے۔“ یائل نے مٹی سے کہا۔ ”منصور میں نے تم سے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا ہے۔“

دونوں خاموش بہت دیر تک بیٹھے رہے، چاند کو آسمان کی دستوں میں، چاندنی کو زمین پر بکھرے دیکھتے ہوئے۔ رات دیر سے دیر سے بیکٹی رہی تھی۔

☆.....☆

اور وہ ایسا ہی shabbat کا ایک دن تھا جب وہ بیمار کے کسی معطر جھونکے کی مانند مگر میں داخل ہوئی تھی۔ سارا مگر خوشی سے مسکرا اٹھا تھا۔ وقت بھی عین وہی تھا سورج کے اندر باہر ہونے سے ذرا پہلے کا جب ملکہ شبات اپنے چاہنے والوں کے مگر تشریف لاتی اور یہودیوں کو نکلنے، خوشی اور محبت کا تقہ عاتیت کرتی ہے۔ یائل کا آنا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

بڑا بچہ ابھی چند لمحے پہلے کھانے کے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھی تھی مگر جب یہ حیات آفرین خوشی ملی۔ کارمیلا سیدنا نے بھی خوشی سے کلاکاری ماری اور بے اختیار ملکہ شبات کے لیے پڑھی جانے والی دعا لیں پر لے آئی۔ ”آؤ کداس پیاری دین کا استقبال کرو۔“

کتنی ہی دیر وہ تاپو توڑ سوالوں کی زد میں رہی کہ بھلا اطلاع کیوں نہ دی اور بڑھاپہ ہوتا ہے کوئی خط نہیں لکھنا نہ فون کیا۔ تمہیں طبی احساس نہیں کہ یہاں تین بندے تمہارے خط تمہارے فون اور تمہاری جانب سے ملنے والی کسی چھوٹی سے چھوٹی اطلاع کے لیے بھی کتنے بے چین رہتے ہیں۔

وہ بس مسکراتی رہی پھر اس نے کہا ”میں تھی ہوئی ہوں۔ مجھے کھانا کھانا ہے اور سونا ہے۔“

در اصل رات کا بیشتر حصہ منصور اور اس نے ستاروں اور چاند کی چھاؤں میں گزارا تھا۔ جنین کے اس عارضی اسپتال کے نواح میں جنگلی پھولوں کی بہتات تھی جن کی خوشبو رات کی ہواؤں سے مل کر انہوں کو مدہوش کیے دیتی تھی۔ علی الصبح اسے روانہ ہونا تھا۔

سویرے ہی منصور بعد ذرا تندر کاڑی کے اسپتال کی

خیزی کے پورے لوازمات سے کچھ دن میں نظر آنے والی اس جگہ کی ساری بجوں کو ڈھانچے اس وقت اسے حسین ترین بنا رہی تھی۔ کسی عری کے مست خرام پانوں کی طرح پورپی ہوا نہیں جا بجا کی جھانپوں میں گھمتی ان کی خوشبوئیں چرائی اور انہیں میدانوں میں بکھیرتی پیچم کی طرف چلتی تھیں۔ جنگلی کافور کی خوشبو میں زور زور سے سانس لیتے ہوئے پائل وہاں پڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔ دونوں پاس بیٹھے ان لمحوں کی مسرت کشید کر رہے تھے جو انہیں سالوں بعد ملے تھے۔

”یائل میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تمہیں بتاتا ہوں۔ وڈو اٹھیک نہیں ہیں۔ ایڈمنڈ کی کمی بھی انہیں بہت محسوس ہوتی ہے۔ انہیں خوشی اور سکون کی ضرورت ہے۔“ ”کیا تم لوگوں کے درمیان میرے بارے میں کچھ فیصلہ ہوا؟“

”تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ ظاہر ہے تمہاری مرضی کے بغیر تو نہیں ہو سکتا۔ تاہم مجھ سے تو ڈوڈا کی ایک طرح سے درخواست ہی تھی کہ میں تمہارے معاملے میں جذبات سے اوپر اٹھ کر حقائق کی روشنی میں فیصلہ کروں۔ ابراہیم ان سے ملے اور انہیں بھی وہ بہت پسند آیا ہے اور وہ اسے تمہارے لیے موزوں سمجھتی ہیں۔“

یائل کے عام سے لچے میں دفعتاً کتنی سی در آئی تھی۔ ”میں تو ڈاکٹر منڈل اور ڈاکٹر موٹے کی باتوں پر حیران ہوں۔ ابراہیم ایمان تم سے کتنا فریٹک ہو گیا ہے۔ تم سے کیا خاص باتیں تھیں اس کی؟“

منصور ٹھٹھکا کر ہنس پڑا۔ کتنی دیر ہنستا رہا۔ اس کی ہنسی پائل کے غصے کو ہوا دے رہی تھی۔ ”اتنے سال باہر رہیں، اتنا پڑھا اور عاداتیں ابھی بھی وہی ہی ہیں۔“

بہت پیارا اور بہت محبت سے جیسے کسی نازک اور قیمتی چیز کو احتیاط سے پکڑا جا رہے منصور نے اس کا منہری بالوں والا سر اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لیا اور بولا۔ ”بچپن تو ابھی بھی تم میں موجود ہے۔ وہی شک و شبہ فلاں نے کیا بات کی؟ اس نے یہ کیوں کہا؟ کہا تو کیوں کہا؟ بس پہلے مار کٹائی اور طعنوں والی باتیں تھیں۔ اب ذرا سنجیدگی آگئی ہے۔“

”منصور مگر والوں کی طرح تم بھی چاہتے ہو میں ابراہیم سے شادی کر لوں؟“

بہت دیر تک منصور خاموش اسے دیکھتا رہا۔ اس کے

ڈاؤن میٹری کے سامنے موجود تھا۔ دونوں نے جب وقت رخصت ایک دوسرے کو دیکھا دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ گاڑی چل پڑی تھی اور جب تک منصور آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا وہ اسے دیکھتی رہی اور پھر شپ شپ آنسوؤں کی بوچھاڑ اس کے رخساروں پر کرنے لگی تھی۔ صبح وہ بہت دیر تک سوئی رہی۔ کسی نے اسے اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ بس بیڑیا آتی اس پر نظر ڈالتی اور چلی جاتی۔ کوئی دوجے وہ اٹھی۔

کار میلا سیوتا (دادی) بیڑی کٹڑ اور رواجی یہودوں تھی۔ چار سال گھر سے باہر رہنے کے باوجود پائل جانتی تھی کہ ہفتے کے دن سہ پہر تک اس نے آرام میں گزارنا ہے اور گھر کے کسی کام کو توجہ نہیں دیتی۔ مگر وہ اٹھے کی اور کلبو کے تیل کی طرح کام میں جت جائے گی۔ ہفتے کی شام کو آلو گوشت کا سناں بنتا ہے۔ حریب کی پھلیوں کی بھانجی بنے گی۔ وہ اپنی الماری میں سنہالا ہوا زیتون کی لکڑی سے بنا ہوا بکس جس میں دارچینی، لوگ اور الائچی ہیں نکالے گی اور میز پر سجائے گی۔ لوگوں کی خوشبو ہر بندے کے فتنوں میں گھسانے گی اور ساتھ میں دعاؤں اور سکون کے لیے کہے گی۔ اس ساری کارروائی کے اختتام پر وہ شات کا دن اس کے حسب حال اچھا کر جانے پر شکر ادا کرے گی۔ گھڑی دیکھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا اور حیرت سے اس نے خود سے کہا تھا۔ ”اٹ میں اتنا سوئی ہوں۔“

سالوں بعد اپنی ماں کے پاس بیٹھنا اور چائے پینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں۔ صبح تو یہ تھا کہ بیڑیا سے تو خوشی سنبا لائی نہیں جا رہی تھی۔

گزشتہ سال بھر سے جب بھی ٹیلی فون پر بات ہوتی یا وہ اسے خط لکھتی۔ ہر خط اور ہر کال میں بہت ساری باتوں کے بعد وہ الٹی سی پیار بھری سرانٹ کرتے ہوئے کہتا یا لکھتا کہ ”بہنہ بھوتی۔“ پائل دیکھتا میری جان اب جب تمہیں کسی یہودی سے ہی شادی کرنی ہے تو بھر کسی نئے ملانے والے کو اس نظر سے بھی تو دیکھو۔ کوئی اچھا اور متقول نظر آئے تو توجہ دو۔ اپنے ساتھ چڑھنے والے کسی یہودی کلاس ٹیڈ یا کالج میٹ کو خیال میں لاؤ۔ ”ماں کی ایسی فضول اور لالچنی باتوں پر وہ بھی ہنس پڑتی اور کبھی ہنسا جاتی۔

”پائل شادی تو کرنی ہے نا۔ کوئی کتوار کوٹھا تو چھتتا نہیں تمہیں۔ میں تو تجھے اس یہودی والی زنجیر سے بھی باغ سے کا نہ کہتی پر ایک حالات کی تکلیفی اوپر سے تیری

دوھیال کی تنگ نظری اور تعصب و گرنہ منصور جیسا میرا لڑکا ساری دنیا، سارے جہاں میں نہیں۔“

اب گزشتہ پانچ ماہ سے ابراہیم ایمان زیر بحث آگیا تھا۔ اس پر دباؤ اور اسرار کی بارش سی گئی۔ بار بار یہ کہا جاتا کہ اس پر وپزل کو فلٹر انداز کرنا مناسب نہیں۔ اس وقت بھی وہ اس حوالے سے بات کرنا چاہتی تھی پر تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی اور خود سے کہتی تھی۔ ”ابھی اپنی زبان بند ہی رکھوں تو بہتر ہے۔ سالوں بعد آئی ہے۔ بات کروں گی تو کہیں موٹھی نہ خراب کرے۔“

دو دن بعد کوئی بارہ بجے وہ بیڑیا کے کمرے میں آئی۔ اس نے لاگ اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ ”میں میں اولڈ جید شالہ آئی کی طرف جا رہی ہوں۔ بیڑی کا فرش کرتا ہے۔“

”منصور سے تمہاری ملاقات ہوئی؟“ بیڑیا کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”منصور آج کل ٹائیس، رملہ، مہرون، جین اور کبھی کبھی غزہ کے کیمپ اسپتالوں میں ہوتا ہے۔ ایک ماہ تو میں نے بھی وہاں ڈیوٹی دی۔ روزی ملنا ہوتا تھا۔

بھروسہ اسکاؤٹر پر اتر کر منصور کے گھر جانے تک کے قافلے میں یادوں کی ایک پلٹھاری جو اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ سوچوں کے بھور تھے جن میں ڈوبتی اور ابھرتی رہی۔ خیالات کی کسمپ کشمیریاں تھیں جن میں وہ ابھرتی رہی۔

بڑے سے چوٹی کندہ کاری سے گھٹے چمک لکھا دروازے سے گزر کر ایک لمبے کے لیے رک کر اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس کا بچپن جیسے ٹکسلانا، کلکاریاں بھرتا، شور مچاتا اس کے آگے پیچھے قس کرنے لگا تھا۔ یہ گھر جہاں آنے کی اسے ہمیشہ بیڑی شمار کرتی تھی جہد و سارہ کا آبائی گھر جس کے کشادہ آئینوں میں نالاب تھا، کنواں تھا۔ یہ گھر طلب اور دشمن کے سبزیوں کے گھروں جیسا تھا۔ نارنگی، انجیر، آڑو اور انار دس کے بیڑوں سے سما گلاب کے پھولوں اور یاسمین کی کٹیوں سے مہکتا۔ کدروں کی چٹیں اتنی اونچی تھیں اور مہتر ایسے قد آور تھے ان پر کل کاری ایسی شاعرانہ تھی کہ اس کی آنکھیں دیکھتے نہ کھیں۔ برآمدوں کی طوائف، دروازوں اور کمر کیوں کا ان میں کھلتا۔ نشست گاہوں میں بیٹھے قافیوں پر مرصع کرسیاں اور صوفے۔ ان کا بر و ظلم کا گھر بھی بیڑی فوسل تھی لیے ہوئے تھا کہ اس گھر کی

ہے چلے جاتے تھے۔ ”آئی دہن ڈھڑوئے۔ منصور کو زخمی کرنا میرا کام ہے۔“

ام غسان نے کتا حے سے کھانا بنایا تھا۔ اپنی ساری چاہت اس نے مطلوبے میں ڈال دی تھی۔

اس نے اپنی انگلیاں جانتے ہوئے کہا تھا۔ ”بہت مدت بعد میں نے جی بھر کر کھانا کھایا ہے۔“

گھر آ کر تھوڑی دیر بیٹا سے باتیں کرنے کے بعد وہ کارمیلہ کے پاس آ کر بیٹھی تھی۔ وہ تاملود (تورن کی تفسیر) کھولے قدرے اونچی آواز میں پیدائش کا بیان پڑھ رہی تھی۔

”اور بچے کی تختی سے بھی چالیس دن پہلے جنت سے ایک آواز سنیں پرستاری دیتی ہے کہ فلاں لڑکی کی شادی فلاں لڑکے سے انجام پائے گی۔“ یہ بیان اس نے کوئی چار بار دہرایا ہوگا۔ یاہل نے خود سے کہا تھا۔ ”کہیں یہ اسے

سنانے کی لاشعوری کوشش تو نہیں۔“ کارمیلہ سیدتا (عبرانی میں دادی نانی) ہرگز اس مزاح کی عورت نہیں تھی پر یاہل گزشتہ چار سال سے اسرائیل سے باہر تھی۔ بہت سی باتیں اور عادتیں وقت کے ساتھ انسانی فطرت میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ غلطوں میں وقفہ فوق اس کا اظہار ہوتا تھا۔ جب

کبھی بیٹا اس سے فون پر بات کرتی تو وہ کہتی: ”خدا ہوئی ہے بیٹا اب تم ہی باتیں کیے جاؤ گی۔“

رکوبون مجھے پکڑا اور مجھے بھی تو اس سے کچھ کہتا ہے۔“ اور یہ کہنا کیا ہوتا وہی کراب آجاء۔ کب تک امن پڑھا نہیں میں جان ہلکان کرتی رہو گی۔ تم نے شادی نہیں کرتی۔ یوں اس کی شادی کے لیے تو وہ تب سے سرگرم تھی جب وہ سولہ سترہ

سال کی تھی۔

”تو بیٹے یہ خدائی فیصلے ہیں جن سے روگردانی ممکن ہی نہیں۔“

”پاس اور بھی اس کا انتہائی ناپسندیدہ تہوار تھا۔ ایک تو اس تہوار میں خیر کا سایا۔ ہر وہ شے جس کے اندر

ذرا سے خیر کا شائبہ ہو وہی ممانعت کے ذمے میں آتا تھا۔ اوپر سے کارمیلہ سیدتا کی اس معاملے میں پابندیاں اور سختیاں۔ وہ جھلانی۔ اپنی ماں سے ابھتی۔ ”ڈنیل روٹی کے بغیر ناشائف بندہ مرنے جائے۔“

بیٹا خاموشی سے اس کے لیے بریڈ لے آتی۔ اسے چھپا کر رکھتی۔ اس کے جربز کرنے پر کہتی۔ ”یاہل میری جان وہ بوڑھی ہے۔ چلو اسے تکلیف ضرور دینی ہے۔“

دوسرے اسے ہجرت کے واقعات سننے سے سخت

بالکونیاں، محرابی دروازے سکوں میں قدامت کا ہے پایاں حسن تھا۔

گھر کی فضا پر جس اداسی اور دکھ کی کیفیت کے سامنے محسوس ہوئے تھے وہ اس کے اپنے احساسات کا عکس

نہیں تھے بلکہ گھر پر دم اور اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس پر پڑنے والی سب سے پہلی نظر ام غسان کی تھی جو کسی کام کے

سلسلے میں باورچی خانے سے باہر آئی تھی اور اسے دیکھتے ہی خوشی سے چلاتے ہوئے اس کی طرف بھاگی تھی۔ ”یاہل

خالیہ دوڑی آئی تھی۔ خالیہ کے سینے سے نکلتے ہی اس کے آنسو پھوٹ نکلے۔ کتنی دیر وہ ایک دوسرے میں ضم

کھڑی رہیں۔ خالیہ اسے سینے سے چٹائے اس کے بالوں پر بوسے دیتی، رخسار دل کو چومتی اور پھر اپنی ہاتھوں کے

دائرے میں سیٹے سیٹے کرے میں لے آئی۔ وہ باتیں کرتی تھیں، جدی کی، جگ کی جس نے فلسطینی مسلمانوں کو نکٹوں

سے ہٹا کر دیا تھا۔ جدی کے شہید ہونے کی۔ ڈاکٹر سموی کے غزوہ کی بچی پر دن رات مصروف رہنے کی۔ کتنی دیر گزر گئی تھی۔ وقت کا تو کوئی احساس ہی نہیں تھا دونوں کو۔

خالیہ کے ساتھ وہ جد و جد کے کرے میں تھی اور وہیک رہ گئی۔ وہ جلال اور جمال کی حامل چھوٹی قاصت والی بہت

بادشاہ اور خوبصورت عورت کہاں تھی؟ یہاں تو بڑیوں کا ایک ڈھانچا بیضا شمع کے دانے لگاتا تھا۔

ان سیاہ آنکھوں کی پتلیوں پر تیرتے پانچوں میں جیسے ادا سی اور غم منہ رہ گئے تھے۔ دہرزد گئی تھی۔

”میری قوم اس کی ذمہ دار ہے۔“ اس نے سوچا۔

پاس بیٹھی تو جیسے ان ہاتھوں میں گھڑی تھی۔ بہت سے پیار بھرے بوسے تھے جو اس کے گالوں پر پڑتے ہوئے

تھے۔

”خالیہ آئی اس گھر کو منصور کی دہن کی فوری ضرورت ہے۔ یہ گھر بہت اداس ہے۔ مجھے اس کی اداسی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔“

خالیہ نے اپنے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تمام لیا۔ ”دہن تو میرے سامنے بیٹھی ہے مگر میں اسے اپنے گھر کیسے لاؤں؟“

خالیہ کی اس بات پر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ کسی ننھے سے بچے کی طرح اس نے اپنا چہرہ خالیہ کے سینے میں چھپا لیا تھا۔ اب وہ کوئی بڑی لڑکی نہیں تھی پر گھر بھی آنسو

بوریت ہوتی تھی۔ کس شہود سے تاریخ دہرائی جاتی۔ میرا اپنے سامنے بڑی ہکا دکوہ بہت کم توجہ سے پڑھتی؟
بہتی مصر سے جہت کو زمانے گزر گئے ہیں۔ اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کیا دہرائنا اور ان تکلیفوں کو کیا یاد کرنا؟ اور تھوڑی تکلیفیں اور تھوڑے دکھ ہیں زمانے میں۔ ہاں سخت ابلے ابلے بہت شوق سے کھاتی۔ اس کے اس شوق پر کار میلا سیتا بھی اسے یہ بتانے اور سامنے سے باز نہ رہتی۔

”دیکھو صدیوں کے قلم و ستم کے بعد بھی یہودی قوم زندہ ہے اور زندہ رہنے کے لیے بہت پُر عزم ہے اور یہ انڈے اسی بات کا اکتھار ہیں۔“

بس اس سارے ہنگامے میں اس کا اپنی ماں کو بہترین سفید لباس میں گڑیا سیخی دیکھنا نہایت اچھا لگتا تھا۔ شبات سے بھی اسے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اسے اپنے ماں باپ، پہلے بھائی تھا اس کے جانے کے بعد کار میلا سوچتا آگئی۔ ان سب کے ساتھ میرا پریشنا اور اپنے باپ کا دعائیں دینا بہت پسند تھا۔

وہ جب بھی گھر میں ہوتی اور شبات کا آغاز ہوتا یا اختتام وہ اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کر صرف دادی کی مدد کے لیے مکن میں جا کر اس کا ہاتھ بنانے لگتی تھی۔

کار میلا سیتا کو بھی خیانتا تھا۔ جدی صبح سے ہی شبات کی تیاری میں جت جاتی تھی۔ میرا بر بھانے کے لیے سفید چادر کا دھلنا ضروری ہوتا۔ شبات کی خاص دودھ کا والی موم بتیاں الماری کے خانے میں علیحدہ سے سنبھالی ہوتی ہوتیں۔ شراب کے لیے عام گلاسوں کی بجائے وہ اسے ہمیشہ Goblets سجانے کے لیے کبھی۔ کارڈ کے لیے بھی تاکید ہوتی اور Challah Loaves کا بیک کرنا بھی لازمی ہوتا۔ اس کی سوندھی خوشبو جب سارے گھر میں بھرتی تو وہ اسے اپنے اندر جذب کرتے ہوئے کار میلا کو تنگ کرنے کے لیے اگلے سیدھے سوال کرنے لگتی۔ کبھی اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے اور اپنی ٹھوڑی ان پر جھاتے، اور کبھی اس کے پو پلے سے چہرے کو ہاتھوں کے پیا۔ لے میں تھامتے ہوئے دلار سے کہتی۔ ”کار میلا سیتا۔ موم بتیاں بھلا جلاتا کیوں ضروری ہیں اور یہ مکہ شبات کیا ہے؟“

کبھی کبھی کار میلا کو غصہ آ جاتا۔ وہ اپنے چہرے کو تنگی کے واضح اثرات سے سہا لیتی اور لہجے میں ڈرامائی کھول

لیتی اور کہتی۔ ”تمہیں تو اپنے دین سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ تم نے پڑھائی کی تو وہ عیسائیوں کے اسکولوں میں۔ ماں اور بیٹی کی باری دوستیاں بھی مسلمانوں اور یونانی آرتھوڈوکس عیسائیوں کے ساتھ ہیں۔ اور وہ تہاری ماں بھی بڑی ہی دلچسپی ہے۔ مجال ہے جو تمہیں دین کی کوئی بات سکھائے۔“

پھر ایسے ہی ایک دن وہ میز سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میری آپ ابراہیم ایمان سے کہہ دیجئے میں شادی کے لیے تیار ہوں۔“

☆.....☆
”منصور تم سن رہے ہوتا۔“ بریڈیافون پر تھی۔
”جی ڈھوڑا!“ (جی خالہ)
”کچھ کچھ بولو۔“ بریڈی کی آواز میں اضطراب، بے چینی اور بے چینی کا جو عنصر تھا وہ منصور سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔

”ڈھوڑا میں سن رہا ہوں۔ ہاں سنایے آپ ٹھیک ہیں؟ یا کس کیسی ہے؟ شادی کی تیاریاں جاری ہیں۔ سب کام ٹھیک ہوں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھیے۔ ہاں کار میلا سیتا کی درودوں کا کیا حال ہے؟“
”تو اپنی کار میلا سیتا سے خود بات کرو۔“ کار میلا نے زبردستی پکڑتے ہی کہا۔ ”تمہیں آنا ہے منصور۔ میری خواہش ہے۔ میری خوشی ہے۔“

”میری پیاری سیتا آپ کی خوشی میرے لیے بہت اہم ہے۔ شادی میں شرکت میرے لیے ممکن نہ ہوگی۔ یہاں ڈاکٹر وں کی بہت کمی ہے۔ یا کس نے یہاں کے حالات دیکھے ہیں۔ وہ بھی مصر کی ہیں۔ اسے بھی سمجھا دیا ہے۔ انشاء اللہ پھر اٹھتے ہوں گے اور ہاں آپ کو ملٹی ونامنر کھاتے رہتا ہے۔“

کار میلا نے فون رکھا اور لمبی سانس بھرتے ہوئے بریڈیٹا سے بولی۔ منصور اپنے کمرے میں تھا۔ پس منظر سے آنے والی فرید العطرش کے دل میں ہلچل مچانے والے اس کے مشہور گیت ”المی واملہ ہو“ کی دھن بہت مدہم سروں میں بج رہی تھی اور اس وقت یا کس بھی فرید العطرش کو ہی سن رہی ہے۔

”کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس یہودیت اور اسلام کو جو لمبے میں جو یک دیتی۔ منصور جیسا لڑکا، ضالیہ اور ڈاکٹر موی جیسے لوگ۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک برس کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

1200 روپے

ایک سال کے لیے 9,000 روپے

9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ دنیا ملک سے قارئین صرف ویشن یونین یا مٹی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

0301-2454188

0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C نیشنل بزنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگ روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

اس کے سینے سے ہوک اٹھی تھی جو مارے چہرے پر
بکھر کر اسے غمگین کرتی تھی۔

کار میلانے قدر سے نکلی سے کہا۔ ”ارے بڑھیا اب
تک تو تمہیں ان بھریڈی (انہما پسند) اور کش ایونٹ
(ایمان والے) گروپوں کی سمجھ آ جانی چاہیے تھی۔ یہ تو ہم
سفاردیوں (اچپن) سے ہجرت کر کے عرب علاقوں میں
سپنل ہونے والے عرب یہودی) کو گھاس نہیں ڈالتے۔
اللہ مارا ان اھلکینا زویں (یورپی یہودی) کا تکبر، ان کا نسلی
اور کسی ہونے کا غرور۔ انہیں کہاں لے جائے گا۔ ہم عرب
یہودی، عرب عیسائیوں اور عرب مسلمانوں کے ساتھ رہتے
ہوئے بہت خوش و غم تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اسرائیلی
ریاست بنے۔ ہم پرانے بوڑھے سفاردی یہودی داؤد
حسی، فرید العطرش، محمد عبدالوہاب اور ذکریا احمد کی دھنوں
کے عاشق۔ مجھے یاد ہے بڑھیا نے دیکھا تھا۔ کار میلا کی
آنکھوں میں ماضی کے کسی خوشگوار احساس کا کوئی عکس جھلکایا
تھا۔ بازار میں سودا سلف لیتے ہوئے کسی کینے پر مچھتی ام
کلوٹم کی آواز اور محمد عبدالوہاب کی دھنیں مجھے باطل کر دیتی
تھیں۔ میں تو آنے پہانے رک جاتی تھی۔ پورا گیت سنتی تھی
پھر کہیں پاؤں آگے کو اٹھتے تھے۔“

ہم نے احمد شوقی، ولادہ بنت المصطفیٰ، بدیع زلی،
فرانس مارشل، انور شاوول اور امرا القیس کو بھی یہ نہیں سمجھا
تھا کہ یہ کون ہیں؟ عیسائی ہیں، یہودی ہیں، آرموڈوکس
آرمینیائی؟ بس ان کی شاعری پڑھتے اور سر دھتے۔ نئی
آوازاں کی تلاش میں رہتے۔ ایک دوسرے سے ملنے تو
پوچھتے۔

”ارے تم نے فلاں کی فلاں چیز پڑھی ہے۔“ پھر
اس پر بحث ہوتی۔

”ارے بڑھیا میں بھی ایکسی پاگل ہوں۔ بوڑھی ہو
کر سخی گئی ہوں۔ دیکھو ہاتھ مارے سامنے یہ باتیں کر رہی
ہوں۔ تمہیں یہ سب سنار ہی ہوں۔ تمہیں جو اس چکر کو جانتی
ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتا ولادہ بنت المصطفیٰ کا۔ دسویں صدی کی
بے باک اور لا جواب شاعرہ۔ تم کیا جالو احمد شوقی کو۔“

پھر وہاں ایک مٹی تاسف بھری آہ تھی۔

”تم بھی اٹھی ہی نکلیں۔ کس نے تمہیں اتنا گلے ملے

کا کہا تھا۔ جب بچے اتنا قریب رہتے ہوں اور خاندانوں
میں اتنا پیار ہوتا ہے کون کوئی دیکھتا ہے؟“
”کار میلا ڈھوڈھو ادھنی تم شمایا کی ہو۔ تمہیں میں نے

کتنی بار بتایا ہے کہ میری ماں منصور کے دادا کو زبانوں سے جانتی اور ان کی بلند نظری کی مداح تھی۔ وی آنا میں اس کا ان کے گھر بہت آتا جاتا تھا۔ ہم تو لٹے پٹے جید آکر اترے تو میری ماں کسی بیہودی تنظیم کی مدد لینے کی بجائے سیدھی برہمنوں ان کے پاس آگئی۔ مجھ جیسی ٹوٹی پھوٹی عورت کو جیسے انہوں نے سنبھالا ہے تو ان کا بڑا اپن تھا۔ ہاں مجھ جیسی اوندھی کو تو یہ عقل ہی نہ آئی۔“ لہجہ میں دکھ لگ آیا تھا۔

”ارے تمہارا تو سسرال بھی اڈل درجے کا بدذات ہے۔ کسی اور کی بات کیا کرتی۔ چلو چھوڑو اب۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بیہودا (خدا) جو کر رہا ہے اچھا ہی ہوگا۔ دونوں قوموں کے انتہا پسندوں نے ہماری پیچی کو برادر گردینا تھا۔ ایک جو اس وقت مظلوم اور بے بس ہے اس نے اپنی رنج کا شور مچانا تھا اور دوسری نے دونوں میاں بیوی کو ٹھکنوں کی ٹوک پر گرہ لیتا تھا۔“

دفعۃً اس کی نظر ہلاک پر پڑی۔ ماتھے پر ہاتھ مارے ہوئے بولی۔ ”لو تمہارے ساتھ باتوں میں تو میں اپنی نمازی بھول گئی۔ مجھے تو ہنسی ہوگئی کہ جانا تھا آج۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی کپڑا سر پر پہنی اور ”یابہودا یا سکینہ“ کہتی تیزی سے باہر نکل گئی۔

شادی برہمنوں میں ہونا طے پائی تھی۔ ڈیوڈ کی فیملی کا پریشہ تھا۔ اس کا سارا خاندان مذہر مذہر مغربی برہمنوں میں تھا۔ یوڈین کی تندہی یونانی کالونی برہمنوں میں رہتی تھی۔ اس کا بھی اصرار تھا۔ فون برہیوڈسن سنٹر کے بارے میں بتاتی تھی کہ مغربی دیوار کے ساتھ بنا ہے۔ اتنا شاندار ہے۔ ڈوم آف دی روک کا منظر اور صدیوں بعد یہودیوں کا عروج۔ بہت لطف آتا ہے وہاں جا کر۔ ایک تاریخی نظروں کے سامنے پھڑ پھڑاتی ہے اور عجیبی بات ہے مسلمانوں نے یہ جگہ ہم سے چھین لی تھی اور ان کی یہ مسجد اقصیٰ تو مکمل عیسائی کے کھنڈروں پر ہی تعمیر ہوئی ہے۔ وہ وقت بھی جلد آجائے گا جب مکمل ماؤنٹ پر ہمارا معبر مجر تعمیر ہوگا۔ اب اس قبضہ الصغیر اور مسلم مسجد کو یہاں رکھنے کا قطعی جواز نہیں۔ دراصل تو اس کی تعمیر ہی زیادتی کے ذمے سے آئی ہے۔

”لعنت ہو تم پر۔“ یوڈین نے فون پلٹے ہوئے خود سے کہا۔

”ابھی بھی تمہارے کعبوں میں شعلہ نہیں پڑی۔ فلسطین پر قابض تو ہو گئے ہو تم۔ بحیرہ روم کی ساری ساحلی آبادیوں کو کیسے ملیامیت کر دیا گیا۔ دیویاسمن میں تو

نازیوں کو بھی مات دے دی۔ پرانے اور نئے یروشلم میں جو جو غلم دسم ہوئے، گھروں پر چھپے بلند درجہ پھرے گئے۔ ان کے اندر کس کرکٹ و غارت کا جو بازار گرم ہوا، کیسے کیسے پیارے اور انسان دوست لوگ قتل ہوئے۔ وہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے آگاہ تھی۔ بڑی حساس عورت تھی۔ ذہن زیادہ اضطراب میں پھنس جاتا تو خود کو نطن طعن کی پشکار سے مارتے ہوئے کہتی۔ ”کجنت بڑی جگہ ہے نا تو مسلمانوں اور عیسائیوں کی۔ کارمیلان ٹھیک کہتی ہے۔ اگر کہیں مسلمان غالب آجاتے تب یہ سب یہودیوں کا مقدر ہونا تھا اور عیسائی بھی ایسے ہی ہیں۔ ارے ہم تو زبانوں سے در بدر کی کی خاک چھانٹتے آئے ہیں۔ ابھی مجھے نہیں جانا کڑھنا۔ ہاں یہ مسلمان فیملی تو بچی بات ہے میری کمزوری ہے۔ مجھے اعتراف ہے اس کا۔“

انہی دنوں ابراہیم ایمان کا فون آیا۔ یوڈینا سے اس نے کہا تھا کہ وہ یاسل سے ملنا چاہتا ہے کہ جب سے وہ اسرائیل آئی ہے وہ اس سے ملائک نہیں۔

یوڈینا تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی۔ چاہتی تھی کہ ٹیلی فونوں اور طے ملانے کے چکروں کی بجائے جتنی جلدی ممکن ہو سکے شادی کی تقریب سر انجام پا جائے۔ یاسل بھی موڈی لڑکی کا ٹھیک سے کچھ نہ نہیں کبھی سے اکڑ جائے۔

پر اب ابراہیم کو ان کا بھی کتنا مشکل تھا۔ یوڈینا نے ذرا جھپٹکے ذرا ڈرتے ڈرتے یہ بات یاسل کے گوش گزار کی تھی۔ یاسل چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”مئی وہ میرے لیے کوئی انتہی تھوڑی ہے۔ اپنے سارے بچے چھپے تو اس نے مجھے شادا لے لیے ہیں۔ اب کیا ملاقات کرنی ہے۔“ تاہم ماں کے چہرے پر بکھرے ملتھیاہ سے تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے کہہ دیا تھا تو آجائے کسی دن۔ عہد یہاں سے کون سی دور ہے؟

اسے لندن کی وہ دوپہر یاد آئی تھی جب ایمان نے اپنے چیلے وائٹول کی نمائش کرتے ہوئے کہا تھا۔ تمہیں ذرا دلچسپی نہیں ہوگی میرے خاندان سے مگر یہ بڑا عجیب و غریب سا خاندان ہے۔ تضادات سے بھرا ہوا۔ تم سنو گی تو ہنسو گی اور واقعی ہنسنے والی باتیں ہی تمہیں۔ دائیں بائیں نظریات کا ملبوہ۔ اس کا باپ چپا کا کمیونسٹ پولیٹکس شہر پلاننگ میں پیدا ہوئے والا۔ 1910ء میں وہ فلسطین آیا۔ ڈیوڈ بن گوریان کا گرا ہیں، اس کا یاہر گرا اس کا نظریاتی دشمن۔ مکمل کھلا اسے اسرائیلی شادونزم کی بدروح کہتا تھا۔ بن کہہ ہاں نے

دیکھتی تھی۔ کتنی دیر بعد بولی۔

”میرے بتانے کے باوجود تم نے مجھے پرہیز
propose کیا۔“

ہاں دو باتیں تھیں۔ پہلی میرے باپ کی ڈائری میں
جن لوگوں کا ذکر بہت احترام اور محبت سے کیا گیا تھا ان میں
ایک نام یوسف خیا خاں کا ہے۔ منصف اور سنی دار۔ سچ حق
پر کھڑا ہونے والا۔ میرے باپ کا بروٹم کے سنی خاندان کے
ایک بااثر شخص سے جھگڑا ہو گیا۔ کیس بروٹم کو نسل میں سماعت
کے لیے پیش ہوا۔ مذاقہ مقابل کو ایک یہودی کے مقابلے پر
بہت سی ترجیحات حاصل تھیں۔ یہودی کا رشتہ وارہ بااثر
شخصیت، مسلمان۔ مگر کس دھڑلے سے فیصلہ کیا۔ نہ کسی کی
پرہیز کوئی خوف نہ لالچ۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد
ہمارے دیگر لوگ حالات میں مدد کے کھاتوں میں یوسف خیا کا
نام بھی شامل ہے۔ میں تمہاری فیملی سے ملے حیدر آیا تو یوسف
خیا کی فیملی سے تعزیت کرنے سب سے پہلے ان کے گھر گیا
تھا۔

دوسرے تمہاری ذات سے ایک واقعہ جڑ گیا اور وہ
ذہن کی دیواروں سے نہیں چھٹتا تھا۔ اسے باپ کی زندگی میں
بھی ہم کوئی بہت خوشحال لوگ نہیں تھے مگر اس کے قتل کے
بعد اس کے بڑے ذہن ہمیں سنبھالنے جان کر ہمارے سر بھی
جھل دینا چاہتے تھے۔ تنگدستی بھی اوپر سے پڑھائی کا
مقابلہ۔ ایک دن میری ماں نے صندوق سے ایک بہت پرانا
سونے کا زیور نکالا۔ یہ شاید بازو میں پہننے والا تھا۔ خاصا
وزنی۔ میری ماں سفاردی یہودیوں (اچین) سے ہجرت کر کے
آنے والے یہودیوں کو سفاردی کہتے ہیں) تھی اور وہ بڑی
منتر اور اتوگی سی چیز تھی۔ زبانوں پرانی اس کی کسی نالی وادی
سے کسی تھے کی صورت میں اسے دان ہوئی تھی۔

میں نے اسے دیکھا۔ میری پہلی پردہ رکھا ہوا تھا اور
میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی سنہری رنگت میں
قدامت کی ایک کھمبیر کا سا دکا اور حسن کا رچاؤ تھا۔ شوخی
اور چمچل پن نہیں تھا۔ خالص، برقی بھر ملاوٹ کے بغیر
شوس، وزنی اور بے حد قیمتی۔ میں نے اسے بچ دیا مگر وہ ہمیشہ
میرے ذہن سے چپکا رہا۔ اور جب میں نے پہلی بار جنہیں
دیکھا تھا میں نہیں جانتا وہ زیور کیوں میری آنکھوں کے سامنے
آیا اور اس کی تم سے کیوں ملاکت جڑی۔

منصور سے میری ملاقات جینن میں ہر روز رات کو ہوتی
کہ میرا قیام بھی وہیں تھا۔ منصور سے میں متاثر ہوا تھا۔ معلوم تو

جیسے بریک لگ جائے۔ شلوم ملیک مالک یون مائی ی ایک
مالک مالاکم۔ الفاظ کی سہاگرمار ہو رہی تھی۔ اسے کوئی یاد آیا
تھا۔ کرور سا ایک وجود جو جسے کی رات کو اسی طرح رہی ہوئی
بن یہود کا یہ گیت اسی محبت اور جذبے سے گا تھا جس طرح اس
وقت اس گھر میں گایا جا رہا تھا۔ اس کا سارا بچپن اسی گیت کے
گرد گھومنا تھا۔ اس کی نفسی اور شناخت ہمیشہ اسے اچھی لگتی
تھی۔ ان دنوں شبات کے بہت سے نئے گیت بھی گائے جا
رہے تھے مگر اس کی ماں کو یہی پسند تھا۔ آئین کہنا بھی اچھا لگتا
تھا۔ مگر اچھ رہا تو ماں زردی کے کتنی کھوا آئین نہیں کہو
گے تو رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے۔

اور جو مئی خدا تمہاری آمد و رفت کا محافظ ہو۔ اب سے
آنے والے وقتوں تک کی گھمراہ شروع ہوئی اس نے شلوم
کہتے اندر قدم رکھا اور دم پتیوں کی چلتی روشنی میں میز کے گرد
بیٹھا خاندان اسے دیکھتے ہوئے خوشی سے چپکا۔
پھر کھانے اور باتیں کرتے ہوئے اس نے اپنی مرحومہ
ماں کا تعارف کروایا۔

کھانے کے بعد کار میلا سیدانے ”برکت ہمازن“ کہا
اور چار شکر ادا کئے۔ خدا نے انہیں کھانا دیا، وہ سر زمین انہیں
دی جس کے وہ وارث تھے۔ تیسری بروٹم انہیں لوٹایا اور
چوتھے اسرائیل کو بھی فائدہ کرنے کی تاکید۔
ایلان اس چوتھی دعا پر زلزلہ ہٹا تھا۔ یہ تو ممکن ہی
نہیں مگر بولا کچھ نہیں۔

اگلے دن دو پہر کو دونوں پورج میں بیٹھے بائیں کرتے
تھے۔ رات جو وہ سنی سینٹر سے روز اٹھیں Rose
Elegance اور پینک بلازم Pink Blossom کے
ایکٹل گلدستے لے کر آیا تھا وہ دیواری گلدانوں میں سجے
خوبصورت لگ رہے تھے۔ چھوٹے سے لالان میں سامنے کے
ریخ تین گھنٹوں کے پتوں پر کچے پھل کی بہار آئی ہوئی
تھی۔ ابراہم نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
حیدر کے گھنٹوں جیسی مٹاس اور سنہری رنگت دنیا میں
کہیں نہیں۔

تھوڑی دیر بعد پائل نے پوچھا تھا۔ ابراہم تم ملنا چاہتے
تھے کوئی بات بھی کیا؟

”کچھ خاص نہیں۔ بس دل چاہتا تھا کہ تم سے ملوں اور
یقیناً کہیں یہ بھی خواہش تھی کہ کہوں بہت لالابی سا انسان ہوں
مگر محبت دینے میں فیاض ہوں۔“
پائل خاموش تھی۔ اپنے سامنے گہرے سرخ پھولوں کو

یہودی شادی کا بے حد اہم جز مقدس شامیانہ chupah کیا سادہ اور سفید ہوگا یا ستارہ واڈوی اور تورانی آیات سے سجا کر وہ ہمیشہ ایسی روایتی چیزوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اس کے بہت سے روپ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر ایک اور منظر اپنی پوری رنگینیوں سے ابھرا۔

مرد و خاتون کی دور درو پہ قطاروں کے درمیان سفید براق گاؤں اور چالی کے قباب کے اندر سے دیکھتے چہرے والی پائل نے اپنے والدین کے ساتھ دمپ پر چلتے ہوئے میرے بارے میں سوچا ہوگا۔

آہنی بڑھانے ابراہیم کو گلے لگاتے ہوئے کیا مجھے یاد کیا ہوگا۔ اس کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے کہیں میرے رخسار ان کے قصور میں ابھرے ہوں گے۔

پھر مجھے اسے خود پر غصہ آیا۔ وہ کس قدر جذباتی ہو رہا تھا۔ جو راستہ اس نے چنا تھا اس پر بھی ہونا تھا تو اب گلے کا فائدہ۔ اس نے غصہ کی گولیاں لیں۔ برکیسی مضطرب سی نیند تھی۔ بار بار آنکھ کھلتی اور بے چین کر جاتی۔

پھر ایک گہری جھوک سی آگئی۔ دو تین سگنے گزر گئے۔ آنکھ کھلی تو اندر مجھے یوں میں کھنکھاتا تھا۔ وہ اٹھا اور میری ٹخنوں کے پاس چلا گیا۔ کون سا راستہ تھا توجہ بنانے کا۔ صرف اور صرف خدمت کا۔

اس نے سوچوں پر پھر سے بٹھا دیئے تھے اور ہر وقت مریموں میں رہنے لگا۔ جب اسے پائل کا خط ملا۔ میں تو خود کو سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ جب یہ طے تھا کہ مجھے اب پیچھے ہٹ کر نہیں دینا اور جذبات کو گہری نیند سلا دینا ہے اور پھر میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں بہت مضبوط ہوں۔ میں نے اپنی محبت کو چھانڈ دیا ہے مگر یہ کسی احمقانہ سی سوچ تھی۔

شادی کے کنڈول میں بے غم طے بہت تکلف وہ تھے۔ ڈیڈی ابراہیم کے لیے کیتل kittel (دولہا کی سفید کپڑا اور سفید کوٹ) بہت قیمتی اور مہنگا لے کر آئے تھے۔ ان کے چہرے پر چاؤ اور محبت کے بہت سے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ میں مٹا کے کمرے میں بھی گئی۔ انہوں نے اسے لہراتے ہوئے داد چاہی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ ہمیں وہ کوٹ اور کھانا پہنچے تو تم کمرے ہو۔

کارمیلا دادی بھی کسی زمانہ شناس ہیں۔ آنکھوں کو پڑھنا جانتی ہے۔ شرشر باہر پکٹے جذبات پڑھ چکی تھی۔ میں جب باہر نکل میرے تعاقب میں آتے ہوئے سرگوشی کے سے

مجھے کوئی ماہ بعد ہوا کہ وہ خانوادے سے ہے۔ اب جب یہ شادی نہیں ہو رہی تھی تو پھر مجھے درخواست گزاری کہ حق تھا اور چلو تم نے اسے قبولیت دے دی۔

اور اس کے جانے کے بعد پائل کتنی دیر ساکت کھڑی رہی۔ کہیں سگن تھی، کہیں غلش تھی، کہیں ترپ تھی اور کہیں حیرت تھی۔ تاہم اس نے سر جھٹکا۔

”آپ کو زندگی میں سب کچھ نہیں ملتا۔“

☆.....☆

کارڈ اور خالیہ کا خط دولوں منصور کو اکٹھے ملے تھے۔ خالیہ نے لکھا تھا۔ شادی اگر جیسے میں ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔ یوٹلم جانا بہت تکلف وہ ہے مگر شرکت بھی لازمی ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ یوٹلم کس دل سے جائیں۔ ابھی دھم اتنے ہرے ہیں کہ ہر دو زمان سے خون رستا ہے۔ مگر بھی نہیں رہا۔ تمہارا پاپ کو کوشش میں تو ہے لیکن یہی بات ہے مجھے تو ایک کی صدمہ بھی اس کی واہبی کی امید نہیں۔ بڑھنا کا اصرار ہے اور پائل کا بھی۔ اس نے تو دم کی دی ہے کہ اگر آپ نہیں آئیں گی تو میں نے شادی ہی نہیں کرنی۔

اس کی مانی کا یہ تھوڑا سا جذباتی اور غیر جذباتی ساخت محض اس کی تسلی و تسکین کے لیے تھا۔ ورنہ کیا وہ اپنی ماں کے جذبات سے لاعلم تھا۔

خط اس نے کتابوں کے پیچھے کہیں پیچک دبا لیے پروانی کے سے انداز میں مگر تاریخ کا کیا کرتا وہ دولی پر قہقہہ ماری۔ سارا سارا دن وہ مریموں اور آنکھوں میں جھار پھتا اور جو بھی تھک کر بیستر پر گرتا تو بن کی آنکھیں پر قلم چل پڑتی۔

26 اکتوبر۔ کیا یہ دن میرا مقدس دن بن سکتا تھا۔

اندرون نے غی سے جواب دیا تھا۔

نہیں۔ جوڑے تو کٹیں اور پہننے ہیں۔ موزوں منزل اور موٹے کوس دن کارڈ ملے۔ منصور کا اضطراب اور بے چینی ان کی سمجھ میں آگئی۔ دولوں نے بیکس خاموشی اختیار کی اور کچھ نہیں کہا اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں شرکت نہیں کرنی۔ منصور کے پاس پھر تاخیر وری ہے۔

اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے یوٹلم کی تاریخی اور تہذیبی ورثے کی حامل مغربی دیوار کے پس منظر میں بلند و بالا سرو کے بیڑوں اور کھاس کے لاناں سے بھرا ڈیوٹن سنٹر کا اوپن ایر وڈیگ Open-air Wedding مرکز تھا۔

اس نے خود سے پوچھا تھا۔

انداز میں بولی تھیں۔

منصور کو نہیں سوچتا۔

بڑی مجرد سی ہنسی میرے ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی۔ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا مگر اپنے کمرے کی طرف بڑبڑاتے ہوئے میں نے خود سے پوچھا تھا۔ میں نے تو خود کی کٹی کردی تھی پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

مگر منصور وہ کچھ میرے لیے قیامت کا تھا جب میں پروٹلم میں ڈیوڈن سنٹر کے رسپ پرچی ڈیڑی کے ساتھ چلتی تھی اور میرے چہرے پر وہ آزدہ کی مسکراہٹ تھی جوئی کے بار بار کہنے پر میں ہونٹوں پر ہیکیری تھی۔ ہم رک گئے تھے۔ سامنے سے ابراہم آتا تھا۔ یہاں میرے والدین نے مجھے اس کے حوالے کرنا تھا۔ میں نے مجھے متوجہ کیا تھا سنو اور دھیان دو۔ فضا میں کسی آیت کو ترنم سے پڑھا جا رہا تھا۔ میں نے سنا۔

”اپنے لیے ستون کھڑے کر۔ اپنے لیے کچھ بنال۔ اس راستے پر چلتے ہوئے دل لگا۔ اس راہ سے جس سے تو کبھی بھی واپس آئے۔ اسرائیل کی دو فیزہ اپنے ان شہروں کی طرف واپس لوٹ۔ اسے برکشتہ بنی تو کب تک آوارہ پھرنے کی۔“

”کیا یہ سب میرے لیے ہے۔“

میرے باپ نے مجھے اپنے بازوؤں میں سیٹ کر

میرے سر پر طولی بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

ابراہم بہت اچھا لڑکا ہے اسے محبت دینا۔ میں کھڑی دیکھتی تھی۔ دونوں نے باری باری اسے لپٹایا اور پیار کیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں بہت بہادری سے مسکرائی۔

میں چلتی تھی پر کیا میں اس کے ساتھ چلتی تھی۔ میں وادی کی اس بات کو بھی بھول گئی تھی جو اس نے مجھے یاد کروائی تھی کہ جب ابراہم تمہارا آقا تھا تمہارے گاؤں اور تم اس کے ساتھ قدم اٹھاؤ گی تو خود کو پیچھے بھٹاتا اور ابراہم کو حضرت اسحاق کا پرچہ جانتا کہ جیسے وہ اپنی معیت کو کسی دور دراز علاقے سے لا رہے تھے۔ کہاں کی رسید اور کہاں کے حضرت اسحاق۔

میرے ساتھ میرا ہاتھ تھا جسے جو چلتا تھا وہ منصور تھا۔ پھر ہتھی کے سامنے سب مراحل طے ہوئے گئے۔ آیات مقدسہ کو ورد کرتے ہوئے انہوں نے سات نعمتوں کا ذکر کیا۔ خدا کی عطا کردہ یہ seven blessings جن کا سننا محفل میں موجود ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔ اور پھر جب قانونی عہد نامہ اونی آواز میں

پڑھا گیا یہودی کے کپڑوں دکھانے اور دیگر ضروریات کی کفالت کا۔ میں نے دیکھا تھا اور پہلی بار ایسا ہوا مجھے کسی آنی کہ وہ مسکراتے ہوئے میرے کانوں میں دھبے سے کہتا تھا۔ بس مجھے اپنے دل پر اور تم پر یقین ہے کہ ہم اچھی زندگی گزاریں گے، پھر جیتے ہوئے اس نے میرا دہانہ ہاتھ پکڑا۔ والہانہ پن اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکتا تھا۔ اس ہاتھ کی آنکھت شہادت میں انگوٹھی پہناتے ہوئے جذبات سے جو جمل چہرہ میری بصراتوں میں بھر پورا انداز میں آیا اور بلند آواز میں یہ الفاظ میری سماعتوں سے گزرائے۔ گواہ بنا۔

اور جب عزیزوں میں سے دو لوگ انگوٹھی کی گواہی دینے کے لیے آگے بڑھے اس نے جیتے ہوئے کہا تھا۔ یار رآئی کو اطمینان دلا دو اس شادی کی ہر رسم میں دولہا کا جوان ہر اخلاص شامل ہے وہ ہر چھوٹی موٹی کٹاہی کی کمی کو پورا کر دے گا۔

دولہانے اپنے دائیں پاؤں سے شیشے کا گلاس توڑا مگر مہمانوں کے شور شرابے میں مجھ سے سرگوشی کرنے سے باز نہ رہا۔ لگا۔ بھیجی میں کبھی نہیں کہوں گا اگر میں پروٹلم کو بھول جاؤں۔ مجھے پروٹلم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

علائقی طور پر اپنے سر پر ربی کی طرف سے تانے گئے سفید کپڑے کے نیچے میرے ساتھ جڑ کر کھڑا ہوا۔ شراب کے گلاس سے گھونٹ بھر کر میری طرف بڑھاتے ہوئے پھر جڑا اور بولا۔

میں اس وقت فضول سی ہنگامہ آرائی کے موڈ میں نہیں مگر نہ چاہتا ہوں کہ گھونٹ تو سب سے پہلے تم بھر تھیں۔

اور سیاہ سیٹ پہنے ہوئے ربی نے اونچی آواز میں ہمیں ہمارے حقوق بتائے اور مارا رک سلامت کے شور میں اس کے اور میرے عزیز رشتہ دار منٹے کے لیے بڑے مکر وہ میرا ہاتھ پکڑے مجھے کھینچا کھینچا وہاں لے آیا تھا جہاں جدو اور ضالیہ آگئی بیٹھی تھیں۔ سارے لوگ منہ اٹھائے حیرت زدہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے جڈو کو جھک کر تعظیمی سلام دیا اور بولا۔

”اس پنڈل میں میرے لیے سب سے معزز اور محترم آپ ہیں۔“ پھر ان کے رخساروں پر بوسے دیتے اور لپٹے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”دعا دیجئے کہ مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

منصور پہلی بار مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرا ہاتھ جس نے تھاما ہوا ہے وہ منصور نہیں ابراہم ایلان ہے۔





URDU TUBE چوننی قاتل

سید جاذب

جرم کو کتنا ہی چھپایا جائے وہ خود گواہی دے دیتا ہے اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ جرم چھپتا نہیں۔ اس نے بھی اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

ایسے جرائم جو مغرب میں عام ہیں

رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا۔ اچانک اطلاعی کھنٹی بجی میرا جسم یکا یک تن گیا۔

”اس وقت کون آسکتا ہے؟“ میں نے حیرت سے سوچا۔ مسٹر اور مسز رہسن تو ہو نہیں سکتے تھے جن کے ہاں میں بے پی پیٹ کر رہی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ پچھلے دروازے سے داخل ہوتے تھے۔ میں اچھل کر کھڑی ہوئی اور پی دی آؤں کرو یا نہ اس وقت جرائم پرینی ایک پرانی قلم دکھائی جارہی تھی اور یہ بے شک میری گھبراہٹ اور خوف میں اضافے کا

باعث بنی تھی۔

”کون ہے؟“ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”جولی، جولی کیا یہ تم ہو؟“ کسی لڑکے کی آواز سرج بگوش ہوئی۔ ”یہ میں ہوں، ڈیوڈ پیرسن..... پڑوسی..... کیا تم مجھے اندر آنے دو گی؟ پلیز.....!“

”ڈیوڈ؟“ میں جانتی تھی کہ وہ پڑوسی تھا لیکن اس سے پہلے وہ کبھی وہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے اور راسن

بیلی کے درمیان یہ پلے پاتھا تھا کہ میں ان کے ہاں بی بی سٹنگ کے دوران کسی بھی لڑکے کی پذیرائی نہیں کروں گی۔

میرے والدین کی بھی سخت تاکیہ تھی کہ میں ایسے میں کسی کو بھی گھر کے اندر داخل نہ ہونے دوں اور میں نے ان سے وعدہ

کیا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ میرے والدین مجھ پر اعتماد کرتے تھے لیکن یہ ڈیوڈ، یہ میرے اسکول کا سا کی تھا۔ ایک ایسا لڑکا جسے

میں چپکے چپکے چاہتی تھی۔ وہ وجہہ شکل کشیدہ قامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ لڑکیاں اس پر جان چڑھتی تھیں۔ وہ

ایک زبردست ایتھلیٹ تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں صرف اسی وجہ سے راسن بیلے کے ہاں بی بی سٹنگ کیا کرتی تھی کہ

وہ ان کا پڑوسی تھا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی تھی کہ کسی طرح میرا اور اس کا سامنا ہو جائے اور یوں میں ایک دوسرے کے

قریب آنے کا موقع مل جائے لیکن میری یہ آرزو آج تک پوری نہیں ہو سکی تھی اور اس وقت رات کے ایک بجے وہ خود

میرے پاس آ گیا تھا اور مجھ سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ میں اس خوش قسمتی پر ہنسا بھی بنا کر کرنی تم تھا۔ چاند

گویا آسمان سے خود میرے آنکھن میں اتر آیا تھا۔ ”جولی! اب دروازہ کھولو بھی پلیز، دروازہ کھولو!“

اس نے دوبارہ منت کی۔ ”لے..... لیکن..... لیکن ڈیوڈ.....!“ میں ایک عجیب

شش و پنج میں جلا ہوئی۔ میں دروازہ کھولنا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی قانون اور ضابطے کی پابندی بھی کرنا چاہتی تھی۔

”اوہ جولی..... کھولو بھی۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ دروازہ کھولو۔ میں تمہیں کاٹ نہیں کھاؤں گا۔“

میں نے بڑھ کر دروازے کی تاب گھمائی اور سختی کھول دی۔ وہ اندر آ گیا اور اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ بولا اور اپنے بالوں میں اٹھایاں پھیرنے لگا۔ گھر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر باہر

جھانکنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ میں دھڑکتے دل سے پوچھ بیٹھی

ممکن ہے یہ اس فلم کا ٹور جو میں دیکھ رہی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی دہشت ناک واقعہ پیش آیا ہو۔ تاہم

میں نے ٹی وی دوبارہ آن کر دیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے کے بعد وہ سانس لینے کے

لیے ہولے ہولے ہانپتا ہوا، طمانیت سے ایک گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے مڑا۔

”کیا بات ہے، اس جملے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ وہ ہنس بڑا اور بڑی بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے میری

زلفوں کو کھیر دیا۔ اس کی یہ حرکت بڑی عجیب تھی کیونکہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ ”بات کچھ بھی

نہیں ہے، احمق لڑکی۔“ اس نے ہستور مسکراتے ہوئے کہا اور ٹی وی پر ایک نگاہ ڈالی۔ ”اوہ کیا تم بھی ٹی وی دیکھ رہی

تھیں؟ میں بھی گھر پر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ وہ خراب ہو گیا۔“ وہ مزید بولا۔ ”جیسی میں بھاگتا ہوا، اس امید پر یہاں آیا

ہوں کہ تم ٹی وی دیکھ رہی ہو گی۔ میں اسے اختتام تک دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے ایک صوفے پر ڈھیر ہو

گیا۔ ”آؤ بیٹھو“ اس نے اپنا قریبی کدرا تھپتھپایا۔ ”یہ فلم دیکھ لیتے ہیں۔“

میری دھڑکنیں اب بھی بے ترتیب تھیں۔ میں اسی عالم میں جا کر اس کے پاس پہنچ گئی لیکن اس وقت تک وہ فلم

دیکھنے میں خود ہو چکا تھا۔ مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ یہی کہ وہ اپنے گھر پر فلم دیکھ رہا تھا اور یہ کہ اس کا ٹی وی

خراب ہو گیا تھا لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اس کے سوا اور کس بات پر یقین کرتی۔ فلم کا سحر اس کی مداخلت سے ٹوٹ چکا تھا

اور اب میں اس میں قطعی دوپہی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ میرے لیے صرف یہی بات تھی کہ ڈیوڈ میرے پہلو میں بیٹھا

تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنے ناخن چبانے لگا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد میں نے پچھلا دروازہ کھلنے

کی آواز سنی اور اگلے ہی لمحے مسٹر اور مسز راسن اندر آ گئے۔ میں نے گھبرا کر ڈیوڈ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ اس کی

موجودگی کا کیا جواز پیش کروں گی لیکن ڈیوڈ ان کی آمد سے بے خبر فلم دیکھنے میں محسوس تھا۔ جیسے ہی مسٹر اور مسز راسن کی نظر

ڈیوڈ پر پڑی، ان کے لبوں پر کھینچی ہوئی مسکراہٹ کا فور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور صفائی پیش کرنا چاہتی تھی کہ اسی لمحے ٹی وی پر کوئی اشتہار آ گیا۔ ڈیوڈ کی نگاہ ان دونوں پر پڑی

اور وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہیلو۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں نے میری آمد کا برا نہیں مانا ہوگا۔ میں دراصل اپنے گھر پر قلم و کلمہ ہا تھا کہ ہمارا ہی وہی خراب ہو گیا۔ میں یہ قلم پوری دیکھنا چاہتا تھا اس لیے یہاں آ گیا تاکہ جولی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکوں۔ اس میں جولی کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ تم لوگ برا نہیں مانو گے۔ ہم اسکول میں ساتھ پڑتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں ڈیوڈ۔“ مسٹر رابنسن نے غلوں سے کہا۔ مسٹر رابنسن نے بھی مسکرا کر تاحید میں سر ہلایا۔

”شکر ہے۔“ اس نے بڑھ کر دیکھ کر آف کر دیا۔
”لیکن قلم تو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔“ مسٹر رابنسن بولکھلا کر بول پڑیں۔ ”اگر تم رک رک کر پوری قلم دیکھنا چاہو تو ہمیں.....!“

”نہیں، نہیں کوئی بات نہیں۔“ شکر ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میں یہ قلم پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ جولی بھی دیکھنا دیکھ چکی ہوگی۔ تمہاری مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ، میں جولی کو اپنی کار میں گھر چھوڑاؤں گا، ٹھیک ہے؟“

وہ مجھے بازو سے تھام کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
”شب بخیر۔“

ہم دونوں باہر آ گئے۔ اچانک مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ اس نے مسٹر اور مسٹر رابنسن کے سامنے غلط بیانی کی تھی۔ اس نے انہیں بے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ پوری فلم میرے ساتھ دیکھنا رہا تھا۔ وہ اچانک مجھے ایک خوفناک آنکھیں لگنے لگا۔ ایک ایسی طاقت جو مجھے بے بس کیے دے رہی ہو۔ میں بے حد زبردستی ہوتی۔

”ڈیوڈ، ہم کار کے بجائے پیدل کیوں نہ چلیں؟“ میں نے خیال پیش کیا۔ میرا گلہ خنک ہو رہا تھا۔ ”تھک..... کتنی حسین رات ہے..... اور..... اور میں صرف پانچ بلاک ہی تو طے کر رہی ہوں۔“

وہ مجھے حیرت سے گھورنے لگا اور پھر اس نے ہنس کر میرے گرد اپنا ایک بازو دھال کر دیا۔ ”ہاں، کیوں نہیں، میری مرضی فاختہ۔“ وہ بولا۔

”اگر تم چاہتی ہو تو ہم پیدل ہی چلے چلے ہیں۔ ایک بات بتاؤں۔“ اس نے توقف کیا۔ ”تم ایک عرصہ سے میری نگاہوں میں بسی ہوئی ہو۔ کیا میرے لیے تمہارے جذبات بھی ایسے ہی ہیں جیسے میرے جذبات تمہارے لیے ہیں؟“

جولی تم بہت حسین اور خوش اندام ہو۔ میں تمہارے بارے میں بہت سوچتا رہا ہوں۔“ وہ رک رک کر کہہ رہا تھا اور اس کے لہجے میں جذبات کی بخش تھی۔ ”کیا تم بھی میرے بارے میں سوچتی رہی ہو؟ آج رات میرے اور ولما کے تعلقات منقطع ہو گئے ہیں۔“

میں چلے چلے ٹھیک کر اسے گھورنے لگی۔ ”تم اور ولما؟ تمہارے تعلقات منقطع ہو گئے؟“

وہ بھی رک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑے پیار سے میرے چہرے پر ہنجرے ہوئے بالوں کو پیچھے کر دیا۔

”ہاں، ہمارے تعلقات ختم ہو گئے۔“ وہ متانت سے بولا۔ ”برسہا رابنسن کے تعلقات کے بعد کیا تم اس کا قصور کر سکتی ہو؟ کیا تم جانتی ہو ہم کتنے عرصے سے ایک دوسرے کو چاہتے آ رہے تھے؟ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ پسند نہیں کروں گا کہ یہ بات دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ہم پچھلے دو سال سے ایک دوسرے کی محبت میں جھلا تھے اور مجھے یقین تھا کہ ہم دونوں.....!“ اس کی آواز دم توڑ گئی اور آنکھوں سے گہرا کر پھٹکنے لگا۔

میرا خوف جذبہ ترحم میں ڈھل گیا۔ ایک چابی کے بعد ہم دوبارہ چلے گئے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے اور ولما کے درمیان ناچاقی کیوں ہوئی لیکن پوچھ نہ سکی۔ ہم خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”میرے اور ولما کے تعلقات منقطع ہونے کا سبب یہ ہے کہ.....“ وہ خود ہی بول پڑا۔ ”وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوئی ہے۔ وہ شہرے بالوں کا مالک اور کشیدہ قامت ہے۔ شہر کے کسی اسٹور میں ملازم ہے۔ سب سے تکلیف دہ امر یہ ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔

”پچھلے دو ماہ سے میرے اور ولما کے درمیان سخت بحث ہوئی رہی تھی لیکن میری کوئی دلیل اسے راہ راست پر نہ لاسکی۔ وہ بس اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نام ایڈ ہے۔ مجھے تو اس نے بھی بتایا تھا۔ آج رات کہنے لگی کہ مجھ سے آگیا

گئی ہے اور ایڈ کے ہمراہ یہاں سے کہیں جا رہی ہے اور بس..... ہماری محبت اس انجام تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی۔ دو دن میں اس کی چاہ کا موسم گزر گیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

ہم چلتے رہے اور ایک بلاک طے کر لیا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ پھر اس نے ایک طویل سانس خارج کی۔ ”اب مڑ کر بائیں کی طرف دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کل

سہ پہر میرے ہمراہ اسکیٹنگ کرنے کے بارے میں کیا کہتی ہو؟

میرادل گویا اچھل کر حلق میں آ رہا۔ ڈیوڈ میرے ہمراہ اسکیٹنگ کے لیے جانا چاہتا تھا۔ اگر میں اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکوں تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے فریڈا سرت سے سوچا۔

”ڈیوڈ میں..... میں..... مجھے بے حد خوشی ہوگی۔“ میں نے خود کو کہتے سنا۔ میری آواز جوشِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔

اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ دبا یا۔ ”ٹھیک ہے، پھر میں تمہیں دو بجے لوں گا۔“ وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے؟“

”بالکل!“ میں بھی مسکرائی۔ وہ مجھے میرے کمر کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ ”شب بخیر، تمھی فاختہ۔“ وہ ایک لمحہ ہچکچانے کے بعد بولا۔ ”کل دو بجے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ مڑا اور روانہ ہو گیا۔

میں کسی ساز سے ٹپکی ہوئی لے کی مانند لہرائی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی۔ میرے ذہن سے ہر شے..... ہر خوف..... اس کی وہ غلط بیانی..... سب کچھ یوں دھل گئی جیسے روشنی سے تاریکی دھل جاتی ہے۔ میری آنکھوں میں تو س قزح کے سارے ہی رنگ اتر آئے تھے اور دل کی دھڑکنیں منگنا رہی تھیں۔ ذہن پر ایک نشہ سا چھا رہا تھا۔ جی چاہا کہ سارے گھر میں ناچنے لگوں۔

☆.....☆

اگلی سہ پہر ہم اسکیٹنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں جانتی تھی وہ ایک زبردست اسکیتس تھا۔ میں نے اکثر اسے ولما کے ہمراہ اسکیٹنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور سوچ رہی تھی کہ ممکن ہے آج ولما سے وہاں ملاقات ہو جائے لیکن پھر اچانک یاد آ گیا کہ ان کے درمیان ایک بہت وسیع خلیجِ حامل ہوئی ہے اور وہی اس شہر کو خیر یا بد کہنے کا منہ بھرتا رہی ہے لیکن یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگ رہی تھی بلکہ بہت ہی عجیب۔ میں ولما کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ایک بہت ہی سچی ہوئی باشعور لڑکی تھی۔ اس سے ایسے پاگل پن کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرے رگ و پے میں نہ جانے کیوں ایک سنسنی سی دوڑ لگی لیکن جو میری نظر ڈیوڈ کے پُرکشش چہرے پر پڑی، میرے سارے محسوسات بھاپ بن گئے۔ میں ممکن ہے میں اس کی کبھی ہوئی باتوں کو ضرورت سے زیادہ کرید رہی

تھی۔ میں نے سارے خیالات جھٹک دیئے اور اس کے ساتھ اسکیٹنگ سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ شام کے تقریباً پانچ بجے ہم وہاں سے روانہ ہونے لگے۔ ایسے میں ڈیوڈ مجھے ڈونکی پٹیکس کربینا۔

”اچھا تو میں گھر فون کر دوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے والدین کو اس سے مطلع کرنا پڑے گا۔“ اس کی آنکھوں سے نکلی جھانکنے کی لیکن اگلے ہی لمحے وہ نارمل نظر آنے لگا۔ فون کرنے کے بعد ہم کار کی جانب بڑھ گئے۔

”تم واقعی بہت پیاری لڑکی ہو۔“ وہ کار اشارت کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ ہم کل رات مل بیٹھے تھے۔“

میرادل خوشی سے جمجوم اٹھا لیکن پھر اچانک مجھے یاد آ گیا کہ ہماری ملاقات کس عجیب انداز سے ہوئی تھی اور اس نے اپنی غلط بیانی سے ایک قلعہ ٹاڑ دینے کی کوشش کی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

”اوہ خدایا، مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے اگلے ہی لمحے خود کو سرزنش کی۔ میں یال کی کمال اتارنے پر کیوں غبی ہوئی ہوں۔ کیا اب میں اس کی کبھی ہوئی ایک بات کی وضاحت طلب کروں؟ لیکن میں اس خوف کو کیا نام دیتی جو نہ جانتے کیوں میرے دل میں سا گیا تھا۔

ہم ایک مختصر سے میٹکین ریسٹوران میں پہنچ گئے اور شمع کی روشنی میں کھانا کھانا۔ اس دوران میں گا رہے گا ہے اس برنظر ڈالتی رہی اور جب کبھی نظر ڈالتی، مجھے اسے خون کی گردن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کتنا حسین و جمیل تھا وہ۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم واقعی ایک دوسرے کی رفاقت میں یہ گھڑیاں گزار رہے تھے۔ کہاں تو یہ کہ میں ایک عرصے سے دور رہی دور سے اس کی پرستش کرتی آ رہی تھی اور کہاں یہ کہ آج سارے فاصلے مٹ گئے تھے۔ میں اس کے ساتھ تھی۔ اس کے پاس تھی۔ ایک بار اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”جولی، میں تمہیں چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے باقاعدگی سے ملتی رہو گی؟“ اس نے پوچھا۔

میرادل اتنی تیزی سے دھڑکا کہ محسوس ہوا میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ وہ مجھ سے ملتے رہنے کی درخواست کر رہا تھا۔

”ہاں۔“ میں جلدی سے بول پڑی۔

رہستوران سے نکلنے کے بعد اس نے میرے لیے کار کا دروازہ کھولا اور ہم روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے گھر نہیں لے جا رہا تھا بلکہ مضامقات کا رخ کر رہا تھا۔ اچانک ایک بار پھر خوف نے میرا سینہ جکڑ لیا۔ اپنی پُر جوش کیفیت کے باوجود، میں خوف محسوس کر کے لڑنے لگی۔

”ڈیوڈ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ مجھے گھر جا کر ہوم ورک کرنا ہے۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا جیکر ملے بی بی سیٹنگ کے دوران ہی سارا ہوم ورک کر چکی تھی۔ ”اس کے علاوہ مجھے اپنے کپڑوں پر استری کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ہمیشہ اتوار کی شب استری کیا کرتی ہوں کیونکہ پھر ایک ہفتے تک چھٹی نہیں ملتی۔ لہذا اگر تم برا نہ مانو تو.....“

اس نے کار روک لی اور میری جانب گردن گھما کر خالی خالی نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے عجیب تھے کہ میں اندر سے کانپ گئی۔ وہ میری کیفیت پر مبالغہ کر رہی تھی اور نرمی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کچھ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ”جولی، کیا بات ہے؟ کہیں تم مجھ سے ڈر تو نہیں رہیں؟ ولما مجھ سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ پچھلے دو ماہ سے مجھ سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن خوف سے ایسا کر نہیں پاری تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ سے خوفزدہ کیوں ہو؟“

اس کا لہجہ اور اس کے تاثرات اچانک اتنے غیر مانوس لگنے لگے کہ مجھے یوں محسوس ہوا میرا دل دہشت سے چمٹ جانے لگا۔

”نہیں، میں تم سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔“ میں نے ایک بار پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ میری آواز خود مجھ سے حد دہشت زدہ محسوس ہوئی لیکن میرے خیال میں اس نے خود خود نہیں کیا۔

وہ مسکرایا اور پھر گویا ہوا۔ ”ٹھیک ہے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔

تین بلاک طے کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر پھنسی پھنسی سی آواز میں احتجاج کیا۔ ”ڈیوڈ میں معذرت چاہتی ہوں۔ مجھے اب ہر صورت گھر پہنچنا ہے۔“

”بہتر ہے۔“ اس نے مجھ پر ایک اپٹٹی ہوئی نگاہ ڈالی اور اگلے موڑ سے سڑک میرے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے سکون کی ایک گہری سانس لی اور پھر سوچنے لگی، میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ مجھے اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ اس نے کار روک دی اور جب میں کار سے اترنے لگی تو اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”جولی سنو میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ وعدہ کرو کہ کرو گی۔“

فرط خوف سے یا فرط جاذبات سے فیصلہ نہ کر سکی۔ ”میں تم سے وعدہ لینا چاہتا ہوں۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”کیا تم مجھ سے وعدہ نہیں کر سکتیں؟“

”معاذ کی کو محبت جانے بغیر میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔“ میں نے جی کڑا کر کہا۔ ”ہاں اگر میں کچھ کر سکتی تو ضرور کروں گی یہ میرا وعدہ ہے۔“

اس نے میرا ہاتھ تیزی سے جھٹک دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”اگر میں اپنی محبوبہ پر بھروسہ نہیں کر سکتا تو اس بات کو بھول جاؤ۔“ اس نے غصے سے منہ پھلا کر کار کا انجن اشارت کر دیا۔

میں اترنے لگی لیکن پھر گردن موڑ کر مخاطب ہوئی۔ ”ڈیوڈ کم از کم یہ تو بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟“

”اجمالاً“ وہ مجھے گھورنے لگا۔ ”تو بتا تا ہوں۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”میں پچھلی رات رہسٹن کے ہاں سوا گیارہ بجے گیا تھا لیکن تم کسی کے پوچھنے پر کہو لی کہ میں.....؟“

”سوا گیارہ بجے؟ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا تھا۔ سوا گیارہ بجے تو ظلم شروع ہوئی تھی اور وہ تقریباً ایک بجے وہاں آیا تھا۔ میرا جہنم نکلا۔ میں نے اس سے کہا چاہا کہ وہ مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ نہ بولے۔“

”تم کہو کی کہ.....“ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”میں وہاں ساڑھے دس بجے پہنچا تھا، یو لو کیا کہو گی؟ لوگوں سے یہ کہو گی؟“

”لوگوں سے کہوں گی؟ کن لوگوں سے کہوں گی؟ آخر باجرا کیا ہے؟“ میں نے سخت الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”تم مجھے پوری بات کہیں نہیں بتاتے؟“

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا چلا گیا پھر نگاہیں چرا لیں۔ ”اوہ خدا کے لیے۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہیں پہلے ہی ساری بات بتا چکا ہوں۔ میرے اور ولما کے تعلقات ختم ہو گئے ہیں۔ ہمارے درمیان زبردست جھگڑا ہوا تھا اور اب میں صرف خود کو اور ولما کو تحفظ دینا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے سچ تو یہ ہے کہ میں ولما کی وجہ سے تمہیں ساری بات نہیں بتا سکا۔ یہ ایک راز ہے۔ میرا نہیں ولما کا راز۔“ اس نے

ہے اگر انہوں نے اس پر یہ الزام لگایا ہے کہ ان کی کوئی شے غائب ہے یا.....

”اوہ! ہمیں ڈیڑی۔“ میں نے خیف لہجے میں کہا۔ میرے جسم سے جیسے جان گل نکلی تھی۔ ”مجھے یقین ہے مشر رہنن ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔“

”پلیز آپ اپنی بیٹی کو جواب دینے کا موقع دیں۔“ آفسر نے مداخلت کی۔ ”جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں، آپ کی بیٹی نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ہم صرف چند سوالات کا جواب چاہتے ہیں۔ ہاں تو جولی جب مشر رہنن کے ہاں تھیں کیا اس دوران ڈیوڈ جیٹرسن وہاں آیا تھا؟“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارا خون میرے دماغ میں سمٹ آیا ہو۔ ”ہاں ہاں آیا تھا۔“ میں بول پڑی۔ ”اوہ! خدایا!۔“ میں نے گراہ کر سوچا۔ ”میں جھوٹ بولوں کہ جی بولوں؟ میرے خدا میں کیا کروں؟“

”اچھا تو جولی۔“ پولیس آفسر دوبارہ گویا ہوا۔ ”اگلا سوال بے حد اہم ہے۔ ذہن پر خوب زور دے کر اور اچھی طرح سمجھ کر جواب دو۔ وہ وہاں کس وقت پہنچا تھا؟“

میں جانتی تھی کہ وہ یہی سوال کرے گا اور اب مجھے احساس ہوا کہ تھا کہ جی بولنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

”تقریباً ایک بجے۔“ میں نے جواب دیا اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے جی بول کر نہ صرف اپنا بلکہ ڈیوڈ کا گلا بھی کاٹ دیا ہے کیونکہ وہ میرا محبوب تھا اور میں اس کی محبوبہ تھی اگر اس پر کوئی آج اتنی تو میں زعمہ درگور ہو جاتی۔

”مجھے یقین ہے۔“ میں اگلے ہی لمحہ بول پڑی۔ ”کیونکہ اسی وقت میں نے اٹھ کر بچوں کو دیکھا تھا کہ وہ آرام سے سو رہے ہیں یا نہیں اور ڈرائنگ روم میں لوٹی تو میری نظر گھڑی پر پڑ گئی تھی۔ اس وقت پونے ایک بج رہا تھا اور یہی سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ اب مشر رہنن آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی ڈیوڈ وہاں وارد ہوا تھا۔“

پولیس آفسر نے میرا بیان اپنی ڈائری میں نوٹ کیا اور پھر اسے بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ، جولی۔ تم بے حد مددگار ثابت ہوئیں۔“

”کیا آپ لوگ یہ بتائیں گے کہ یہ سب کس سلسلے میں ہے؟“ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

سراخ رساں مسکرایا۔ ”اوہ! کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولا۔

ایک لمحہ توقف کیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ”لیکن جولی اگر میں تمہیں یقین دلاؤں انتہائی سنجیدگی اور یقین دہانی سے یہ یقین دلاؤں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے تو کیا تم مجھے تحفظ دو گی؟ بولو جولی..... پلیز..... تحفظ دو گی؟“

میں نے سوچا، اب وہ جی کہہ رہا ہے اور اسے اہم معاملے میں مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ ”میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس پر غور کرنا پڑے گا اور اب میں جاری ہوں۔“

میں جلدی سے کار سے اتر گئی اور تقریباً بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی۔

☆.....☆
اس کے ایک گھنٹے کے بعد میں کپڑوں پر استری کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں، میں نے دو آدمیوں کو صدر دروازے پر ڈیڑی سے یہ کہتے سنا کہ وہ پولیس آفسرز ہیں۔ میرا جسم ایک تھک گیا۔ پھر ڈیڑی نے مجھے ڈرائنگ روم میں آنے کی ہدایت کی۔ ان کے چہرے سے الجھن برسرِ رہی تھی۔

”جولی۔“ وہ بولے۔ ”پولیس آفسر کہہ رہے ہیں کہ انہیں تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اپنی ماں سے کہو کہ وہ اس موقع پر تمہارے پاس رہیں۔“

میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ سوری تھیں۔ ”اوہ! نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ایک سراخ رساں بول پڑا۔ ”تمہاری بیٹی نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ہم اس سے صرف کچھ رات کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ اس کے ساتھ کون تھا؟“ وہ مسکرایا لیکن اس کی یہ مسکراہٹ خالص پیشہ ورانہ تھی۔ ”اچھا لڑکی ہمارے ایک دوسروں کا برادر تو نہیں بنائی؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“ میں نے کاہنچے ہوئے جواب دیا اور مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا۔ میں جلدی سے مونس پر پہنچ گئی۔ ”اوہ خدایا! میں ڈیوڈ کے لیے جھوٹ بولوں یا جی بولوں؟ کیا کروں؟ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا تھا اور آنکھوں کے سامنے وحدی چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے جولی۔“ وہی آفسر کو پایا ہوا۔ ”کچھ رات تم مشر رہنن کے ہاں نہیں کیا یہ جی ہے؟“

”ہاں جناب۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن یہ پہلا موقع نہیں تھا۔“ ڈیڑی نے مداخلت کی۔ ”یہ پچھلے کئی ماہ سے ان کے ہاں بے بی شک کر رہی

کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ کیا مجھے اس کے لیے جھوٹ بولنا چاہیے تھا؟ میں نہیں جانتی، میں اس قدر پریشان اور بیزار ہو گئی کہ جی چاہا خود کشی کر لوں۔

اسی روز سہ پہر کے چار بجے پولیس دوبارہ میرے پاس آئی اور مجھے اپنے ہمراہ پولیس اسٹیشن لے گئی۔ جی بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم نے ڈیڑی کے دفتر فون کر کے انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”ڈیوڈ کا اصرار ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ ایک پولیس آفیسر نے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ تم ولما سے حسد کرتی تھیں اور یہ کہ تم جانتی ہو کہ ولما یہ شہر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور یہ کہ تم ہفتے کی رات کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے کر صرف اسے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتی ہو، لہذا ہم چاہتے ہیں کہ تم اس کا سامنا کرو اور کہیں کیا ہوتا ہے۔“

”اچھا، تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وقت کا فرق کیا مسمیٰ رکھتا ہے؟ اس نے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ساڑھے دس بجے

”ولما کے والدین مسٹر اور مسز گرینفیلڈ نے یہ رپورٹ درج کرائی ہے کہ ان کی بیٹی پچھلی رات ڈیوڈ کے ساتھ گلی میں آ کر اب تک نہیں لوٹی۔ ہم نے نصف گھنٹا قبل ڈیوڈ سے استفسار کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ پچھلی رات اس کے اور ولما کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ تقریباً دس بجے اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد سے اس نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اسے ادھر ادھر تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر تھک ہار کر گھر لوٹ گیا۔ پھر تقریباً ساڑھے دس بجے راہنوں کے ہاں..... تمہارے پاس چلا گیا لیکن تمہارا یہ بیان اس کے بیان سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہمیں واپس جا کر اس کے بیان کو دوبارہ چیک کرنا پڑے گا۔“

☆.....☆

اگلے دن سارے اسکول میں یہ چرچا تھا کہ ولما اب تک لاپتہ ہے اور ڈیوڈ زیر حراست ہے۔ مسز ادب نے کہ ہر تصویر دیکھ کے بعد ایک نئی افواہ سننے میں آئی۔ پولیس نے ولما کی لاش برآمد کر لی ہے۔ ولما کی لاش اب تک نہیں ملی ہے لیکن جلد ہی مل جائے گی۔ ڈیوڈ نے اس کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ ڈیوڈ نے اعتراف نہیں کیا ہے لیکن پولیس بہت جلد اعتراف کرا لے گی۔ دس مختلف لوگ ڈیوڈ کو ایک ہی وقت میں دس مختلف جگہوں پر دیکھنے کا دعویٰ کر رہے تھے اور ان تمام قصوں میں، میں ایک اہم کردار کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ڈیوڈ نے مجھے موقع واردات سے عدم موجودگی کے لیے استعمل کیا تھا۔

”جولی مجھے سچ بتاؤ۔“ میری کنبلی اٹھانے کہا۔ ”ہفتے کی رات ڈیوڈ کس وقت تمہارے پاس گیا تھا؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ایک محلے سے پہلے ہی وہاں نہیں پہنچ گیا تھا؟ کیا تم خود کو محفوظ دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی؟“

وہ مجھ سے ایسے ایسے سوالات کرنے لگی کہ میں گھبرا کر ایک ہی بجے اسکول سے بھاگ آئی۔ تازہ ترین افواہ یہ سننے میں آئی کہ اس حقیقت کے باوجود کہ ڈیوڈ اور ولما طالب و مطلوب تھے، میں اور ڈیوڈ چوری بچے ایک دوسرے سے ملے رہے تھے اور ولما کو اس بات کا علم ہو گیا تھا، چھٹی اس نے ڈیوڈ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا اور اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پولیس سے غلط بیانی کی ہے۔ میں اس قدر پریشان ہو گئی کہ گھر پہنچتے ہی بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈیوڈ نے انتہائی دیانت داری سے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس نے

رئیل اسٹیٹ اینڈوائزر
DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI
 پلاٹ، مکان، دکان، بنگلوں اور فلیٹ
 کی خرید و فروخت کے لیے مستند نام
ریاض حسین
 ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
 فون نمبر: 0300-3658964

کہ میں ڈیوڈ کی درخواست کے باوجود اس کے ساتھ تھوڑا سا تعاون بھی نہیں کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈیوڈ کی کمرے میں آئے۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے۔ ”جولی! تم میں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ مخاطب ہوئے۔ ”تم اتوار سے اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ نہ کچھ کھا رہی ہو، نہ لی رہی ہو۔ صرف روئے جا رہی ہو۔ میری ایک بات اچھی طرح سن لو۔ میں تمہارے منہ سے سچ اور صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ کیا تم نے پولیس سے غلط بیانی کی ہے؟“

میں سر سے ہر ایک گائب کر رہی اور دوسرے ہی لمحے اچھل کر ڈیوڈ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”نہیں۔“ میں سچ پڑی۔ ”لیکن مجھے غلط بیانی کرنی چاہیے تھی۔ ڈیوڈ بے گناہ ہے۔ اس نے مجھ سے غلط بیانی کرنے کی درخواست کی تھی اور مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور خود اپنے ہی پیروں پر کھڑی ماری۔ اسے ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ مجھے غلط بیانی سے کام لینا چاہیے تھا۔“ میں دوبارہ بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈیوڈ نے بڑھ کر نرمی سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”نہیں، میری جان! تجھیں ہرگز غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔“ وہ بولے۔ ”کچھ بھی ہو مجھے خبر ہے کہ تم نے درغلزائے جانے کے باوجود سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور یقین کرو کہ ایک روز تم بھی اس پر فخر کرو گی۔“ انہوں نے جھک کر میرے ماتھے کو چومنا اور پلے تلے۔

”ہاں کیوں نہیں؟“ میں نے جمل کر سوچا۔ ”فخر کروں گی۔ انہیں کیا پتا کہ میں اسے کس قدر چاہتی ہوں۔ جیسے وہ خود سیدھے سادے تھے ویسے ہی انہوں نے میری پرورش کی تھی۔ کاش میں اتنی سادہ لوح نہ ہوتی لیکن اب میں بالکل بھولی بھالی بن کر زندگی نہیں گزاروں گی۔ میں ڈیوڈ کے ساتھ باہر جاؤں گی۔ خوب سیر پائے کروں گی۔ محبت کروں گی اور محبت کراؤں گی لیکن صرف ایک کام نہیں کروں گی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے سچ بولنے کی تربیت دی گئی ہے لہذا ابیش سچ ہی بولوں گی۔

☆.....☆

ڈیوڈ کو رہا کر دیا گیا، درودہ پھر سے اسکول آنے لگا۔ پہلی بار جب اسکول کے کوریڈور میں ہمارا آمتنا سامنا ہوا اور آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے بے حد تاسف سے سر ہلایا۔ اس کے بعد جب میں ہسٹری کی کلاس میں پہنچی تو وہ بھی پہنچا

وہاں نمودار ہوا تھا یا ایک بجے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ وہاں پہنچا تھا۔“ میں نے کہا۔

پولیس آفیسر مسکرایا۔ ”یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”مسٹر رہسن نے اس کی تصدیق کی ہے لیکن عزیزہ بات دراصل یہ ہے کہ پختے کی رات گیارہ بجے کے تھوڑی ہی دیر بعد ولما آخری بار ہائی وے کے ایک ڈرائیونگ میں دھکی گئی تھی۔ وہاں موجود پولیس نے اسے وہاں کے ریٹ روم میں اور پھر ایک کار میں سوار ہو کر روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکی کہ ڈرائیونگ سیٹ پر کون تھا تاہم ان کا خیال ہے کہ وہ ڈیوڈ ہوگا کیونکہ ان کا رومائس چل رہا تھا۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور دوبارہ گویا ہوا۔ ”لیکن کسی سنگین معاملے میں ہم قیاسات سے کام نہیں لے سکتے۔ ڈیوڈ حلفیہ کہتا ہے کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے مسٹر رہسن کے گھر میں تمہارے پاس تھا اور یہ کہ دلما بلیا کی اس اور کے ساتھ ہوئی خصوصاً ایڈ کے ساتھ..... ایک شادی شدہ مرد جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن ہم اب تک ایسے کسی شخص کا پتا نہیں چلا سکتے ہیں اور تمہارا بیان ڈیوڈ کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا۔“

میں خاموش ہو گئی کیونکہ میں اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ چند تھاپے کے بعد ڈیوڈ کمرے میں لایا گیا۔ اس کی آنکھوں سے مایوسی بھک رہی تھی۔

”جولی!“ وہ مجھے دیکھتے ہی سچ پڑا۔ ”تم سچ کیوں نہیں بتا دیتیں؟ کیا تم اپنی موت پر شرمندہ ہو؟ کیا ہم ایک دوسرے سے ملنے نہیں رہے تھے؟ تم جانتی ہو کہ میں ولما سے قطعاً متعلق کرنا چاہتا تھا۔ اس سے میرے ملنے کی صرف ایک وجہ تھی۔ یہ کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایڑی جیسے شادی شدہ مرد سے ملے۔ تم سچ کیوں نہیں کہیں؟“

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن جب پولیس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنا بیان بدلنا چاہتی ہوں، تو میں صرف نفی میں اپنا سر ہلا کر رہ گئی۔ بالآخر ڈیوڈ وہاں سے لے جایا گیا اور مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

☆.....☆

اس روز شام کے اخبارات کے مطابق ولما کا ایک بک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ پولیس نا کام رہی مگر لیکن معاملے کی گہری کثمت کے بعد وہ اس امر کی قائل ہو گئی کہ ولما شہر سے فرار ہو گئی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر میں بھاگ کر اپنے کمرے میں جا گئی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ مجھے علم تھا تو اس بات کا

گھڑی کے مطابق؟“

”اوہ ڈیوڈ!“ مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ میں ایک مینے سے اپنی اس غلطی پر خود کو برا بر لختِ ملامت کرتی آرہی تھی اور اب جب کہ وہ میری بچھلی حمایتوں کو نظر انداز کر کے میرے پاس آگیا تھا تو پتی چاہ رہا تھا کہ اسے دل میں بیٹا لوں۔

”اوہ جولی۔“ اس نے میری نقل اتاری۔

اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی لیکن وہ نئے میں بالکل نہیں تھا۔ ہر پہلو سے ہوش و حواس میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھنے کے بعد ہی دی کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں یہ پردہ گرام دیکھ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے جواب دیا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اگلے پانچ منٹ تک ہمارے درمیان صرف دو چار لفظوں کا تبادلہ ہوا اور پھر مسرور اور مسرور اس نے گھر آگئے۔ ڈیوڈ پر نگاہ پڑتے ہی ان کے ماتھے پر ہل پڑ گئے لیکن انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ڈیوڈ نے ایک بار پھر مجھے کمرہ چھوڑ آنے کی پیشکش کی اور جب ہم باہر آگئے تو میں نے پیدل چلنے کا خیال ظاہر کیا۔

”تم اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں جولی ہے نا؟“ اس نے کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”اوہ ڈیوڈ! اتنا قنبدہا نہیں مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”رات بہت حسین ہے اور میرا گھر بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم نے پی آرنگی ہے۔ پیدل چلنا ہی بہتر ہوگا۔“ ”صرف تین پیگ۔“ وہ غرایا۔ ”پیگز کے تین پیگ..... آؤ میری کار میں گھڑی ہے۔“

مجھے وہاں اس کی کار گھڑی دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں بے چوں و چرا کار میں سوار ہو گئی۔

”ایک بات بتاؤں۔“ وہ اسٹیرنگ سنبھالتا ہوا بولا۔ ”تم مجھے بے حد یاد آتی رہیں۔ پچھلا مہینا جس کرب میں گزارا وہ بیان سے باہر ہے۔ جب بھی تم یاد آتیں اور اس روز کی اسکیٹنگ کا خیال آتا میں اپنا دل مسوس کر رہ جاتا۔ تم بھی اس روز بہت لطف اندوز ہوئی تھیں ہے نا؟“

”ہاں بے حد۔“ میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ غالباً اس نے مجھے معاف کر دیا تھا اور اب ہم پھر ایک ہو گئے تھے۔ ”لل۔ لیکن میکی کا کیا بنا؟“ میں نے ہٹکا کر پوچھا۔ ”کیا

اور اس سب سے مجھے گھورتے ہوئے مخاطب ہوا۔“ تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے تمہیں یقین دلایا تھا اس کے باوجود تم نے ایک دوست کی حیثیت سے میرا ساتھ نہیں دیا۔ خیر کوئی بات نہیں جیو اور یکسو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

اس نے ایک گہری سانس لی اور چلا گیا۔ اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد میں نے اسے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے بے اعتبار رہی چاہا کہ بڑھ کر معافی مانگ لوں لیکن جونہی قدم بڑھایا اسے ایک لڑکی میکی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا پھر اس نے میکی کا ہاتھ پیار سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں کار کی جانب بڑھ گئے۔ اسے دوسری محبوبہ مل گئی تھی۔ ایک ایسی محبوبہ جو چچ اس پر اعتبار کر سکتی تھی جب کہ میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“ میں نے سوچا۔ ”اس کی خاطر مجھ کو کیوں نہیں بولا۔“ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں سر جھکا کر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس روز کے بعد ڈیوڈ اور میکی ہر وقت ساتھ نظر آنے لگے۔ انہیں ساتھ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی میرے دل میں چاقو چلا رہا ہو۔ دل اب تک بے چاشنی لیکن اب کوئی اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ ڈیوڈ اب پہلے کی طرح ہشاش بشاش نظر آنے لگا تھا۔ اس کے تہمتے لوٹ آئے تھے۔ وہ میکی کا ہاتھ تھامے اسکول کے کورڈور میں ہمارا کمرہ تھا۔ میں جب بھی انہیں اس طرح ہتے بولتے اور آپس میں چہلیں کرتے دیکھتی تو جی چاہتا کہ خود کٹی کر لوں۔ اگر میں نے وہ حماقت نہ کی ہوتی تو آج میکی کی جگہ میں ہوتی۔

اور پھر ایک رات..... جب میں مسرور اس کے ہاں بے بی بیٹنگ کر رہی تھی کہ چائیک کال بیل بجی۔ ساتھ ہی آواز آئی۔ ”جولی ہے میں ہوں۔“ یہ ڈیوڈ کی آواز تھی۔

میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکا اور پھر گویا ہوا۔ ”جیو اگر میں اعدا آ جاؤں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟“ چہا بہتر ہے کہ پہلے ہی اپنی گھڑی میں وقت دیکھ لیں۔ اس وقت میری گھڑی کے مطابق رات کے ٹھیک گیارہ بج کر چوبیس منٹ ہوئے ہیں اور تمہاری

تم آج کل اس سے محبت نہیں کر رہے ہو؟“

”محبت؟“ اس کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی۔ یوں جیسے اس نے یہ لفظ پہلے ہی نہ سنا ہو اور جواب دینے سے پہلے یہ غور کرنے کی کوشش کی ہو کہ اس کا کیا مفہوم ہے۔ میری محبوبہ دلما تھی۔“ اس نے چند لمبے بعد جواب دیا۔ ”وہ واحد لڑکی تھی جسے میں نے چاہا تھا۔ ہم طالب و مطلب تھے۔ کیا میں نے تمہیں پہلے یہ بات بتائی تھی؟ دو سال سے..... میں اس سے محبت کرتا آ رہا تھا۔ اسے قطع تعلق کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ وہ میری محبوبہ تھی۔ اسے ایسی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس نے اچھا نہیں کیا تھا ناں؟“

میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گالوں کو تر کرنے لگے تھے۔ میں جلدی سے ایک طرف سٹ گئی۔ ”نہیں اسے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ہر شخص جانتا ہے کہ وہ تمہاری محبوبہ تھی۔“ میرا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا تھا۔ ”یہ نشتے میں ہے۔“ میں نے خوف سے کانپتے ہوئے سوچا۔ ”اور بہتر ہے کہ نشتے میں ہی رہے..... اودہ خدا یا، میں کیا کروں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ بولا۔ ”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کسی بھی لڑکی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ چار سال تک محبت کے بندن میں بند رہنے کے بعد کیا ایک اسے توڑ دے۔“ اگلا موڑ قریب آ رہا تھا۔ میں نے اچانک فیصلہ کیا کہ وہ جو بی کار کی رفتار سے کر رہے گا، میں دروازہ کھول کر باہر کود جاؤں گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھٹکتے گی لیکن اس نے دیکھ لیا اور اس کی آنکھوں کا کرب برہمی میں ڈھل گیا۔ اس نے کار کی رفتار کم کرتے کرتے اچانک تیز کر دی اور کار بواہو گئی۔

”اب تم اس لڑکی کے بارے میں کیا کہو گی جسے کوئی تفریق کرانے لے جائے جس کی رفاقت میں اس کا وقت بہت اچھا کٹے، جو کسی کو بہت اچھی لگے لیکن!“ وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ ”لیکن جو تعاون کرتے پر آمادہ ہو۔ ذرا سا بھی نہیں میں آج رات اسی پر غور کرتا رہا اور جتنا غور کیا، جتنا غور کیا!“ یکا یک اس کی آنکھوں سے سخت دھشت اور برہمت بھاگنے لگی۔ ”کیا دلما سے ملنا چاہتی ہو؟“ دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگا۔ ”دلما بہت اچھی اور پُر خلوص لڑکی ہے۔ بہت ہنسار۔ تم اور دلما۔ کیا تم کہہ سکتی ہو کہ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا؟ میں یہی کہوں گا کہ آخر وہ تمہاری پہلی تھی، ہے ناں؟ اتنی اچھی پہلی جس کی خاطر تم نے میرے

لیے جھوٹ بولنا گوارا نہ کیا۔ تمہیں اس کی حمایت کرنی تھی۔ ہے ناں؟ اچھا پھر ٹھیک ہے اس کا ساتھ دو۔ میں تمہیں اس کے پہلو میں ڈن کر دوں گا۔“ یکا یک وہ پاگوں کی طرح تھقبے لگانے لگا۔

میں دھشت سے اچھل پڑی اور باہر کودنا چاہا لیکن اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

”سنو۔“ وہ پھر نکارا۔ ”زیادہ جالا لک بننے کی کوشش مت کرنا اگر کار سے کودنے کی کوشش کی بھی تو نہیں بچ سکو گی۔ میں تمہارے دو گھر سے کر دوں گا۔ میری جب میں چاقو ہے۔ وہی چاقو جس سے میں نے دلما کا کام تمام کیا تھا۔“ اس نے کار کا لہرہ اکر ایک موڑ کاٹنے ہوئے چاقو اپنی جیب سے نکال لیا اور اس کی نوک میری پہلی سے لگا دی پھر کار روک کر چاقو میرے حلق پر رکھ دیا۔

”اب تم ڈرا نیو کرو گی۔“ اس نے حکم دیا۔ ”چلو ڈرائیونگ سیٹ پر جاؤ۔ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو گلا کاٹ دوں گا، چلو تھی غدار۔“ اس نے پھل کا دباؤ میرے حلق پر بڑھا دیا اور کہنی سے میری پہلی میں ایک ضرب لگائی۔ میں شدت تکلیف سے کراہ کر رہ گئی۔ میرا جسم قہر قہر کانپ رہا تھا۔ اس نے چاقو کی نوک دوبارہ میری پہلی سے لگا دی۔

میں اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی اور وہ میری سیٹ پر آ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ میں خاموشی سے ڈرائیونگ کرنے لگی۔ وہ میری رہنمائی کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ آنکھوں کے سامنے موت ناچ رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا اور میں گھڑی دو گھڑی کی ہمان ہوں۔ ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ کار کسی جگہ سے ٹکرا دوں۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے میں نے اسٹیرنگ گھمانے کی کوشش کی یہی تھی کہ اس نے بروقت اسٹیرنگ پکڑ کر واپس گھما دیا اور چاقو پر اتنا دباؤ ڈالا کہ اس کی نوک میرے گوشت کو چیرتی ہوئی پہلی میں اتر گئی۔ میرے منہ سے ایک کرب ناک چھ لگی تھی۔ زخم سے خون بہہ نکلا اور میرے کپڑے کو تر کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے نا جولی۔“ وہ شدت غیظ سے پانچتے ہوئے پھر نکارا۔ ”اب اگر ڈرائیو کسی کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو میں چاقو تمہارے گلے پر پھیر دوں گا اور پھر تمہیں چھوٹی چھوٹی یونیوں میں تبدیل کر دوں گا۔ اب خاموشی سے ڈرائیو کرنی رہو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔“

میں روٹی کا پتی ہوئی ڈرائیو کرنے لگی۔ میرا جسم سن

اس کے پیچھے نمودار ہوا اور ڈیوڈ کے دونوں بازو پیچھے مردوز کر اسے جھکڑیاں پھندا دیں۔ دوسرا پولیس آفیسر مجھے سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ہسپتالی انداز میں پیچھے جا رہی تھی۔

”بس..... سب ٹھیک ہے..... سب ٹھیک ہے۔“ وہ مجھے تسلی دینے لگا۔ ”ہم شروع ہی سے تمہارا تعاقب کر رہے تھے۔ ہم مینے ہمسارے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہے تھے۔ اس کی سرگرمیوں پر بے حد کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یہ قاتل ہے لیکن ہمارے پاس کوئی محسوس ثبوت نہیں تھا۔ اب ہمیں کافی ثبوت مل جائے گا۔ ہمیں اس کی رسی وصلی کرنی پڑی تھی اور اب وہی رسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑے گا۔ اس نے اپنے سے یہ پھندا خود بنایا ہے۔“

☆.....☆

اس کے اگلے روز ولما کی لاش ابھی جگہ سے برآمد کر لی گئی جہاں بھول ڈیوڈ اس نے ڈنک کی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا تھا اور ڈیوڈ نے مسلسل ہو کر چاقو کے پے در پے وار کر کے اسے قتل کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اپنے پاس چاقو رکھنے لگا تھا کیونکہ ولما نے کئی دوستوں سے کہا تھا کہ وہ اس سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہے اور ڈیوڈ نے ٹھان لیا تھا کہ اگر اس نے کوشش کی تو وہ اسے قتل کر دے گا اگر وہ اسے حاصل نہ کر سکا تو کوئی بھی اسے حاصل نہیں کر سکے گا۔ ایک مبینہ یک میری وہی کیفیت انتہائی ناگفتہ بہ رہی۔ میرے ذہن پر ایسی دہشت چھائی تھی کہ میں رات میں چونک کر بیدار ہو جاتی اور خوف سے رونے لگتی۔ سوچتی ہوں میں کتنی بڑی احمق تھی کہ اس کے چھانے میں آگئی تھی لیکن اتنی عقل مند ضرور تھی کہ اس کے درغلزے پر اس کی خاطر غلط بیانی نہیں کی تھی۔ خدا ہم لڑکیوں کو اتنی عقل دے کہ ہم ڈیوڈ جیسے عیار اور مکار لڑکوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ ایسے لڑکے جو اپنی محبوباؤں سے غلط بیانی کریں اور انہیں اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہیں ہرگز قابل اعتبار نہیں ہو سکتے۔ میں نے اس کی باتوں میں آکر خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔ آئندہ میں ایسی کوئی حماقت نہیں کر سکتی۔ ڈیوڈ نے سچ کہا تھا کہ ایک روز مجھے اپنی حقیقت بیانی پر فخر ہوگا اور یہ سچ ہے کہ آج میں اس پر فخر محسوس کرتی ہوں۔

ہور ہا تھا اور ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کالوں میں جیسے ہزاروں جھینگری پول رہے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف موت اور صرف موت نظر آرہی تھی۔ نیچے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ مجھے کل کرنے کے لیے جا رہا تھا اور میں کل ہونے کے لیے جا رہی تھی۔ میری زندگی اب بہت تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ میں سر سے پیر تک کسی خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ ہاتھ پیر سے جان نکل گئی تھی۔ نہ جانے کتنے کتنے ہونے لمبے نذر گئے۔ بالآخر اس نے ایک ویرانے میں کارروائی کا حکم دیا۔ میں نے فرط دہشت سے فوراً تعجب کی۔ ہم شہر سے میلوں دور نکل آئے تھے۔ چہار سو دیوڑی تھی اور اس نے کاراج تھا۔ میرے صوچ آف کرتے ہی اس نے کار کی چابی جھپٹ کر انیشن سے نکال لی۔

”اترو۔“ وہ غریبا۔

میں کسی لاش کی مانند کار سے اتر پڑی۔ اس نے میری تقلید کی اور میرا بازو جھکڑ لیا۔ ”ہاں، تو بھولی۔“ وہ سفاکی سے بولا۔

میں نے پکپکا ہونے اس کی طرف دیکھا اور گہری تاریکی کے باوجود مجھے اس کی آنکھوں میں دہشت اور جنون کی چمک نظر آئی۔

”اب تم اسی طرح مجھ سے رحم کی بیک مانگو جس طرح میں نے تم سے تعاون کی درخواست کی تھی۔“ اس نے سفاکی سے اپنا جملہ مکمل کیا۔ ”میں سچ بول کر نہیں چاہتا لیکن مجھے قتل کرنا پڑا ہے کیونکہ تم میری محبوبہ تھیں اور تم نے میری توہین کی تھی۔“ اس نے نہایت بے دردی سے میرا بازو مردوز دیا اور میں تکلیف کی شدت سے رونے ہوئی گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی۔

اچانک ہم روشنیوں میں نہا گئے۔ وہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ میں کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ ڈیوڈ ایک جھلکے سے مجھے چھوڑ کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھوں کی طرح روشنی کو گھورنے لگا۔

”خبردار۔“ کسی نے گرج کر حکم دیا۔ ”دونوں ہاتھ

اٹھاؤ ڈیوڈ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“

اس نے جال میں پھنسے ہوئے کسی زبردست کی مانند تیزی سے اُدھر اُدھر دیکھا اور بھانسنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے سناٹے میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور وہ اپنا بازو پکڑ کر کراہتا ہوا زمین پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک پولیس آفیسر

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوه تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے





رانا بھیر کی بھی کال ہو گیا تھا اور اترام آیا تھا اور حسین پر اس جرم میں اسے چابی ہو گئی۔ اور حسین کا بیان نعمان ایڈووکیٹ زہرہ کے ساتھ کرنا مل
 قاتل کو دھڑلے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران رانا بھیر اپنی جی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ صفائی ماتھے آقا کی تک باسے بھی لگا ہوا تھا کہ
 قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری لائے کی یونین میں نائب صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اواخر ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بن کر
 فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ عدالت سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان کی اپنی پراٹھ دینا بھی وہ اس سلسلے پر غور کر رہا تھا کہ رانا بھیر کی بیٹی
 نے اسے ایک ڈائری دی جو جھوٹ لکھی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان بن رہوں سکوں پر کام کر رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی بھی قہیم
 نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ وہ ایک جہان بین کے بھائی ہیں جس کے لیے کچھ
 سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر بات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ ہاتھوں سے لگا کر وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے قہیم کے جانے
 کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرہانہ کب تک آگیا کر اسے ڈائری کا پارت ٹول گیا ہے۔ آگے دن زہرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے کمر کیا تو ڈائری کے
 واقعات سے جس نے رقت کھل کے کودنے کو دیا تھا۔ اس دن میں اڑے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ اس میں عزیز خان بھی تھا جس کی کھڑکی میں بین ٹویپ کی
 گشتہ کی گاڑی سے دو سہارا پارا تھا۔ میں نے عزیز خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ گاڑی پارے حضرت ان کو بھی سہولت ملے لیکن
 میں چاہتا ہوں کہ یہ سہولت پارٹر میں ہی ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستر پارا تھا کہ کایا کاٹوں آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف پھرد
 نکل سے فرار ہوئے ہوئے اراک۔ یہ خبر سننے میں اچھا کہ گڑوڑا سپورٹ کی گاڑی آئی ضرور ہو گئی تھی۔ سہو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڑوڑی آؤں میں
 خیانت کا کاردار ہوتا تھا۔ سو کر خست کر کے میں بیٹھا تھا کہ کایا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری خیانت سندھ ہو چکی ہے اور مجھے کرنا کرنے کے لیے ایس
 ایچ اور لاہور خان آ رہے ہیں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بانٹ پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کایا کے اڑے پر بیٹھا تھا کہ بین کاٹوں آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس
 کمرہ آئی تھی اور قہیم کے قتل کے بعد مجھ میں نے گڑوڑی دے دی۔ وہاں مجھے پر غور ہوئی اور میں نے حالات میں بیٹھا تھا کہ ایک چابی نے آ کر ایک اخبار دیا۔
 اخبار میں جیسی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا۔ اگلے صبح کے کچھ خبر نے مجھے ہلکا ہلکا دھچکا دیا تھا۔ وہاں پر بیٹھا تھا کہ میں اڑے پر بیٹھا تھا تو پولیس میرے کمر میں ملوث عزیر
 نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں بیٹھا اور ان سے صوبہ کے متعلق پوچھا۔ وہ کمرہ اخبار میں نے کہا کہ یہ حال پولیس بھی پوچھنے کی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بھیر کے
 ہاں بیٹھا پھر میں نے ٹک ڈرائیج کی گولٹا سی گاڑی جس کے ٹک نے زہرہ کی کار کھٹ کیا تھا کر آیا تو کاشٹ ملے آگے جیوری میں بین کو چاہتا تھا۔ وہی انوار
 کا سر کر پریشان ہو گیا۔ مگر اس رات کایا کے ساتھ میں بیٹھ ستر کے کچھ میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ بیٹھ ستر نے کہا کہ اس نے
 میری بین کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے۔ بلا تائوں کہ کہ اس نے آئی لیکن کیا لڑکی کو لے کر آجائے۔ یہی روزی نے کہا کہ بیٹھ ستر صحت بول رہا ہے اس نے
 لڑکی کو کشن مدد میں نہیں ہیں اور رکھتے پھر اس نے بتایا کہ میں بیٹھ ستر سے اپنی بین کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کھانچا نکلا۔ اس
 کے آدمیوں نے مجھے بھی دنگی کر دیا۔ ساتھ میں ستر کے ستر کر میں نے بیٹھ ستر کے ہاں کھانچا نکلا اور روزی کے ہاں رشت میں
 پہنچا۔ یہ اس کی نکل کا قیث قلم۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ "بیل دلا۔ بیل لے کر آیا ہوں۔" روزی نے
 دروازہ کھولا تو بیل والے کو دھکا دے کر وہاں سے نکلتے آئے۔ اس سے ستر کر میں نے اس کے لپٹ کر ان کو لڑکی کی حالت کے لیے دو پولیس والے
 بھیج دیے۔ مگر میں اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس کے لپٹ کر ان کو لڑکی کی حالت کے لیے دو پولیس والے
 بھیج دیے۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس قہیم میں بیٹھا تھا کہ نص از کر زہرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں وہاں ہو گیا اور ہاں تکا اور زہرہ کے پردوں والے
 کمر میں داخل ہو گیا اور صحت کے ذریعے زہرہ کے کمر میں اتار گیا۔ لیکن اسی وقت مجھے سے کوئی بیلنے کی آواز آئی اور ایک لڑکی نے سانی دی۔ جب کمر میں
 بیزیر میں کھلی چکا تھا۔ اندر سے زہرہ ہنسنے لگی تھی اور وہی کھلی اس کے کچھے تالہ کھڑکی پر تھی۔ میں نے زہرہ پر قابو پا کر خاندہ سے لائے کو
 کہا۔ مجھے باہر سے دروازہ حذر حذر کیا گیا۔ کمرے کے لوگ آگئے تھے کہ وہ بعد میں کسی کی کھلی تھی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چلی بڑا ہونے کمرہ آ گیا
 کروں کی کھلی تھی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ کچھ لپٹ گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا تو قہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پرے پناہ دے رہے تھے۔ اس کی حالت بھی کات دی تھی
 تھی۔ بیٹھ ستر الگ لگا لپٹ کرنے پر چھا ہوا تھا۔ کچھ دھوکے ل کابلہ لپٹا جا رہا تھا۔ استاد بھائی نے حضور دیا کہ خود کچھ چار کھوں کی تک لاری کا کچھ پچلی
 ئی کے کمر میں دھوپڑا رکھا گیا ہے۔ ایک آپا کھلا اور پھر کمر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر میں موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر رات کو جب
 اڑے پر پہنچا تو اور شہانے بتایا کہ ماما میں مران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرحان کے دفتر میں جو جگہ گا میں داخل ہوں وہاں پہنچا تو بین
 راندہ سے سامنا ہو گیا۔ اس کا کچھ کہتا ہوا میں نشیروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کٹھنر کر لیا۔ میں تو آگیا مگر ایک دوسرا شخص دپ کر ہلاک
 ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں میں بین راندہ کے جہاز کو دھوکے میں نام کو مرام میں داد کے ساتھ
 ساحل پر آ گیا تھا کہ وہ مجھے نظر آگیا۔ میں اس کے خلاف میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا۔ اس نے ہتھوں نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر حسرت کا
 دی کر دھوکہ دے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اور کایا رانا بھیر کے ہاں پہنچے تو اسے شام میرے آدمیوں کے زور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بھیر
 نے پولیس بلوائی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر نکلتے جاتے۔ ہم وہاں سے نکلے تو زہرہ کاٹوں آگیا کہ کچھ کر۔ میں نے

لکڑی کاٹل ٹھی اور مخصوص چھٹی منگڑی جلد میں ٹھی اوداس پر
"RM-7" لکھا تھا اور قاتل کے کمرے میں اور یہ دہریل
نمبر جس جس کے بارے میں شاہ میر مجھے بتا چکا تھا۔
یوں ہم دونوں نے یہ سارا "کالم" ہاتھوں میں
دستاں چڑھا کر انجام دیا تھا جس کی تیاری پہلے ہی سے ہم
نے کر رکھی تھی۔

بہر کیف! اس فائل کے ہاتھ آتے ہی ہم نے سب کچھ دوبارہ اسی طرح ”برابر“ کیا اور واپسی کے لیے پلٹے۔

گیت پر کسی گاڑی کے ہارن بجنے کی آواز سنائی دی تھی۔
 ”اوہ..... کلکا ہے وہ دونوں خواتین آگئی ہیں۔“ میں
 نے گرائنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے تشکیک سے کہا۔
 میں نے دیکھا اس کی پیشانی پر بھی ان گنت سلوشیں بکھر چکی
 تھیں۔ اسی انداز میں بولا۔

”ہمیں جلد کچھ کرنا پڑے گا، ورنہ گزربڑکا احساس ہوتے ہی کہیں یہ لوگ پولیس کو نہ بلا لیں۔“

”ان دونوں کو کن پوائنٹ پر اندر لے آتے ہیں پھر انہیں عتاویس لینے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے راہ بھائی۔

”ہم! میرا خیال ہے اب جو راہ اپنائی ہے اسی پر ہی کاربند رہنے میں بھلائی ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا اور ہم دونوں باہر لے گئے۔

ہارن کے بعد گیت سلائیڈ ہوتے چلے گئے۔ ہم دونوں ایک دم دائیں بائیں دیوار کی آڑ میں چلے گئے۔

یقینی امر تھا کہ وہ کار سے اترتے ہی گن مین کو تلاش کی کوشش کر سکتی تھیں۔ پھر وہی ہوا۔ کار گیٹ کے اندر داخل

ہوتے ہی رک گئی تھی۔ عقب میں گیٹ دوبارہ سلائیڈ ہو کر بند ہوا۔ میری عقائی نظروں نے کارسواروں کو جانچا۔

مجھے تسلی ہوئی کہ دونوں خواتین کے علاوہ کوئی ڈرائیور نہ تھا۔ اسٹیرنگ پر شاہ میر کی بیوی لیلیٰ صمدی اجماع تھی۔

اس کے براہ میں اس کی بیٹی کا وفد بھی۔
 ”جعفر..... جعفر.....“ لیلیٰ کار کی کھڑکی سے سر ذرا

ہاں کمال کرکین کی جانب منہ کر کے اسے آوازیں دینے لگی۔ جعفر یقینی طور پر اس گن مین کا نام تھا جسے ہم نے کین کے اندر رن بستہ حالت میں مقید کر دیا تھا۔

جواب نہ پا کر لیلیٰ نے کارپورج کی جانب بڑھا
ری۔ شکر تھا کہ یہ دیکھنے کے لیے وہاں نہ اتری۔

بلاشبہ گرانٹ کی یہ چار حادہ حرکت میں سمجھ سکتا تھا، یون میں بننے، ابھی آگے قدم بڑھا دیا۔ بظنی گٹ کے ذرا اور نزدیک پہنچے ہی گرانٹ کی کارستانی نظر آ گئی۔ اس نے گمن میں کو جھپٹ رکھا تھا۔ میرے اعصاب بھی تن گئے۔ میں بھی اندر جا کھسا اور عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

تب تک گرانٹ مین کو چھاپ چکا تھا اور اسی کی مین قبضے میں کرتے ہی اس کے کندھے کی ضرب سے اسے ڈھیر کر چکا تھا۔

باس ہی اس کا کہیں تھا۔ ہم دونوں بے ہوش کن مین کے جسم کو کھینٹے ہوئے کہیں کے اندر لے گئے۔ وہاں رسی مل گئی۔ ایک لوہے کا بیڑ کو نے جس بجھا ہوا تھا باقی ضرورت کا مختصر سامان ڈالتا تھا۔

ہم نے ممکن مین کو بیڈ کے ساتھ ہی پاندھ دیا اور بیڈ پر بچے بستر کی چادر کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے منہ میں بھی ٹھونس دیا تاکہ ہوش آنے پر وہ شور نہ مچا سکے۔

”اگر وہ دونوں ماں بیٹیاں واقعی اندر مروجہ نہیں ہیں تو بغیر کسی الجھن کے ہم اپنا کام نمٹا سکتے ہیں۔ آؤ.....“ گرانٹ نے ہانچتی ہوئی سی جھٹکی آواز میں کہا۔

میں اس کی چابک وئی اور بروقت بیدار مغزی کا معترف تھا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندر سنا تھا۔ اوپر آئے
مرگنٹ کے لیے مطلوبہ دروازوں کے لاک کھولنا چاہا
مشکل ثابت نہ ہوا۔ وہ تیل کے بھرنے کنوئیں کی آگ
بجھانے کا ایک عالمی ایکسپٹ تھا۔

جلد ہی ہم بیڈروم تک جا پہنچے۔ شاہ میر نے مرتے وقت مجھے سیف کا نمبر بتا دیا تھا۔

شاہ میر کا بیڈروم بڑا شاندار اور قیمتی اشیاء سے مزین بھی تھا۔ ایک آہنی الماری کھول کر مگر انٹ نے شاہ میر کی شاندار مٹی میں خفیہ سیف تلاش کیا اور اس کے نمبر لاکر اسے ”اوپن“ کر دیا۔

یہ خانہ شاید صرف ضروری کاغذات کے لیے مخصوص تھا، ورنہ یہاں جیولری یا دیگر قیمتی سامان موجود ہوتا، خیر ہمیں ان سے یوں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

شاہ میر نے جس فائل کی نشاندہی کی تھی وہ تہہ در تہہ دیگر کاغذات اور فائلوں کے نیچے دلی ہوئی تھی۔ یہ میروں

”میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ لیلیٰ نے طعناً سے کہا۔

میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا اور میرے اشارے پر گرانٹ نے بھی کاغذ کے ساتھ جلی کیا تھا اور وہ جلدی سے اپنی ماں سے جا مل گیا۔

ہم لاؤنج میں تھے۔ صوفیوں پر براجمان ہو گئے۔ میں نے بہت دیر سے دیر سے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں لیلیٰ صدا کو ساری باتیں بتادیں۔

اپنے شوہر کی ہلاکت پر پہلے تو اسے یقین نہیں آیا تھا مگر کاغذ رو پڑی تھی۔ لیلیٰ صدا بلاشبہ مضبوط اعصاب اور حوصلے والی خاتون ثابت ہوئی گی۔

جب اسے یقین آیا تو اس نے چند ماہ کے لیے آنکھیں بند کر کے شاید اپنے اندر گم ہونے کی کوشش چاہی گی یا پھر وہانے گی۔ میں بہر طور اپنا تعارف بھی دوران رواد کر چکا تھا۔

”میرے شوہر کے قاتل تم بھی تو ہو سکتے ہو، مسٹر نچان!“ لیلیٰ صدا نے آخر میں میری جانب تیز اور جھپتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پوری توقع تھی مجھے اس خدشے کی کہ آپ مجھے ہی اپنے شوہر کا قاتل سمجھیں گی۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”اور میں بھی سمجھتی نہیں بولوں گا کہ میری اپنی بھی جلی خواہش تھی کہ اپنے باپ کے قاتل کو کم از کم اپنے ہاتھوں سے سزا دوں لیکن قانون کے دائرے میں مگر تقدیر نے کچھ اور ہی کر رکھا ہوتا ہے۔ انسان کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے بھلا۔“

”میرا خیال ہے مسٹر نچان نے آپ کو ساری بات مکمل تفصیل کے ساتھ بتادی ہے۔“ گرانٹ، اس بار لیلیٰ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اتنی صراحت سننے کے بعد میں امید رکھتی جا رہی ہوں کہ آپ کو ہماری باتوں پر یقین آ گیا ہو گا۔ پھر شاہ میر نے خود نچان کو اپنے خفیہ سیف کا نمبر بتایا، میں نہیں سمجھتا کہ ہماری داستان کی سچائی کا آپ کے سامنے اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت پیش کر سکیں۔“

گرانٹ نے لیلیٰ کو یاد کرانے کی غرض سے آخری جھٹ کی۔ میں نے دیکھا کہ لیلیٰ صدا کی سوچ میں مستغرق ہوئی۔ اس کے چہرے سے غم و غصے اور ایک اندرونی اہل کے سے تاثرات دیتے ہوئے شاہیے مامدہ بننے لگے تھے بلکہ اس کی جگہ اب نہ کوہ طور پر ابھرنے پریشانی نے لے لی تھی۔

پہرے میں جا کر جیسے ہی کد رکی۔ میں ابھر کر انٹ ایک نیم نگاری پتھون کی طرح ان کی جانب لپکے۔ پہلا وہ دہشت زدہ ہی جی دق رہ گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے ان کا سکہ ٹوٹا اور انہوں نے چلنا چاہا مگر ہم دونوں نے بیک وقت انہیں جھپٹ لیا۔

بوڑھے شاہ سے ہم نے دودھ دہتول لے کر رکھ لی تھیں، وہی کام آئیں۔ ان کے زور پر ہم لیلیٰ اور کاغذ کو اندر لے آئے۔

لیلیٰ صدا جواب شاہ میر کی ہوی کہلاتی تھی، اگرچہ ابھی اسے اپنے شوہر کی ہلاکت کا غم نہ تھا۔ وہ ایک پتھریس سالہ خوب رو اور صحت مند خاتون تھی۔ رنگ گورا اور آنکھیں گہری سیاہ اور موٹی تھیں۔ قد بھی دراز تھا۔ اس کی بیٹی کاغذ بھی کم حسین نہ تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ بہت دہلی اور اسارت کی تھی۔ غرض یہ کہ دونوں ہی ماں بیٹیاں فیشن سیٹل اور حسین تھیں۔

”ہم جھپٹیں کسی بھی قسم کا کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“ میں نے ان سے نرم لہجے میں کہا۔ ان کا خوف کچھ کم ہوا۔ میرا خیال تھا شاید شاہ میر نے انہیں میری تصویر وغیرہ دکھا رکھی ہوگی اور وہ مجھے پہچان لیں گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

میرے ہاتھ میں فائل دہلی ہوئی تھی اور لیلیٰ اسے بار بار دیکھنے جا رہی تھی۔

”تم دونوں دیکھ رہی ہو کہ ہمیں صرف اس فائل کی ضرورت تھی جو ہم نے کال کی ہے۔ ہائی کسی جیولری اور روپے پیسوں وغیرہ کو ہم نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔“ اس بار گرانٹ نے ان سے کہا۔

”ہم سیدھی طرح یہاں داخل ہونا چاہتے تھے مگر تمہارے پریذکشن میں نے ہم سے سیدھے منہ بات تک کرنا گوارا نہ کیا۔“

”اس طرح بھی کسی کی ذاتی پراپرٹی میں نہیں گھسا جاتا مسٹر انون..... اتم لوگ کیا چاہتے ہو اب؟“ لیلیٰ نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں اب ایک طعنا سا نمودار آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ ہمارا نرم رویہ تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم ہے چند ضروری باتیں کرنا چاہیں گے، کوشش ہوگی ہماری کہ تمہیں اعتماد میں لیا جائے۔ بات بنی تو ٹھیک اور اگر تم تنہی دشمنی کی ابتدا کرنا پسند کرو تو بھی تمہاری مرضی۔“

دیکھی ہی کیا۔ لٹی نے بھی اپنی نشست یکدم چھوڑ دی۔
 ”خیر ہے!“ لٹی صداد نے اچانک کہا۔ کادھ
 خاموش بیٹھی تھی۔

”ہی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے لٹی کی طرف دیکھا۔
 ”مم..... میرا خیال ہے مجھے آپ کی بات کا یقین کر
 لینا چاہیے۔“ لٹی صداد اٹھتے ہوئے لچھے میں بولی۔
 ”شش..... بب..... بلکہ مجھے اور میری بیٹی کو آپ کی مدد کی
 بھی ضرورت پڑے۔“

میں نے یہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ اترا
 اترا سا محسوس ہوا تھا مجھے، میری باتیں شاید اس کے دل کو لگی
 تھیں اور اس نے کسی قسم کی جذباتیت سے کام لینے کی کوشش
 نہیں کی تھی حالانکہ ابتداء میں بھی کچھ نظر آ رہا تھا مگر اب جیسے
 میرے سمجھانے پر وہ سنبھل گئی تھی۔

”میں نے کہا نا..... لٹی صاحبہ کہ تقدیر بسا اوقات
 انسان کی کج غیر متوقع طور پر بدل کر رکھ دیتی ہے، صدیوں
 پرانی دشمنی، دوستی اور دوستی، دشمنی میں بدل جاتی ہے۔“ میں
 نے بدستور اس کے چہرے پر نظریں گاڑے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”یہاں بھی کسی کچھ ہوا ہے۔“ خیر کے سلسلے میں مجھ
 سے بنا دشمنی میں جو کچھ ہوا۔ اس کا مجھے شدید قلق ہے۔ قسماً
 ہی دشمنی کسی کے ساتھ کسی مگر میری فطرت ایسی نہیں ہے کہ
 کسی کو اولاد کا گم دوں..... کیونکہ ایک بھائی کے غم سے میں بھی
 گزر رہا ہوں جو زندہ و گور ہو چکا ہے۔ شاہ میر کی کہانی اس
 کی ہلاکت کے بعد ختم ہو گئی۔ بہر حال.....“

میں نے لحوہ بھر کے توقف کے بعد ایک گہری ہنکاری
 خارج کی اور اگے بولا۔ ”مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے
 میری بات سمجھ لی۔ اب دوسرا میرا آپ کو مشورہ یہ ہوگا کہ
 اپنی سیکورٹی سخت کر دیں۔ ذرا بھی کسی پر شبہ محسوس کریں
 پہلے پولیس کو اور دوسرا مجھے مطلع کریں۔ میں آپ کو کچھ ایک
 رابطے کے لیے نمبر دے رہا ہوں اور اپنا پرسنل کا ٹیلیف نمبر
 بھی۔ کسی میں اپنے نمبر پر رابطے میں نہ آسکوں تو ان
 پر کر دیجئے، کچھ فوراً آپ کا کوئی بھی پیغام ہوگا، وہ مل
 جائے گا۔“

اگلے نصف گھنٹے بعد ہم اپنی جیب میں واپس صرافہ
 لوٹ رہے تھے۔

یہ ظاہر کوئی خطرہ نہ تھا اور راوی جین ہی جین لکھ رہا تھا
 مگر دیکھا جاتا تو اس ”جین“ میں جو بے چینی چھپی ہوئی تھی،
 اس کی خطرناکی مجھے ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے

”صورت حال دکھائی بھی ہے، عجیب بھی اور کافی حد
 تک سنگین بھی۔“ چند ٹاپے کی گھمبیرتا خاموشی کے بعد میں
 نے گلا صاف کرتے ہوئے لٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ میں اس وقت اپنے دشمنوں کے
 گھر میں ہوں لیکن اب صورت حال..... مختلف بلکہ اس کے
 الٹ ہے۔ تقدیر نے بلاشبہ ایک عجیب کھیل کھلایا ہے۔ بڑی
 باریک بینی سے آپ کو یہ فیصلہ دینا ہوگا کہ کیا آپ میرے
 ساتھ دشمنی کا وہی پرانا سلسلہ جاری رکھنا چاہیں گی جس کی
 ابتداء آپ کے مرحوم شوہر نے کی تھی یا پھر اسے سنبھال رہی
 ختم کرنا پسند کریں گی..... کیونکہ میں نے شاہ میر کی ناگہانی
 ہلاکت کے بعد صدق دل سے آپ کو معاف کر دیا ہے کیونکہ
 اس میں بہر حال آپ کا کوئی قصور نہیں، شہر والے معاملے پر
 مجھے واقعی افسوس رہے گا لیکن دیکھا جائے تو اس کی ذمہ
 داری بھی آپ کے مرحوم شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ میرے
 بھائی فیصلہ سے کی گئی دروغ کی ذمہ داری بھی بات نہیں۔
 طاقت رکھتے ہوئے بھی میں نے خیر کے ساتھ بدلے میں
 ایسا کچھ نہیں کرنا چاہا تھا۔ اسے یہ خیال بتانے کا مقصد بھی میرا
 محض صرف اسی قدر تھا کہ وہ میرے پاس کی انوکھی جوان
 بیٹی فرحانہ کو آزاد کر دے۔ اگر اعتماد کریں تو یہ ساری باتیں
 کرنے کا میرا مقصد فقط یہی ہے کہ جن لوگوں نے آپ کے
 شوہر کو نہایت دروغی سے ہلاک کیا ہے وہ میرے بھی دشمن
 ہیں، یہ بات شاہ میر بھی اچھی طرح جانتا تھا اسی لیے اس
 نے ان کی قبر کو مودنے کے لیے ان کے بچہ اہم راز اس فائل
 کی صورت میں مجھے دینے چاہے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کے
 ہاتھ میں ہے۔ آخری بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس
 خطرے کا احتمال بہر حال آپ کو رہے گا وہ کسی بھی حوالے
 سے آپ کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”ممکن ہے کہ.....“ گرانٹ نے بھی درمیان
 میں جیسے مگرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”بعد میں انہیں پتا چلے کہ
 بعض ایسے ہی اہم رازوں کی فائلز ڈیٹیلو یہاں موجود ہوں
 اور وہ یہاں رکھ کر ہیں۔“

میں نے دیکھا کہ لٹی صداد قہقہوی دہ پہلے جتنی
 پُر اعتماد اور جنگ نظر آ رہی تھی اب اتنا ہی ڈری ہوئی محسوس
 ہوتی دکھائی دی۔

”فیصلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سے دشمنی یا
 پھر دشمنوں سے دوستی۔“
 کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گرانٹ نے بھی دیکھا

اودھائے گرانٹ کو بھی محسوس ہوئی تھی۔ بولا۔ ”ہمیں ابھی
حکلی صمد پر مکمل مجروسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اندر سے
دہرے زخموں کا شکار ہے اور عورت جب اندر سے زخمی
ہو جائے تو زہریلی ناخن کاروپ دھار لیتی ہے۔“

مجھے اس کی بات سے پورا اتفاق تھا۔ تاہم ایسی کوئی
خوش فہمی مجھے بھی نہ تھی کہ میں حکلی صمد کو ایک ہی ملاقات
میں اپنا ہمدرد یا ایسا کوئی ساتھی سمجھ لوں جو ہمارے اس نیک
مشن میں بھی خواہوں کی صورت، ہمارے شانہ پیشانہ تھے۔

میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ ایک پوری چین کی کالے
شیطان سے لے کر بن راند اور شاہ میرنگ۔ اسی کی پالیسیوں
پر چلتے ہوئے بن راند اور شاہ میر اپنے آئندہ کے منصوبوں پر
عمل کرتے تھے۔ میرے باپ کو پچاس کی کے پھندے سے
لے کر بہرام خان کے گل اور پھر صرافہ والوں کا پانی بند کرنا
اس پر عاصبانہ قبضے تک اور اب آگے نبھانے کیا کچھ ہونے
والا تھا۔

”ہم م م مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے۔“
کہتے ہوئے میں نے پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ میچھے۔
پھر آگے بولا۔ ”ہم بہر حال اپنا کام کر آتے ہیں۔ حکلی صمد
اگر ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھانا بھی چاہے گی تو اسے خود کو
ہی نقصان ہوگا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اسے اعتماد میں لینے میں
کامیاب ہو چکے ہو؟“ اس نے ایک سٹیل پر جیب روکتے
ہوئے گوگلوے انداز میں سوال پوچھا۔

”میرا تو خیال یہی ہے۔“ میں نے کندھے اچکائے۔
گرانٹ کو بھوک لگ گئی تھی۔ میرا بھی کچھ کھانے بنے
کوئی چادر ہاتھ۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں رکے۔ گرانٹ کو
شراب کی طلب بھی ہو رہی تھی مگر یہاں اس کی کٹلے ہندوں
”طلب“ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

ہم ایک قریبی ریسٹورنٹ میں کارروک کے نیچے اتر
آئے۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم نے الہدیٰ اسپتال کا
رخ کیا۔

اسپتال کی عمارت بڑی خوبصورت تھی۔ اس میں سفید
اور نیلا رنگ زیادہ نظر آتا تھا۔ باغ بھی تھا اور ایک پورا نظم و
نویظ کے علاوہ صفائی ستھرائی کا نظام تو دیکھنے سے تسکین رکھتا
تھا۔ یہاں تو مریض بھی ایسے ماحول کو دیکھ اور محسوس کر کے
بغیر علاج کے بھی اس کی آدھی بیماری ویسے ہی غائب
ہو جاتی۔

گیٹ پر خدایے وغیرہ کی چٹنگ ہو رہی تھی۔
سکپورٹی گارڈز وردی پوش تھے۔ روز آنے جانے والے،
جن کے مریض داخل تھے یا پھر وہ جو مقررہ دن اپنے طبی
معائنے کے لیے آتے تھے انہیں شاید کوئی پاس وغیرہ جاری
کیا گیا تھا اور وہ صرف اسے شوکر کے ہا آسانی اندر چلے جا
رہے تھے جبکہ ایسے لوگ جو ہماری طرح پہلی بار اندر اپنے
کسی مریض سے ملاقات چاہتے تھے انہیں اسپتال کے گیٹ
سے باہر قریب ایک کیمپن میں اپنی شناخت اور اندر داخل
شدہ مریض سے متعلق معلومات درج کروانا ہوتی۔ ہم بھی
اسی آزمائش سے گزرے جس میں تھوڑی دیر لگ گئی۔

وہاں ہم دونوں پہنچ کر سیہا استقبالیہ پر پہنچے اور سسٹر
آریہ کا پوچھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہاں مریضوں سے
ملنے کے کیا اوقات تھے؟ اس سلسلے میں کوئی مسئلہ پیش آسکتا
تھا، اسی لیے میری کوشش یہی تھی کہ پہلے آریہ سے ملا جائے،
وہ یہاں کی نرس بھی اور اگر اوقات کار میں تھوڑی بہت مشکل
درپیش ہوئی تو دو مل کر سکتی تھی۔

استقبالیہ گرل ایک خوبصورت سی عربی لڑکی تھی اور
اس نے سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے سسٹر آریہ کا پوچھا
تو اس نے ایس کن اطلاع دی کہ وہ آج صبح ہی اپنی ڈیوٹی
”آف“ کر کے جا چکی ہے کیونکہ اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔

”پلیز آپ ایک پھٹ (مریض) کے سلسلے میں
ہماری ویلپ کر سکتی ہیں؟“ میں نے اس سے بڑے اخلاق
سے پوچھا۔ وہ ایک سرد قد اور گہری آنکھوں والی پرسش
دو شیرہ تھی۔ اس کا انداز غلط بڑا اشتہ تھا۔ اس نے
انہماک میں جواب دیا تو میں نے اس سے فرمانہ کے بارے
میں پوچھا اور اس کی کچھ ڈیٹیل دی۔ اس نے پہلے تو ایک
بڑے سے جلد ریشم میں کچھ دیکھا پھر سائڈ میں رکھے کمپیوٹر
میں کچھ جائزہ لیا پھر مجھے وارڈ اور کمرہ بتا دیا وہی تھا
جو گھنٹا پہلے بتا چکی تھی۔

”لیکن اب پھٹ کی حالت قدرے بہتر ہونے
کے سبب اسے جزل وارڈ نمبر تین میں شفٹ کر دیا گیا
ہے۔“ اس نے آخر میں مطلع کر دیا۔

اجتیاط کے پیش نظر ہی میں نے پوچھا تھا کیونکہ ممکن
تھا مریض کو بد وقت ضرورت ”شفٹ“ بھی کر دیا جاتا ہو۔

شکر تھا کہ مریضوں سے ملنے کا وقت ابھی باقی تھا۔
میں اس لڑکی کا شکریہ ادا کر کے گرانٹ کے ساتھ مطلوبہ وارڈ
پہنچا تو محمود اس سے ملاقات ہو گئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران

English

انگلش پھر سب سے آگے !



انگلش دنیا کا بہترین ٹو تھ پیسٹ ہے۔
 کیونکہ اس میں ہے کلورینیکلیم کے ساتھ ڈبل فلورا ایڈز، تاکہ آپ کے دانتوں کو سب سے
 Maximum فیس بک۔
 Guaranteed Cavity Protection

A Product of
 Sarwana & Sohzihi
 Pakistan

@SnScare

english.toothpaste

Pakistan Standards

سے تصدیق شدہ

بوڑھے باپ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے میں تو اس کا بدلہ بھی ساری عمر نہیں اتار پاؤں گا بلکہ میں تو تم سے شرمندہ بھی ہوں۔ خیر! تم حکم کرو، در خواست نہیں۔“

میں نے اس سے عامہ اور ایڈووکیٹ ز تیرہ کا خیال رکھنے کا کہہ دیا اور یہ بھی کہ ان دونوں کو میری اور کالیا کی خیریت کے بارے میں اطلاع کر دیا میں بہت جلد ان سے بھی ٹیلی فونک رابطہ کروں گا۔ اس نے کھلے دل اور پورے یقین کے ساتھ مجھے تسلی دی کہ وہ دونوں بھی اس کی بیٹیوں کی طرح ہے، جیسے فرحانہ ہے، لہذا میں ان کی بالکل بھی نگہ نہ کروں۔

راانا بیشر سے بات کرنے کے بعد میں فون بوتھ سے باہر آ گیا۔ اس کے بعد میں جیب میں گرانٹ کے ساتھ بیٹھا اور ہم اوڑلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم مین شاہراہ پر آ گئے۔

☆.....☆
 ”اوہ.....“ اچانک گرانٹ کے منہ سے برآمد ہوا۔
 ہمیں اسپتال سے نکلے ابھی بہ مشکل دس، پندرہ منٹ ہی
 ہوئے تھے۔

”کیا ہوا؟“
 ”ایک ٹیلر ایک کی کار ہمارے تعاقب میں ہے۔“
 وہ یوں۔۔۔ سٹل کریں ہوتے ہی اس نے جیب ایک جھکے سے
 آگے دو بھادری کی اور ایک انڈر پاس سے وہ ڈبل ٹریک پر
 آگیا تھا۔
 ”خبردار! پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ بیک دو یو میں نظر
 ڈالتے ہو۔“

میں نے اس کے کہنے سے پہلے ہی وہاں نظریں جمادی
تھیں۔ ہمارے پیچھے ایک چھوٹے سائز کا ٹرک تھا۔ اس کے
عقب میں مجھے ایک نیلی کار کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔
”مگر انا! تم اپنا راستہ مت بدلانا۔ مناوا کے
مضافات اور ادوالی کے راستے پر ان سے ٹھنٹے ہیں۔“
”ہم.....“ اس کے منہ سے نکلا اور اس نے جیب کی
رفٹاریز جمادی۔

تھوڑی دیر بعد ہم مضافات پر گاڑن تھے۔ اداں کے راستے پر آتے ہی ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیلی کار بدستور ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی۔
”مجھے قائل چھپانا ہوگی۔“ میں اچانک یک خدشہ کے تحت خودکلامیہ بیڑایا۔

”فوری نمٹاؤ یہ کام۔ کارکی رفتار تیز ہوگئی ہے۔“
گرائٹ بولا۔ میرے اعصاب یکفخت تن گئے۔ میں کھینچ
سیٹ پر چلا گیا اور بانیڈان کے نیچے فائل چمادی۔
اسی وقت کار تیزی سے ہمیں اور ٹھیک کرتی ہوئی
آگے بڑھتی چلی گئی۔

”ابو جبرال!“ گرائٹ کے منہ سے اچانک نکلا۔
”کیا؟“ میں چونکا۔ اب ہم دونوں کی نظریں سامنے
تھیں۔ کار نے اچانک بریک لگا دی اور سرک پر یوں ترچھی
ہو کے رک گئی کہ ہمارا راستہ بند ہو گیا۔ گرائٹ نے بھی فوراً
جیب کو بریک لگا دیئے۔

کار سے تین افراد اترے۔ بظاہر وہ تینوں غیر مسلح
تھے۔ ان میں ایک ابو جبرال تھا۔ اس نے ہمیں نیچے اترنے
کا اشارہ کیا۔

میں اور گرائٹ اتر آئے۔ رکی ہائے ہیلو کے بعد
ابو جبرال نے گھورتی نظروں سے ہمارے چہروں کو دیکھتے
ہوئے سوال کر ڈالا۔ ”شاہ میر کی رہائش گاہ پتہم دونوں کیا
کرنے گئے تھے؟“

”تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے! ہم
کسی کے غلام تو نہیں ہیں۔“ گرائٹ نے ناگواری سے کہا۔
اسی وقت ابو جبرال کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا مگر
گرائٹ بھی کچھ نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ابو جبرال کا تھپڑ
اس کے گال پر پڑتا، اوپر اے گرائٹ نے پہلے ہی اس کا
ہاتھ روک لیا اور ایک گھونسا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔
ابو جبرال لڑکھڑاتا ہوا اپنے دونوں ساتھیوں سے جا کر آیا۔
ان دونوں نے فوراً اپنے لباسوں کے اندر سے پستول نکال
لیں۔

میں سچ بچاؤ کرنا تھا ان کے درمیان آ گیا۔
”متمہرو... کیا کر رہے ہو تم... جبرال...؟“ میں
نے جبرال کو گھورا۔ وہ اچانچہ آسہلانا ہوا سنبھلا اور گرائٹ کو
خوفناک نظروں سے گھورتے ہوئے مجھ سے بولا۔

”تم آگے سے ہٹ جاؤ نعمان! میں ابھی اسے مرہ
چکھاتا ہوں۔“

”خبردار جبرال اگر تم نے اب ایک قدم بھی آگے
بڑھایا۔“ میں ان کے درمیان تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”کیا تم
مجھے نہیں پہچان رہے ہو؟ میں تمہاری سلطان بن رائد سے
شکایت کروں گا۔“

”میں انہی کے حکم پر ہی تمہارے پیچھے لگا ہوں۔ مجھے

جواب چاہیے۔“ وہ درشت لہجے میں مجھ سے بولا تو میں نے
بھی نیچی انداز اپناتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

”جب مجھے افسوس ہوا ہے یہ بن کر کہ سلطان نے
ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا یا نہیں اپنا غلام سمجھ لیا
تھا۔ میں تو شہزادی نلیم سے ان کے رشتے کی بات چلا رہا تھا
اور اپنے دوستوں کی ہی ریکی کروا رہے ہیں؟“

میں نے دانستہ شہزادی نلیم کا تذکرہ چھیڑا۔ میں جانتا
تھا کہ جبرال، بن رائد کا خاص آدمی تھا۔ اسے سب معلوم
تھا۔ حسب توقع وہ ڈھلا پڑ گیا۔

اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں
نے اپنی پستولیں دوبارہ لباس کے اندر ڈال دیں۔

”اوہ! شاید مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اس میں
معزز سلطان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔“ اس نے بڑی
عماری سے پتلی بدلی اور مفادعنا رویہ اختیار کرنے پر مجبور
ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ جدی والوں کے لیے صرافہ دہشتی
رک گئی۔

”دوست راہیں ہوا رکیا کرتے ہیں اور وہ میں کر رہا
ہوں۔ میں کل رات ہی معزز سلطان کا پیغام شہزادی نلیم کو
پہنچا چکا ہوں۔ انہوں نے جو جواب دیا ہے، وہ حوصلہ شکن
نہیں ہے، میں خود اس سلسلے میں سلطان سے ملاقات کرنا
چاہتا تھا۔“

اسے غصہ پڑتے دیکھ کر میں نے بھی مصلحانہ رویہ
اختیار کیا۔

”اباؤ سہلا میں ابھی جا کر معزز سلطان کو یہ خوشخبری
سنا تا ہوں۔“ وہ ایک دم خوش ہو کر بولا۔ ”کیا ہی اچھا ہوتا
اگر تم بھی ہمارے ساتھ مل جیتے۔“ اس کی کھینچی ہوئی ہنسی
والی آنکھوں سے ہلاکی مکاری دیکھنے لگی تھی۔

”ابھی تو ہم صرافہ جارہے ہیں۔ کل صبح میں سلطان
بن رائد سے ملاقات کروں گا۔“ میں نے اسے اٹلنے کی
کوشش چاہی۔ وہ کچھ سوچتا ہی گیا۔ پھر اپنے ساتھیوں
سمیت واپس اپنی کار میں جا بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔

میں اور گرائٹ وہیں کھڑے ہی اس کا رکو جاتا دیکھتے رہے۔
”تم نے اچھا جواب دیا ہے!“ کار دخول اڑاتی ہوئی
دور نہیں نکل گئی تو گرائٹ نے سہکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”تم نے بھی تو ایک عدد گھونے کے ساتھ اس کی
اوقات یاد دلا دی۔“ میں بھی مسکرا کر بولا۔ ”چلو آؤ صرافہ
کھینچ کر فائل کا جائزہ لیتے ہیں۔ دیر مناسب نہ ہوگی۔“

چوڑے اور موٹے ہوتے تھے۔ عرف عام میں اسے ”کیکڑا“ یا ٹیک کہتے ہیں۔ دو کئی میٹروں کی طرح اچھلتی کودتی ہماری جیب کے تقاب میں لگ گئیں۔

یہی وہ وقت تھا جب عقب میں ہمیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی بھی آوازیں سنائی دیں۔ گرانٹ اور میں نے غیر ارادی طور پر اپنے سر پر چھکے لیے تھے۔

جیب کی عقبی باڈی سے گولیوں کے ”زٹ..... زٹ..... زٹ.....“ گرانٹ نے فوراً سیدھے ہو کر اسٹیرنگ کھایا۔

اسے ریت میں جیب چلانے کا خاصا تجربہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے جیب کو پچھلے ایسے انداز میں کھایا تھا کہ عقب میں آتی ہوئی دونوں ہائیکس اپنی ہی جموٹ میں قریب آتی چلی گئیں جبکہ گرانٹ نے بھی بریک مار کے جیب کے ٹائر جام کر دیے تھے، جیب ریت پر ذرا ٹھکرتی تھی اور کافی حد تک اٹلتے اٹلتے بھی پھرتی تھی۔ میں اگر فوراً ڈیس بورڈ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو میں جھٹکا لگنے سے اس کے اوپر ہی آ رہا ہوتا۔

محض ایک بلکے سے دھماکے سے ایک ہائیک گھرائی اور اس کے دو سواری جنہوں نے واضح طور پر چہروں پر تقاب چڑھائے ہوئے تھے اور ایک کے ہاتھ میں ہمیں کن بھی وہی نظر آئی تھی، قلابازی کمانے کے انداز میں ہائیک سے ریت پر گرے اور ان کی ہائیک اٹلی ہوئی، اس کے چاروں موٹے ٹائر تیزی سے گھومنے لگے اور انھیں بند ہو گیا۔

دوسری ہائیک کے سوار نے البتہ کمال بھرتی کے ساتھ اپنی ہائیک ہماری جیب سے گھرانے سے بچا تو لی تھی تاہم وہ بھی بالکل قریب آ کر گر گئی۔

میں جب تک سمجھتا ہوں کہ گرانٹ اپنا پتو لٹال نکال کر ان پر تلے اور دو تین گولیاں داغ چکا تھا۔ ساتھ ہی مجھے دو افراد کے چہرے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں تب تک اپنی طرف کے دروازے سے دوسری جانب کود گیا اور برقی لہری طرح جیب کی آؤلیٹا ہوا، ان تک پہنچا تو گرانٹ تب تک جیب سے اچھل کر ان سے بڑبڑا رہا تھا۔ اُدھر میں نے بھی ان پر چلائی لگا دی۔ اب باقی دو ہی حملہ آور بچے تھے۔

ایک کومیں نے چھپنے کی کوشش چاہی تھی کہ اس نے لات چلا دی، جو میرے پیٹ پر لگی۔ اذیت کی لہری میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی لیکن فوراً ہی میں اس تکلیف کو لی گیا بلکہ آتش جوش تھے یہ درد بگیا۔

ہمارا ستر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ گرانٹ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اوائی ہی گرانٹ نے راست بدلا اور اب ہم سترانہ کی جانب مائل تھے۔

ہمارے اطراف میں اب حدنگار ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ جا بجا پھیلے ریتیلے ٹیلوں پر سنہری شام کی کرنیں بکھرنے لگی تھیں۔ دور مغربی افق پر جہاں ریگزار اور فلک باہم ملے ملتے محسوس ہوتے تھے، تاریخی کرلوں کی سرخیاں بادلوں کی آوارہ کلوں کے آ رہی ہوتی تھیں۔ سامنے پیش کر رہی تھیں۔

”بیسے یقین نہیں آتا کہ جبرال نے ہمیں ایسے ہی چھوڑ دیا۔“ گرانٹ نے جبرہ لیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے شہر ہو چکا ہے کہ ہم شاہ میر کے گھر سے کچھ لے کر نکلے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں!“ گرانٹ نے کہا۔ ”لیکن شاید تم اب بھی میری بات کا مطلب نہیں سمجھ ہو۔“ اس کا لہجہ اچانک اسرار بھرا سا ہونے لگا تھا۔

”مجھ چکا ہوں میں، وہ ہمارا راستہ کھوٹا کر سکتے ہیں۔“

”بالکل درست!“

”تم راستہ بدل لو۔“

”یہی کیا ہے میں نے۔“

”ہمم.....“ میں نے پُرسوج انداز میں مونٹ سمجھ لیے۔ پھر بولا۔ ”لیکن نہیں میرا خیال کہ ابو جبرال اب کوئی ایسی ویسی حرکت کرے گا۔“

”اب ہی تو وہ ایسی ویسی حرکت کرے گا۔“ گرانٹ ترنت بولا۔ ”پہلے وہ ہم سے ویدہ دلیری سے کھرایا، جب وال نہیں لگی تو وہ دوسری حرکت کر سکتا ہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، شاید مجھے اس کی اُمید کم ہی تھی۔

ابھی ہماری جیب ریلنگ اٹلی کے وسط میں ہی تھی کہ گرانٹ اور میرے خدشات کی تصدیق ہوئی۔ اچانک فضا میں ”گھر گھر روررر“ کرتی آوازیں سنائی دیں۔

”اوہ..... کیسی آوازیں ہیں؟“ ابھی میں نے چونک کر اتنا ہی کہا تھا کہ..... دامن بائیں کے ٹیلوں سے دو ”فورڈ ٹیل“ ہائیکس نمودار ہوئیں۔

یہ بالکل ایسی ہائیکس تھیں جو ساحل سمندر کے کنارے، یار پھیلے اور تپ ہوار پہاڑیوں پر چلائی جاتی تھیں۔ ان کے چار ٹائر ہوتے تھے جو غیر معمولی طور پر خامے

سفاکیت اور زندگی کانوکھا کھیل

عالم اسلام پر تاتاریوں کی جانب سے کی جانے والی لکھ رکھی تقریباً دو دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس لکھ رکھی کے دوران تاتاریوں نے سفاکیت اور زندگی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ جن کی نظیر نہ ان سے پہلے کہیں ملتی ہے اور نہ ہی ان کے بعد، دنیا میں کسی نے اپنی مفتوح اقوام سے ایسا سلوک نہیں کیا جو تاتاریوں میں روا تھا۔ تاتاریوں نے عام اور نیچے مسلمانوں سے انتہائی بھیمانہ سلوک کیا۔ کل و غارت گری کی وہ داستانیں رقم کیں کہ انہیں لکھتے ہوئے آج کا منورج بھی کانپ اٹھتا ہے۔ شہر فتح کرنے کے بعد پوری پوری آبادی کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ خصوصاً وہ شہر جہاں مسلمانوں نے زیادہ مزاحمت دکھائی ان علاقوں میں تو انسانوں کے ساتھ ساتھ کتے اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پوشیدہ خزانوں کی برآمدگی کے لیے مشتبہ بالدار افراد پر تشدد کے سخت نئے طریقے ایجاد کیے گئے۔ مقتولین کی کھوپڑیوں کے ہتار بنانا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ شہر کے باسیوں سے تمام مال و دولت چھیننے، ان کا مکمل عام کرتے، اس کے بعد ان کے مکانات کو آگ لگا دیے تاکہ تہہ خانوں میں چھپے ہوئے لوگ بھی زندہ جل کر ہلاک ہو جائیں۔ سرحد بنیاد، توقد، اتر اور دیگر شہروں میں عام مسلمانوں اور جنگی قیدیوں سے یہی سلوک کیا گیا۔ حدود یہ ہے کہ جن شہروں کو انان دی گئی اور باقاعدہ معاہدہ کر کے قبضہ کیا گیا ان شہروں میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے یہی سلوک کیا گیا۔ ایسے مواقع پر وہ مسلمان عمامہ بن جو غداری کر کے تاتاریوں سے ساز باز کر لیتے انہیں بھی بعد میں قتل کر دیا جاتا۔

مرسلہ: شوکت فہمی۔ راولپنڈی

میں نے پھر سنبھلے ہی اس آدمی کے سینے پر ہاتھ زبردستی رکھی۔ وہ ریت پر گر پڑا اور اس کا ایک ہاتھ زبان گزنی کن پر پڑ گیا۔ وہ اسے اٹھا کر ابھی پوزیشن لینے کی کوشش میں تھا کہ میں اپنل کر اس پر چاڑھا اور ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔

اس کے ملق سے تیل جیسی ذکراہٹ ابھری، میرے دوسرے ہاتھ کے کئے نے اس کے جڑے کی توابع کر ڈالی اور اگلے ہی لمحے میں نے اس کی کن پر چھینا مارا۔ اب وہ میرے قبضے میں تھی اور میرا مقابلہ بے سہہ تھا۔

اسی وقت ایک جیم آدمی مجھ پر آن پڑا۔ ہم دونوں ہی ریت پر گرے۔ میں سنبھلا، وہ اٹھا اور اس نے لات چلائی چاہی تو گرانٹ اس پر پل پڑا۔ وہ گرانٹ کا ہی شکار تھا اور اسی نے ہی اسے اچھا لگتا جو مجھ پر آن پڑا تھا۔

میں نے لپک کر گرن اٹھائی اور ایک ہوائی برست فائر کیا۔ وہ آدمی اپنی جگہ جہاں کا تھاں کھڑا رہ گیا۔ ہم تینوں کی سانسیں بری طرح بھولی ہوئی تھیں۔ گرانٹ کا چہرہ غیظ ناک ہو رہا تھا۔ باقی دو حملہ آور ریت پر زخمی پڑے بری طرح تڑا رہے تھے۔

میں نے دیکھا ان میں سے ایک کے دائیں پہلو پر گولی لگی تھی اور دوسرے کے پیٹ میں۔ یہ گرانٹ کے شکار تھے۔ میرا شکار ہنوز بے سہہ پڑا ریت چاٹ رہا تھا۔

”اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لو۔“ میں نے حکیمانہ روشنی سے کہا۔ حملہ آور نے ایسا ہی کیا۔ گرانٹ کو میں نے مخصوص اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے چہرے سے نقاب جو ایک بڑے سیاہ رومال کی صورت میں لپٹا ہوا تھا، نوج لیا۔ وہ چہرہ ایک عیسائی بچیس سالہ نوجوان کا تھا، جو مقامی ہی محسوس ہوتا تھا۔

”کون ہو تم اور اس کے کہنے پر ہمارے پیچھے گئے ہوئے تھے؟“ میں نے سخت لہجہ میں سوال کیا۔ وہ عربی بولنے لگا۔ اسی وقت گرانٹ غصے سے دانٹ سمجھتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے پیٹ پر زوردار مٹکا رسید کر دیا۔ نوجوان اور گ کی آواز سے رکوع کے بل جھکا تو گرانٹ نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر اپنی دائیں ٹانگ کے گھٹنے کی ضرب رسید کر ڈالی۔

”رک جاذ گرانٹ! یہ کہہ کیا رہا ہے؟“ میں نے گرانٹ کو ٹوکا۔ مجھے اس کی یوں مارا ماری سے کوفت ہونے لگی تھی۔

”یہ مکر کر رہا ہے۔ سمجھتا ہے مجھے عربی نہیں آتی۔“
گرائٹ نے ہنسے سے ہانپتے ہوئے بولا۔ ”کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہمیں بے خوف بنانا ہے۔“

حقیقت یہی تھی کہ مجھے تو نہیں البتہ گرائٹ کو اچھی خاصی عربی آتی تھی۔ کسی حد تک تو میں بھی کام چلا لیتا تھا۔
اس کی چالاکی پر مجھے بھی غصہ آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر نوجوان کو گھورا اور ممکن گرائٹ کو تھمادی ہنر دونوں ہاتھوں سے اسے گریبان سے پکڑ کر دو بوجا۔

”بچ بولو گے یا تمہارا ستر بھی تمہارے ساتھیوں جیسا کر کے ہم آگے بڑھ جائیں، کیونکہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آخری موقع تمہارا ہے۔“

”ہم..... تمہیں لوٹنا چاہتے تھے؟“ نوجوان نے اٹکتے لہجے میں کہا اور اگلا لمحہ میرے گھونے کا اس کے پہلے سے مضروب چہرے پر بڑنے کا تھا۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑایا اور پاس گن تھامے کمرے گرائٹ سے ٹکرایا۔

وہ اس کی حرکت کو نادانستہ سمجھا جبکہ ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا، عقدہ چمکلا جب اس نوجوان نے گرائٹ سے ٹکراتے ہی اس کی گن پر ہاتھ مارا تھا۔ دوسرے اپنے کانہ سے کی ٹوک رہی مگر گرائٹ کے لیے یہ سب غیر متوجع اور اچانک تھا، ریت میں اس کے پاؤں ٹھیک طرح نہ جننے کے سبب وہ پیچھے لڑکھڑا بھی گیا۔

”بس! کھیل ختم!“ نوجوان نے گن تیسے میں کرتے ہی غراتے ہوئے کہا۔ میں اور گرائٹ جہاں کے تھاں اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔

اُداس شام کی ریٹیلہ ذرات اثراتی غبار آلود فضا جیسے ایک ایک قسمی گئی تھی۔ اس نوجوان نے کمال پھرتی اور چابک دستی کے ساتھ اچانک ہی ہم دونوں کو بے بس سا کر کے رکھ دیا تھا۔

”چلو، تم جیب میں بیٹھو اور اسٹیرنگ سنبھالو۔“ اس نے گرائٹ کو حکم دیا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ”اور تم اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھو گے۔ چلو جلدی۔“

”تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے تیز سے لہجے میں پوچھا۔
”بکواس بند کر داپنی، جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو، ورنہ تمہارا ایک سانھی ابھی تڑپا نظر آئے گا۔“ اس نے مجھے غوغو لہجے میں جھڑک دیا۔ مجھے اس کے تیردوانی خطرناک محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے گرائٹ سے کہا۔ ”چلو

مگر ان! جیسا یہ کہہ رہا ہے ویسا ہی کرو۔“

گرائٹ قہر آذربانی جیب کی طرف بڑھا اور میں بھی اس کے پیچھے سواریا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی وہ بھی ایک دم اچک کر جیب کی جھنجھی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

گرائٹ نے جیب اشارت کی اور نوجوان نے اسے راستہ بتایا۔ گرائٹ نے جیب اس طرف موڑ لی۔

اب ہمارا سفر انجانی منزل کی طرف تھا۔

اس دوران جھنجھی نشست میں بیٹھا وہ گن بدست نوجوان فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ گھنگھو عربی میں ہورہی تھی، میرے لیے تو کچھ نہیں پڑا، البتہ میں نے کن انکھیوں سے اپنے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر اسٹیرنگ سنبھالے بیٹھے گرائٹ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھنا اس کی زبان سمجھ اور سن رہا تھا۔

ڈرائور بعد اس نے سلسلہ منقطع کیا اور سب سے آخر میں جس راستے کی طرف ہمیں چلنے کو کہا وہ قصبہ کارڈوف کی طرف جاتا تھا۔ میں چوکا۔

ابھی تک میں اور شاید گرائٹ بھی جی سمجھے ہوئے تھے کہ ہمیں حدی ہی لے جایا جائے گا اور اسے ہم بن رانڈیا جبرال کا ہی آدھی سمجھے ہوئے تھے مگر کارڈوف تو صراحتہ اور حدی کا.... شمال اور جنوب کے فرق سے بالکل ہی مخالف سمت کا قصبہ تھا۔

مجھے یاد تھا، میرے ٹیکسی ڈرائیور فاران نے مجھے اس چھوٹے سے قصبے کے بارے میں بتایا تھا جو بھول اسی کے ہی صحرائی اعلانی کے بالکل آخری سرے پر واقع تھا۔

”یہاں میرا کون نیا دشمن پیدا ہو گیا تھا؟“ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

”کارڈوف!“ میں نے ہولے سے کہا۔ ”یہ ہمیں قصبہ کارڈوف لے جا رہا ہے۔“

گرائٹ نے سنا اور اسی طرح ہی سامنے دیکھ کر اسکرین پر نظریں اور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر جمائے ہوئے ہونٹ بچھ کر اثبات میں ہولے سے سر کو ہٹا دی تھی۔

”اے..... آپس میں کوئی بات مت کرو۔ سمجھے تم دونوں۔“ وہ ہماری کسر پرسی بھگ پاتے ہی ٹھکانہ درستی سے بولا۔ ”کیا تم بن رانڈ کے آدمی نہیں ہو؟“ میں بحس کے ہاتھوں بے یقینی ہو کر اس سے پوچھ بیٹھا۔ اس نے گن کا کندھا میرے کانہ سے پر سید کر دیا۔ درد سے میری کراہ خارج ہو گئی۔ اس تکلیف سے میرا دماغ بھنا گیا۔ مجھے یوں

لگا جیسے میری ہنسی کی ہڈی چیخ مچی ہو، میں اسے پہلانے لگا۔
 ”اب کوئی نکواس نہیں۔“ وہ جیسے سے فرمایا۔
 ”اوہ! ہمیں یہاں کسی ٹیلے کی آڈلے کر رکھنا پڑے گا۔“ اچانک ادبرائے گرانٹ نے اعلان کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ نو جوان نے پوچھا۔
 ”طوفان کی آمد کے آثار نظر آرہے ہیں۔“ گرانٹ نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں سمجھا شاید گرانٹ کوئی چال چلنے کی کوشش میں ہے لیکن جب میں نے بھی سامنے دیکھا اسکرین سے سامنے تاحہ نظر بھیجا صرا میں جھانکا تو دور جنوب مغربی اتر پر بے پناہ سرخی کے آثار دیکھے جو تیزی سے اٹھتے چلے آرہے تھے۔
 ”یہ معمول کا طوفان ہے، تم جیب مت روکتا۔“ نو جوان نے حکم دیا۔

”یہ عام طوفان نہیں ہے۔ سرخ آندھی ہے جسے یہاں ریڈ اسٹارم کہا جاتا ہے۔“ گرانٹ بولا۔ ”اس کے طوفانی اور دیویشیل بکولے ہماری جیب کو کسی کھلونے کی طرح اٹھا کر دور پھینک دیں گے۔“

وہ جوشیلا سا نو جوان شاید یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم کوئی چالاکي چل رہے ہیں لیکن مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ گرانٹ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ خود مجھے طوفان بہت خوفناک آکا رہا لیے ہوئے بدھتا دکھائی دے رہا تھا۔

نو جوان نے گمن کے کندھے کی ایک ضرب گرانٹ کو بھی رسید کر ڈالی۔ گرانٹ زور سے گرا ہوا۔ خود میں پہلے ہی اپنی اسی ضرب کے باعث ابھی تک بھٹایا ہوا تھا، نہ جانے میرے اندر جوش غیظ تلے ایسی جرات اچانک کہاں دوڑائی، میں نے دانت پیستے ہوئے نہایت پکڑتی کے ساتھ نو جوان کی ٹھوڑی پر ہلکا رسید کر دیا، یہ دلو تھا جب وہ گرانٹ کو اپنی گمن کا کندھا رسید کرنے کے لیے ذرا آگے کو بھٹکا تھا۔

اس کے ملنے سے ”اوخ“ کی آواز خارج ہوئی، اس نے سنجیدگی کی کوشش کرنا چاہی مگر مجھ پر غیظ جنوں سوار ہو چکا تھا، میں اپنی سیٹ سے نصف اٹھ کر عقب میں گھوما اور اس کی گمن کی نال دیوچ لی۔

ہماری زور آزمائی جاری تھی کہ گرانٹ نے جیب کا اسٹیرنگ تیزی سے گھمایا۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ اس کی غلطی تھی، کیونکہ اس طرح میرا توازن بگڑ سکتا تھا اور وہ نو جوان سنبھل کر مجھ پر غالب آسکتا تھا لیکن ادبرائے گرانٹ نے سوچ سمجھ کر ہی کچھ ایسی ڈائریکشن میں جیب کا اسٹیرنگ

گھمایا تھا کہ میرا توازن انہیں البتہ اس نو جوان کا توازن ضرور بگڑا تھا، وہ اور آگے کو جھک آیا تھا اور اس بار گرانٹ کے دائیں بازو کی کھنسی پکلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی تھی، جو اس کی ناک پر پڑی، اور ہیک وقت میرا ناک بھی ہتھوڑے کی طرح لہرایا اور اس کے جڑے پر پڑا۔

نو جوان اس دہرے تہرے حملوں سے ڈھے گیا۔ پھر میں نے اسے چمپائے میں دیر نہیں لگائی۔

”نوی اتم اسے سنبھالو، میں جیب دوڑا رہا ہوں۔“ طوفان نزدیک آرہا ہے۔“ گرانٹ نے چیخ کر کہا اور ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔

اس نے اسٹیرنگ کا ناکا اور میں نے نو جوان کو جس کا چہرہ خونوں خون ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے گمن چھین کر اس کے برابر میں ہی پینٹ گیا۔ وہ بے سدھ ہو کر سیٹ پر ہی لڑھک گیا تھا، میں نے اسے ذرا سیدھا کر کے سیٹ کی پشت کاہ سے لگا دیا لیکن جیب کے تیزی سے ٹرن لینے کے دوران وہ بھر بھر پر لڑھک آیا۔ میں نے پھر اس کے بے سدھ وجود کو دھکا دیا۔

تب ہی میری نظر اپنے قدرے عقب میں اور دائیں جانب کھنڈی سے بار پڑی تو میری آنکھیں پھیل گئیں۔

ایک سرخ رنگ کی چارڈی طوفانوں مرغولوں کی صورت میں ہمارے نقاب میں آ رہی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس نے ہمیں جیب سمیت اپنے زرخے میں لے لیا۔

شائیں..... شائیں کرنی خوفناک آوازیں کانوں کے سامتوں کو بھینچنا رہی تھیں۔

”جب روک دو، ورنہ الٹ جائے گی۔“ میں چلایا لیکن گرانٹ نے شاید آندھی اور طوفان کے شور و غلبہ میں کچھ شای نہ ہو۔ وہ جیب کی رفتار بدھتا ہی چلا جا رہا تھا جبکہ حقیقت یہی تھی کہ آندھی کی چادر ہمارے چاروں طرف تن جکڑی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے دوبارہ چلا کر گرانٹ کو یہی ہدایت کی اور اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے جیب بری طرح ڈول رہی ہو اور دوسرے ہی لمحے وہ خوف ناک ”شائیں..... شائیں“ کرنی طوفانی آوازیں کے ساتھ ہی اچلی۔ میں لڑھک گیا، گمن ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گرانٹ کی چیخ ابھری۔ جیب کسی کھلونے کی مانند اچلی اور پھر زمین پر آ رہی، میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔

گرد و غبار اور طوفانی ہواؤں کے ساتھ ریت کے

”کر سکتے“ ذرا تھوڑے اور تھوڑے میں گھر میں۔ دم بھٹنے جیسی کیفیت ہونے لگی۔ میں بھی چلانے لگا۔

جب الٹ کر شاید ریت میں جنس مٹی تھی۔ گرائٹ میرے اور آگن گرا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا شاید اس کے سر پر جب کا کوئی اگنی راڈ یا ٹھوس فریم لگا تھا، میری حالت قدرے بہتر تھی۔ اب تو آنکھوں میں بھی ریت مٹی جارہی تھی۔ ان میں تیز جھپٹ کا بھی احساس ہوتا تھا۔ چوٹیں مجھے بھی آئی ہوئی تھیں مگر وہ قابل برداشت تھیں۔

میں نے خود سمیت گرائٹ کے بے سدھ جسم کو بھی سنبھالا اور یہ دیکھ کر میں لرز سا کیا کہ جب کے اندریوں تیزی سے ریت بھرنے کی تھی جیسے جب کسی گھرے پانی میں جا ڈولی ہو اور جس طرح پانی تیزی سے بھرنے لگتا ہے، کچھ یہی حال جب اور ریت کا تھا۔

میں اگر ذرا بھی تسلی پاؤں تو یہی سے کام لیتا تو ہمیں ہماری ریت کی قبر بن جاتی۔

میں نے گرائٹ کے بے ہوش مگر کراہیل وجود کو سنبھالا دیا اور کسی طرح کھینچ کر جب سے باہر نکال لایا مگر یہاں صورت حال اور بھی ڈر کر گوں ہونے لگی تھی۔

میں نے اپنے ہونٹ کھینچ رکھے تھے تاکہ ریت نہ میں نہ گھسے، آنکھیں مھولے رکھنا اگرچہ مجبور تھی مگر وہ بھی ضرورت کے تحت ہی داکرنا۔ مٹی اور ریت سے میں اور گرائٹ بری طرح اٹ بنے تھے اور بھوت ہی نظر آ رہے تھے۔ یوں جیسے بھوت بل دیا گیا ہو۔

تیز طوفانی ہوائیں مجھے کھینچنے کو در پے تھیں، میرا گرائٹ کو سنبھالا دینا دو بھر ہونے لگا، اسی لیے میں اس کے جسم کے ساتھ تقریباً لپٹ ہی گیا تھا تاکہ وزن بڑھنے کے سبب یہ طوفانی مرفوے مجھے دور نہ کھینچ کر لے جائیں، دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ آگمی کے زور کا رخ جانچ کر ریت پر اٹھی پڑی جب کی اس طرح آڑ میں آگیا کہ تیز رفتاری ہواؤں کے دباؤ کا کم سے کم فائدہ رہا۔

جو کفر پڑا اور میں جب کی پاؤں سے ٹک لگا کر تپتی سے اسے دوپچے پڑا رہا۔ گرائٹ کو بھی میں نے خود سے جدا نہیں کیا تھا بلکہ اسے تو میں نے خود سے یوں کھینچ لیا تھا جیسے وہ میرا کوئی صدمہ یوں بچھا ہوا بھائی ہو۔

کافی دیر تک یہی طوفان رینگ کا شور جاری رہا، پھر رفتہ رفتہ اس میں کمی آتی گئی۔ میں نے بھی سکون کی سانس لی۔ خوفناک آوازوں کا شور تھا تو میں گرائٹ کو ہوش میں

لانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اسے ہوش آنے لگا، وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے پہلے تو اپنے چہرے سے اور پھر اس کے چہرے سے ریت مٹا دی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو ”پانی..... پانی.....“ کی ٹھکرار کرنے لگا۔ اسے شاید ابھی اندازہ نہ تھا کہ یہاں کسی بے سروسامانی کا عالم تھا۔

طوفان کے تھمتے ہی ہر سو ایک دم عجیب سا ساٹا طاری ہو گیا تھا۔ منہ میں ریت بھرنے کی وجہ سے ”کرک“ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہی حال بے چارے گرائٹ کا تھا وہ بار بار تھو..... تھو..... کر رہا تھا۔

”گرائٹ! ہوش میں آؤ، طوفان ختم چکا ہے۔“ میں نے اس کا گل تپتیا۔ ہوش میں تو وہ ابھی چکا تھا میں چاہتا تھا وہ اپنے حواس بھی جلد ہی بحال کر لے تو کچھ آگے کا سوچا جائے۔

ایک عجیب بات مجھے محسوس ہوئی تھی۔ طوفان کے تھمتے ہی قطعاً میں ایک دم جس کی ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ آسمان ابھی تک سرخ تھا۔ شام بھی گہری ہو چلی تھی اور رات کا گمان ہونے لگا تھا۔ پہلے گرا اور دل دھڑکا دینے والا ایسا ساٹا طاری ہو گیا تھا جیسے ابھی بچہ ہونے والا ہو، جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔

اس زخمی اور بے ہوش حملہ آور نوجوان کا نبھانے اس طوفان نے کیا حشر کیا تھا اور وہ کہاں اسے اڑا لے گیا تھا مجھے نہیں پتا تھا۔

”اوامی گاڈ! یہ کیسی قیامت آئی تھی۔“ گرائٹ ہوش میں آنے کے بعد ذرا کراہا تو بولا۔

”حوصلہ رکھو گرائٹ! خیریت رہی۔“ میں نے ہولے سے اس کا شانہ تپتیا تو بولے کہا۔ ”دور نہ آگ میں تمہارے بے ہوش جسم سے لپٹ کر جب اور ٹیلے کی آڑ تک نہ لاتا تو ہم دونوں ہی گھسے تھے۔“

”تمہارا شکر یہ دوست!“ گرائٹ نے ممنون بھرے لہجے میں کہا۔ ”جب کے اللہ سے میرا سر کی سخت شے ٹھکرا تھا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔“ پھر چند لمحہ ادھر ادھر نظر کر گھماتے ہوئے پوچھا۔ ”ذہن کدھر گیا؟“ ”اسے شاید سرخ آگمی کا بکولا لے اڑا ہے۔“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

”ہن رانک ایک کبر کا بداعتاد اور کینہ فحش ہے۔ ایوچر ال کے بعد اس نے دوسرے لوگوں کو بھی میری راہ کوئی کرنے پر لگا رکھا تھا۔“

”میں صرف تمہاری آخر الذکر بات سے اختلاف کروں گا۔“ میں نے اسرار بھرتے لہجے میں کہا۔
”کیا مطلب؟“

”ہاں! دوسری بار حملہ کرنے والوں کا تعلق کسی اور گروہ سے ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے، ابوجہال کے بعد ہم سے ٹکرانے والے ان کے سامنے نہیں بلکہ کوئی اور تھے؟“
”ہاں!“

”کون تھے پھر وہ؟ ہمارے تو ایک ہی دشمن گروہ کے لوگ ہیں۔“ وہ بولا۔

”میں نے ہونٹ بھیج کر کچھ سوچا اور پھر بولا۔ ”میں خود ابھی ان کے بارے میں اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔“

”اب کیا کریں؟“ وہ بولا۔ پھر اپنی جینیں دبھینے لگا۔ اسے سیل فون تلاش کیا کر میں نے بھی اپنی جیب میں

ہاتھ ڈال دیا۔ اس کا تو سیل فون نہیں کر کے غائب ہو چکا تھا لیکن شکر تھا کہ میرا سیل فون سلامت تھا، میں اس سے

شہزادی نئیم سے رابطہ کرنے لگا تو معلوم ہوا یہاں مشکل کا مسئلہ تھا۔ اسکرین کے کونے میں ان کا سیل فون غائب تھا۔

”کیا ہوا؟ رابطہ ہوا کسی سے؟“
”نہیں، سیکل کا ایڑا آ رہا ہے۔“ میں نے کہتے ہوئے

بے بسی سے ہونٹ بھیج لیے۔
”تم احتیاطاً شہزادی نئیم اور ابوشاہ کے سیل پر ایک

ایس ایم ایس بھیج دو۔ سیکل اب ڈاؤن ہوتے رہتے ہیں۔
مجھے ہی آن ہوگا تو کم از کم یہ پیغام تو مل ہی جائے گا نہیں۔“

گرائٹ نے مشورہ دیا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور کوشش کی کہ مختصر الفاظ میں کام کی بات پہنچا سکوں، ہم اس وقت ریل

ایٹلی کے کس مقام پر تھے، اس کی لوکیشن میں نے گرائٹ سے پوچھ کر لکھ دی تھی اور پیغام بھیج کر دیا۔

ایک ایک وہ میری طرف غور سے اور بتانے دیکھنے لگا۔
اسے یوں اچانک خود کو گھورتا پایا کہ میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو میری طرف تم گرائٹ؟“

”فائل کہاں ہے؟“ اس نے اچانک پوچھا اور پھر جیسے میرے بہروں تلے ذہن نکل گئی۔

”میرے خدا!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں پلٹا اور ہاتھوں کی طرح، الٹی پڑی جیب کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکھ دو وہ وقت مقب سے مجھے اوبھانے لگا۔ گرائٹ کے ہاتھ سے فائل نکالنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں اس کا یہ شعار مجھے سخت ناگوار کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ اچھا خاصا سنجیدہ انسان تھا لیکن حالات کا دھیرہ بھی الگ ہوتا ہے۔ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ پاگل بن بھی پیدا کرتا ہے اور یہ ایک طرح کی بے بسی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس صحرائی طوفان کے بعد تو جیسے میں خود کو بھی بھول گیا تھا۔ فائل بھلا کیا یاد رہتی۔ ابھی گرائٹ کے پوچھنے پر یاد آئی تو میرے اوسان

خطا ہو گئے اور میں جنون کی ممانعتی پڑی جیب کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک اندھیرے میں میرے ٹوٹے ہاتھوں سے کوئی شے ٹکرائی اور میں نے اسے باہر بھیج لیا۔ جالی پھٹائی

شے ہاتھ لگنے ہی بے اختیار میرے منہ سے سکون کی سانس خارج ہوئی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ فائل

ہی تھی۔
”مل گئی فائل؟“ گرائٹ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ہاں!“
”شکر ہے۔“

”لیکن تم نے فائل کس بات پر لگا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گھور کر پوچھا۔ میری بات پر وہ

ہولے سے سکرایا اور بولا:
”تمہاری حالت پر فائل کے ذکر پر جس طرح

تمہارے اوسان یک دم خطا ہوئے تھے اس نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ویسے یہ میرا دو ستارہ انداز ہے۔ تمہیں برا لگا

نہ تو معاف کر دیتا یا را۔“
اس کے لہجے میں جانے ایسی کیا ذندہ دلی تھی میں بھی

ہنس دیا۔ ہم دونوں ہی ہنسنے لگے۔ میں نے کہا۔ ”بات تو تمہاری بھی غلط نہیں تھی۔ یہ فائل جانے کیوں مجھے بہت

اہمیت کی حامل معلوم ہو رہی ہے۔ میرا ازل و بحن شاہ میر، شاید مرتے مرتے مجھ پر کوئی بڑا احسان کر گیا ہے۔“

”اب جلدی صرافہ کچھ کر اس فائل کا جائزہ لینا چاہیے لیکن.....“ کہتے کہتے اچانک گرائٹ رکا، میں نے

اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ میرے عقب میں یک تک کہیں دیکھنے لگا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا اور جیسے ہی اس کی نگاہ کی سیدھ میں مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا تو مجھے اس کا جواب

بھی مل گیا۔
 سامنے تاریکی میں کچھ روشنیاں لہراتی دکھائی دے رہی تھیں۔
 ”کیا یہ کوئی قافلہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، یہ دشمن ہیں۔“ گرانٹ کھنٹی ہوئی متانت سے بولا۔
 ”دشمن؟“

”ہاں! تم شاید اس نوجوان کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے، جو فون پر اپنے کسی ساتھی کو تازہ اطلاع دیتے ہوئے اس سے مدد کا تقاضا کر رہا تھا۔“
 ”اوہ!“ میرے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔ میں نے ریت میں نصف سے زیادہ دھنسی ہوئی جیب کو جھرت سے دیکھا۔
 ”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مراٹھ سے کوئی مدد آئی ہو۔ میرا مسیج مل گیا ہو شراودی نلیم کو؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔
 ”یہ ابھی بعید از قبس ہے۔“ اس نے کہا اور میں سوچنا بن گیا۔
 ”جلدی آؤ میرے ساتھ..... دوڑو۔“ اچانک گرانٹ یہ کہتے ہوئے پیچھے پلٹا۔ میں نے فوراً اس کی ہدایت کی اور بولا۔

”میرا خیال ہے ہم اس طرح دوڑ کر ان سے زیادہ دیر تک نہیں بچ سکتے۔“
 ”تم دوڑتے چلوں!“ وہ چیخا۔
 تھوڑی دیر بعد ہی مجھے گرانٹ کی ہنسی فرست اور چابک دستی کا قائل ہونا پڑا۔
 دفعتاً ہی وہ رک گیا اور بڑا حال سا ہو کر ریت پر گر پڑا۔ میں بھی بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ جہاں وہ گرا تھا، اس جگہ ریت پر کوئی شے نصف حد تک دھنسی ہوئی دکھائی دی تھی۔

فور سے دیکھنے پر میں چونکا۔ وہ ”کیڈا“ بانیک تھی۔
 ”میرا اندازہ درست نکلا۔ آؤ جلدی سے باہر نکالو۔“ گرانٹ بولا۔ ہم دونوں ریت کے اندر دھنسی بانیک کو باہر نکالنے میں جت گئے۔ روشنیاں ادھر ادھر پھیلنے لگی تھیں، جس کا مطلب تھا ہماری صحرا میں اسی مقام پر تلاش جاری تھی جو حمران کے ساتھی نوجوان نے نشانہ دی کی ہوگی۔

گرانٹ کا اندازہ اس لیے درست ثابت ہوا کہ مذکورہ ست جہاں ہماری کیڈا بانیک سواروں سے ڈبھبڑ ہوئی تھی، وہاں ان کی بانیکس موجود تھیں، اگرچہ آمدنی طوفان کے سبب وہ بھی ادھر ادھر جا بھری تھیں، تاہم گرانٹ کو کچھ اُمید تھی کہ انہیں تلاش کی کوشش کی جائے تو ان دو بانیکس میں سے کوئی ایک تو ہاتھ لگ ہی جاتیں۔
 وہ کہتے ہیں تاکہ جو انسان اُمید سے خالی ہوتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا، اُمید کی ہلکی سی جوت بھی غیر متوقع کامیابی سے ہلکا کر دیتی ہے۔

ہم دونوں کی کوششوں سے بالآخر ریت میں نصف سے زیادہ دھنسی ہوئی بانیک باہر آئی۔ گرانٹ فوراً اس پر سوار ہوا، یہ سیلف اشارت تھی۔ دو تین بار کی کوشش سے وہ اشارت ہوئی اور میں فوراً اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔
 گرانٹ نے اس کی ہیڈ لائٹ آن کر دی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ ہمارے پاس فقط ایک ہی گن تھی جو میں نے سنبھال رکھی تھی۔
 ”روشنیوں پر نظر رکھو۔“ گرانٹ چیخا۔

”بے فکر رہو میں رکے ہوئے ہوں ان پر نظر۔“ میں نے بھی چلا کر جواب دیا۔ ”روشنیاں اب ہمارے تعاقب میں ہیں۔“ میں نے اسے مطلع کر دیا۔

”یہ دو تین سے زیادہ گاڑیاں نہیں لگ رہیں۔ میرا اندازہ ہے ان میں سات آٹھ افراد اور دو سوار ہوں گے۔“
 میں اسے بتاتا جا رہا تھا کہ اچانک ہماری بانیک اچھلی، ایک زوردار جھٹکا لگا۔ مجھے اس قسم کی کیڈا بانیک پر بیٹھنے کا کبھی تجربہ ہوا تھا اور نہ ہی غالباً گرانٹ کو اسے چلانے کا موقع ملا ہوگا، شاید اسی سبب بانیک بے قابو ہوئی اور لائٹ مٹی، ہم دونوں ہی ریت پر آن گرے۔ بانیک ”مگھوں مگھوں“ کرتی رہی۔ میں سنبھلا اور دوبارہ اٹھ کر بانیک کی طرف بڑھا۔ اس کا انجن بند ہو گیا۔ میں نے اسے فوراً سیدھا کیا اور اسے اشارت کرنے کی کوشش چاہی مگر بے سود۔

”اس طرف بھاگو، چھوڑ دو بانیک۔“ اچانک گرانٹ تعاقب میں آتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر چلا کے بولا۔
 ہم دونوں دوڑ پڑے۔ گن اب گرانٹ کے ہاتھ میں تھی اور میرے ہاتھ میں فائل۔
 اسی وقت گولیوں کی تڑا تڑا بھری۔ ہم دونوں فوراً ریت پر گر گئے۔ دشمن لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہے تھے، اب تو

ان کی گاڑیوں کی آوازیں تک سنا دی گئی تھیں۔

قریب ایک ٹیلا تھا، ہم نے اسی طرف کہوں اور کھٹنوں کے سہارے ریٹکنا شروع کر دیا۔ اس کی آڑ میں آتے ہی گرانٹ نے کن تان لی۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے بھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہم بھی شاید دیکھ لیے گئے تھے۔ دشمنوں نے ٹیلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کی گاڑیوں کی تیز لائیں ہم پر پڑنے لگیں۔

”فائرنگ مت کرنا گرانٹ! ورنہ یہ ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔“ میں نے اسے تنبیہ کیا۔ وہ بھی شاید صورت حال کی سنگینی کو سمجھ رہا تھا اس لیے محض کن پکڑ کر رہ گیا۔

ہماری بے بس نظریں دشمنوں کو کنے جارہی تھیں، وہ دوبارہ بڑکی چپوں اور دو کھڑا ہائیکس میں سوار تھے اور ہماری بے بسی سے شاید وہ بھی حفا تھا رہے تھے۔

وہ سب ہی سا نظر آ رہے تھے۔ چند ایک نے توجہ کے نشے میں بھولی فائرنگ بھی کر ڈالی تھی۔ میں اور گرانٹ بے بسی سے دانت پتیر کر رہ گئے۔

اس کے بعد انہوں نے گھبراہٹ میں دیکھ لیا۔ ان کا تعداد چھ، سات کے قریب تھی۔ وہ سب ہی رخ تھے۔ قد کے دراز اور خوب تھے کبھی.... کے نقوش گاڑیوں اور چہروں کی رنگت سناوٹی تھی۔ صورتوں سے ہی یہ بد معاش دکھائی دیتے تھے۔

چاند کی چمکتی ہوئی تیز طلسماتی سی روشنی میں ان کے چہرے ہم پر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہونا تھا کہ... ان کا حلق کسی اور ہی قبیلے سے تھا۔ یعنی نہ مراٹھ سے متعلق محسوس ہوتے تھے اور نہ ہی حوی کے قبیلے سے ان کا تعلق لگتا تھا۔ عجیب ”بد“ قسم کے لوگ دکھائی دیتے تھے یا پھر کوئی خانہ بدوش صحرائی قبیلہ تھا یہ۔ لیبروں کا خدشہ بھی ذہن... میں ابھرتا تھا۔

گرانٹ نے گن پھیک دی تھی اور مجھ سے انہوں نے فائل چھین لی تھی۔ ایک نے اسے کھول کر دیکھا اور بے وقعت جان کر دروازے کی طرف اچھال دیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا اور میں فوراً بے اختیار اسے اٹھانے کو پکاء اسی وقت برسٹ چلنے کی آواز ابھری اور میں اچھل کر رہ گیا۔ میرے قدم وہیں جا رہے ہو گئے۔ کسی نے ریت پر میرے

پروں کے قریب فرسٹ فائر کر دیا تھا۔ مقصد مجھے آگے بڑھنے سے روکنا ہی تھا۔

”اس فائل میں میرے اہم کاغذات ہیں۔“ میں نے ان سے ملتا نہ انداز میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور بھراورد میں کہا مگر کسی نے توجہ نہ دی یا وہ بھر شاید اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور بولی سمجھتے ہی نہ تھے۔

تیز ہوائیں اب بھی چل رہی تھیں اور فائل کل گئی تھی، اس کے اندر کلپ کیے ہوئے کاغذات پھڑ پھڑا رہے تھے۔ یوں جیسے خبر سے سے آزاد ہونے کے لیے مقید پرندہ پر پھڑ پھڑاتا ہے۔ یہی نہیں ایک اور اس کا سامنی کچھ زیادہ ہی خرد باغ ثابت ہوا۔

اس نے مجھے ریت پر پڑی فائل کو گھورتا پکارا پی کن سیدھی کی اور فائل پر گولیوں کی بو جھاڑ کر ڈالی۔ فائل میری پھٹی پھٹی نظروں کے سامنے پڑہ پڑہ ہو گئی۔ اس کے کاغذات اوپر اور جل کر الگ ہو گئے، صحرائی ہواؤں نے ان جلے ہوئے پڑوں کو اوپر اوپر بکھیر دیا۔

اتنی سخت اور جانوں کا ریک لے کر جو فائل ہم نے حاصل کی تھی اسے ان جاہل جلیگوں کے ہاتھوں برباد ہوتا دیکھ کر میرا جہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

یہ وحشی... قسم کے لوگ تھے، اسی لیے شاید گرانٹ بھی سردست ان سے بچا لینے کے موذی نہ تھا۔

جب ہی مجھے کسی نے دکھا دیا اور میں دوسرے جنگی سے ٹکرا کر ریت پر گر کر... وہ سب قہقہے لگانے لگے۔ اس کے بعد ہمیں دیوبند کرچپ میں بٹھا دیا گیا اور روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

”فائل کے برباد جانے کا مجھے بے حد قلق ہوا تو ہی۔“ گرانٹ نے ہولے سے سانسفانہ آواز میں کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کالے شیطان پر ہاتھ ڈالنے کا ایک اہم راستہ ہم کو چکے تھے۔

مجھ پر شاید قسم کی قوطیت طاری ہو گئی تھی۔ دل و دماغ بو جھل ہونے لگا تھا۔ سینہ سوزاں میں ایک آگ سی بھڑک رہی تھی اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ان ساتوں جاہلوں کو ایک ہل میں گولیوں سے بھون کر رکھ ڈالوں جبکہ ابھی تو ہم خود ان کے دم و دم پر تھے۔

”اب فائل کے جانے کا نام چھوڑ دو می! آگے کی فکر کرو۔“ گرانٹ نے میرے کان میں پھر سرگوشی کی۔ جیب کی عقیب نشست پر ہمیں ساتھ ساتھ بٹھایا گیا تھا اور ہمارے

ہاتھوں کو پٹ پر جمھا کر باقاعدہ پائیگیا تھا۔
کرانت نے اپنی بیانی جاری رکھا۔ ”مجھے یہ کوئی اور
نیا پکڑ کھائی دیتا ہے۔“

”کرانت! امیر اس وقت دماغ بالکل کام نہیں کر رہا
ہے۔“ بالآخر میں نے جملائے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ بے
چارہ چپ ہو رہا۔ مجھ پر چڑچاہٹ طاری رہی۔
انجانی منزل کی جانب اور نامعلوم دشمنوں کی غیر یقینی
”سنگت“ میں یہ مشکل کوئی پندرہ بیس منٹ تک ہی محیط رہا
ہوگا کہ آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ صحرائی زمین بھی خشک
اور خیر ہونے لگی تھی۔

آبادی کیا تھی بس کچھ مکانوں کے کنڈریلے سے
آمار تھے، انہی کے بیچ میں جو بیڑ نما مکانات تھے۔ وہاں
مشطیلین روشن تھیں، بجلی کے آمار بھی نظر آتے تھے کیونکہ ہائی
لینٹن تاروں کے پلوں بھی کافی کافی فاصلے پر نظر آتے تھے۔
بستی پر تاری اور دم دم روشنی کا استخراج عجیب
تاثر دیتا محسوس ہوتا تھا۔

ایک نسبتاً بڑی سی عمارت کے سامنے گاڑیاں رک
گئیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ وہاں دو تین چند اور بھی رخ
افراد اعدہ سے نکل آئے۔ ہمیں دیکھ دیکھ کر اندر لے جایا
گیا اور ایک چھوٹے سے ہال میں کھڑا کر دیا گیا۔ وہ ایک
فرشی نشست گاہ ہی تھی۔

پرانے دور کا تاثر محسوس ہوتا تھا یہاں۔ دیواروں پر
مشطیلین نصب کی ہوئی تھیں اور قالین پر چند افراد لمبے
چوٹے سے پہنے بیٹھے تھے، انہی میں ایک شناسا آدمی کو دیکھ
کر میں بری طرح چونکا تھا اور اس کے ساتھ ہی میری رگوں
میں خون کی گردش بھی تیز ہونے لگی تھی۔

وہ شناسا آدمی شیخ عالی جاہ تھا، وہی عالی جاہ جس کے
بھائی سلطان کو میری وجہ سے مرافد میں چھائی پر چڑھا دیا
گیا تھا اور جس جھگڑے کی ابتدا میرے پاکستان سے بحرین
آتے وقت طیارے کے اعدہ ہوئی تھی۔

وہ میری طرف بڑی خوش اور نرم کھائی ہوئی نظروں
سے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک اور خود مند شخص بھی
گاؤ کی قریب کیے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے اپنی وضع قطع سے ان
سب کا کوئی سردار تپ آدمی لگتا تھا۔

لیکن میرے لیے ایک عجیب بات یہ تھی کہ عالی جاہ مجھے
یہاں ان کا کوئی مہمان ہی محسوس ہوا تھا کیونکہ اس کی وضع
قطع ان سب سے مختلف تھی۔

”سچان لیا مجھے مسٹر نعمان؟“ عالی جاہ بدستور مجھے
گھورتے ہوئے بولا۔

”بہت اچھی طرح!“ میں نے مختصر جواب میں کہا۔
”مجھے بھی یقین تھا کہ تم مجھے بولنے کی غلطی بھی نہیں
کرو گے۔“ اس کے جیسے لہجے کا تنہا زہر میں بجھا ہوا
تھا۔ ”میرے بھائی سلطان کی قبر کی مٹی ابھی تک نم ہے اور
میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کے خشک ہونے سے پہلے تمہیں
عبرت ناک موت سے ہٹا کر روں گا۔ آج میری قسم کے
پورا ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔“

کرانت بھینکا بس کہ جیران و پریشان ہوا ہوگا۔ کیونکہ
اسے اس معاملے کا کوئی علم نہ تھا۔ ممکن تھا غائبانہ طور پر کوئی
سن گن لی ہو۔ وہ ایک دم بولا۔

”یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم لوگوں کا شکار نہیں
ہوں۔ مجھے یہاں سے جانے دیا جائے، میں آپ کا مشکور
رہوں گا۔“ کرانت نے عالی جاہ سے ملتھانہ لہجے میں کہا۔

میری اور عالی جاہ کی گفتگو سے کرانت نے جو کچھ
اندازہ لگا لیا تھا وہ درست تو تھا ہی لیکن مجھے اس کی چالاکی
سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی، لہذا کچھ میں نے بھی بیدار مغزی سے
کام لیتے ہوئے مصنوعی پیش کا مظاہرہ کیا اور اس کی طرف
گردن موڑ کر غصے سے بولا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟
میرے تم پر اتنے احسانات ہیں..... اور تم.....“

”بھائو! میں گئے تمہارے احسانات!“ وہ بھی جیسے
خار کھائے لہجے میں مجھے گھور کر بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ
مجھ پر بہت پہلے سے ادھار کھائے بیٹھا ہو۔

”تم شہزادی نیلم کے غلام ہو کر رہ گئے ہو اور بس!
جبکہ میں اس کی چالاکی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ

مرافد کی مرز میں ایک عرب سچ کے ہاتھوں فروخت کر کے
سارا روپیہ اسپتھ کرالینڈ اسے ایک خفیہ عاشق کے ساتھ
شادی کر کے ساری زندگی وہیں گزار دیتا جاتی ہے۔“

میں ہی نہیں کرانت بھی جانتا تھا کہ اس وقت مرافد
اور شہزادی نیلم والا ”ایمو“ کس قدر ”ہاٹ“ اور ”ہائی
لائٹ“ تھا۔ اسی لیے دانت اس نے اس موضوع کو جو میسر
ہوئے شہزادی نیلم سے متعلق ایک لغو اور جھوٹی بات کہی تھی۔
ساتھ ہی میں نے کن انہیوں سے اور کچھ چوری نظر عالی جاہ
کے چہرے پر بھی ڈالی تھی، جہاں مجھے اس ”ڈرامے“ کی اثر
پذیری کے خاطر خواہ اثرات نظر آئے۔

وہ اپنی جمنوسیکلر کڑھار جھٹکھانہ بحث کو بڑے

مجھے اسی حالت میں وہاں چھوڑ کر وہ دونوں چلے گئے اور باہر سے دروازہ بند کر کے بالفاظ دیگر لاک کر دیا۔
میں نے ایک گہری سانس لی اور دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔

ہم دونوں کی بجائے صرف مجھے یہاں قید کرنا اور گرانٹ کو وہیں روکے رکھنا، اس بات کی کوئی گواہی تھی کہ ہمارا ڈراما رنگ جانے لگا تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کس قدر ہم دونوں کے لیے سودمند ثابت ہو سکتا تھا؟ تاہم مجھے گرانٹ کی ذہنی فراست پر بھی بھروسہ تھا کہ اتنی سی کامیابی بھی اس کے لیے کم نہ تھی، وہ ان لوگوں کو مجھ سے دشمنی کا تاثر دینے کے بعد اب انہیں مزید شے میں اتارنے کی کوشش کرے گا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کی بندشوں پر توجہ مرکوز کی اور ان جکڑ بندوں پر زور دے کر وہاں شروع کر دی لیکن زیادہ دیر تک میں یہ کوشش جاری نہیں رکھ سکا، کیونکہ وہ اس قدر مضبوطی اور جفا کر رہا تھا کہ مجھے سمجھنے سے کہ انہیں زیادہ جینش بھی دینے پر وہ دھکے کھائے تھے۔

میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور دیوار سے سر ٹکا کر خود کو گویا تن بے تھک کر دیا۔ حالات میری توقع سے زیادہ تیزی سے بدلتے چلے گئے تھے یا پھر میری ڈگری ایسی راہ پر چل نکلی تھی کہ جہاں تک وہ جین کا یا راہی نہ رہا ہو لیکن میں بھی کب بہت ہارنے والا تھا، تاہم میری بہت اور حوصلے کو جس چیز نے زیادہ دھچکا پہنچایا تھا وہ قائل تھی۔ اس کے زیاں کا مجھے بے حد قلق ہو رہا تھا، اس قدر کہ میں اس موجود وقت کی گنجینی کو بھی فراموش کیے ہوئے تھا، جس نے مجھے ایک ایسے زخمی سانپ کے سامنے لایا تھا جو مجھے ڈسنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

عالی جاہ کو یقیناً اپنے بھائی سلطان کی موت کا قلق تھا اور وہ اس کی وجہ مجھے ہی سمجھتا تھا۔ حالانکہ میں نے تو قبر سے جمع میں اطلاع یہ کہہ تھا کہ میں سلطان کو معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بے شک یہ دردناک منظر دیکھنے کے لیے بد نصیب سلطان کا بھائی عالی جاہ وہاں موجود نہ تھا مگر اس کا کوئی نہ کوئی بھی خواہ وہاں موجود ہو گا۔ اس نے ضرور یہ بات اسے بتائی بھی ہوگی لیکن باوصف اس کے وہ..... مجھ سے انتقامی سلوک روا رکھے ہوئے تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ ایک روشن دان چھت کے قریب تھا۔ اس میں آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ وہاں سے باہر

خوار سے سننے میں چھٹا۔
”تم اپنی کو اس بند کرد، جھوٹ بولتے ہو تم؟“ میں نے گرانٹ سے درشت لہجے میں کہا۔

”ارے..... تمہیں کیا پتا تمہاری اس شہزادی نلیم کو اسی بات پر کوئی بلیک میل بھی کر رہا ہے اور وہ اس کا منہ بند کرنے کے لیے اسے ہر ماہ ایک بڑی رقم سے بھی نوازے ہوئے ہے لیکن بعد میں اس بے چارے کو قتل کر دیا گیا مگر شہزادی نہیں جانتی کہ اب وہ سارے ثبوت میرے پاس موجود ہیں لیکن میں بے خوف نہیں ہوں کہ خود کو ظاہر کر کے شہزادی کو بلیک میل کروں۔ چھپ کر اس سے پیچھے انہوں گا۔“

”اب میں تمہاری چالاکی سمجھا، تم کس لیے صراحتہ میں مقیم ہو، مجھ سے دوستی بھی تمہاری اسی غرض کے پیش نظر تھی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
یہ کہتے ہوئے میں چار حانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اپنے سر کی ٹکڑ.... جان بوجھ کر اس کے منہ پر مارنے کی بجائے سینے پر ماری۔ وہ لڑکھڑایا اور پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے اپنا نواز نہ برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔

مجھے دو افراد نے دے بوجھ لیا اور گرانٹ کو بھی سنبھالا گیا۔ عالی جاہ کے ساتھ بیٹھے سردار عجیب آدمی نے عربی میں اپنے ساتھیوں سے چکمانہ کچھ کہا۔ جس سے میرے اندازے کی تصدیق ہوئی کہ وہ ان کا سردار ہی تھا مگر مجھے یہاں عالی جاہ کی موجودگی مجھ میں نہیں آ رہی تھی، مجر اس کے کہ وہ اس کا کوئی خیر خواہ ہوگا۔

عالی جاہ نے قدرے جھک کر سردار کے کان میں کچھ کہا اور اس نے اپنے ان آدمیوں سے چکمانہ کچھ کہا جنہوں نے گرانٹ کو سنبھال کر اٹھا کے اس بارے سے مجھ سے دور کھڑا کر دیا تھا۔

میں بھی کھڑا رہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور دل ہی دل میں اس ڈرامے کی کامیابی کی دعا میں مانگنے لگا۔ عالی جاہ میرے لیے ایک زخمی سانپ ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر سردار کے اشارے پر مجھے دو آدمی وہاں سے لے گئے اور ایک پتلی گلی سے گزارتے ہوئے ایک تنگ سی کھڑی نما جگہ میں بند کر دیا۔

اندازہً ایک لائین ہی کوئی شے چھت کے وسط میں جمبول رہی تھی۔ فرش بھی اکڑا ہوا سا اور گندہ ہو رہا تھا۔ فرش پر پتلی پتلی سی درزی چمکی گئی۔

تاریک آسمان کا مقدور بحر منظر نظر آ جاتا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق رات اپنے آخر پہر میں ہوگی۔ مجھ پر غصہ کی طاری ہونے لگی اور میرا سراپا بار بار نیند اور غصہ کی بوجھ تلے ڈھلک جاتا تھا اور پھر ”نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے“ کے صدق میری بھی آنکھ لگ گئی۔

☆.....☆

شاید میں کھٹکے کی نیند میں تھا، اس آواز پر میری آنکھ کھلی۔ صحت پر کھٹی قیدیل جیسی قدیم وضع کی لائین کی لوبھی جھنجھی نظر آرہی تھی۔

بہت مدد رشتی میں تاریکی کے دھبے پردوں کے بار دیکھنے کی جستجو میں آنکھیں پھاڑے میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

جب دوبارہ کھڑے کی آواز ابھری تو یقین کرنا پڑا کہ یہ میرا وہاں ہرگز نہ تھا، کسی ایسے ہی کھڑے پر میری آنکھ کھلی تھی، یوں میں نے اندازے سے سامنے دروازے کے رخ پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

میں آنکھیں کھلے سامنے دیکھتا رہا۔ سنا ہی اس طرف روشنی کی ایک باریک کھیر ابھری جو بتدریج چوڑی ہوتی چلی گئی۔ پھر وہاں ایک انسانی سایہ نمودار ہوا۔

وہ چوروں کے سے انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے عقب میں دروازہ بھڑوایا۔

میرا دل یکبارگی مسرت تلے زور سے دھڑکا۔ گرانٹ کا ڈراما کا ملبہ ہوا تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ انہیں بے وقوف اور کسی لالچ میں ڈال کر اپنا اعتماد قائم کر چکا تھا اور اب موقع ملے ہی مجھے ہار کرانے آن پہنچا تھا۔

وہ سایہ جو میرے خیال میں گرانٹ کا ہی ہو سکتا تھا، اب دبے پاؤں میرے قریب پہنچنے لگا، اس کے قدموں کی چاپ بڑی ست اور دھیمی تھی۔

جب وہ میرے قدرے قریب آیا تو میں نے ہولے سے اور دہنی دہنی مسرت تلے اسے آواز دی۔
”گرانٹ! تم ہی ہوں؟“

پُر اسرار سامنے نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں چونکا اور میرے پیرے کے تاثرات یکھت خنجر ہو گئے، مجھے اس کی سانسوں کی بازگشت کچھ ایسی سناٹی دینے لگی تھی جیسے وہ ہانپ رہا ہو لیکن میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ ایسی ہی سانسوں کی آوازیں تھیں جیسے کوئی جوش یاغینہ میں ہو۔

اچانک ہی سامنے نے اپنے منہ سے ایک غراہٹ سی

اگلی اور مجھ پر ہل پڑا۔

میں جو صرف چند تھپے پہلے ہی اس کی طرف سے ایک دم شے میں پڑ گیا تھا، یک دم اس کی گرفت سے خود کو بچانے کے لیے حتی الامکان کوشش کے ساتھ رن بسٹ حالت میں ایک طرف کوسر گیا۔

وہ سایہ جوش غیظ تلے اپنی ہی جمبوک میں اس دیوار اور خالی جگہ پر آن پڑا جہاں چند ہی لمحات پہلے میں تھا، پھر بھی میں اپنے جسم کا بچلا حصہ پوری طرح سرکانہ پایا تھا اور وہ میری ٹانگوں سے ٹکرایا تھا۔

جب ہی..... میری پچلی پچلی آنکھوں نے ایک تیز دھماکہ خبر کی چمک محسوس کی۔

میرا دل اچھل کر گھٹن میں آن لگا۔ کہاں تو میں اس خوش فہمی میں جھلا تھا کہ میرا گرانٹ کا ڈراما شاید کامیابی سے ہمسٹار ہوا ہے اور اب گرانٹ ہی موقع ملے مجھے اس قید خانے سے رہائی دلانے آیا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا لگا۔

”آخر کون تھا یہ؟“ اور کیوں مجھے اس قدر رازداری سے قید خانے میں اور کس سے حکم سے قتل کرنے آیا تھا؟ جبکہ میں تو پہلے ہی سے ان کی قید میں تھا انہیں بھلا مجھے یوں ہلاک کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟“

ذہن میں تلے اوپر بھرنے والے سوال خاصے سمجھیر ہی نہیں بلکہ اسراریت کی حد تک سنگین بھی تھے۔

پُر اسرار سامنے نے وار خالی جاتے دیکھ کر غراہٹ آواز ملے سے خارج کی تھی۔ گویا یہ اس کی توقع کے خلاف تھا کہ میں بروقت اس کے صلے سے بچ گیا تھا۔ شاید اسی سبب وہ چند تھپے کے لیے جہاں کا تھاں پڑا رہا تھا اور پھر منجمل کر دوبارہ میری جانب جارحانہ انداز میں لگا۔

میری ٹانگیں آزاد تھیں اور میں جان چکا تھا کہ میں ایک خطرناک اور ”گمنام“ موت کی زد میں ہوں یہاں کوئی میری مدد کو نہیں آ سکتا اور جو کچھ کرتا ہے میں نے ہی اپنی جاکے لیے کرنا ہے جبکہ مجھے وہ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے کہ قیمت تھا ٹانگیں آزاد تھیں۔

لہذا میں اپنی ہی کوشش اور بھرتی کو بروئے کار لاسکتا تھا، وہ لاتے ہوئے میں نے خود کو پشت کے بل دیوار سے لگا کر تھوڑا کھڑے ہونے کی کوشش چاہی اور جس قدر قوت کے ساتھ ایک لات کی ضرب اس خونی سامنے کے سینے پر لگا سکتا تھا وہ میں نے رسید کر دی۔ سایہ الٹ کر چند قدم پیچھے جا پڑا لیکن اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے میں زیادہ

دیر نہیں لگا تی تھی۔

موقع پاتے ہی پھرتی سے جھک کر میرے پہلو میں مخبر کا مہیب چہل اتارنے کی کوشش کی، میں نے ایک دم لیے لیے پلٹی کھائی، اس کا دار خالی گیا، اس نے لمحہ بھی ضائع کیے بغیر دوسرا دار میری پشت پر کیا، میں نے پھر خود کو بچایا لیکن میرا دائیں کا ہندھا اس کے مخبر کے ظالم چرے کی زد میں آ گیا۔

درد و اذیت کی لہری میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور بے اختیار مارے تکلف کے میرے مقل سے چیخ نکلی لیکن میرے حواس محل نہیں ہوئے بلکہ اس کی جگہ غیظ و غضب نے لے لی۔ وہ مجھ پر ایک اور دار کرنے کے لیے پر تو لے لگا، میں نے پلٹی کھا کر خود کو پشت کے مل سیدھا کیا، وہ اس بار میرے سینے یا پشت پر۔۔۔ مخبر کا دار کرنے کے لیے جھکا تو میری۔۔۔ دونوں ٹانگیں اس کے گلے کا بدن گئیں۔

یہ ”لیگ لاک“ تھا۔ میں جانتا تھا اب بس یہی ایک میرا پہلا اور آخری دار ثابت ہو سکتا تھا اگر یہ کارگر ثابت نہ ہوا تو میں گیا تھا۔

اب صورت حال یوں تھی کہ میں خود پشت کے مل زمین پر تھا، میری دونوں ٹانگوں نے پراسرار حملہ آور کی ٹانگوں کو جکڑے رکھا تھا اور وہ مجھ پر جھکا اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، یہاں تک وہ اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے سیدھا کھڑے ہونے کی سعی کرنے لگا تو نتیجے میں میرا جسم بھی نصف سے زیادہ اسی تناسب میں اوپر کو اٹھتا رہا۔ اس نے مخبر میری ٹانگ پر بھست کرنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اسی وقت میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کو جھٹکا دیا اور نیسے نیچے کر لیا لیکن اپنی ٹانگوں کے شکستے سے اس کی گردن کو پھر بھی نکلنے نہ دیا۔

اسے گرانے سے ایک فائدہ ہوا کہ مخبر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میرے حوصلے بلند ہو گئے میں نے اب اپنے پورے وجود کی طاقت کو اپنی دونوں ٹانگوں میں جمع کر ڈالی اور اس کی گردن کو دبا کر بدستور جھٹکے دیتا رہا۔ اس کے حلق سے پہلے خراپیں برآمد ہونے لگیں جو بعد میں کراہوں میں بدل گئیں۔

میں نے اسے جب تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔

پھر بھی احتیاط کے پیش نظر کہ کہیں یہ مکر نہ کر رہا ہو، اس کی گردن کو مزید دو تین زوردار جھٹکے دیئے تو اس نے تب بھی کوئی جنبش نہ کی، پھر ٹپکی ہوئی اس کی گردن کو آڈا کر دیا۔

میرے جسم کا اس وقت رواں رواں متحرک تھا، دل اس تجزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے کا مخبر تو ذکر باہر نکل آئے۔ اعصاب تھے ہوئے تھے متحرک بھی ہو رہے تھے۔ دل و دماغ میں ایک گمائی کی اور بے بسی میں مارے جانے کا خوف بھی تھا اور اس خطرناک صورت حال سے نیرو آ رہا ہونے کا جوش جنوں بھی فزوں تھا۔

اس کی سب سے اہم وجہ یہی تھی کہ میں رن بست حالت میں تھا اور میرا پراسرار دشمن آزاد بھی تھا اور مخبر بدست بھی۔ یوں میں اس اندھیری کوکھڑی میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔

میں چیخ چلا بھی سکتا تھا مگر اس طرح زندگی بچانے کا جوش اور جذبہ بے مانند بڑھ جاتا۔ اپنے دفاع پر توجہ بھی بٹ جاتی جبکہ موت سر پر کھڑی تھی۔

وہ پراسرار سایہ مخبر ہاتھ میں پکڑے دوبارہ میری جانب لپکا۔ اس بار وہ ریل میٹا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت میں اپنی ٹانگوں سے ہی ایک حد تک کام لینے کا روادار تھا، لہذا اس نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور جیسے اس نے میری ٹانگوں سے چیخ کر مجھ پر دوبارہ حملہ کرنا چاہا تو میں نے دیوار کے ساتھ ہی کھڑے کھڑے پلٹی کھائی، وہ مخبر لہراتا ہوا پھر خالی دیوار سے ٹکرایا اور اس پار اس نے مجھے ایک لات رسید کر دی۔

وہ بد بخت جان گیا تھا کہ مجھے زمین پر گرانے سے ہی بے بس کیا جاسکتا ہے جبکہ خود میری ہی پلٹی کوشش تھی کہ خود کو زمین پر گرانے نہ دوں لیکن بدستی سے میں اس کی لات کی ضرب سے خود کو فوری طور پر نہیں بچا سکا۔ لہذا، دیوار کا سہارا پشت اور کاندھوں کے مل پر لیٹا جا لیکن اگلے ہی لمحے میں فرش پوس ہو چکا تھا۔

ایک لمحہ کو میرے ہوش اڑے، حواس محل پڑے لیکن دوسرے ہی لمحے دل و دماغ بے جذبہ جوش جنوں نے کھد بڑھ چائی۔ سایہ خاصا جسم مگر قد کا درمیانہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں مخبر توڑا ہوا میری جانب لپکا۔

مجھے اس کے حملے سے بچنا تھا، اس لیے دوبارہ دیوار کا سہارا لے کر بے شکل تمام کھڑے ہونے کا وقت نہ تھا۔ لہذا میں نے اس کے قریب آتے ہی اپنی ٹانگیں اس کی ٹانگوں سے ٹکرانے کی کوشش چاہی تھی تاکہ اسے بھی کراسکوں مگر وہ اچھل کر خود کو صاف بچا گیا اور اگلے ہی لمحے اس نے ایک

بڈی GUY۔

”میری پشت کے پیچھے خنجر پڑا ہے۔ اس کی مدد سے ری کاٹ ڈالو میرے ہاتھوں کی۔“ میں نے کہا۔ اس نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگا کر بغیر ایسا کیا اور حیرانی سے پوچھا۔

”یہ خنجر کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“
”یہ خنجر اسی خنجر کا ہے جو مجھ سے ذرا فاصلے پر دیوار کے کونے میں لاش کی صورت پڑا ہے۔“ میں نے دانت پیس کر کہا اور اسے اس پراسرار حملہ آور کے بارے میں بتا دیا۔
میری طرح اسے بھی حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

”واٹ؟..... کیا مطلب؟ یہ کون ہے؟ اور تمہیں اب کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ میں نے ہاتھ آزاد ہوتے ہی انہیں سسلے اور ”وارم اپ“ کرتے ہوئے جواب میں کہا۔ ”شاید ان لوگوں کو مجھے ہلاک کرنے کی زیادہ ہی جلدی تھی۔ صبح تک کا انتظار ان کے لیے محال تھا۔“

”ہرگز نہیں!“ گرانٹ نے جیسے پورے وقوف کے ساتھ گردن لگی میں ہلائی۔ ”اگر انہی لوگوں نے تمہیں ہلاک کرنا ہوتا تو اسی وقت ہی کر ڈالتے، جس طرح کی صورت حال کا میں یہاں آتے ہی اندازہ لگا چکا تھا، اسی لیے تو میرے ذہن میں یہ فوراً چلا گیا کہ خلیاں ابجرا تھا اور میں نے تم سے جھگڑا کرنے کا ذرا مار چایا تھا۔“

”میں سمجھ گیا تھا تمہارے ڈرامے کو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اسی لیے تو تمہارا فوراً ساتھ دیا تھا۔“

”غصہ روا میں ذرا ایک نظر اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اس طرف کو سرک گیا جدراس پراسرار حملہ آور کی لاش پڑی تھی۔

”ارے..... ایسی..... یہ تو عدیل ہے!“
معا اس کی حیرانہ آواز ابجری۔ ”ہی..... تو واقعی تمہیں ہلاک کرنے کے درپے تھا مجھے تو حق بتی کہ.....“
”کون عدیل؟ کیا تم جانتے ہو اسے؟“ میں نے حیرانی کے ساتھ ادب پرانے گرانٹ سے سوال کیا۔ اس کے کہنے کا انداز ہی مجھے چونکا گیا۔ ”یہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا اور تم جانتے تھے؟ یارا یہ کیا گورکھ دھند ا ہے گرانٹ! مجھے بھی بتاؤ۔“

”مائی گاڈ!“ وہ ابھی تک ایک عجیب اور گھمبیری تشویش میں جلا تھا۔ آگے بولا۔ ”ہاں! جانتا ہوں میں اسے مگر کچھ زیادہ نہیں، صرف چند گھنٹے پہلے جب عالی جاہ

ان جاں مسل لمحات اور جاں کش اصاب جس تک دود کے بعد میرا جسم ایک دم سست پڑ گیا۔ جوش و جذبہ بات فرد ہونے لگے، میں بے لیے سانس لیتے ہوئے اپنے حواسوں کو جمع کرنے لگا۔

ذرا دیر بعد جب میری حالت قدرے سنبھلی تو میں آہستہ آہستہ مگر بے مشکل تمام، فرش پر اس جانب کو سرکنے لگا جہاں اس پراسرار حملہ آور کا خنجر گرا پڑا تھا۔

قریب پہنچ کر میں نے لینے لینے اپنے جسم کو پشت کے رخ پر کیا، کیونکہ اسی جانب ہی میرے دونوں ہاتھ باغیچے میں تھے۔ میری اگلیاں فرش سے خنجر اپنے کے لیے متحرک ہو گئیں اور ذرا سی کوشش کے بعد انہی خنجر کا دست اگلیوں سے ٹکرایا ہی تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔

میں یک دم گر گیا۔ دل ایک بار پھر کسی ایسے ہی جاں مسل خطرے کے خدشے تلے کباب کی زور سے دھڑکا۔
”کیا پھر کوئی نصیبت نازل ہونے والی تھی؟“ میں نے دل میں سوچا اور گردن ذرا موڑ کر دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

دروازہ کھلا اور باہر سے پڑتی روشنی پر مجھے کسی کا ہیولا نظر آیا۔ میں اسی طرح فرش پر قدرے پشت اور پہلو کے بل پڑا رہا۔ البتہ خنجر میں نے اگلیوں میں لیے لیا تھا۔
وہ ہیولا دبے قدموں کے سے انداز میں آگے بڑھا اور کمرے کے وسط میں پہنچ کر رکا۔

”نعمان..... لوی!“ اس نے مجھے سرگوشی میں پکارا۔
آواز پہچانتے ہی میرے غصے و جوش میں سرک کی لہر دوڑ گئی۔

”مگ..... گرانٹ..... امیں..... میں یہاں ہوں.....“ میں نے فوراً انہی آواز میں جواب دیا۔ تب ہی مدھم مدھم روشنی میں اس نے میری آواز کی سست دیکھا اور میری جانب پکا اور ایک عجیب جذباتی انداز اور دوستانہ محبت کے ساتھ مجھ سے پلٹ گیا۔ میں کچھ حیران سا ہوا اور ہولے سے مسکرا بھی دیا۔ وہ مجھے زندہ پا کر خوش ہوا تھا لیکن میں الجھ مکی گیا تھا، آخر ایسا کچھ کیا ہوا تھا کہ اسے مجھے زندہ دیکھ کر ایک جذباتی سی خوشی ہوئی تھی؟ کیا یہاں میری موت کا پروانہ جاری کیا جا چکا تھا؟

”تت..... تم ٹھیک تو ہو؟ DUDE؟“ کہتے ہوئے وہ اکڑوں بیٹھا اور مجھے سنبھالنے لگا۔

اس کا پیار سے مجھے ”دوڈ“ کہنا اچھا لگا۔ عام فہم میں اس کا مطلب ”لڑکے، دوست یا پیارے“ ہوتا ہے۔ جیسے

کوہ نور

ہیئر آئلز



کوہ نور آملمہ ہیئر آئل

کوہ نور چینیلی ہیئر آئل

... زندگی سے بھرپور صحت مند بال

KAHO/032K18

سے عداوت کی کیا نوعیت بنتی ہے۔“
وہ عدیل کے متعلق اتنی صراحت بیان کر کے خاموش
ہوا اور میں نے صمنوں میں اچکا لیں۔
”چلو اب دیر مت کرو نکلنے کی کرو۔“ گرانٹ آخر
میں بولا۔

ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ مخبر ہی تھا ایک وہی
اٹھایا اور ہم اس قید خانہ نما کوشش سے نکلے اور پتلی سی گلی
سے گزرتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔

یہاں ایک کنڈرو کی سی دیوار تھی۔ تھوڑی دیر یہاں
رک کر ہم نے بڑے دروازے کی سمت سے سن گن لینے کی
کوشش چاہی۔ مگر مختلط ردی کے ساتھ آگے قدم بڑھا
دیئے۔

سیدہ سحر نمودار ہونے کو تھا۔ سب لوگ خواب
خرکوش کے آخری لمحات میں تھے۔ ایسے وقت میں نیند اور
زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ ہم خاموشی سے نکلے۔ ایک جگہ
اونٹ بندھے ہوئے تھے۔

گرانٹ نے ایک اونٹ کو پکارتا کہ وہ کوئی آواز
وغیرہ نہ نکال سکے، اس کے بعد اسے ہم دونوں سمجھتے ہوئے
طویلے سے باہر نکال لائے، اس کے بعد اس میں سوار
ہو کے راہ فرار اختیار کر لی۔

☆.....☆

گرانٹ کے مطابق عالی جاہ نے شہزادی نلیم کے
سلوک سے دل برداشتہ ہو کر اس کے خلاف بغاوت کی راہ
اختیار کر لی تھی اور لٹیروں کے گروہ سے ساز باز کر لی تھی۔
ہم سورج اُبھرنے تک بالآخر مراۃ صبح گئے۔ ایک
مخفیہ ٹھکانے اور اپنے نبی خواہوں کے پاس پہنچ کر ہم نے
سکون کی سانس لی تھی۔

ہم جیسے ہی بستی میں داخل ہوئے، مجھے پہچانتے ہی
بستی کے لوگوں نے خوشی سے ہوائی فائرنگ کر کے ہماری
آہ کا اعلان محل دالوں کو کر دیا۔

محل میں داخل ہوئے تو وہاں ہم نے شہزادی نلیم،
کالیا اور ابو شاہ کو بڑی بے چینی سے اپنا شہر پایا۔ ہمیں
دیکھتے ہی انہوں نے سکھ کی سانس لی تھی۔

ہم نے انہیں ساری رام کہاں نشانی اور یہ بھی بتایا کہ
کالے شیطان سے متعلق ہمارے ہاتھ جو اہم کلیہ ایک قافل
کی صورت لگا تھا وہ بھی ان وحشی لٹیروں کے ہاتھ چڑھ کر
ضائع چلا گیا، جن کا ان سب کو بھی بہت ملال ہوا لیکن شہزادی

مجھ سے ایک الگ کمرے میں شہزادی نلیم کے متعلق اس
بارے میں مزید تفصیل جاننے کی کوشش کر رہا تھا، جو ڈرانا
پڑنے صورت حال کی نزاکت جان کر کھلیا تھا وہ اس چکر میں
آ گیا تھا، کیونکہ وہ اس کا زخم کھایا ہوا تھا، یاد ہے ناں! تم نے
مجھے عالی جاہ اور اس کے بھائی سلطان کی چھائی کے بارے
میں بتایا تھا۔“

”ہاں!“ میں نے ہولے سے سرکواٹات میں جنش
دی اور بے چینی سے مستغفر ہوا۔ اب میں سمجھا کہ اسے میری
جانب سے ایسی توثیق کیوں تھی اسے اس بات کا خدشہ تھا
کہ عدیل مجھے موقع پاتے ہی کسی وقت بھی ہلاک کر سکتا تھا
مگر کیوں؟ اور اس ”کیوں“ کا جواب میں نے اس سوال
سے کیا۔

”مگر تم مجھے عدیل کے بارے میں بتا رہے تھے؟“
”یہ بھی اس وقت عالی جاہ کے ساتھ بیٹھا تھا
اور کچھ زیادہ ہی خار میں دکھائی دیتا تھا۔“ گرانٹ بتاتے
لگا۔ ”میں تمہاری برائیاں کر کے وراصل عالی جاہ کی
ہمدردی ہی نہیں تھوڑی مہلت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا
تا کہ موقع ملے ہی تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں۔ تم
نے بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود ایک خطرناک مگر
چھپے ہوئے دشمن کو زیر کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

میں نے عالی جاہ کو کوشش میں اتار لیا تھا، وہ تو اسی وقت ہی
تمہیں موت کے گھاٹ... اتارنے کے درپے تھا مگر میں
نے چالاک سے کام لیتے ہوئے اس سے یہی کہا تھا کہ عالی
جاہ! تمہارا شکار اب تمہارے قبضے میں ہے پھر اتنی جلد بازی
کیوں کرتے ہوئے؟ ابھی شہزادہ میں نے اس سے یہی تم
سے شہزادی نلیم کے متعلق کچھ اور اہم راز بھی اٹھوائے ہیں۔

یوں صبح تک تمہاری موت کا جاری کردہ پروانہ لگ گیا مگر
عدیل نہیں مان رہا تھا، وہ اسی وقت تمہیں موت کے گھاٹ
اتارنا چاہتا تھا، مجھے حیرت ہوئی تھی کہ کبلا کون تھا؟ معاملہ تو
تمہارا عالی جاہ کے ساتھ تھا، جب عالی جاہ کی عدیل سے
اس بارے میں بحث ہونے لگی تو عقدہ کھلا کہ عدیل اور
سلطان آپس میں کئے بھائیوں سے بڑھ کر بچپن کے
دوست تھے، یہی نہیں بلکہ عدیل تو اپنے جگری دوست
سلطان کا احسان مند بھی تھا۔ وہ سلطان کو اپنا صمن بھی سمجھتا
تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر بات یہ تھی کہ عدیل کو اپنی چھوٹی
بہن مر پارہ سے بڑی محبت تھی اور وہ سلطان کی محبت اور
اس کی مقیتر بھی تھی۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عدیل کی تم

نہیں، عالی جاہ کی اس حرکت پر بری طرح چراغ پا ہو گئی۔
 ”ہمیں یقین نہیں آتا کہ عالی جاہ پچھ پیچھے ایسی سچ
 اور گندی حرکت بھی کر سکتا ہے مگر یہ حرکت کر کے اس نے
 ہمارے غیظ و غضب کو آواز دی ہے، ہم اب اسے بالکل
 معاف نہیں کر سکتے۔“

”شہزادی صاحبہ! آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت
 نہیں ہے۔“ ابو شاہ نے ادب سے مخاطب ہو کر شہزادی سے
 کہا۔ ”اس غیبت نے جن صحرائی لئیروں کی گود میں پناہ لی
 ہے، وہ اس طرح اپنی موت آپ مر چکا ہے، صاف ظاہر
 ہوتا ہے کہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں بچا ہے۔ وہ اب ساری عمر
 ریت پھاٹکا اور خاک کا چائرا رہے گا اس لیے اب اس کی
 طرف سے اپنی توجہ ہٹا دی، دیے اس پر اب کڑی نگاہ رکھی
 جائے گی۔“

”ہرگز نہیں ابو شاہ! شہزادی نلیم طیش کے عالم میں
 بولی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں شہزادی نلیم کو اس قدر برہم اور
 غضب ناک کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔

”عالی جاہ کو پتا چلنا چاہیے کہ اس نے شہزادی نلیم کے
 معزز مہمان کے ساتھ جو بیچ اور بدولت حرکت کی ہے اس کا
 کتنا بڑا اور گنہگار بن جاتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے
 ابو شاہ کو فوراً حکم صادر کر دیا کہ آدسوں کو ان کے ٹھکانے پر
 روانہ کرے جو عالی جاہ کا وہاں خاتمہ کر کے لوٹیں۔“

اس درمیان میں ہولے سے ٹکاکر کر میں نے
 مداخلت کرتے ہوئے شہزادی سے کہا۔

”میرا خیال ہے شہزادی صاحبہ! ابو شاہ ٹھیک کہتے
 ہیں۔ ہم بڑی مشکلوں سے ایک جنگ سے جان چمڑا کر بیٹھے
 ہیں۔ ان صحرائی لئیروں سے جنگ میں الجھنے تو بہت سے
 ایسے اہم مقاصد کے حصول سے ہٹ جائیں گے جو اس
 جنگ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جبکہ ابھی تو ”عدی“
 والوں سے جنگ بھی ایک طرح سے عارضی طور پر ختم ہوئی
 ہے ابھی اس کی باقیات اپنی جگہ موجود ہیں، میں نے بن
 راند سمیت کالے شیطان کے خلاف ایک کامیاب چال چلنے
 کی کوشش کی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ عالی جاہ کی طرف
 سے ہمیں ابھی فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے، ہوا بھی تو میں
 اس بارے سے ذمہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میری بات پر شہزادی نلیم کا اشتعال کچھ کم ہوا تھا۔
 میں جانتا تھا کہ شہزادی نلیم کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے
 مراٹھ والوں کے لیے میں اتنی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ مجھے اپنا

محسن سمجھتے تھے۔ اللہ رب العزت نے مجھے تو فیض بخشی تھی کہ
 میں ان بے چاروں کو عدی والوں کی سازش سے بچا سکوں،
 جو اس پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔
 ابھی تو ہم ٹھکے ہوئے تھے۔ ناشتا وغیرہ کر کے
 سرگئے۔ دن میں جاگے تو سر جوڑ کر موجودہ حالات کے
 بارے میں غور کرنے لگے۔

میں نے شہزادی نلیم کو ایک صاحب مشورہ دیتے
 ہوئے کہا۔ ”کھلو آگل کبھی میں مراٹھ کے خلاف سازشیں
 کرنے والے عناصر میں سے دو اہم افراد کا اور شاہ میر
 ہلاک ہو چکے ہیں۔ کوہ جنبل پر عدی والوں کا پانی بند کرنے
 کا ناپاک منصوبہ بھی میں اپنے سامھی کا لیا اور کافی حد تک
 گرانٹ کے ساتھ مل کر خاک میں چلا چکا ہوں اور ابھی وہ
 وقت تھا جب بن راند میری چال کے جال میں آنے پر مجبور
 ہوا لیکن افسوس کہ ہم فائل کچھ لٹا کر، خیر!“ میں چھٹا پے کے
 لیے رکا۔ وہ سب میری بات فورے سن رہے تھے۔

”اب میرا خیال ہے شہزادی صاحبہ!“ میں نے
 دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”آپ کو اب براہ راست خود دوڑ
 ورتھ آگل کے لی اوڈی یا ان کی انگریز کیلکولیٹنی یا پھر ان کے
 چیف میں سے بات کرنا پڑے گی لیکن اس سے پہلے آپ کو
 سرکاری سطح پر تحفظ اور سرپرسی و کار ہے۔ آپ نے اب مل
 کر کھلو آگل کی بددیہتی سے آگاہ کرنا ہوگا اور معاہدے کی تیغ
 بھی مل میں لانا ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو ایک کانڈی ہوم
 ورک تیار کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے ابو شاہ
 کے علاوہ اور اسے گرانٹ اور محمود محسن آپ کی مدد کر سکتے
 ہیں۔ بحرین میں آپ کو کسی بڑے سرکاری بیورو کریٹ یا
 افسر سے ملاقات کرنا پڑے گی۔“

”برخوردار حکومت سے مشروط معاہدے سے
 تمہاری مراد انہیں ٹیکس دینا مقصود ہے یا حکومت کو رائلٹی
 دینا؟“ ابو شاہ نے نرم لہجے کی مسکراہٹ سے پوچھا۔

”دونوں!“ میں نے فوراً کہا۔ ”اس سے مراٹھ کو
 ڈہرا فائدہ ہوگا۔ اسے سرکاری تحفظ حاصل ہوگا۔ شہزادی
 صاحبہ کو پروٹوکول ملے گا۔ حکومت سے سہڈی ملے گی۔ بحر
 حدی والے کیا کسی کو بھی مراٹھ کی طرف آگاہ اٹھانے کی
 جرأت نہ ہوگی۔ دیکھنا پھر مراٹھ راجہ بدالئی کے صحراؤں میں
 ایک چپکتے ہوئے ستارے کی طرح پورے بحرین کے نقشے
 میں ابھر آئے گا۔“

”سبحان اللہ..... جزاکم اللہ خیر.....“ بے اختیار

”اس بار میں بھی پہلوں کا تم دونوں کے ساتھ۔“
 کالیا بھی ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ اور رائے
 گرانٹ بھی کھڑا ہو چکا تھا۔

”میں تمہاری موجودگی میں یہاں سخت بور ہوتا
 رہا ہوں۔ اب یہاں کے معاملات کافی بہتر ہیں۔“

میں جانتا تھا وہ اب نہیں مانے گا اور گرانٹ نے مجھے
 جو امید دلائی تھی اسے میں جلد از جلد آمانے کا ارادہ کر چکا
 تھا۔ یوں گرانٹ نے بھی اس کی حمایت میں مجھ سے کہا تھا
 کہ اسے ساتھ رکھ لیا جائے۔ بسا اوقات ایک سے زائد کام
 نمٹانا پڑ جاتے ہیں، وغیرہ۔

بہر کیف! ہم نے مختصر اتاری پکڑی۔ شہزادی نلیم اور
 ابوشاہ ہمیں یوں اتنی جلدی اور اچانک صرافے سے روانہ
 ہونے کا کمر کر تھیں ان بھی ہوئے اور پریشان بھی لیکن جب
 ہم نے اپنی بھجوری بتائی تو وہ دونوں اسے سمجھتے ہوئے چپ
 ہو رہے۔

گاڑی کا بندوبست کر دیا گیا۔ ہم تینوں اس میں سوار
 ہوئے اور ایک بار پھر شہر متاوا کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

اس بار ہم کار میں سوار تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ گرانٹ
 نے ہی سنبھالی تھی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان
 تھا۔ کالیا عقبی سیٹ پر تھا۔

حالات سروسٹ منہول پر تھے اور ہمیں فوری طور پر ایسی
 خطرہ کسی سے نہ تھا تاہم پھر ہم اپنے گرد و پیش سے متاھے۔

میں ایک بار پھر اسی ذاتی آئینل پتھل کا شکار ہو گیا
 تھا جسے پہلی مرتبہ لیلی صمد کے ہاں جاتے ہوئے پورا تھا۔

اس بار بھی صورت حال کم و بیش ویسے ہی تھی۔ کچھ پتہ نہ
 تھا کہ اب ان دونوں ماں بیٹیوں نے میرے بارے میں کیا

سوچ رکھا تھا؟ آیا وہ میری باتوں سے واقعی متاثر ہوئی تھیں یا
 مجھے پولیس کی گرفت میں پہنچانے کا ارادہ کر چکی تھیں؟

دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ گراہیا نہیں بھی تھا اور وہ دونوں
 اب بھی دوبارہ میرے ساتھ کبہر و ماثر کرنے پر تیار ہو جائیں

تو کیا ضروری تھا کہ گرانٹ کی دلائی ہوئی ایک سوہم سی
 امید بار آور ثابت ہوتی یعنی ضائع شدہ اہم قائل کی کوئی

کاپی کپیڈ میں محفوظ ہوتی؟
 بہر حال! میں دل میں بھی دعائیں سارے راستے

ہی مانگتا رہا تھا حتیٰ کہ ہم ایک بار پھر اپنی مطلوبہ عمارت کے
 گیٹ کے سامنے موجود تھے۔

وہاں وہی کارڈ جسے دوبارہ نظر آسکتا تھا جسے گرانٹ
 اور میں نے ”بھجور“ تھوڑا از دو کوپ کر کے اسی کے کین
 میں بند کر دیا تھا مگر کھڑا ہوا نہیں تھا وہاں۔ نہ جانے کہیں چلا
 گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل سے کال بتل پر انگلی دکھ دی۔
 اتر کام بتل بھی شکر تھا کہ اندر کوئی موجود تھا۔

”ہیلو، کون؟“ یہ نسوانی آواز جی جیسے پیچا تھی میرا
 دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”سبز شاہ میرا میں ہوں، نعمان!“ میں نے اتر کام
 کے قریب ہو کر کہا۔

”تم؟“ وہ یوں بولی کہ میں اندازہ نہیں کر پایا کہ یہ
 لفظ اس نے حیرانی سے کہا تھا یا برعکس۔

”جی ہاں! میں ہوں۔ ایک بہت ہی ضروری بات
 کہنا تھی آپ سے۔“

امید و بیم اور طرح طرح کے اندیشے اور سو سے اس
 وقت روہوتے گئے جب پہلے سے کھڑے کی آواز سے بظنی

اور لہنے کا لالاک اندر سے نکلا۔
 ”آ جاؤ۔“ ساتھ ہی لیلی صمد کی آواز ابھری۔

ہم تینوں اندر داخل ہو گئے۔ دونوں ماں بیٹیاں
 موجود تھیں۔ کافہ کی آنکھوں میں کچھ سرا سبکی کا شائبہ نظر

آتا تھا جبکہ لیلی صمد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ تاہم دونوں کے
 چہرے اب بھی غنا کی تصویر بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں نے بلا در پائی وہاں دوبارہ فوری طور پر آدم بسر
 مطلب بتایا تو وہ ابھی ہوئی لگا ہوں سے ایک دوسرے کی

طرف دیکھنے لگیں لیکن پھر دوسرے ہی لمحے لیلی نے مجی سے
 کچھ کہا پھر اس سے جواب پا کر وہ ماری طرف توجہ ہوئی اور

ہمیں وہیں بیٹھنے کا کہا۔
 ہم اس کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے صوفوں پر براجمان

ہو گئے۔ کافہ اور پری منزل جانے والے زینے کی طرف
 بڑھ گئی۔

”پاس درو کی ٹکر نہیں کریں۔“ لیلی نے حوصلہ افزاء
 لہجے میں کہا۔ ”شاد میرے ضروری کاغذات اور فائیں وغیرہ

بھی کپیڈ میں کپال کرنی تھی، اسی لیے اسے پاس درو معلوم
 ہے، وہ اوپر شاہ میر کے اسٹڈی روم سے ان کا لیپ ٹاپ

لینے گئی ہے۔“
 ”کیا وہ صرف لیپ ٹاپ ہی استعمال کرتے تھے یا ڈیسک

ٹاپ (کپیڈر) بھی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

مجھے جواب دینے کی بجائے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لکٹی نہ ہوئے سے اثبات میں اپنے سر کو جھٹک دی۔ بولی۔ ”اس کے لیے اوپر جانا ہوگا اگر مطلوبہ فائل مل گئی تو پھر بھی اوپر ہی رکھا ہے، اس کی کاپی نکال لیجئے گا۔“

”بہت بہت شکریہ خاتون! اس دعا کیجئے وہ فائل مل جائے۔“ میں نے ممنون بھری نظروں سے لکٹی کی طرف دیکھا۔ میرے اس طرح کہنے پر اس نے چند تاپے کے لیے میرے چہرے کی طرف بڑے غور اور گہری نگاہوں سے دیکھا تھا، ایسے غما کی اور عجیب نگاہیں جیسے اس ماحول میں مجھے اس کی سوئی سوئی سیاہ آنکھوں اور نرم و گداز ہونٹوں پر بے نام کسی سکراہٹ کا ایک ہلکا شائبہ سامعوس ہوا تھا، میں اس وقت زیادہ توجہ نہ دے پایا۔

ہم سب اوپر آگئے۔ اس کے بعد ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ کافہ نے جلدی سے ایک بڑی سی میز سنہال لی جس پر ایک کمپیوٹر دھرا ہوا تھا۔ اس سے ٹرن آن کرنے اور مطلوبہ ڈرائیو اوپن کرنے کے بعد کافہ نے کرسی چھوڑ دی اور مجھے اس پر بیٹھنے کا کہا۔

میں نے لک کر کرسی سنہال لی۔ عقب میں کالیا اور اوپر اے گرانٹ بھی کپڑے کی اسکرین پر جھک گئے۔ میں جلدی جلدی ڈرائیو دیکھنے لگا۔ اس میں چند ہی فائلیں تھیں اسی لیے جلد ہی مطلوبہ فائل میری نظروں کے سامنے آگئی اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ اس پر ”RM-7“ لکھا تھا۔ احتیاطاً میں نے سیریل نمبر بھی چیک کیا جو درست تھا۔

یہ وہ فائل تھی جس کی بارڈ کاپی ضائع ہو چکی تھی۔ ”مل گئی..... اوپر اے گرانٹ! مل گئی..... وہ فائل.....“ میں خوشی سے چلتا ہی میری مسرت بھری نظریں لپ ٹاپ کی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ گرانٹ اور کالیا نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ وہ بھی ہنوز اسکرین پر جھکے ہوئے تھے۔

میں نے یونہی فائل کا کور پیج بنایا تو اچانک اندر کے ایک صفحے پر چلی اور سیاہ حروف میں ایک لفظ لکھا نظر آ گیا۔ یہ وہ لفظ تھا جسے پڑھتے ہی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں موت کی سی سرد لہر سرسراتی محسوس ہوئی تھی اور..... وہ لفظ تھا..... ”قلعہ الموت“.....

(جاری ہے)

تھوڑی دیر بعد وہ نیچے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک لپ ٹاپ تھا، وہ اپنی ماں کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی اور لپ ٹاپ آن کر لیا۔

تھوڑی دیر تک وہ لپ ٹاپ کو دھس دھس کر رکھ کر اس سے چیخڑ چھاؤ کرتی رہی، میری دھڑکنے لگی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دل بے چین سا ہوا جا رہا تھا۔ پھر اس کے بعد کافہ نے اٹھ کر لپ ٹاپ میری جانب بڑھا دیا اور بولی۔ ”پاپا کی ایک ڈرائیو میں نے اوپن کر دی، اسے چیک کر لیں۔“

وہ بے چاری بھی غمزہ اور انجانے خوف تلے عجیب سی کیفیات اور تاثراتی صلیے کا کافہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے لپ ٹاپ لیا اور چیخڑ چھاؤ شروع کر دی۔

کئی فائلیں تھیں، میں انہیں ہٹاتا چلا گیا مگر میری اس وقت مایوسی کی انتہا نہ رہی جب میری مطلوبہ فائل پر ”RM-7“ ان میں کہیں نظر نہ آئی۔

پھر بھی میں نے دوبارہ چیک کیا مگر نتیجہ وہی صفر۔ میری امیدوں پر جیسے پانی پھرنے لگا۔ عالم مایوسی میں سینے میں ٹھن کی محسوس ہونے لگی۔

”کیا ہوا؟ نہیں ہے اس میں وہ فائل؟“ اچانک لکٹی نے میرا اترا اترا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ فائل ایسی نوعیت کی نہیں تھی سزا میرا!“ معافی اور اے گرانٹ نے سنجیدہ لہجے میں لکٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ، میرا مطلب ہے آپ کے سپینڈ کوئی ڈیٹک ٹاپ (کمپیوٹر) بھی استعمال کرتے تھے؟“

لکٹی نے جواب میں کہا۔ ”اس کا تو مجھے کچھ خاص علم نہیں..... لیکن.....“ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھ بیٹھی کافہ کی طرف متغیر انداز نگاہوں سے دیکھا ہی تھا کہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں اظہار بلا دیا۔

”جی ہاں! پاپا کی اوپر اسٹڈی میں ان کا ایک ڈیٹک ٹاپ کمپیوٹر رکھا ہوا ہے..... لیکن بہت کم ڈاکومنٹس اس میں وہ سیکر کرتے تھے۔“

کافہ کی بات پر ایک بار پھر میرے اندر مطمئناتی ہوئی امید کی لہر پھڑپھڑائی۔

”پلیز! لیکن ہو تو مجھے وہ بھی چیک کر دو اس پلیز؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر ملتانجہ انداز میں کہا تو کافہ نے

ادب شناس 02

اوارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفر د انعامی سلسلہ

گذشتہ ماہ سے ایک نیا سلسلہ ”ادب شناس“ شروع کیا گیا ہے۔ یہ نیا سلسلہ جو آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی دے گا۔ ہر ماہ کی ایک مشہور مصنف کی تحریر کا اقتباس دیا جائے گا۔ آپ ذہن پر زور دیں، اندازہ لگائیں کہ یہ اقتباس کس معروف مصنف کے قلم کا شہکار ہے۔ اس اعادہ سے تحریر شناسی پر عبور حاصل ہوتا رہے گا۔ درست جواب بھیجے والے قاری کو چھ ماہ تک ”سرگزشت“ اعزازی طور پر بھیجا جائے گا۔ درست جواب ہمیں 30 دسمبر 2018 تک موصول ہو جائے۔ تاہم ایک سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس ماہ کا اقتباس

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ خود ہی بے ہوش ہو گیا۔ باقی سب کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں اس نے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے اس کا محل وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے، وہ اس غصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں، اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ قبل یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ادب شناس 01 کا جواب

یہ اقتباس سعادت حسن منٹو کی تحریر عصمت چٹائی سے لی گئی ہے۔
آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔
”یہ کیا بات ہے کہ عصمت چٹائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت اگر یہ دوستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاید سے شادی کر لی اور منٹو۔
انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں شریک نہ تھا لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو

کھیر کر یہ سوال کیا۔ ”آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟“
ادب شناس 51 کا یہ سوال ہمارے قارئین کے لیے بہت آسان ثابت ہوا ہے کیونکہ ڈیر
سارے جوابات بالکل صحیح تھے مجبوراً قرعہ اندازی کرنی پڑی۔

اس قرعہ اندازی میں انور یوسف زئی، اسلام آباد کا نام نکلا ہے، انہیں 6 ماہ تک سرگزشت اعزازی
طور پر ارسال کیا جائے گا۔

ان کے علاوہ جن کے جوابات درست تھے:

کراچی سے سالار خان، آفتاب حسن، شفاعت حسن، نہال قیوم، محسن اختر بلوچ، شوکت علی
ابڑو، سدرہ بانو ناگوری، سلطان احمد، نوشین اختر، زاہد حسین، فلک بانو، نازش اختر، ارباز خان، سید
عباس رضوی۔ لاہور سے۔ انک سے نزات انصاری، شاہین چنگیزی، ضیاء اللہ خان، فیضان ملک،
آذر فاروقی، ابرار احمد، یاسین بٹ، نصر طفیل، مشا کر علی، احسن قلندری فیضان، سعد حسن، فیصل آباد
سے فیض احمد، ناصر حسین، ارباب یوسف زئی، شریف خان، عزیز خان آفریدی۔ ہنگو سے ملک
فیض۔ شیخوپورہ سے علی اختر، اطہر احمد صدیقی، ضیاء کریمی۔ راولپنڈی سے رملہ حسن خان، انیلا
جہاں، عاصم حسن، فوزیہ تنویر۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، کائنات بٹول، سعدیہ کاشف۔ واہ کینٹ
سے انیلا قیوم، آصفہ انصاری، حمید نیازی، عذرا اطہر۔ حیدر آباد سے آصف حسن، شاد زیدی، کلیم
الدین۔ چمنیو سے لیاقت جعفری، محمد ثار۔ سرگودھا سے انعام شیخ۔ راجن پور سے عمر حیات۔ مظفر
گڑھ سے محمد عمر۔ منجھ آباد سے آصف خان، شبیر علی۔ ڈی آئی خان۔ رحیم ابڑو۔ حیدر آباد سے
شمیر خان اچکزئی۔ ہنگو سے نصیر اختر۔ ملتان سے نیاز حسن۔ کوٹلی سے اعجاز احمد۔ وزیر آباد سے محمد
شفیق۔ ساہیوال سے نظیر حسن۔ چارسدہ سے ناصر خان۔ جہلم سے ایم ایس سید، زاہد خان، دلبر
خان۔ کوہاٹ سے طلحہ خان، نظیر شاہ، عباس اچکزئی۔ چیچہ وطنی سے ناصر عباس۔ خوشاب سے احمد
علی۔ منجھ آباد سے اطہر حسین، شمیم خان۔ روہڑی سے زاہد بزنجو، زریں بزنجو۔ پسرور سے شاہد
علی۔ مشرف پور سے مدنان۔ لالہ موٹی سے فرحت جان، بابر زمان خان۔ حضرو سے فرید یار خان،
اظفر خان، شبیر خان۔ سبی سے ہیبت خان اچکزئی۔ میرپور خاص سے راز سکندر علی، مومن خان،
فصاحت اللہ سرور دلی، شاہد پرویز۔ لیہ سے مشرف الدین، عبدالکریم۔ ایبٹ آباد سے اعجاز حسن
خان، کاظم شاہ، کاشف حسن۔ حافظ آباد سے محمد ابراہیم، عقیل چٹھہ، فصیح الدین۔ پشاور سے داروغہ
خان، سلطان محمد، امتیاز حسین۔ ملچھ سے افضل احمد۔ ڈیر اسماعیل خان سے محمد سیف الدین۔ لیہ
سے احمد حفیظ، اسد اکبر، فصیح خان۔ حیدر آباد سے زونشاں پروین، سردار خان، صنم کوثر، عنایت مسیح،
نجیم درانی، لیاقت علی، پرویز علی، نعیم انصاری، ملک فیروز۔ ڈیر اغازی خان سے کلیم الدین، نعمان
سار، محمد سیف۔ بہاولپور سے احتشام حسن، عارف احسان، محسن خان۔ بہاولنگر سے سید ثانی، شہنشاہ
احمد۔ سرگودھا سے عابدہ اطہر، محمد شفیق، اسماعیل ڈرائیو۔ جبک آباد سے نجیم الدین احمد، کمال احمد
جوینجو، عارف احمد۔

آصف جام.....کراچی
وہ ہم سے دور جا میں گے جہاں بھی
ہماری آہ پہنچے گی وہاں بھی
(شاعر: معلوم)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی ٹکلی.....ملتان
کھول ہال پریشاں نہ کرو روح کو تم
اے میرے سوگ کے کمرے میں سنورنے والے
عبدالغنی شہر.....کراچی
نازکی اس کے لب کی کیا کہے پھڑکی اک گلاب کی سی ہے
تیرا نیم ہارا آنکھوں میں ساری سستی شرب کی سی ہے
آفتاب احمد.....حیدرآباد

کیا کہیں گھر گئے کن بلاؤں میں ہم
کچھ محبت کے غم کچھ زمانے کے غم
(شاعر: نواز کرشن گوپال معلوم)

ناہیدہ عثمان.....لاہور
کبھی جو ذہن میں آتا ہے واقعہ کوئی
تو دل میں ایک انوکھی کنگ سی ہوتی ہے
(شاعر: لعل آذر)

ارباب خان.....کوئٹہ
شب غم سوزن صبر و رضا سے
رفو میں نے بھی پاک دل کیا ہے
(شاعر: ڈاکٹر بانو)

ریاض الرحمن.....پشاور
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
(شاعر: معلوم)

فرزانہ ندیم.....راولپنڈی
حسن والے تری ان مست لگا ہوں کی قسم
بعد مدت کے خزاؤں میں بہار آئی ہے

آفتاب احمد نصیر اشرفی.....کراچی
یہ ہل حسن کی بیبت سے درد ہے کہ نہیں
یہ آنکھ عشق کی وحشت سے لال ہے کہ نہیں
پڑے پڑے درود پوار دیکھنے والے
تیرا یہاں کوئی پرسان حال ہے کہ نہیں
(شاعر: میر احمد نوید)

فیصل جاوید.....مظفر گڑھ
بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روڈوں کی آنکھوں میں مسکراؤں کی
وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کے مناؤں کی
(شاعرہ: پروین شاکر)

قاضی شرف الدین جمیدی.....لاہور
نظر ملائی ہے ساقی تو لاج بھی رکھ لے
تمام عمر نظر میں تیار رہنے دے
(شاعر: معلوم)

اسامہ توقیر.....چنیوٹ
بجر کی ماری ان آنکھوں کی تہید مبارک
جن آنکھوں میں تم لیتے ہو ان آنکھوں کو عید مبارک
(شاعر: معلوم)

مرزا انیس بیک.....حیدرآباد
اب کیا کہیں یہ سنگ دلی ہے کہ بے حسی
دل ہے غموں کی زد پہ مگر آنکھ نم نہیں
(شاعر: معلوم)

شاہد خان.....کراچی
تیرے قصورات سے تنہائیوں میں بھی
محسوس کردہ ہوں کہ اک انجمن ہوں میں
(شاعر: رحمت جلی)

ناہیدہ حسنین.....سیالکوٹ
آنکھوں سے میری ہو کے رہا سوز غم نہاں
ہر چند دل میں آتشِ فرقت نہاں رہی
(شاعر: صالحہ بیگم علی)

اگر دل..... شہزادہ
مٹا دوں قص دل سے بھول جاؤں ہو نہیں سکتا
ہی نہیں صحت کی جلاؤں ہو نہیں سکتا
یہ دل کی اجڑی ہستی بھر بساؤں ہو نہیں سکتا
کہ میری روح چاکر رہی ہے آج بھی آپ کی
(شاعر: دارلی بریلوی)

نارم اس نظری..... فیصل آباد
ہم بھٹ کے لیے اس سے بچھڑ جائیں گے
کس کو معلوم تھا ایسی بھی جہان ہو گی
(شاعر: جمیل لاروی)

علی احمد..... کراچی
دوب کر ترے غم میں کب کوئی نہہتا ہے
دھوپ تو بڑی شے ہے جاعنی میں جہا ہے
باد کے دھنکوں سے یوں گزر رہا کوئی
بادلوں کے چوہے میں چاند چھپ چکا ہے
(شاعر: جمیل لاروی)

حافظ علی راہی..... حیدرآباد
چمن گئے تم تو ہوئی رخصت میری دندہ دل
ہونٹ اس دن سے نہیں میرے جسم آٹھا
(شاعر: جمیل سر)

نازیہ شبیر..... لاہور
ایسی تنہائی تو میں نے بھی سونپی بھی نہ تھی
کاش آجائے کوئی دل ہی دکھانے کے لیے
(شاعر: سائرہ محسنی)

صابرہ ارشد..... بہاول
زنجی کس قدر اسکی ہے
اک معا ہے اک بیکلی ہے
میں نے جانا ہے سچ تک
وہ تری عظمت اسکی ہے
(شاعر: جمیل امین)

الحاج ایوب..... مرگودھا
کون ہے درد یاد آتا ہے
تار احساس قمر قمراتا ہے
سارے عالم کو جب بھلا بیٹھے
آج بھر کوئی یاد آتا ہے
(شاعر: شہزاد عورت)



سیدہ انعام..... اسلام آباد
مجھے یقین ہے معراج بنیگی ہو گی
تصورات میں اب میرا آستانہ ہے
(شاعر: بیٹا کاشفی)

غنی محمد زین مے..... لندن وہاڑی
حیرے رخسار و گیسو سے تاجھیں دوں سیکر
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سبلی میں یو اسکی
(شاعر: معلوم)

محمد الیاس..... میرپور خاص
روئے آئی قص رو مٹی شبنم
دامن شب بیکو مٹی شبنم
برگ و گل کے اسرودہ پھروں سے
گرد کی تہ کو دو مٹی شبنم
(شاعر: انور بیٹا مالوری)

کوش اسلام..... مردانہ
فہم افکار سکھل نہ پوچھ کیسے سر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا بھی ایک چراغ بجھا دیا
صفیہ سلطانہ..... راولپنڈی
بہت دنوں سے نہیں اپنے دہمان وہ محض
اداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ محض
(شاعر: جمیل صفائی)

وارث

محترم مدیر
السلام علیکم!

یہ صرف واقعات کا مجموعہ نہیں المیہ ہے۔ یہ مجھ بیتی نہیں میری ایک سہیلی کے گوئہ میں رونما واقعہ ہے۔ اس میں اتنے اہم لوگ ملوث ہیں کہ ہم چاہ کر بھی اس گوئہ کا نام نہیں لے سکتے۔ بہت سوچا کہ اسے تحریر نہ کروں کہ دشمنی کا خطرہ ہے لیکن وہ چیخ جو آج بھی رات کے اندھیرے میں گونجتی ہے مجھے بے چین کرتی ہے کہ تحریر مکمل کر دوں۔ پس اسی خیال سے میں نے اسے کہانی کی شکل دے دی ہے۔
تفصیلہ سعید
(کراچی)

”ایک بات کہوں سائیں۔“ کچھ سوچتی سو مری نے اعجاز شاہ کے چہرے پر اپنی نظریں ڈالتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔ ”آپ دوسری شادی کر لو۔“ بیوی کی بات غور سے سنا اعجاز شاہ جیسے ایک دم چونک اٹھا۔

”ہاں سائیں۔“ سو مری کو شاید اس کا جواب سننے کی ضرورت پائی نہ رہی تھی، اس لیے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ بولی۔ ”اتنی بڑی جائیداد کے لیے کسی وارث کا ہونا ضروری ہے۔ دھیاں تو پر اپا دین ہوئی ہیں اور اگر ہم کل ان کی شادی کریں گے تو یہ ساری زمین پرانے ہاتھوں میں چلی جائے گی، وہ زمین جس کو ہم زمیندار اپنی ماں مانتے ہیں اس پر کسی غیر کا قبضہ کیسے برداشت ہوگا؟ پھر سوچ سائیں اگر کل کلاں اس زمین کو بچانے کے لیے ہم اپنی لڑکیاں کنواری گھر بٹھائیں تو کیا فائدہ۔ ہمارے مرنے کے بعد سردار اس کے لڑکے ان زمینوں پر دھمکتے ہوئے مس جاویں گے اور یہاں سے وہاں تک سارا قبضہ کر لیں گے۔“

سو مری کی باتیں سو فیصد سچ تھیں یہی وجہ تھی جس نے اعجاز شاہ کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے گاؤں میں سب سے زیادہ زمین اس کی تھی۔ سو مری اس کی من چاہی بیوی ہونے کے باوجود پچھلے بارہ سالوں میں اعجاز شاہ کو اولاد دینے نہ دے سکی تھی۔ ان بارہ سالوں میں وہ دو بیٹیوں اور چار بیٹوں کی ماں بنی مگر انفس اس

اس کی بات پر جب اعجاز شاہ کا متنی رد عمل نہ آیا تو اس نے ایک لڑکی بھی ڈھونڈ لی، حلیمہ جو کہ سو مری کی دور پار کی رشتہ دار، ایک سبھی ہوئی لڑکی تھی جسے سوتن بنا کر سو مری کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا اور دونوں اس گھر میں شیر و شکر ہو کر رہنے لگیں اور پھر سو مری کی نیک نیتی سے کی جانے والی دعا میں رنگ لائیں اور جلد ہی حلیمہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ حیدر شاہ اس حوالی میں خوشی کی لہر میں کرا گیا۔ سو مری کی دونوں بیٹیاں فوری اور رانی کی تو بھجھو اپنے بھائی میں جان تھی، دلاور شاہ کے دو سال بعد حلیمہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا، سکھان جس کے پیدا ہونے ہی حلیمہ ہی دنیا چھوڑ گئی اور اس طرح دونوں بچوں کی ذمہ داری سو مری کے کندھوں پر آن پڑی جسے اس نے ہر لحاظ سے بخوبی نبھایا اور بحیثیت ماں



لیکن یہاں آئے اسے زمانہ گزر گیا تھا۔ تیس چالیس سال تو ہو
 ہی گئے ہوں گے۔ پہلے بچے حارث خانی پر دہتا تھا، پھر ہالے ہی
 آکر اسے چڑھا لیا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی تھی۔
 لوگ کہتے تھے کہ ان کی زبان میں اثر ہے جس کو دماغ دے دیں
 وہ ضرور پھری ہوتی ہے۔ ہا ہا صرف جمرات کو کٹیا ہے باہر
 آتے درخشاں رہتے ہیں صرف حیدر شاہ کو اجازت تھی کیونکہ
 لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ انہی کی دعا کا اثر ہے۔ حیدر کے لیے ہا
 کی طبیعت میں ایک عجیب سی محبت اور نرمی بھری تھی جس کی وجہ
 شاہ حیدر کی انسان دوست طبیعت بھی تھی۔ حیدر اپنی لطافت
 کے اعتبار سے باپ اور چاچا سے قدرے مختلف ایک محبت
 کرنے والا انسان تھا اور یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے لوگ بھی اس
 سے محبت کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆

آج حرمی میں لال اور ہرے نئے جھکا رہے تھے
 کیونکہ حیدر شاہ پورے تیس سال کا ہو گیا تھا۔ دیسے تو اعجاز شاہ
 ہر سال اپنے بیٹے کی پیدائش کا یہ دن دھوم دھام سے مناتا،
 پورے گاؤں کو کھانا کھلا پاتا اور تین دن بچنے پر قید مزدوروں
 کے حال پر ترس کھاتے ہوئے انہیں بھی کمر جانے کی اجازت
 دے دیتا مگر آج خاص بات تھی۔ آج وہ اپنے بیٹے کا رشتہ طے
 کرنے جا رہا تھا جب کہ دوسری طرف حرمی کے زنان خانہ
 میں بیٹھا حیدر اپنی ماں سے جرج کر رہا تھا۔ اسے اعتراض تھا
 کہ اس سے پہلے اس کی دونوں بہنیں کیوں نہ نکاح نہیں کیں؟ وہ
 انکاری تھا کہ پہلے لوری اور رانی کے ہاتھوں پر ہندی ہے گی
 پھر وہ سہرا ہائے گے۔ ماں بیٹا کی بحث کے دوران اعجاز شاہ
 کب اندر داخل ہوا دونوں کو پتا ہی نہ چلا دونوں اس وقت
 چرگے جب اعجاز شاہ کی آواز ان کے کانوں سے گرائی۔ ”یہ
 وقت اس روپے کا نہیں ہے۔ اس کو سمجھا دے کہ ان دونوں
 کے جوڑ کا لڑکا ہماری برادری میں موجود نہیں، لہذا ہم ان
 دونوں کا نکاح نہیں کر سکتے۔“

اعجاز شاہ کے الفاظ نے باپم جس نے حیدر سے زیادہ
 سکھان کو چلا دیا اور وہ اسے حیرت اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔
 ”ہا ہا اگر خاتمان میں جوڑ نہیں ہے تو ان دونوں کا
 رشتہ کسی دوسری برادری میں اچھا لڑکا دیکھ کر کر دیں۔ یہ تو
 ہمارے رب کا حکم ہے کہ جو ان بیٹی جلد از جلد اپنے گھر کی
 کردی جائے، ہمارا مذہب ذات، برادری کا درس نہیں دیتا
 ہا۔“ حیدر شاہ نے کھڑے ہو کر اپنے باپ کو سمجھانا چاہا۔

چاروں بچوں میں کسی کوئی فرق نہ رکھا۔ حیدر شاہ رانی سے بارہ
 سال چھوٹا تھا جب کہ لوری بھی اس سے دس سال بڑی تھی یہی
 وجہ تھی کہ وہ اپنی دونوں بہنوں کا دل سے احترام کرتا پھر حیدر
 شاہ شروع سے ہی ذرا الگ طبیعت کا تھا۔ اس میں ڈیموں
 والی کوئی بات نہ تھی۔

سکھیاں سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے نہ صرف
 لاڈلی بیٹی تھی بلکہ نینوں بہن بھائی بھی اس سے بہت محبت
 کرتے تھے سبب تھا جو اعجاز شاہ نے تمام خاندان کے باوجود
 حیدر شاہ کے ساتھ ساتھ سکھیاں کو بھی اسکول میں داخل کر دیا
 کیونکہ وہ اپنی اس بیٹی کو پڑھانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس
 نے برادری کے بڑوں کی طرف سے کیے جانے والے کسی
 اعتراض کو درغور اٹھانہ چاہا اور ان سکھیاں اسکول کی بیڑیاں لے
 کر نکلی ہوئی کالج تک جا پہنچی۔

☆☆☆☆☆

جب چھپے ہی گاؤں جانے والی میٹروپولیٹن پڑوسی، حیدر
 شاہ کی نظر دور اندھیرے میں ٹھٹھکی اس پہلی سی روشنی پر بڑی
 جربہا کی جھکی سے پھوٹ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی
 جاگ رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے اپنی جیب کے میں
 اتار دی۔ اسے ایسا کرتا دیکھ ساتھ والی سیٹ پر موجود اس کا
 سکیمورنی گاڑا اسلم ایک دم الارٹ ہو گیا جب کہ چھپے والی سیٹ
 پر بیٹھان کا پرانا ملازم ریلنگ بولے بتا نہ رہ سکا۔ ”چھوٹے
 سامیں! آپ ہا ہا سے دن کی روشنی میں ملاقات کر لیں تو زیادہ
 اچھا ہو گا کیونکہ اس وقت جنگل میں اندھیرا پھیل گیا ہے اور
 ایسے لمحے ہیں۔۔۔۔۔“

”نہیں چاچا، میں پہلے ان سے ملوں گا پھر حرمی جاؤں
 گا۔“ حیدر شاہ کے منہ سے ایسے ہی ریلنگ کو خاموش کر دیا کیونکہ وہ
 جانتا تھا کہ ہا ہا کے معاملے میں حیدر شاہ بہت جذباتی ہے۔
 بچپن سے ہی اسکول سے واپسی میں ہا ہا سے ملاقات ضرور کرتا
 اور اس کے اس محل پر کسی اعجاز شاہ نے بھی اعتراض نہ کیا تھا
 یہی وجہ تھی کہ وہ جب چاہتا ہا ہا سے ملے اس کی کٹیا میں بھیج
 جاتا۔ ریلنگ کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ ہا ہا جراثیمی عام زندگی
 میں بھی کسی سے ملے کٹیا سے باہر نہ نکلتا تھا یہاں تک کہ باہر
 کھڑے کسی سالک کے لیے اس کی کٹیا کا درد ادھو بھی مشکل
 سے کھتا لیکن جب حیدر پہنچتا تو وہ خود اپنی کٹیا سے باہر نکل کر
 اس کا استقبال کرتا۔ باوجود اس کے کہ وہ اعجاز شاہ اور سرور کو
 سخت ناپسند کرتا، ہا ہا کون تھا، کہاں سے آیا تھا کسی کو پتا نہ تھا

کے سامنے رکھ دیا۔
 ”مجھے اُمید نہ تھی کہ اس زمانے میں بھی لوگ ایسے
 دقیاؤں سے ہوسکتے ہیں۔“ سہاول، سکھان کی بات سن کر حیرت
 سے بولا۔
 ”دیکھو سہاول میں تمہارے ہاتھیں روکتی ہیں اس لیے
 اچھا ہو گا کہ ہم دونوں کو رٹ میرج کر لیں۔“ سکھان کی بات
 سن کر سہاول چونک اٹھا۔

”مجھے اپنے رب کے کسی حکم سے انکار نہیں۔“ اچھلا شاہ
 نے سختی سے لب بھیجنے ہوئے اپنے لاڈلے بیٹے کی جانب
 دیکھا۔ ”لیکن ہماری برادری میں آج تک کوئی لڑکی باہر نہیں
 چلائی گئی کیونکہ ہم اپنی زمین کو ماں سمجھتے ہیں، اس لیے نہیں
 چاہتے کہ لڑکی کے ساتھ جسے میں اسے زمین تقسیم کر کے دے
 دی جائے۔“

یہ وہ بڑے اگشالاف تھے جو آج سکھان پر ہوئے ورنہ
 وہ تو سہاول کی محبت میں ادنیٰ ان تمام باتوں سے کسی بے پروا
 تھی۔ اس نے تو کبھی بچپن کی کوشش ہی نہ کی کہ رائی اور
 نوری اسی عمر میں... کھواری کیوں ہیں؟ اور آج بھی شاید وہ نہ
 جان پائی جواگر حیدر شاہ اس سلسلے میں باپ سے سوال نہ کرتا۔
 باپ کے جواب نے سکھان کو ایک نئی اوجھن میں ڈال دیا
 کیونکہ سہاول کا تعلق دوسری برادری سے تھا۔ اسے سوچتے پر
 بھی یاد نہ آیا کہ ان کی برادری میں کوئی لڑکا اس کے جوڑ کا بھی
 ہے سوائے چاچا سردار کے چھوٹے بیٹے زمان کے جس سے
 سکھان کو شدید نفرت تھی۔ یہ خیال ہی اس کے لیے جان لیوا تھا
 کہ کوئی مناسب اور جوڑ کا رشتہ نہ ہونے کے باعث وہ بھی
 نوری اور رائی کی طرح ساری حیاتی سلیڈ لباس پہنے گزاردے
 گی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی کیونکہ اسے رگوں سے محبت تھی، سفید
 رنگ تو اسے بھی پسند ہی نہ آیا تھا اگر یہی رنگ اس کا نصب
 بن گیا تو..... ہرگز نہیں۔ سکھان نے اپنے دل میں عہد کیا کچھ
 بھی ہو جائے وہ اپنی زندگی بڑی بہنوں کی طرح نہیں گزارے
 گی۔ بے شک سہاول سے شادی کرنے کے لیے اسے گھر ہی
 چھوڑنا پڑے گا مگر وہ ہار نہ مانے گی، خود کو نوری یا رائی
 نہیں بننے دے گی کبھی بھی نہیں۔

☆.....☆

سہاول، حیدر شاہ کا دوست تھا اس کی چھوٹی بہن ماہی
 سکھان کے ساتھ چڑھتی تھی جسے کالج چھوڑنے اور لینے سہاول
 ہی آیا کرتا تھا۔ اس دوران اسے کب سہاول سے محبت ہوئی پتا
 ہی نہ چلا ہوش حب آپا جب باپ کی زبانی علم ہوا کہ اس کا رشتہ
 غیر برادری میں ملے نہیں ہو سکتا، یہی وجہ تھی جو آج وہ ماہی کے
 گھر جانے کا بہانہ کر کے سہاول سے ملے آئی۔ چونکہ ماہی ان
 دونوں کی محبت کی واحد راہ دار تھی، اس لیے سکھان کو جب بھی
 سہاول سے ملنا ہوتا وہ بلا خوف و خطر ان کے گھر آ جانا کرتی اور
 آج تو معاملہ بھی بہت سنگین تھا جسے آتے ہی اس نے سہاول

قارین مسوحوہوں

سچا نہیں ملتا

ہم عمر سے بعض مقامات سے پر شکایات مل رہی ہیں
 کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
 انٹرنیٹ کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
 ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
 کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ یک اشال کا نام جہاں پر چاند شہادت نہ ہو۔
 ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
 ☆ ممکن ہو تو یک اشال PTCL یا موبائل نمبر۔

0301-2454188

خاص سوسائٹس ڈسٹرکٹ

مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: **jdpgroup@hotmail.com**

کے بڑے بڑے معززین بھی شریک تھے، سجاد ملانی ہی اپنے بابا اور بڑے بھائی کے ساتھ شریک ہوا جب کہ احمد علی ملانی کی شرکت کا مقصد محض اتنا تھا کہ وہ اعجاز علی شاہ سے اپنے بیٹے کے شتے کی بات کر سکے۔ جب کہ سجاد ملانی کا بڑا بھائی ملاد علی ملانی ہی جو کہ حالیہ الیکشن میں اپنے گاؤں سے منتخب ہو کر اسمبلی پہنچا تھا وہ بھی ان دونوں کے ہمراہ تھا۔ احمد علی ملانی اپنے گھر سے فیصلہ کر کے آیا تھا کہ یہ شتہ نہیں کسی زمین دجا یادو کے بنا

ملے کرنا ہے اور انہیں امید تھی کہ اعجاز شاہ راضی ہو جائے گا کیونکہ بیٹی کا رشتہ ملے کر تو وقت سارا مسئلہ ہی زمین سے محبت کا ہوتا اور زمین احمد کو نہیں چاہیے تھی۔ ویسے بھی سکھان ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی اور شاید وہ اپنے خاندان کی وادعہ لڑکی تھی جسے تمام تر مخالفت کے باوجود اس کے باپ نے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی تھی مگر یہ وہ واحد سبب تھا جس نے احمد کے ساتھ ساتھ سجاد ملانی کو بھی خاصا براؤنڈ کر دیا تھا کہ اگر اعجاز اپنی بیٹی کو تعلیم دلا سکتا ہے تو یقیناً اس کا رشتہ بھی غیر برادری میں ملے کر نہ کرے گا کوئی عارضی دھوکہ دے گا اور یہی ان سے غلطی ہوئی۔ وہ بھول گئے کہ اعجاز شاہ اپنے فرسودہ رسم درواج میں بکڑا ایک خدی اور جاہل انسان ہے جو احمد ملانی کی بات سننے ہی بھڑک اٹھا۔ اسے حیرت تھی کہ احمد ملانی کی اتنی حرأت کیسے ہوئی کہ وہ اس کے گریپھ کر اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرے حالانکہ یہ تو کسی بھی ماں باپ کے لیے اعزاز کی بات ہوتی ہے کہ بیٹی کا رشتہ خود چل کر ان کے گھر آئے، انہیں تلاش نہ کرنا پڑے لیکن چونکہ یہاں صورت حال مختلف تھی۔ غیردوں کی زبان سے اپنی بہن بیٹی کا نام سننا بھی موت کے مترادف اور بے غیرتی کی علامت سمجھا جاتا تھا لہذا اعجاز کے ساتھ ساتھ سرور اور اس کے تینوں بیٹے بھی تن کر احمد کے مد مقابل آن کھڑے ہوئے۔

”ایک منٹ بابا جلیز آب اتنا ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟“ صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتا حیدر شاہ سجاد کی مدد کو آگے بڑھا کیونکہ وہ ملاد کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھ چکا تھا جس سے اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ معاملہ کافی سنگین ہو چکا ہے۔

”یہ میرا دوست سجاد ملانی ہے جو کہ ایک قابل اور.....“

”ایک منٹ بابا۔“ اعجاز شاہ کے کچھ بولنے سے قبل ہی سرور جیسے کی جانب پلٹا۔

”تمہارا دوست ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ہمارے گھر کی بہو بیٹیوں پر گندی نظر ڈالے۔“ سرور نے بات کو

”کوئی فیصلہ جلد بازی میں نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے سکھان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہارے گھر والے مان جائیں دیے بھی تم شاید بھول گئی ہو کہ ہمارا تعلق جس علاقے سے ہے وہاں گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والوں کو کاری کر دیا جاتا ہے۔ یاد رکھنا تمہارا خاندان ہمیں کبھی نہ بخشے گا اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری محبت دشمنوں کی نذر ہو جائے۔“

”اور اگر میں اپنے خاندان کے رسم درواج کی بھیبت چڑھ گئی تو؟“

”فکر نہیں کرو ایسا کچھ نہیں ہوگا میں خود حیدر شاہ سے بات کروں گا میرا خیال ہے کہ وہ میری بات سمجھ جائے گا۔“

”باہل ہو گئے ہو کیا؟“ سجاد کی بات سننے ہی سکھان ایک دم نرم ہو گئی۔ ”وہ میرا بھائی ہے ایسا نہ ہو تمہاری کوئی بات اسے بری لگ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔“

”کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ سجاد سوچتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا اس طرح ملنا بھی ٹھیک نہیں اور نہ ہی ہم ایک دوسرے کے بتا رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنے گھر میں میرا ذکر کرو اور میں اپنے بابا تک تمہاری بات پہنچاؤں۔“

”ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں کہ ماں سے بات کروں۔“ سکھان کا لہجہ یقین سے خالی تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ماں سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا پھر بھی سجاد کو جھوٹی تسلی دیتی وہ اپنے گھر واپس آ گئی۔

☆.....☆

خوش بخت، حیدر شاہ سے پورے چار سال بڑی تھی لیکن اس کی خوش بختی یہ تھی کہ وہ سرور علی شاہ کی اکلوتی بیٹی تھی جسے حیدر شاہ کا مقدر بنادیا گیا اور نکاح کے پروانے پر مائل کرتے ہی خوش بخت کی ساری زمین حیدر شاہ کے نام منتقل ہو گئی اور اس خوشی کے موقع پر پورے گاؤں کو تین دن تک کھانا کھلایا گیا۔ اعجاز شاہ خوش تھا کہ آج اس کی زمینوں میں مزید زمین کا اضافہ ہو گیا اور اپنی جگہ سرور شاہ بھی مطمئن تھا کہ جتنی زمین بیٹی کے نام کی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ نیازی کی شادی سکھان سے کر کے حاصل کر لے گا لیکن اسے خبر نہ تھی کہ قسمت ان دونوں پر ہنس رہی ہے۔ زمین دجا یادو کی خاطر انسانوں کو اہیت نہ دینے والے دو انسان جو بھول رہے تھے کہ ایک دن اسی زمین میں دفن ہو جاتا ہے۔

☆.....☆

آج حیدر شاہ کا لہجہ تھا جس میں گاؤں کے علاوہ شہر

بالکل ایک یارخ دے کر ماحول میں لگی آگ کو حیران بخڑا دیا۔
”چاچا سائیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“

سجاد نے آگے بڑھ کر سر دوکھٹا چاچا کو اس کا یہ عمل خاصا خطرناک ثابت ہوا کہ سرزد سے بچا سوچے سمجھے سجاد کے منہ پر پھیر دے مارا۔ گھر آئے سہمان کی انکی عزت افزائی اس قبیلہ کی روایت تھی جس کا مظاہرہ سرور شاہ نے کیا۔ غصے میں بیچ و تاب کھاتا بلادل سمجھ گیا تھا کہ یہاں کی جانے والی کوئی غلط حرکت ان لوگوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے لہذا وہ فوری طور پر اپنے باپ اور بھائی کو لے کر اس گاؤں کی حدود سے نکل آیا لیکن گاؤں کی سرحد عبور کرتے کرتے اس کا دل غصے کے ساتھ ساتھ نفرت اور انتقام کی آگ سے بھر چکا تھا جو شاید اب بدلے لینے کا منصوبہ بنانے والی تھی اور اعجاز شاہ کو احساس بھی نہ تھا کہ آج انجانے میں اس سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے جس کا خیزا زہ شاید اس کی آنے والی کئی لسوں کو چکانا تھا۔

☆.....☆

سکھان دور در ہی تھی اور اس کے سامنے بیٹا حیدر شاہ بے بسی سے اپنی بہن کو روتا دکھ رہا تھا۔ جب کہ سکھان کا اس طرح زار و قطار روتارانی کے لیے بھی دکھ کا باعث بن رہا تھا کیونکہ بڑی بہن ہونے کے ناتے وہ اپنے چھوٹے دونوں بہن بھائی سے مادرانہ شفقت کے جذبات رکھتی تھی۔ اس نے خاموشی سے آگے بڑھ کر سکھان کو گلے سے لگایا۔ مقصد جس اسے تسلی دینا تھا مگر جانے خوش بخت کو کیا ہوا جو وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھی اور حیدر شاہ کو مخاطب کر کے طرہ انداز میں بولی۔ ”غیر مرد کے لیے روتی بہن یا اپنی کو زندہ زمین میں گاڑ دینے والے لوگ ہیں ہم اور یہاں بے غیرتی نہ دیکھو کیسے گلے سے لگا کر بڑھا دیا جا رہا ہے تاکہ کل کلاں کو یہاں نہ کالا کر کے ہم لوگوں کی عزت خاک میں ملا دے۔“

خوش بخت کی چمکارتی آواز نے روتی ہوئی سکھان کو ایک دم ہی چپ لگا دی۔ اس نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھ کر سامنے کھڑی بھالی پر ایک نظر ڈالی جو استہزائیہ انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”ایسے کیا گھور رہی ہو۔“ کرے میں موجود حیدر شاہ اور رانی کو قطعی نظر انداز کرتی خوش بخت سکھان کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”پہلے بڑھائی کے نام پر تم نے شہر جا کر جو گل کھلائے ہیں مناسب جاتی ہوں اور شکر کرو کہ ابھی تک میں نے زمان کو کچھ نہیں بتایا ورنہ اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح تمہاری زندگی بھی اسی گھر کے ایک اندھیرے کرے میں

اڑیاں رگڑتے گزر جاتے گی۔“ خوش بخت کے غرور میں ڈوبے یہ الفاظ نہ صرف سکھان بلکہ رانی کے لیے بھی تکلیف کا احساس بن رہے تھے جس سے وہ یہ توقف لڑی قطعی ناواقف تھی۔ اسے غرور تھا کہ محض چند سو گز کی زمین کے بدلے حیدر شاہ جیسا خوب مرد اس کا مقدر بنایا گیا جب کہ اس سے کئی سال بڑی رانی اور روری بی ابھی تک کنواری اپنے باپ کی دلہیز پر بیٹھی تھیں اور رہی سکھان تو وہ بھی اگر خیا ز سے شادی پر آمادہ نہ ہوئی تو بھینا اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح گھر کے اندر بند قید تھی اس کا مقدر بن جاتی اور ابھی وہیں کہ وہ حکم تصور میں سکھان کو اپنے عیش بھائی کا مقدر بنا دیکھ کر خوشی سے اپنے جواس کھینچتی تھی مگر بھول گئی تھی کہ یہ مقابل رانی یا نور بی بی نہ تھیں بلکہ سکھان تھی جو بڑی دونوں بہنوں کے مقابلے میں اپنے باپ کی زیادہ سرحلہ تھی ہونے کے ساتھ ساتھ حیدر کی بھی لاڈلی مٹی تھی وہ بھی خوش بخت کی بڑھک وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی اور اپنے آنسو صاف کرتی زور سے ہنس دی۔

”واہ بھرجانی واہ.....!“ سکھان نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔ ”میری قسمت کا فیصلہ تم نے ایک سیکنڈ میں یہاں کڑے کڑے ہی طے کر لیا، قربان جاؤں میں تمہاری اس ادا پر اور تمہیں اچھی طرح سمجھا دوں کہ اپنے بھائی کے حوالے سے جو سہانے خواب تم نے دیکھنا شروع کیے ہیں وہ سب کچھ ختم کر دو تو اچھا ہے کیونکہ سکھان اور رانی آپا میں بہت فرق ہے اس لیے بہتر ہوگا اپنے منہ سے نکلے ہم کبھی اور جا کر پچھنکو۔ میں تم سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔“

حیدر نے آئے سامنے کھڑی تند بھالی پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے آگے بڑھا جب کہ رانی سر جھکائے اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس کی کوئی بات ایک بار پھر سے خوش بخت کو ناراض نہ کر دے جب کہ حیدر خوش بخت کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو، جاؤ اپنے کمرے میں۔ یہ مسئلہ ہم بہن بہنوں کا ہے ہمیں ہی طے کرنے دو۔“

”اوہہ!“ خوش بخت نے تیزی سے حیدر شاہ کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا، سکھان پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی اور کرے سے باہر نکل گئی۔ حیدر اپنی جگہ خاموش کھڑا کچھ دیر تک بیوی کو پشت کی جانب سے ٹکتا رہا جب تک وہ برآمدہ عبور کر کے اپنے کمرے کی جانب نہ بڑھ گئی پھر بہن کے سر پر ہاتھ دھرتا شفقت سے بولا۔ ”تم رومت میں کچھ کرنا تو۔“ اتنا کہہ کر لیے بیٹوگ بھرتا خود بھی کرے کی دلہیز پار کر گیا۔

نہیں آتا چاہے تھا مگر شاید شہر کی تعلیم نے جنہیں بے غیرت کر دیا ہے اور تم باپ، بھائی کی بے عزتی بھول بیٹھے ہو۔
 ”ایسی بات نہیں ہے ادا۔“ اسنے لوگوں کے کچ اعمار شاہ اور اس کی بیٹی کا تذکرہ اور پھر بلاول کا اعزاز منگوا کر ہوا دل شرمندہ کر گیا۔

”ہات بھیجی بھی ہوا مگر جنہیں اسی لڑکی سے شادی کرنی ہے تو پھر ہم سب کا یہی فیصلہ ہے کہ تم اس لڑکی کو بھاگ کر لے آؤ تو ہی تمہاری اس سے شادی ہو سکتی ہے ورنہ نہیں کیونکہ اعمار شاہ سے لیا جانے والا کوئی انتقام اس سے بہترین نہیں ہو سکتا کہ ان کی عزت ہمارے گھر بچے جانے اور وہ ہاتھ ملنے رہ جائیں۔“

سہاول نے دیکھا وہاں موجود ہر شخص بلاول کے اس فیصلے کا حامی تھا یہاں تک کہ اس کے باپا جان بھی شاید یہی چاہتے تھے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ اپنی محبت ہانے کے لیے آنے والی کئی سٹوں کو انتقام کی اندھی آگ میں جھونک دے کس لیے ایک بار پھر سے امت جمع کرتا ہوا بولا۔
 ”میری حیدر شاہ سے بات ہوئی ہے اس کا یہ کہنا ہے کہ ہمارا سوال کرنے کا طریقہ غلط تھا اسکا ہاتھ پہلے گھر کی عورتوں کے درمیان ہونی چاہیے پھر انہیں مردوں تک پہنچایا جاتا ہے، ایسے سوال ڈائریک مردوں سے نہیں کیے جاتے۔“

”وہ پھر شاہاش ہے۔ ایک لڑکی کی خاطر تو اپنے باپ اور بھائی کو بھی اب غلط کہنے، تیرا خیال ہے کہ ہم ان کے گھر پہلے اپنی بیٹیوں کو وکیل کرانے بھیجتے اور پھر خود وکیل ہونے جاتے۔“

”ایسی بات نہیں ہے باپا جان! آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”ہمیں کوئی کوشش نہیں کرنی کہ تمہاری بات سمجھ سکیں۔“ بلاول نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے ساری بات ختم کر دیا ہوا یہی کہاں جیسے۔ ”یہ تو ہے کہ اب ہم دوبارہ اس گاؤں میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر حیدر خود اپنی بہن یہاں چھوڑ جائے تو ہمیں منظور ہے ورنہ تم اسے وہاں سے بھاگ لاؤ کیونکہ اس گاؤں میں تمہاری برائت جانا اب مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور یہی ساری برادری کا آخری فیصلہ ہے۔“

”پھر جو فیصلہ آپ سنار ہے ہیں میرے لیے وہ بھی ناممکن ہے۔“ قطعی انداز میں بات ختم کرتا سہاول اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے خبر نہ تھی کہ دور کمری نظر براس کے اس فیصلے پر کھٹکلا کر ہنس رہی ہے۔

”ادھیہ یہ کچھ کرے گا۔“ پیچھے کمری سکھان منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی جس بھائی نے گھر میں بیٹھی دو بڑی بہنوں کی موجودگی میں سہا سہا لیا وہ میرے لیے کیا کرے گا۔ سارے کے سارے لاٹھی اور اپنی غرض کے مارے انسان، بے غیرت، بہنوں کو زندگی کی خاطر قربان کر دینے والے لوگ۔“
 ”خاموش ہو جاؤ سکھان۔“ رانی سے اب حربہ برداشت نہ ہوا تو وہ فوراً ہی اسے ٹوک بیٹھی۔ ”تمہارا اور غرض بخت کا مسئلہ الگ ہے مگر تم لمبے کی شدت میں یہ بھول گئی ہو کہ حیدر شاہ ہمارا اگوتا بھائی اور ہمارے باپا کا تھا وارث جسے ہم نے بڑی منتوں اور مردوں سے حاصل کیا ہے اپنے بھائی پر اگر ہماری ساری زرعی بھی قربان ہو جائے تو کوئی پروا نہیں، زمین تو بہت معمولی چیز ہے ہم تو اس پر اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔“

”آپ وارث کی ہوں گی مگر میں نہیں۔“ حیدر اور محارت سے جواب دہنی سکھان کے چہرے پر چھائی نفرت، رانی کو بھی خاموش کر دیا مگر وہ سمجھ گئی کہ اس وقت اس لڑکی سے کوئی بھی بات کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے لہذا اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہ بھی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆

آج بیٹھک میں کوئی خاص میلنگ تھی جس میں شرکت کے لیے سہاول کوئچ سے ہی پیغام مل گیا تھا وہ یونہی دھڑکی سے کمر آتے ہی سیدھا دوسرے جا پہنچا جہاں اس کے باپ اور بھائی کے ساتھ خاندان کے چند بڑے بھی موجود تھے جنہیں سلام کر کے سہاول اپنے بھائی بلاول کے قریب رہی خالی کرسی پر جا بیٹھا تھی بلاول نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

سوال اتنا اچانک تھا کہ سہاول ایک دم گڑبڑا گیا اور سمجھ ہی نہ پایا کہ اسنے لوگوں کی موجودگی میں وہ بھائی کو کیا جواب دے۔ جب احمد علی نمازی کی آواز اس کے کان سے گزری۔
 ”سوال اتنا اچانک نہیں ہے، جس کا تم جواب نہ دے سکو پھر حال ہم سب آج یہاں تمہارے لیے ہی جمع ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔“

”میری شادی۔“ سہاول جیسے اپنی شادی کا سننے ہی تڑپ اٹھا۔ ”آپ ابھی طرح جانتے ہیں باپا جان کہ.....“
 ”بس!.....!“ اس کی بات کا قاف بلاول تجزی سے بولا۔
 ”تم جو بے عزتی اس دن جاری وہاں سے کرو کر لائے ہو اس کے بعد تو تمہاری زبان پر بھی اعجاز شاہ کی چھوری کا نام بھی

☆.....☆

جسہ کو زمان کے ساتھ کلاخ ہے، یہ خبر تھی یا کوئی پھلتا
لاوا جس نے ایک ہی بل میں سکھان کے سارے دجو کو جلا کر
بجسم کر دیا اور وہ غصے میں جلی بجی و نعمانی ہوئی حیدر شاہ کے
کمرے میں جا پہنچی، جہاں وہ خوش بخت کی ولداریوں میں
معروف تھا۔ اس منظر نے سکھان کو سرتاپا بری طرح تپا
دیا۔ اس کی حالت دیکھ کر خوش بخت نے جیسے اجمارے کیا اور
ٹھوہے ہنس دی۔ اسے نظر انداز کرتی سکھان، حیدر کے پاس جا
کھڑی ہوئی۔ ”ادا سائیں تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری
شادی وہاں ہوگی جہاں میں چاہوں گی میری زبان والا کیا
تھا شاہ۔“

”اے چھوڑو میں بتاتی ہوں، راتخ الاول کے پہلے
جسہ تمہارا کلاخ میرے بھائی سے ہونا طے پا گیا ہے اور اب
تمہاری اچھل کود کا ہم پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“ حیدر کے
جواب دینے سے پہلے ہی خوش بخت نے سکھان کے دل میں
گلی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ وہ دیش کھا کر کٹلی اور خوش بخت کو
کھودے ہوئے بولی:

”اپنے دل سے یہ خوش فہمی نکال پھینکو، کوئی فائدہ نہیں
کیونکہ ابھی سکھان اتنی کمزور نہیں ہوئی ہے کہ زبان جیسے میاش
آوی کا مقصد بنا دی جائے یا درمنا میں ان لوگوں میں سے
ہوں جو اپنی تقدیر خود بناتے ہیں، تمہارے جیسے ناکارہ لوگوں
کی طرح بنی بنائی تقدیر کا حملہ ہونے نہیں آجاتے۔“

خوش بخت کو دوبارہ جواب دے کر وہ کمرے سے باہر
نکل آئی۔ حیدر اس کے پیچھے لگا اور سکھان کا بازو تھامتے
قدرے پیار سے بولا۔ ”اتنا فصد نہ کرو میں ایک درود میں باہا
سے تمہارے حق کی بات کرتا ہوں تم پریشان نہ ہو۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہے جانے دو۔“ سکھان کو جیسے حیدر
شاہ کی تسلی و دوائے کی بڑکے سوا سمجھ نہ گئی اور وہ حیدر کی گرفت
سے اپنا بازو چھڑاتی تیزی سے اوپر جانے والی میزچیلوں کی
جانب بڑھ گئی۔

☆.....☆

آج حیدر کا دل بہت پریشان تھا اس لیے وہ صبح
سویرے ہی باہا کی کٹیا پر جا پہنچا جو شاید فجر کی نماز کے بعد
وفا تک میں معروف تھے۔ اسے کچھ دیر بند دروازے کے
باہر انتظار کرنا پڑا۔ پھر منٹ کے انتظار کے بعد باہا اچھ میں
سیخ لیے باہر نکل آئے۔ عمو! کیا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ خود باہر
آئیں ورنہ حیدر کو اندر کٹیا میں آواز دے کر بلا لیتے۔ حیدر

انہیں باہر آتا دیکھ کے تیزی سے اپنی جیب کا دروازہ کھول
کر پیچہ اتر اور آگے بڑھ کر احرا نا باہا جی کے کھنوں کو چھونے
کے لیے جھکا ہی تھا کہ انہوں نے حیدر کا کندھا تھام کر اسے
روک دیا۔ کچھ دیر وہ حیدر کی شکل دیکھتے رہے اور پھر اسے اپنے
سینے سے لگا لیا۔ حیدر کو محسوس ہوا جیسے باہا جی رو رہے ہوں۔ وہ
ایک دم گھبرا گیا اور اپنا سر ان کے سینے سے اٹھاتا ہوا بولا۔ ”خیر
ہے باہا جی آپ کچھ پریشان ہیں۔“

”پریشانی تو بہت ہے۔ لال آغری کا غبار دور سے اٹتا
نظر آ رہا ہے جو اپنے ساتھ سب کچھ ہلا ڈالے جائے گا۔ کچھ باقی
نہ بچے گا۔ رہے گا تو صرف اللہ کا نام، باقی سب فانی ہے۔
سب ختم ہو جاتا ہے۔“ باہا در زور سے بولنے کے ساتھ روٹتی
رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے بہتا پانی، واڈھی جھکوتا ان کی
قیس کے گرد پان کو بھی بھگورہا تھا۔ ان کا اس طرح رونا حیدر کو
بے چین کر گیا تھا۔ اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ باہا کیسے کیوں رو رہے
ہیں، حق ہے کچھ باتیں سمجھنے میں وقت لگتا ہے اور ابھی شاید
حیدر کے سمجھنے کا وقت نہ آیا تھا، یہ ہی وجہ تھی جو وہ باہا کے ہاتھ
نہایت عقیدت سے تھامے انہیں روتا دیکھ رہا تھا اور نہ صرف
حیدر بلکہ اسلم اور گاڑی میں موجود دیگر افراد بھی باہا کے اس
طرح رونے پر نہایت خاموشی سے سر جھکائے حیران پریشان
کھڑے تھے جب باہا کی آواز ان کے کان سے گھرائی کہ اب
تم جاؤ مجھے بھی جانا ہے یہ آخری پڑاؤ ہے۔ کچھ آخری وقت
آگیا سب چھوڑ کر جانے کا وقت آگیا۔ اب تم سے وہاں
ملاقات ہوگی میرا انتظار کرنا۔ ”اپنی بے ربط گفتگو کو کوئی سرا
دینے بنا باہا واپس کٹیا میں چلا گیا اور باہر حیدر اس وقت تک
کھڑا رہا جب تک اسلم نے اس کا کندھا ہلا کر اسے گاڑی میں
بیٹھنے کا اشارہ نہ کیا۔

☆.....☆

رات کی تاریکی چار سو پچیس بج چکی تھی اور حلی کا ہر کین
اپنے کمرے کے دروازے بند کیے خواب غرقوش کے کمرے
لوٹ رہا تھا۔ گلتا تھا پوری حلی پر ایک سکون کی چادر تھی ہے
لیکن بظاہر جو سامنے سے دکھائی دیتا ہے اکثر دوسرا ہوتا نہیں
ہے اور یہاں بھی ایسا نہ تھا۔ حیدر شاہ اپنے کمرے میں بے
چین کر دوش بدل رہا تھا کہ اس سے سکھان کی حالت دیکھی نہ
جاری تھی، ایسے ہی سومری بھی جاہ نماز پر بیٹھی اپنے اللہ سے
دست سوال بھیجی اس کے سامنے اپنی خوشیوں کے لیے جموٹی
پھیلائے بیٹھی تھی۔
نیند تو سکھان کی آنکھوں سے بھی غائب تھی۔ کمرے کی

بات پر یہ طعنہ نہ دے کہ تمہاری وجہ سے میں نے اپنے چاروں کو چھوڑا۔

☆.....☆

حویلی میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ بے شک ابھی یہ ڈھکی چھپی محسوس ہو رہی تھی کہ اماں کا روز بازاروں کے پھر لگانا، ٹوری اور رانی کی بڑی قیامت اس بات کی گواہی کہ گھر میں کچھ نیا ہونے والا ہے پھر آج کل خوش بخت بھی اپنے گھر روز ہی جانے لگی تھی۔ جب وہ وہاں آئی تو اس کے چہرے پر رقصاں قاتمانہ مسکراہٹ سکھان کوئی جان سے جلا دیتی اور اس کا بچی چاہتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سجاد کے ساتھ ہماگ جانے پھر ایک دن ہمت بانٹے وہ سو مری کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ کیا بات ہے پھر بھی اپنے لہجہ میں دینا جہاں کی مٹھاس سوئے ہوئے بڑے دلار سے بولی۔ ”ست بم اللہ آج میری دم خود چل کر میرے کمرے میں آئی ہے میں داری جاؤں ادھر آکر بیٹھ۔“

ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتی سکھان یک دم ہی اس کے پاؤں میں جا بیٹھی اور رو ہنسی ہو کر بولی۔ ”اماں میرے ساتھ یہ ظلم نہ کر۔“

”کون سا ظلم میری بچی میں سمجھی نہیں۔“ سب کچھ جانتے ہوئے بھی جیسے سو مری بالکل انجان بننے ہوئے بولی۔ ”میں نے زمان سے شادی نہیں کرنی اس سے تو اچھا ہے تو میرا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دے۔“ وہ بھی آواز میں رونے لگی۔

”اپنی بد شکونی نہیں کرتے، شکر کہ تیری شادی ہو رہی ہے۔ تیرے نصیب میں رانی اور ٹوری کی طرح سفید جوڑا نہیں لکھا گیا اور نہ تو تو اک دن بھی ان کی طرح دین و پران زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔“ اسے سمجھائی، پہلائی سو مری کی آواز میں ایک حسرت جھپٹی تھی جس نے سکھان کو چونکا دیا اور وہ ایک دم ہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے ہوئے ماں سے نہایت راز دارانہ انداز میں بولی:

”ایک بات بولوں اماں، تو زمان کے ساتھ ٹوری کا دیاہ کر دے آخر کو خوش بخت بھی تو ہمارے بھائی سے چار سال بڑی ہے جب کہ ٹوری اور زمان کی عمر میں تو صرف تین سال کا فرق ہے۔“

”جانتی تو میں بھی یہی تھی۔“ سو مری نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”مگر کیا کرتی خوش بخت کی نظر شروع سے

یہ تنہائی شب کے اس پہر اسے جیسے کھانے کی کمی تھی وہ اس تنہائی اور اندھیرے کا فائدہ اٹھانے کا نئے فن لگائے سجاد سے خوشگوار گئی۔ اس کی آواز اس قدر کم تھی کہ شاید کمرے کی دیواریں بھی انہیں سننے سے قاصر تھیں۔ اس کی یہ دھیمی روٹی ہوئی آواز فون کے دوسرے سرے پر موجود سجاد کے دل کو جیسے چیر رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیا کرے کہ جس سے سکھان کی ساری تکلیف ختم ہو جائے وہ کہہ رہی تھی۔ ”میری بات یاد رکھنا سجاد اگر تم نے کچھ نہ کیا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

”جان سجاد۔“ سکھان کی باتوں نے جیسے اسے تڑپا دیا اور وہ بے قراری سے بولا۔ ”تمہاری موت سے پہلے میں مر جاؤں گا دوبارہ اپنی موت کا ذکر بھی نہ کرنا۔“

”تو پھر کیا کروں اپنی زندگی میں زمان کے ہاتھوں کی مہندی سجا کر خوش بخت کے دل کو کھنڈک پہنچاؤں؟ جانتے ہو جب وہ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرائی ہے تو دل چاہتا ہے کہ کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے جان سے مار دیتی۔“ سکھان کے دل میں موجود نفرت زہر بن کر اس کی زبان تک آ گئی جس نے سجاد کو چونکا دیا اور وہ ہستے سے بولا:

”اگر ایسا ہے تو پھر ہمت کر کے گھر چھوڑ دو۔“ وہ شاید اسی لمحے کی ذم داری آگیا تھا جب سکھان کے آنسو اس کے دل پر درد بن کر گر رہے تھے۔ ”میرے ساتھ میرے گاؤں آ جاؤ کیونکہ میرے بابا اور بھائی تمہیں قبول کرنے کو تیار تو ہیں مگر اب وہ تمہارے بابا کے پاس میرا رشتہ لے کر دوبارہ نہ آئیں گے۔“ اور اس کے ساتھ ہی سجاد نے اسے اپنے اور بلا دل کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن و سن شادی جسے سن کر سکھان سوچ میں پڑ گئی اور آہستہ سے بولی:

”میرا خیال ہے میں ایک دفعہ اماں یا بابا سے خود بات کر کے دیکھ لوں، شاید کوئی راستہ نکل آئے۔“ سکھان کا دل ابھی بھی ڈانواں ڈول تھا اور وہ اس طرح رات کے اندھیرے میں حویلی چھوڑ کر جانے کے خیال سے ہی لرز گئی۔ ویسے تو ہر لڑکی کو ایک دن اپنا گھر چھوڑ کر پناہ دینا جانا ہوتا ہے مگر اس طرح سب کچھ چھوڑ کر جانا کہ واپسی کا سفر ناممکن ہو جائے بہت مشکل ہوتا ہے یہی سوچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سے اپنے آنسو پونچھ لیے مبادا اس کا رونا سجاد کو کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کر دے جب کہ دوسری طرف سجاد بھی سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے خاموش ہو گیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ سکھان اپنا ہر فیصلہ خود کرے تاکہ کل کلاں اسے کسی بھی

وقت کا ختم ہے اور یہ منصوبہ انتقام کے جلتے لاد پر بنایا گیا تھا جس میں بھیجا شرعی شر تھا اور اس شر سے بے خبر کھساں رات گزرنے کے انتظار میں سولی پر لگی پل آگے بڑھتی گھڑی کی سوئیوں کو تک رہی تھی اور خالی دہائی گھڑی کی یہ تک تک کی آواز اس کے دل کی دھڑکن کو تیز سے تیز تر کرنے کا سبب بھی بن رہی تھی۔

☆.....☆

حیدر کو آج فکار پر جانا تھا اس لیے وہ صبح سویرے ہی اٹھ گیا جب کہ خوش بخت کی طبیعت کچھ غراب تھی اور ایسے میں وہ جانتی تھی کہ حیدر اپنا پروگرام کینسل کر دے گا دوسری طرف اٹھ کر کہنا تھا کہ وہ سارے انتظامات مکمل کر چکا ہے اور پھر اسے اگلے پندرہ دن کی چھٹی بھی دور کا تھی جب کہ حیدر کے پاس شکار کرنے کا تصور اسلم کے ہاتھ ہی نہیں اس لیے خوش بخت کو دلا سادہ تادہ جگری نماز پڑھ کر کچن کی طرف آ گیا جہاں گھڑی ملازمہ اماں دوی سب کے لیے چائے تیار کر رہی تھی۔ حیدر کو دیکھتے ہی اس نے جلدی جلدی تیار شدہ چائے ٹک میں ڈال کر ساتھ ہی ناشتا بھی تیکل پر رکھ دیا۔ اسی پل فوری اپنے کمرے سے باہر نکلی اور حیدر کو ناشتا کرتے دیکھ کر ٹھک گئی۔ ”میرا سوہنا اتنی سویرے سویرے کہاں جا رہا ہے۔“ بھائی پر سکرانی عبت پاش نظریں ڈالے وہ سوال گوی۔

بہن کی آواز سننے ہی ناشتا کرتا حیدر اٹھ کھڑا ہوا اور احتراماً سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ”فکار پر جا رہا ہوں اوی، تم میرے پیچھے خوش بخت کا خیال رکھنا وہ کچھ پریشان ہے شاید طبیعت ٹھیک نہیں اس کی۔“

”آج شکار پر نہ جاؤ۔“ بے ساختہ ہی فوری کے منہ سے نکلا۔

”آسمان کا رنگ بدل رہا ہے مجھے لگتا ہے کہ لال آسمان آنے والی ہے۔“ چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز بھی تشویش زدہ ہو گئی۔

حیدر سکر ادیا۔ ”میرے ساتھ بہت سارے لوگ ہیں اوی! اللہ خیر کرے گا بس دعا کرنا میرے لیے۔“

جواباً فوری نے حیدر کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے دعائے اعزاء میں لب ملائے تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ دھیمے سے بڑبڑائی۔ ”شکر سوہنے سائیں جو تو نے فیعت ہمیں عطا کی۔“ اس کا اشارہ کس بات کی جانب تھا حیدر سمجھتے ہوئے ایک بار پھر سے سکر ادیا اور بڑی بہن کا

ہی تھہ پرتی جانے کیوں خوش بخت نے ہمیشہ سے یہ چاہا کہ وہ تجھے بھر جائی بنا کر اپنی حویلی لے جائے جب کہ فوری اور رانی نے ہمیشہ تیرے ساتھ بڑھ کر اس کا چاہ کیا پھر بھی جواہنا نصیب۔“

”اوہ.....!“ اب ساری بات رانی کی سمجھ میں آئی، تو یہ سارا جال خوش بخت کا پھیلا ہوا ہے۔ اپنے باپ اور بھائی کو اس نے کھساں کے پیچھے لگایا تھا۔ یہ سوچ دماغ میں جگہ پاتے ہی جیسے وہ سانپ کی مانند پھٹکارنی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ایسا ہے تو پھر تو خوش بخت کو اپنی خوشی پوری کر لینے دے۔“ سویری کو محسوس ہوا جیسے اس کے لہجے سے بغاوت کی بو آ رہی ہے مگر وہ یہ سوچ کر نظر انداز کر گئی کہ آخرا ایک کمرور لڑکی اسنے طاقت ور مردوں کا مقابلہ کیسے کرے گی اور ایسے میں وہ بھول گئی کہ جب چوٹی ایک باجی کی موت کا سبب بن سکتی ہے تو پھر کھساں کیوں نہیں کچھ کر سکتی اور نہیں اس سے سمجھنے میں ایک ایسی غلطی ہوئی جس کا خیر نہ آئے والی کئی لسوں کو بھگتنا پڑا۔

☆.....☆

کھساں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کیا، وہ اپنی زندگی بھائی کی خاطر قربان نہیں کر سکتی۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں آنے والا یہ خیال اسے مسلسل بے کن کر رہا تھا کہ اس کی زمان سے شادی، خوش بخت کے لیے ایک بہت بڑی فتح ہوگی اس لیے اب یہ جیسے اس کی ضد بین تھی کہ وہ ہر حال میں خوش بخت کو گنہگار نہ دیکھائے جو اس صورت ممکن تھا کہ اسے اپنی بھالی بنائے گا جو خواب خوش بخت دیکھ رہی ہے وہ کبھی پورا نہ ہو جس کے لیے سجاد کی بات ماننا لازمی ہو گیا۔ شادی میں صرف پندرہ دن باقی تھے ایسے میں اس کا حویلی سے لٹکانا خاصا مشکل تھا جس کا حل بھی سجاد کے پاس تھا چونکہ رات کے وقت حویلی کا گیت کھول کر باہر لٹکانا بہت مشکل تھا اس لیے دونوں نے فیصلہ کیا کہ کھساں صبح سویرے اس وقت گھر سے نکلے گی جب نماز کے بعد ساری حویلی کے

کیمین سو رہے ہوں، ساتھ ہی سجاد نے اسے تاکید کی کہ وہ صبح سویرے کی چائے یا دودھ میں نیند کی چند گولیاں ملا دے تاکہ ایک دھبہ ہی چائے پینے کے بعد سونے والوں کو کوئی گھٹے ہوش نہ آئے۔ نماز فجر کے ساتھ ہی حویلی کا گیت بھی مکمل جاتا تھا تو ایسے میں کھساں کے لیے باہر لٹکانا مشکل نہ تھا۔ یہ تو تھی ان دو بھیت کے باروں کی منصوبہ بندی جو اس بے خبری کا شکار بھی کر کوئی اور بھی ہے جو ایک اور منصوبہ بنائے اس

ہاتھ چم کر وہ جیسے ہی باہر نکلے گا ایک دم ہی اس کا سر چکرایا۔ شاید نیند پوری نہ ہونے کے سبب اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے محلی بھی محسوس ہوئی۔ سوچا آج نہ جائے۔ اسی پہلے جیب کا تیز ہارن اس کی سماعت سے گھرا بیٹھنا اسلم ڈیرے سے گاڑی لے آیا تھا اب ایسے میں نہ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لہذا اپنی پہل کو نیٹے میں ڈال حیدر قدم گھٹیاں باہر کھڑی جیب میں جا بیٹھا۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی اور بولا۔ ”کیا ہوا سائیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں! شاید نیند آ رہی ہے۔ ہاتی سب کہاں ہیں؟“

”آکھیں بند کر کے سیٹ سے ٹپک لگاتے لگاتے حیدر نے جیسے چوہے چلتے ہوئے سوال کیا۔

”ڈیرے پر۔“ آہستہ سے جواب دے کر اسلم نے گاڑی کے پرا تار دی اور پلٹ کر ایک نظر حیدر پر ڈالی جو شاید سو گیا تھا پھر ڈیرے اطمینان کے ساتھ وہ جیب دوڑاتا کھینچوں کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆

نور اپنی بکریوں کے لیے گھاس کاٹ کر گھر کی جانب لوٹ رہا تھا جب اس کے کانوں سے کسی عورت کی چیخ گھرائی شاید وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا مگر بے درپے سنائی دینے والی ان چیخوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور وہ تیزی سے اس سمت دوڑا جہاں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ جلد ہی وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا مگر وہاں پہنچ کر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کا دل ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ زمین پر بیٹھی خوں آلود عورت اور گاڑی میں ایک مرد کی لاش اور ان تمام باتوں سے زیادہ اس کے لیے جو خوف زدہ کر دینے والی چیز تھی وہ یہ کہ جیب حیدر شاہ کی تھی اور زمین پر بیٹھی روٹی کر لائی عورت سکھان تھی اور یہی وہ سبب تھا۔ ایک دم ہی نور اعلان کے بل چلاتا ہوا گاؤں کی جانب واپس دوڑا۔

☆.....☆

”خون.....خون.....“ وہ اپنی سائیکل اور گھاس کا کھنڈی وپیں پھینک آیا تھا اور پھر صرف چند منٹ میں پورا گاؤں وہاں جمع ہو چکا تھا جہاں گاڑی میں حیدر شاہ کی خوں آلود لاش ہر شخص کو بین کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ غرض ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہو چکا تھا سوائے سوجھ بوجھ کے جہاں ایک ماحولم سائنات طاری تھا بالکل ایسے جیسے وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔

☆.....☆

سجاول نے بمشکل اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو دن کی

☆.....☆

جیب کے ہارن نے اسے چوکا دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ دیکھ مٹی مٹی ٹگر جب جیب کے دور ہونے کی آواز سنی تو وہ چادر کی ہل مارے حوصلے کے جھپٹے گیٹ سے باہر نکل آئی جہاں چیچے کی جانب کھبت تھے اور پھر بھی گھٹھڑی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی حوصلے سے دوڑ ہوتی چلی گئی وہاں جہاں کھینچوں کے دوسری طرف بیٹھنا سجاد اپنی جیب سمیت موجود تھا اور اسے یقین تھا کہ اس گاڑی میں بیٹھے ہی وہ ایک نئی زندگی میں قدم رکھ دے گی اور یہی خوش فہمی اسے ہواؤں میں اڑائے لیے جارہی تھی۔ جب کہ وہ چیچے حوصلے کی طرف سے بالکل بے خبر تھی کیونکہ سچ سورے ہی اس نے چائے کے دیکچے میں نیند کی گولیوں کی ابھی خاصی مقدار نہیں کھلا دی تھی اور یہ گولیاں اس نے رانی کے پاس سے چرائی تھیں جو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اپنی ڈپریشن دور کرنے کے لیے روز و رات ایک گولی کھا کر سوتی تھی۔ سکھان جانتی تھی کہ یہ گولیاں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں سوائے چند گھنٹوں کی گہری نیند یا نیم بے ہوشی کے اور اسی سوجھ بوجھ میں تم اس کے قدم تیزی سے منزل کی تلاش میں رواں دواں تھے، یہی اسے گولیوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ رکی، اس نے اس طرف دیکھا جب دوبارہ ہر سب کی آواز بند آئی تو وہ

باپ کی اجلی پکڑی مٹی کردی بلکہ اپنا بھائی بھی خود مار دیا اور فکر ہے جو اسکی صورت ہماری حویلی میں بھدین کر نہیں آئی ورنہ جانے کتنی تپلیں برباد کر دیتی۔ ”باپ کی باتیں سنتا سجاد چمک گیا کیونکہ بڑے ناٹم کے ساتھ بھائے اس کے کہہ کرے میں روشنی اترتی، کرا اندر میرا اور ہاتھ اور پھر بلا دل کے لایٹ جلاتے ہی وہ مجھ تکہ گیا کہ رات ہو چکی ہے۔ مطلب وہ بارہ گھنٹے سے بھی زیادہ سو تیار ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے اور اگر گڑبڑ نہ ہو تو بلا دل کے کہہ کرے سے باہر نکلتے ہی اسے اپنا فون بیڈ پر رکھا کیسے نظر آ جاتا اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ بے چین ہوا تھا کہ اس کی اندر می صحت نے سکھاں کو ایک ایسی سائش کے جال میں پھنسا دیا تھا وہ اپنے ہی بھائی کی قاتل ٹھہرا دی گئی اور اب سجاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی کس طرح مدد کرے اور پھر سکھاں کی بے بسی کے خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ سکھاں کو کوئی فون بھیج بھی نہ کر سکتا تھا اور اسی بے چینی میں سے سجاد نے اپنے سیل کو اٹھا کر اس کی میموری چیک کی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گھر سے نکلنے وقت اسے سکھاں نے کیا پیغام دیا ہے مگر مدد حیرت کہ اس کے فون کی میموری بالکل خالی تھی یہاں تک کہ ناموں کی لسٹ سے سکھاں کا نام بھی منتخب تھا۔ اب وہ سمجھ نہ پایا کہ آیا یہ سب اس کے ہاتھ اور بھائی نے احتیاط کے طور پر کیا ہے یا در پردہ کوئی اور کہانی ہے۔ اس موقع نے ہی سجاد کے دماغ کو ابھار دیا۔

☆.....☆

شاید اس نے کر دت بدلنے کے لیے اپنے بدن کو سمیٹا تھا کہ دردی کا ایک شدیلہ اس کے پورے سر اُپے میں دوڑ گئی ساتھ ہی اس کا پاؤں کسی سخت شے سے ٹکرایا تو اس کے سوتے سوتے حواس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے اور بڑی مشکل سے اس نے اپنی بند آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو کمرے کے روشن دان سے چمن کرائے والی روشنی نے اسے دوبارہ آنکھیں موندھنے پر مجبور کر دیا، اسے محسوس ہوا جیسے اس کا جسم سم ہو گیا ہے اور پاؤں کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی بری طرح دکھ رہی ہیں اس احساس کے ساتھ ہی سکھاں نے اپنی ٹانگیں لمبی کرنا چاہیں تو خالی کرا چمن چمن کی آواز سے گونج اٹھا، زنجیر کی آواز۔ اس نے گھبرا کر کھڑا ہونا چاہا تو معلوم ہوا اس کے دونوں پاؤں لوہے کی موٹی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ خوف زدہ ہو گئی اور ایک دم ہی حیدر شاہ کا خون آلود وجود اس کے تصور میں

لپکی ہوئی روشنی اس کے پردوں سے چمن کرائے آ رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی سات بج رہی تھی جب کہ اسے تو سکھاں کے پاس صبح سویرے پانچ بجے پہنچنا تھا۔ اس نے گھبرا کر نیکے کے پاس اپنا موبائل تلاش کرنے کے لیے اٹھ مارا مگر بے سود اس کے پاس اس کا فون نہ تھا۔ ”فون کون نے لیا؟“ وہ بڑبڑایا۔ سکھاں نے تو چہچہے پکڑ ڈی رہی تھی جانا تھا۔ اب تو سواسات ہو گئے تھے یہی عالم پریشانی میں وہ اسے فون کر رہی ہوگی اور اس کا فون.....“ یہ سوچتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھا اور اس کے منڈل پر اٹھ رکھتے ہی ایک دوسرا جھٹکا اسے لگا کیونکہ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ سجاد ایک سینکڑ میں ہی سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور یہ دھوکا کسی اور نے نہیں خود اس کے بھائی نے کیا تھا۔ یہ خیال ہی اسے خوف زدہ کر گیا کہ اگر سکھاں حویلی سے نکل کر پکڑ ڈی پر آئی ہوگی تو یہاں اس کو وہاں سے بلا دل نے اٹھالیا ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا اور چاکہ کہ اسے زور زور سے دھڑ دھڑائے۔ اسی لمبی باہر سے لاک میں چابی کھونسنے کی آواز اس کی سماعت سے گرائی وہ پیچھے ہو گیا۔ دروازہ کھول کر بلا دل کے ساتھ باپا اندر داخل ہوئے۔ سجاد نے اپنے چہرے پر سرکھٹام کر بھائی کی جانب دیکھا اور ہستہ سے بولا۔ ”سکھاں کہاں ہے؟“

”اپنی حویلی میں۔“ بلا دل کا اطمینان قابل دید تھا۔ اس کے جواب نے سجاد کو چھٹکا دیا۔ ”شکر کرو تم بھی گئے کیونکہ سکھاں نے اپنی محبت کو پانے کے لیے حویلی کے کینوں کو بے ہوش کی دوا دی اور جب وہ فرار ہونے لگی تو حیدر شاہ نے اسے پکڑ لیا جس پر اس نے اپنے گئے اور اکلوتے بھائی کو مار دیا۔ اپنی ہی دمی نے اعجاز شاہ کا وارث ختم کر دیا۔ سوچا اگر رات ہم نہیں نیند کی دوا نہ دیجے تو آج تم جیل میں ہوتے یا پھر گاؤں کے لوگ مین موقع پر تم دونوں کو پکڑ کر قاری کر دیتے۔“

”مگر آپ نے مجھے نیند کی دوا کیوں دی؟ کیا آپ کو علم تھا کہ سکھاں یہ قدم اٹھائے گی۔“ سجاد کے لہجے میں شک کی بو آ رہی تھی۔

”نہیں..... لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ سکھاں اس حویلی میں آئے ہم نے تو صرف تمہیں بھلانے کے لیے اس کے فرار کا منصوبہ بنایا تھا کیونکہ ہمیں امید تھی کہ وہ لڑکی بھی اپنے باپ کی پکڑی پیروں سے روند کر تمہارے ساتھ نہ آئے گی مگر افسوس کہ ایک شخص کی محبت میں نہ صرف اس نے اپنے

آکر جیسے اس کے کھوئے ہوئے حواس بھال کر گیا اور اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ بنا کسی تحقیق کے اسے حیدر شاہ کا قاتل قرار دے دیا گیا ہے اور یہ کال کو فخری شاید عمر بھر کے لیے اس کا مقدر بتا دی گئی ہے ساری زندگی اس چھوٹے سے کمرے میں دن رات بتا دینے کا خیال ہی اتنا خوف زدہ کر دینے والا تھا کہ بے اختیار اس کے حلق سے ایک تیز چیخ برآمد ہوئی اور پھر یکے بعد دیگرے اس کی چیخوں سے جیسے کال کو فخری گونج اٹھی۔

☆.....☆

حویلی کے بڑے سے بڑے میں سفید چادریں بھیجی تھیں اور تعزیت کے لیے آنے والوں کا تائبندھا تھا ہر آنکھ ایک بار بھی خوش بخت اسپتال میں تھی۔ رات ہی اس نے وقت سے پہلے ایک بچے کو جنم دیا تھا جو پیدا ہونے ہی فوت ہو گیا۔ یعنی ایک ہی ہفتے میں حویلی کا دوسرا وارث بھی داغ اہل دے گیا۔ سو مری اور رانی بچتے آنسوؤں کے ساتھ سر جھکائے قرآن پاک پڑھ رہی تھیں جب ان کے کانوں سے سکھان کی چیخ گھرائی جسے سنتے ہی رانی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہاں دکھ اور تکلیف کی جگہ نفرت نے لے لی تھی اور کال کو فخری میں قید جتنی چلائی اس لڑکی سے وہاں موجود کسی عورت کو کوئی ہوری نہ تھی سب کے نزدیک وہ ایک قاتل تھی جس نے اپنی عاشقی کے ہاتھوں کے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

☆.....☆

وقت گزر گیا کیونکہ وقت کا کام ہی گزرتا ہے وہ کسی کے لیے کسی نہیں ٹھہرتا اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے جیسے شہر سے میں گلو میٹر دور در شاہ پوری کی حویلی سے بھی سب کچھ وقت کے ساتھ بہہ گیا۔ خوش بخت اپنے حصے کی زمین لے کر باپ کی حویلی واپس چلی گئی جہاں سفید لباس اس کا مقدر بتا دیا گیا اور اپنی رات کی تنہائیوں میں اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے سکھان اس کے آس پاس ہی نہیں موجود ہے۔ اسے لگتا شاید اس کی زندگی سکھان کی بددعا کی زد میں آکر دوہرا ہو گئی ہے اور اس احساس نے اس کی زبان پر قفل لگا دیئے۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا اور خاموش بیٹھی سارا دن چمت گھورتی رہتی، زمان کی شادی رانی سے ہو گئی اور اعجاز شاہ کی ساری زمین اس کے نام منتقل ہو گئی۔ اعجاز شاہ اپنے گھر تک محدود ہو گیا۔ اب وہ کسی سے نہ ملتا تھا جب کہ سو مری بھی سارا دن جامہ نماز سنہیالے اللہ کے حضور سجدے میں گری رہتی۔ حویلی کے

قبرستان میں دو قبروں کا اضافہ ہو گیا۔ ایک حیدر شاہ دوسری اس کے پہلو میں موجود نویری کی قبر جو اپنے شہزادے بھائی کا خون دیکھتے ہی دل کی دھڑکن میں گونج اٹھی اور ایسی زمین پر گری کہ دوبارہ نہ اٹھی۔ حیدر شاہ کے گل کا واحد چشم دید گواہ اسلم تھا جس نے بتایا کہ ان کی جیب روک کر قاتلنگ کرنے والوں نے اپنے چہرے کے پڑے سے پھار کے تھے۔ اسلم نے متوجع حملے سے بچنے کے لیے کسے میں اتر کر اپنی جان بچائی جب کہ حیدر لٹائی جانے کی بدولت اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ اسلم نے یہ بھی بتایا کہ حملہ آور وہاں پہلے سے موجود کسی کے خستہ تھے شاید سکھان کے گھر اس کے آنے سے قبل بد قسمتی سے حیدر کی جیب بے خبری میں ہی جانے دوڑ کر جا پہنچی جس پر قاتلنگ کر دی گئی۔ اسلم نے وہاں کسی لڑکی کو بھی اتے دیکھا تھا مگر اس سے پہلے ہی سفید گاڑی میں سوار حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ اسلم کے بیان نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ بلا واسطہ ہی کسی سکھان اس گل کی شریک جرم تھی۔ اسلم نے ایک اہم بات پولیس سے چھپائی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب اس کا سر پرست کوئی نہ تھا۔ اس حالت میں وہ دینی دھننی پالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نکل مارے ایک شخص کے ہاتھ میں وہ قسمتی گھڑی تھی جو اس نے بلا دل کے ہاتھ میں دیکھی تھی اور سب سے اہم بات جو اس واقعہ کی سی وہ بابا کی خالی کشمکش وہ حیدر شاہ کے گل کے بعد کسی کی کو دکھائی نہ دینے جانے وہ کہاں چلے گئے کسی کی نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی۔

☆.....☆

سجاول نے نماز پڑھ کر سلام پھیرا آج سکھان کی بری تھی جانے کتنے سال گزر گئے تھے وہ ہر سال آج کے دن سکھان کی بری مناتا تھا کیونکہ اسے اسلم کے ذریعے پتا چلا تھا کہ اس رات حویلی میں سکھان کو مار کر خاندانی قبرستان میں ایک بے نام قبر کا اضافہ کر دیا گیا تھا کیونکہ قبیلے کی روایات کے مطابق ایسی کسی لڑکی کو جینے کا حق نہ تھا جو اپنے خاندان کے اچھے شے کو کسی میں رول دے لہذا جرم کی پاداش میں سکھان کی سزا بھی موت ہی تھی جو اسے مل گئی۔ کوئی یہ نہ جانتا تھا کہ آدمی رات کے وقت حویلی سے سناٹی دینے والی چیخیں کس کی ہیں شاید وہ کوئی بدروح بھی جو رات کی تنہائیوں میں حویلی کے زعمہ مینوں کو روپا کرتی تھی۔ جو جانتے تھے وہ خاموش تھے اور جوندہ جانتے تھے وہ بے خبر اور بے خبری میں ہی زندگی گزار رہے تھے۔

(۱۷۱)

نشانِ عبرت

محترم مدیر

السلام علیکم !

ایک عبرت بھرا قصہ ارسال خدمت ہے۔ گو کہ اس واقعہ کو اخبارات نے خوب اچھالا ہے۔ خوب تشہیر کی ہے لیکن اس کا ایک کردار بہت طاقتور ہے۔ علاقے میں خوب رعب دیدہ رکھتا ہے، اس لیے تمام کرداروں اور علاقے کا نام بدل دیا ہے۔ لکھا بھی ہے تو افسانوی انداز میں۔ اُمید ہے میری یہ کاوش قارئین کو پسند آئے گی۔

کوثر اسلام
(صوابی)



پٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی نکیلہ گھر تھی بانی بیٹے بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دونوں بیٹے شادی کے بعد الگ ہو چکے تھے بلکہ یوں کہا مناسب ہے کہ مرزا خالده نے انہیں الگ کیا تھا۔
”کھانا تیار ہے کھالو“ بیوی نے اس کے سامنے کھانا

مرزا خالده برآمدے میں نکیلہ لگائے اپنی بیٹی کو گھر گھر کر دیکھ رہے تھے جو گھر میں چولہے پر ہانڈی چڑھائے کھانا پکا رہی تھی۔

دبلا پتلا چھریا جسم خشکی داڑھی، سر پر ہر وقت رومال باندھے مرزا خالده بیک پچاس کے پٹے میں تھے۔ مرزا کے دو

ماہینا مسرگزشت

”ارے واہ ماسی..... تیرا تو جواب نہیں۔ یہ بتا لڑکا کیا کرتا ہے خاندان بڑا تو نہیں۔“ خالد نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”لڑکے کا نام کوہر ہے۔ ایک جگہ تو گری کرتا ہے چند پیکر زمین ہے ماں باپ مر چکے ہیں دو بہنیں ہیں آگے پیچھے کوئی نہیں۔“ ماسی نے اسی رازدارانہ لہجے میں جواب دیا۔
 ”اس سے اچھا رشتہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ خالد نے جب سے چند لمحوں تک لال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”یہ لے اس خوشخبری کے لیے۔“ مہراس نے ہکلیہ کو آواز دے کر کہا۔ ”ہکلیہ..... او ہکلیہ۔“
 ”مٹی اہا۔“
 ”بیٹے ماسی کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لا۔“
 ”اچھا ابھی لائی۔“

☆.....☆

ہکلیہ خالد کی بیٹیوں میں سب سے خوبصورت فرماں بردار اور خوش اخلاق تھی۔ اس کی ماں اس کے اچھے نصیب کے لیے ہر وقت دعائیں مانگا کرتی لیکن جب سگا باپ ہی بیٹی کو بکاؤ مال سمجھے تو اس کی دعائیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

خالد کی نظر میں گوہر کے رشتے سے اچھا رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لڑکا شریف تھا اس سے طلاق لینا آسان تھا۔ مہر میں بڑی رقم اور زمین کی توقع تھی مرزا دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا۔

اگلے چند دنوں میں ماسی صالحہ کے توسط سے رشتہ ہو گیا۔ مہر میں دو پیکر زمین اور دو لاکھ روپے لکھے گئے۔ ایک مہینے بعد ہی رخصتی ہو گئی۔

گوہر اتنی پیاری بیوی یا کر بہت خوش تھا خصوصاً اس کی بہنیں۔ وہ ہکلیہ کا بہت خیال رکھیں۔ گھر کا سارا کام وہ کرتیں ہکلیہ کوئی کام نہ کیا چاہتی تو ان میں سے ایک دوڑ کر آتی اور یہ کہہ کر وہ کام کرتی کہ ہمارے ہوتے ہوئے ہماری بھائی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہکلیہ دل ہی دل میں خوش ہو کر کہتی۔
 ”مولا ایسا سرسبز اور ایسی سندس بیڑی لڑکی کووے۔“

تقریباً ایک مہینے بعد خالد بیٹی سے ملنے گیا۔ گوہر گھر پر نہیں تھا وہ کام کے لیے گیا تھا۔ اس کی بہنوں اور خود ہکلیہ نے خالد کی خوب خاطر مدارت کی۔

”گوہر نظر نہیں آ رہا، کہاں گیا ہے، کیا میری وجہ سے کہیں غائب ہو گیا،“ اس نے بیٹی سے پوچھا اس کے لہجے میں طنز صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

رکھ کر کہا تو وہ خیالوں سے جھٹک پڑے۔
 ”ہکلیہ کو ایسے گھر گھور کر کیوں دیکھ رہے تھے۔“ بیوی نے کپڑے سے روئی نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

خالد نے سر سے رد مال کھول کر نیچے پر رکھا اور روٹی توڑتے ہوئے کہا۔ ”ہکلیہ کی شادی اگر ہو گئی تو سارے دلدرد دور ہو جائیں گے۔“

نوالہ گویا اس کی بیوی کے حلق میں ایک گھاس لپٹا کر مشکل لگتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا خوف کرو بھائی بیچوں کی طرح اس معصوم کی زندگی بھی تباہ کرنے پر تے ہو۔“
 ”بیٹیاں گھاس کا سودا ہے۔ میں اگر گھاس کو تنوع میں بدلوں تو اس میں قناعت کیا ہے۔“ خالد نے گھاس میں پانی ڈال کر کہا۔

پانی پینے کے بعد وہ کھانے میں ایک بار پھر مشغول ہو گئی جب کہ اس کی بیوی نے ہاتھ سمجھ لیے۔ جانے کیوں کھانا ایک دم انتہائی کڑوا کھینا ہو گیا۔ وہ خاموش رہی اس لیے کہ وہ جانتی تھی خالد ایک بار جو کہہ دیتے ہیں کر کے صبر رہتے ہیں۔

☆.....☆

خالد بیٹیوں کی شادی ہماری مہر کے عوض کرتے ہوئے شریف لڑکا دھوڑے جس کا خاندان کچھ خاص بڑا شاہ ہو۔ لڑکا دھوڑنے میں ماسی صالحہ اس کی مدد کرتی۔ لڑکے لڑکیوں کے رشتوں کا شکریہ ماسی صالحہ نے ادا کیا تھا۔

شادی انتہا سادہ طریقے سے ہوئی کچھ مہینے بعد مرزا کوئی بھانجہ بنا کر لڑکے سے طلاق دلواتے اور مہر وصول کر کے ماسی صالحہ کے در پہلے ناراض دھوڑے۔ ایک بار تو اس نے حد کر دی مچھلی لڑکی کو طلاق دلوانے کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو اس نے کچھ عورتوں کو پیسے دے کر ان کے در پہلے اپنی بی بیٹی پر اٹنے سیدھے الزامات لگائے جس کے بعد اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا۔

ایک دن خالد گھر میں آکھیا تھا اس کی بیوی بیٹے کی ہوئی تھی۔ ماسی صالحہ صبح آئی تو بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ خالد نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”ماسی تیرا آنا مبارک ہو صبح صبح کیسے آتا ہوا۔“

ماسی صالحہ سامنے بڑی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ برقعہ اتار کر ایک طرف رکھا دوپٹا درست کر کے اچھر اچھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ”مبارک ہو بہت اچھا رشتہ دھوڑا ہے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ..... آپ کو بتاتا تو ہے وہ
 دیوٹی پر گیا ہے چار بجے آ جائے گا۔“ ٹھیکہ لے کر جواب دیا۔
 ”اے گھر پر ہونا چاہیے تھا کیا میرا بانی کے اسنے آداب
 بھی اسے نہیں آتے افسوس..... میں نے بنی کہاں بیاہ دی۔“
 خالد نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہا ہا اسے آپ کے آنے کا علم نہیں تھا ورنہ آج چھٹی
 کر لیتے۔“ ٹھیکہ لے کر صفائی دے کر کوٹش کی۔

”مجھے سبق مت پڑھا اچھی طرح جانتا ہوں میں آج
 کل کے نوٹروں کو۔“ خالد نے سنے سے افسوس کیا۔ جسے میں اس
 نے ٹھیکہ سیت کو ہر کی بھول کو بھی برا بھلا کہا۔

سب کو بے نقط خانے کے بعد وہ پاؤں پٹختا ہوا گھر
 سے نکل گیا۔

☆.....☆

گوہر جب تھکا ہوا اس آیا تو ٹھیکہ لے کر اسے پورا بنا دیا۔
 سٹایا۔

”اوہ یہ تو بہت برا ہوا مجھے تو ان کے آنے کا علم نہیں تھا
 نہ ہی انہوں نے آنے کی اطلاع دی تھی۔“ گوہر نے پریشان
 ہو کر کہا۔

”میں نے انہیں بتا بھی دیا مگر وہ نہیں مانے۔“ ٹھیکہ
 لے کر کہا۔

”چلو میں ان سے معافی مانگنے جاتا ہوں۔“ گوہر اٹھا
 اور اسی وقت خالد کے پاس گیا لیکن خالد نے اس سے ملنے
 سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن وہ اس سے نہ ملا۔
 ایسی چھوٹی چھوٹی توں کو بھاندا بنا کر خالد نے اس سے
 تعلقات کشیدہ کر لیے۔

ایک دن ٹھیکہ گھر آئی ہوئی تھی گوہر اسے لینے کے
 لیے آیا تو خالد نے اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ٹھیکہ کی ماں
 کی طبیعت ٹھیک نہیں ٹھیکہ ایک دو دن یہاں رہے گی۔ دو
 دن بعد گوہر آیا تو اسے پھر واپس کر دیا تیسری بار جب
 خالد نے ٹھیکہ کو جانے نہ دیا تو ان کے درمیان کچھ رخ
 جملوں کا تبادلہ ہوا۔ یہ سچ کلامی جھگڑے پر جا کر منتج ہوئی
 اور بات بات کا ہوا پانی تک پہنچ گئی۔ شور شرابہ سن کر پڑوسیوں
 نے نکاح بچاؤ کر لیا۔

دو دن بعد بیٹھائیت میں خالد مسکین صورت بنائے کہہ
 رہا تھا۔ ”میرا دادا میری بیٹی پر ظلم کرتا ہے اسے ماں سے ملنے
 نہیں دیتا میری بیٹی بیمار ماں کی حمایت کرنے آئی تو یہ بددعوی
 لے جانے لگا میں نے ایک دو دن رکھنے کو کہا تو مجھ پر ہاتھ

اٹھایا۔ میں جب بھی بیٹی سے ملنے جاتا ہوں یہ مجھے اپنی بیٹی
 سے ملنے نہیں دیتا۔“ خالد کی آواز گونگر ہو گئی۔ ”میرا دادا مجھے
 بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتا ہے میں مزید اس کے ساتھ
 رشتہ داری قائم نہیں رکھ سکتا میں اپنی بیٹی کے لیے طلاق کا
 مطالبہ کرتا ہوں۔“

گوہر نے قسم کھا کر کہا کہ خالد کے لگائے گئے الزامات
 غلط ہیں۔ میں نے بھی کبھی اس کی بے عزتی نہیں کی لیکن
 خالد کے گھر پر اس کے ساتھ جھگڑنے اور پڑوسیوں کی گواہی
 نے اس کے کس کو گھروں کر دیا اور یوں بیٹھائیت نے اس سے
 طلاق کے ساتھ مہر میں دو بیگہ زمین اور دو لاکھ روپے لے
 لیے۔

ٹھیکہ پر یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی وہ بہت روٹی
 لیکن اس کا روتا سحر میں بارش جیسا تھا جو غرب برستی ہے لیکن
 کچھ بھی نہیں آگاتی۔

شکندل باپ نے بیٹروں کے لالچ میں اپنی ہی بیٹی کا
 ہنسا ہنسا گھر اجاڑ دیا۔ سچ ہے لالچ اٹھا بہر اٹھاتا ہے۔

پیسے اور زمین ملنے کے بعد خالد کا خیال تھا کہ وہ باقی
 زندگی آرام سے رہے گا بیٹی کے بوجھ سے خود کا کڑا کرانے اور
 ایک اور مسودے کے لیے اسے اس کے عدت کے گزرنے کا
 شدت سے انتظار تھا۔

☆.....☆

عدت گزرنے کے بعد خالد نے باقی سالہ کے توسط
 سے اس کا رشتہ شہر ہی میں بیٹھائیت کے ساتھ کر لیا۔ بیٹھائیت اس
 سے عمر میں تین گنا بڑا تھا لیکن اسے اس کی عمر سے کوئی
 مطلب نہیں تھا اسے مطلب تھا تو ان دن لاکھ روپوں سے جو
 اسے بیٹھائیت کی طرف سے ملے۔

بیٹی کے ساتھ بیٹھائیت میں سامان نہ ہوا اور اس کا ہا پ پیسے
 لے لے کر سفر ال میں اس کی خاک عزت ہو گئی۔

ٹھیکہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اس کی حیثیت اس گھر
 میں تو کرائی جیسی تھی۔ جبر کی اذان سے پہلے وہ اپنی گھر کے
 تمام بچوں کے لیے کپڑے استری اور جوڑے تلاش کرتی پھر
 ان کے لیے ناشتا تیار کرتی کہ انہیں جلدی سکول جانا ہوتا۔
 بچوں کو تیار کرنے کی ذمہ داری بھی اس کی تھی۔ بچوں کے
 جانے کے بعد وہ پورے گھر کے لیے ناشتا بناتی ناشتے کے
 بعد برتن دھوتی اور پھر پورے گھر کی صفائی کے بعد دوپہر
 کے کھانے کا انتظام کرتی۔ سارا سارا دن کام کرنے اور
 مناسب کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اس کی صحت گرنے لگی۔

ساتھ گھر سے بھاگ رہی ہے کیا..... میں ابھی تیرے گھر والوں کو خبر کرتا ہوں کہاں سے آئی ہے۔“
 ”میں مظلوم عورت ہوں مجھے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے خدا کے لیے میری مدد کرو اور مجھے گاؤں پہنچا دو۔“ ٹھیکیلے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

دلوں چوکیداروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں ہوس ناپی رہی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ کہنے کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم سبھی ہوئی ہو ہمارے کو اظہر میں تھوڑی دیر آرام کرو میرا ساسی تمہیں بحفاظت گھر پہنچا دے گا فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

ٹھیکیلے ڈرتے ڈرتے دوسوں میں گری ان کے ساتھ مٹی۔ وہ کرتی بھی کیا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔
 کمرے میں پہنچ کر دونوں اندر آئے اور کٹڑی لگا دی۔ جب وہ دونوں دست درازئی کرنے لگے تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ آسمان سے گر کر مجبور میں انگ مٹی ہے۔ وہ روٹی کڑکڑاتی انہیں خدا رسول کے واسطے دیے مگر بے سود۔ جن پر شیطان سوار ہو چکا ہو وہ کب کسی کی سنتے ہیں۔ جہنم کی آگ خود ہی خرید لیتے ہیں۔ چوکیداروں نے ساری رات اسے بھجھوڑا ٹھیکیلے اس صدمے کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گئی۔

☆.....☆

ٹھیکیلے کی ماں بیٹی کاظم زیادہ دیر تک نہ سہ سکی اور جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد خالد بر قاج کا شدید حملہ ہوا۔ اس کا پورا بدن مفلوج ہو کر رہ گیا۔ گھر اس کی دیکھ بال کے لیے کوئی نہیں تھا وہ اکثر سوچا کرتا اگر میں بیٹیوں کو نکال ڈال نہ بھتا تو اب میری دیکھ بال تو کرشم۔

خالد لوگوں کے لیے نشانِ جہت بنالپ بھی زندہ ہے۔ وہ نہ جیتا ہے نہ مرنے لگا۔ پڑوسی اس پر ترس کھا کر اسے کچھ کھلا دیتے ہیں اکثر وہ اپنی ہی گندگی میں تھرا ہوتا ہے اس سے جب ناقابلِ برداشت بدلو کے بجائے اڑتے ہیں تو پڑوسی بھکیوں کو پیسے دے کر اسے نہلا دیتے ہیں۔
 گھر ٹھیکیلے کو سینٹل اسپتال میں داخل کر کر اس کا علاج کر رہا ہے اب اس کی حالت کافی بہتر ہے اور وہ زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ رہی ہے۔

کمزور بدن پر بیمار پیاں جلدی حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ بیماری میں جب وہ کام کرتی تو اسے گوہر کی بیشیں یاد آ جاتیں جو اسے کسی چیز کو کاتھ لگانے نہ دیتیں۔ اس دوزخ میں اس جنتی گھر کو یاد کر کے وہ بہت روٹی۔

ایک دن اسے بخار چڑھا ہوا تھا اور گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اس نے جیسے تیسے کھانا تیار کیا اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا پھر آنے کی وجہ سے وہ کئی بار مگر مٹی۔ جب اس کی قوت مدافعت جواب دے گئی تو تھوڑے آرام کے لیے وہ اپنے کمرے میں گئی اور ستر پر لیٹے ہی سو گئی۔

کھانے کا انتظار کرتے کرتے جب وہ بو گئی تو اس کی دیو رانی آئی اور اسے بھجھوڑ کر کہا۔ ”اٹھ! اصر مہمان آئے ہیں اور تو اصر شہزادی بنی سو رہی ہے۔ کھانا کیا تیار باپ لگائے گا۔“

”ہاں مجھے بخار ہے بدن ٹوٹ رہا ہے مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔ کھانا تیار ہے، برائہ نامیں تو آپ لگا دیں۔“ ٹھیکیلے نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

تراخ..... دیو رانی نے اسے اسے زور سے تھپڑ مارا کہ اس کے چہرے پر اس کی انگلیاں نقش ہو گئیں۔

”تیرے کمرے بہت بدھ گئے ہیں، مہمان چلے جائیں تو حیرت خبر لیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

رات لگے جب مہمان چلے گئے تو سیٹھ فییم غصے سے بچ و تاب کھاتے ہوئے آیا۔ آتے ہی اس نے ٹھیکیلے کی چٹائی شروع کر دی۔ عورت ہوتے ہوئے بھی اس کی دیو رانی اس کی چیخوں سے محفوظ ہوتی رہی۔ جب سیٹھ فییم مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے ٹھیکیلے کو دھکے دے کر کمرے نکال دیا۔ یوں بھی بیٹیوں کے اس پیار و جانچے کی ضرورت اب اسے نہیں رہی تھی۔

ٹھیکیلے ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کڑکڑائی کہ اتنی رات کو وہ کہاں جائے گی اسے رات نہیں رہنے دیا جائے لیکن سیٹھ فییم نے اس کی ایک نہ سنی۔

گھر سے قفل کر پھاری ڈری سبھی گرتی پڑتی گوہر کے گاؤں کی طرف جانے لگی۔ اس امید پر کہ گوہر اسے اپنا لے گا۔ اس کے لیے اس کا باپ کب کا مرنے لگا تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد اسے دو چوکیدار نظر آئے تو اس کے دل میں امید کی شمع روشن ہو گئی کہ وہ اسے گاؤں پہنچا دیں گے مگر اس کی ساری امیدیں ہوا ہو گئیں جب قریب جا کر ایک چوکیدار نے اسے روک کر کہا۔ ”کیوں..... کسی عاشق کے

ہوتے ہیں۔ میری زیر نظر روداد پڑھ کر آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ آج میں تہائی کی زندگی بسر کر رہی ہوں تو یہ میرا اپنا کیا دھرا ہے۔ خیر اب مزید تمہید کیا یا اندھی۔ میں اسے حالات بلا کم و کاست رقم کر رہی ہوں جنہیں پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ انسان کو بعض اوقات اپنے

انسان کی زندگی میں بہت سے غیب و فراز آتے ہیں۔ کچھ تو اس کی قسمت میں رقم ہوتے ہیں اور اسے ہر صورت ان سے گزرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ اس سلسلے میں انسان بے بس ہے مگر ہماری زندگی میں پیش آنے والے بیشتر مصائب، دکھ اور تکلیفیں ہمارے اپنے اعمال کا بھی نتیجہ

گلی تنگ



جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم !

جب میں لاہور میں رہتی تھی، تب اس سرگزشت کی مرکزی کردار ماہی کو دیکھا۔ ابتداء میں اس کی محنت دیکھ کر حیران ہوتی تھی پھر جب اس کی سرگزشت کے اہم نکات کا علم ہوا تو قلم ہاتھ میں آگیا، میں بے چین ہو گئی کہ ان حالات و واقعات کو کہانی کی شکل دوں لیکن وقت کی کمی آئے آرہی تھی۔ اب موقع ملا تو لکھتی چلی گئی۔

نسرین اختر نینا

(راولپنڈی)

URDU TUBE
A WAVE OF ENTERTAINMENT



مکھنڈ، خرد اور کبیر کی سزا اسی دنیا میں پہنچتی پڑتی ہے۔

میں نے جب ایک بہن اور تین بھائیوں کے بعد اپنے والدین کی آخری اولاد کے طور پر اس عالم رنگ و بو میں آکھیں کھولیں تو میرے والدین مجھے پاکر خوشی سے نہال ہو گئے جیسا کہ بعد میں پتا چلا تھا کیونکہ میں انتہائی حسین تھی۔ اگرچہ میرے دیگر بھائی بہن بھی خاصے خوش حال تھے مگر میری تو بات ہی اور تھی۔ گلابی رنگت، حسین اور دلکش نین نقوش اور سنہری چمکیے کوگر پالے ہال۔ میری خوب صورتی کی وجہ سے میرا نام ماہ نور رکھا گیا جو میری شخصیت کے مطابق تھا۔ نہایت ناز و نعم سے میری پرورش ہونے لگی۔

ای امی ابو تو مجھے چاہتے ہی تھے مگر میں اپنے دیگر بھائیوں اور بہن کی آنکھوں کا بھی تار تار تھی۔ میری سب سے بڑی بہن آرزو آپنی مجھ سے پورے دس سال بڑی تھیں۔ ان سے چھوٹے تین بھائی تھے۔ ارمغان، بھائی، ساغر، بھائی اور مجھ سے تین سال بڑے طاہر، بھائی۔ آرزو آپنی کے لیے تو میں ایک جیتی جاتی گڑیا تھی۔ وہ ہر وقت مجھے اٹھائے رکھتیں۔

ای کے پاس مجھے صرف دو دودھ پلانے لے جاتیں یا پھر اسکول جاتے ہوئے امی کے حوالے کر تیں۔ ورنہ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے اسکول بیک میں مجھے ڈال کر اسکول بھی لے جایا کرتیں کہ انہیں میری چند نکوئی کی جوابی بھی گوارا نہیں تھی چہرہ جب میں اسکول جانے کی عمر کو پہنچی تو وہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھیں مگر میرے لیے ان کی محبت میں جب بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ خود مجھے صبح بیدار کر کے اسکول کے لیے تیار کرتیں۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے ناشتا کرواتیں۔ میرا اسکول بیک اور بچ بچس تیار کرتیں۔ ان کے اس جنون پر امی حیران ہو کر کہیں۔ ”آرزو میری چندا تم ابھی خود بچی ہو اور تم اپنی چھوٹی بہن کی ایسے دیکھ بھال کرتی ہو جیسے یہ میری نہیں تمہاری بیٹی ہو، تمہیں اتنی اچھی کیوں لگتی ہے۔“

”ای آپ نہیں جانتیں کہ جب اللہ نے مجھے بعد دیگرے مجھے تین بھائیوں سے نوازا تو میرے دل میں ایک خواہش جا گئی میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگی تھی کہ وہ مجھے ایک بہن عطا کر دے۔ میں اسے ماں سے بڑھ کر چاہوں گی۔ جب ماہ نور پیدا ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میری دعائیں قبولیت کا درجہ پا چکی ہیں۔“

”اچھا! ای بیویں۔“
”اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی کا شکر یہ ادا کرنے کا میرے پاس ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اس نعمت کی جی جان

سے قدر کروں۔ مجھے بھائی بھی پیارے لگتے ہیں ان کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے بھی مجھے خوشی ملتی ہے مگر مایہ کی تو بات ہی اور ہے۔“ آپنی مجھے اپنی ہاتھوں میں سمجھ کر کہیں۔

جب میں میٹرک پاس کر کے کالج میں پہنچی تو آپنی بیاہ کر ملتان چلی گئیں۔ ان کی شادی ملتان کے نوابی ملائے میں واقع ایک گاؤں کے ایک زمیندار کمرائے میں ہوئی تھی مگر چونکہ ان کے شوہر بڑے لکھے تھے اور ایک سرکاری گھرے میں افسر تھے اس لیے آپنی ان کے ساتھ لاہور میں رہنے لگیں جہاں انعام بھائی کو سرکاری گھر ملا ہوا تھا۔ برلا کی اپنی رخصتی پر روٹی ہے مگر میری آپنی کو زیادہ دکھ مجھ سے جدائی کا تھا۔ ہم لوگ سرگودھا میں رہتے تھے، آپنی لاہور میں۔ وہ بہنوں بعد ہی گھر آپنی تھیں مگر جب بھی آئیں، مجھے گلے لگا کر بہت روتیں اور کہتی تھیں۔ ”مایہ تم بس ایف اے پاس کرو، پھر میں تمہیں اپنے پاس لے جاؤں گی۔“

ای گھر آکر کہیں۔ ”ارے لڑکی ہاؤلی ہوئی ہے۔ کیا کبھی بہنیں بھی بھائی بہن کے گھر میں رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی دے گا تو تم اس کی محبت میں کھو کر اپنی مایہ کو بھول جاؤ گی۔“

”ہرگز نہیں ای امی کی جگہ کوئی بھی نہیں لے سکتا چاہے میری دس بیٹیاں کیوں نہ ہو جائیں۔ مایہ جیسا پیار مجھے کسی سے نہ ہوگا۔“ آپنی مجھے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہیں۔

”اف ایک تو میں اس لڑکی کی زبان سے نکل ہوں۔ جو زبان میں آتا ہے ہر چیز اگل دیتی ہے۔ اللہ سے خیر مانگو۔ آج کل ایک بیٹی بھی ہماری ہوئی ہے اور تم دس دس بیٹیاں مانگ رہی ہو۔“ سیدھی سادی بے چاری امی آپنی کو ڈانٹنے لگ جاتیں۔

”ارے میری بھولی امی وہ تو میں یونہی عمار کا کہہ رہی تھی۔ ورنہ مایہ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی بیٹی کی خواہش نہیں ہے اور ہاں آپ گھر نہ کریں میں مایہ کو یونہی اپنے گھر میں نہیں لے جاؤں گی۔ بلکہ اپنی دیورانی بنا کر لے جاؤں گی۔ انعام کا ایک کزن بہت بڑا زمیندار ہے۔ اگرچہ عمر کچھ زیادہ ہے مگر ہے بہت دولت مند۔ اپنی مایہ پیش کرے گی ساری زندگی۔ شہزادی بنا کر رکھے گا وہ اسے۔“ آپنی نے پیار سے کہا تو میں شرما کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

چونکہ میں نے گھر اور باہر ہر جگہ اپنی خوب صورتی کے چرچے سنے تھے اس لیے میں خاصی خود پسند ہو چکی تھی۔

دور چلے جانے کے بعد تو میں ہاگل ہی چھارہ جاؤں گی۔
 "ارے امی آج کل یہ لاسٹے کیا اہمیت رکھتے ہیں،
 میں انشاء اللہ آپ سے ہر ماہ ملے آپا کروں گی۔ جہاز تو چند
 منٹوں میں مجھے آپ کے پاس پہنچا دیا کرے گا۔ آپ
 پریشان نہ ہوا کریں۔" میں امی کے گلے میں اپنی ہاتھیں
 عامل کر کے ان کی پیٹھ پر اپنے ہونٹ دھکت کرتے ہوئے
 کہتی تو امی ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتیں۔

آرڈر دیا جاتا ہے حد خوش تھیں کہ میں ان کے سسرال
 میں ہی بھا کر جا رہی ہوں۔ "ماہی میں تقریباً بیسے دن میں
 ہار تم سے ملے آپا کروں گی، خود نہ آسکی تو تمہیں اپنے پاس
 بلا لیا کروں گی۔ رہائش بھائی بہت اچھے اور اچھے انسان
 ہیں وہ تم پر کوئی بلی پھڑکی جائے نہیں کریں گے۔"

آپا کی ایسی باتیں مجھے بے انتہا خوشی بخشتی تھیں۔
 گھر میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگی
 تھیں۔ امی اور ابو کی خواہش تھی کہ مجھے جیلز میں دلچسپی
 دی جائے تاکہ میں اپنے دولت مند سسرال میں طر سے سر
 اٹھا کر رہ سکوں اور مجھے کسی قسم کی کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔
 شادی سے ایک ہفتے پہلے مایوں کی رسم ادا کی گئی۔ سسرال
 سے میرے لیے انتہائی خوب صورت پہلے رنگ کا جوڑا،
 مٹائی، مایوں اور مٹائی آئے تھے۔ جس دن میں مایوں
 بیٹھی، اس روز قرآن خوانی بھی کروائی گئی اور مہمانوں کی
 تواضع مٹائی، چلوں اور لذت کھانوں سے کی گئی۔ میرے
 والدین اپنی لالائی بیٹی کی شادی پر بیٹا پانی کی طرح بہا
 رہے تھے۔ ہر چیز میری مرضی اور پسند کی خریدی جا رہی تھی۔
 میرا برا بیٹل سوٹ ہی بہت زیادہ ہنگام اور منگروا تھا۔ وہ
 میں نے لاہور جا کر خود پسند کیا تھا۔ ابو اور امی نے مجھے کہا
 تھا۔ "چپے کی پردہ نہیں کرنی جو تمہیں پسند آئے بس وہ پردہ
 لینا ہے اور اسی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے سب سے
 جتنی سوٹ منتخب کیا تھا، جس پر سب مہمانوں کا ہمارے نفس کا کام
 بنا ہوا تھا۔"

"میری ماہی اپنا بیٹا راستہ بہن کر تو ہاگل پرستان
 کی شہزادی لگے گی۔" آرڈر دیا جاتا ہے مجھے گلے سے لگا کر کہا
 تھا۔ اس پر انعام بھائی منہ بنا کر بولے۔ "مجھے نہیں آتا کہ ماہ
 نور کی مرحہ چھارے والدین کے ساتھ کون سا کارون کا
 فرائڈ لگ گیا ہے جو یوں دونوں ہاتھوں سے لٹایا جا رہا ہے
 جب کہ چھارہ مرحہ تو بڑا ہاتھ روک کر طرح کیا گیا تھا۔"
 انعام بھائی کی جلی جلی سن کر آپا ایک دم چپ سی ہو

گھٹنوں آہنے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو سہائی سنوارتی
 رہتی۔ چھوٹی عمر میں مجھے سنے سنور نے ادرنت سے فیشن
 کے کپڑے پہنے کا شوق ہو گیا تھا اور میں اپنی شہائی رنگت،
 سنہری راز دیا سو اور بڑی بڑی آنکھوں کو کچھ کچھ کر خود ہی پر
 ڈال رہی تھی اور پھر جلد ہی آپا کی کوششوں سے رہائش احمد سے
 میرا رشتہ طے ہو گیا۔ مٹائی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے
 منعقد کی گئی۔ میرے سسرال والے کئی سیٹ ڈیورٹ، بہت
 سے جتنی اور خوب صورت ملبوسات، مٹائی اور چلوں کے
 نوکرے لے کر آئے۔ تقریباً تیس مایوں مایوں افراد بڑی بڑی
 گاڑیوں میں آئے تھے۔

مٹائی میں بیٹل نے سرخ رنگ کا لینگ سوٹ پہنا تھا جس پر
 بہت خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ بیٹی پار سے تیار ہو کر
 جب میں..... آئی تو ہر کوئی میری خوب صورتی کو سراہ
 رہا تھا۔ میری ساس جلد میں مجھے دیکھ دیکھ کر کہاں ہو رہی تھیں
 کہ اس قدر خوب صورت اور کم عمر لڑکی ان کے بیٹے اور
 بھائی کی دلہن بننے جا رہی ہے۔ مٹائی کی تقریب میں سسرالی
 رشتے داروں اور ہمارے قریبی احباب دلیرہ کو ملا کر تقریباً
 ڈیڑھ سوا گھنٹے۔ مجھے سلامیوں کے علاوہ ڈیڑھ سوا
 جتنی تحائف بھی ملے اور میں خود کو بے حد خوش قسمت تصور
 کر رہی تھی کہ اسے بڑے گھرانے میں میرا رشتہ طے ہوا
 ہے۔

اگلے ہفتے ہمارے گھر والے میرے سسرال گئے۔
 لڑکے کو انگوٹھی پہنانے۔ وہاں انہوں نے اپنی شادمانی
 حوصلے میں بہت بڑا نقش کیا تھا جہاں ان لوگوں کے عزیز
 رشتے دار اور ملے جلے والے موجود تھے۔

میری امی اگرچہ بے حد خوش نظر آتی تھیں کہ میں ایک
 ایمر کچھ جاگیر دار سے بھاہ جا رہی ہوں مگر پتا نہیں میں
 دیکھتی تھی کہ انکو وہ مجھے پیار کرتے کرتے رو پڑتی تھیں۔
 "امی آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟" میں حسرت سے
 پوچھتی تھی کہ تو وہ جلدی سے دوپٹے کے پلے سے اپنے آئینہ
 صاف کرتے ہوئے کہیں:

"وہ بس ذرا اس خیال سے آنکھیں میچ جاتی
 ہیں کہ میری منگی مٹی بیٹی اتنی دور چلی جائے گی۔ پہلے ہی
 آرڈر کی جہاز کا دھک ہے۔ وہ بھی اتنی دور ہے کہ سال میں
 ایک دو بار ہی آجاتی ہے اور اب تمہیں بھی خد کہ اپنے
 سسرال میں لے جانا چاہتی ہے۔ دونوں بیٹیوں کے کوسوں

گئیں اور مجھے بھی شاک سا ہوا تھا کہ واقعی آپ کی شادی بھی اگرچہ بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور ان کے لیے بھی ہر چیز اچھی سے اچھی لینے کی کوشش کی گئی تھی مگر میرے لیے خریدی گئی چیزوں کے مقابلے وہ کچھ بھی نہیں تھیں۔ میں اپنی شادی کی شاپنگ کے سلسلے میں تقریباً تین چار دن آپ کے گھر میں رہی تھی اور سارا وقت انعام بھائی کا منہ بنا ہی رہتا اور وہ آپ کی کوکئی نہ کوئی جلی کٹی سانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیے مگر جواب میں آپ نے جب سادہ لبتیں۔

میری اتنی اچھی پیاری اور نرس لکھ آپ کی زندگی میں ایسا شخص آیا تھا جو انتہائی مفرد، خود پسند اور بد مزاج تھا مگر پھر بھی آپ اس کے ساتھ بھاری تھیں اس کی تلخ و شیریں باتیں ہنس کر سہہ لبتیں۔ البتہ چپ چپ کر دیتی تھیں، میں جب آپ سے کہتی کہ آپ کیوں ایسے خود غرض اور لڑاکا شخص کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ دفع کریں اسے، ہمارے والدین کے پاس کس چیز کی کمی ہے جو آپ اس طرح ذلت سہہ رہی ہیں۔ وہ شخص آپ کے لیے عزتی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اسے اتنا بھی لحاظ نہیں کہ آپ کے بچے والے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے بھی آپ کی انسلٹ کرتے رہتے ہیں اور آپ سکرما کر برداشت کر لیتی ہیں۔

میں آپ کی جگہ ہوتی تو ایسے بدترین انسان کے ساتھ ایک لمحہ بھی نہ رہتا گووارا کرتی۔ وہ مجھے ایک بات کہتا میں دس سٹانی اور اب مجھے بھی اس شخص کے خاندان کے حوالے کرنے جا رہی ہیں مگر میں یہ بات بتا رہی ہوں کہ اگر میرے سرسرا والوں یا شوہر نے اف تک بھی کہا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔

”ایسے نہیں کہتے میری چندا شادی کے بعد عورت کا اصل گھر اس کے شوہر ہی کا گھر ہوتا ہے۔ وہ مجھے قریب کر کے لیکر دیتا شروع کر دیتیں۔ شوہر لاکھ برا ہو مگر جس کے ساتھ والدین نے رخصت کر دیا، ہر ممکن طریقے سے چاہتا چاہے اور پھر وہ بیوی کو گھر مہیا کرتا ہے۔ اپنی محنت کی کمائی اس پر خرچ کرتا ہے جیسے بھی ممکن ہو مگر کی تمام ضروریات پوری کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ بھی انسان ہوتا ہے، ہنک سکتا ہے، آسا سکتا ہے۔ اگر وہ بھی بکھار توڑا سا تلخ ہو جائے تو بیوی کو مبر و محل سے کام لینا چاہیے۔ گھر کو بتائے رکھنے کی ذمہ داری بڑی حد تک عورت ہی پر عائد ہوتی ہے۔ پھر اگر شوہر کسی قسم کی ٹینشن کی وجہ سے اپنا غبار گھر میں نکال لینے تو اس سے بیوی کا کیا بکڑ جاتا ہے۔ اسے تو اس کی

ہمدرد اور غم گسار ہونا چاہیے، شوہر کے مسائل کا ادراک ایک بیوی کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں گھر کو چاڑھنے کا ذمہ دار ہمیشہ عورت ہی کو سمجھا جاتا ہے اور خود سر اور خود مختاری کے ذم میں جیلا عورت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور اگر وہ طلاق کا داغ ہاتھ پر لگا کر شوہر کا گھر چھوڑ دے تو اسے کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔ والدین کا گھر تو شادی کے فوراً بعد ہی پرایا ہو جاتا ہے، وہاں بھائیوں، ان کے بچوں اور بیویوں کا راج ہوتا ہے اور طلاق یافتہ بہن یا بھتی کو والدین خوش دلی سے قبول کرتے ہیں نہ ہی بھائی۔ ایسی عورت کی پینک کی مانند ہوتی ہے جو پناہ کی تلاش میں در بدر پھرتی پھرتی ہے۔“

آپ کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ بھر میں نے دوبارہ ان سے اس موضوع پر بات نہیں کی مگر انہوں نے میری خاموشی کا اور ہی مطلب لیا اس لیے دوبارہ گویا ہوئیں۔ ”یو پیے میری گڑبا جھیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ریاض بھائی خود بھی بے حد نرم مزاج اور صبر جو فطرت کے مالک ہیں اور ان کے گھر والے بھی سلیجے ہوئے اور نرم خو ہیں۔ تم اسے سرسرا میں بھی ایسے ہی پیش کر دو گی جیسے کہ والدین کے گھر میں کر رہی ہو۔“

آپ کی قلمی آئینہ نگار کے باوجود مجھے ہر وقت یہی کریدگی رہتی تھی کہ میرا ہونے والا شوہر کس طرح کی عادات و اطوار کا مالک ہے۔ اس کی شخصیت اور خاص کر شکل و صورت کیسی ہے؟ ان سب سوالات کا جواب مجھے شادی سے قبل بھی نہ مل سکا۔ اپنی رومانوی شرم و حیا کی وجہ سے مجھے والدین سے پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ آپ نے سے کریدنے کی کوشش کرتی تو وہ اس کے حسن اخلاق اور نیک فطرت اور اچھی سیرت کے گن گانے لگتیں۔ دراصل ان کے نزدیک ایک شوہر میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم ہونی چاہئیں۔ شکل و صورت اور عمر کے فرق کو وہ زیادہ اہمیت دینے کی قائل ہی نہ تھیں کیونکہ خود وہ اپنے اعلیٰ تعلیم، خود اور اعلیٰ عہدے پر فائز شوہر سے نالاں تھیں جو انہیں ذلیل کرنے اور نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا اس لیے وہ سمجھتی تھیں کہ شوہر کی شکل بلا سے اچھی نہ ہو مگر وہ محبت کرنے والا اور خوش خلق ضرور ہو اور میرے ہونے والے شوہر میں انہیں یہ خوبیاں بدرجہ اتم نظر آئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میں لاڈ پیار میں ملی ہوں، سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھر کے ہر فرد کی آنکھوں کا تار تار میں اور وہ چاہتی

کروانے کے لیے کمرے میں آئے ان کے ساتھ میرے بچا، ایک بھائی اور ماموں وغیرہ تھے۔ قاری صاحب نے مجھ سے تین مرتبہ ایجاب و قبول کروایا اور پھر نکاح ٹا سے پر مختلف کالوں پر میں نے سائن کیے تو مبارک باد کا شور بلند ہوا اور میری ای اور آئی مجھے پیار کر کے رونے لگیں۔ میری آنکھیں بھی پھول گئیں مگر میری گہری دوست فریحہ نے مجھے سختی سے رونے سے منع کیا تاکہ میرا میک اپ خراب نہ ہو جائے۔ میں نے میروں ٹھکرا بھاری کام والا لہنگا پہن رکھا تھا، دو شاہوے خوب صورت اسٹائل میں سیٹ کیا گیا تھا۔ گلے میں خالص سونے کا بڑا سارا نی بار، گھونپہ اور لاکٹ پہن کر میں خود کو بے حد بوجھل محسوس کر رہی تھی۔ ماتھے پر زیکا اور ایک سائڈ پر بڑا سا بڑا جھومر تھا۔ ناک میں سونے کی بڑا اونچھٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں بہت سی سونے کی چوڑیاں اور کین پہنے ہوئے تھے۔ یہ سارا زور و دن پہلے ہی میرے سرال والوں نے بیجا تھا۔ البتہ عروسی سوٹ میں نے خود خریدا تھا اپنی پسند کے مطابق۔

پھر مجھے میری فریڈ زبا پر خواتین والے حصے میں لے گئیں جہاں خوب صورتی سے انچ سیٹ کیا گیا تھا جب میں اپنی دوستوں کے حشر میں انچ پر بیٹھ گئی تو سب سے پہلے ایک بوڑھی سی عورت میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس نے میری ہلا میں لیتے ہوئے ہزار ہزار کے کئی نوٹ مجھے دے دیے جو آپنی نے مجھ سے لے کر میرے چھوٹے سے گولڈن پرس میں ڈال دیے۔ اس بوڑھی عورت نے کہا۔ ”آج سے تم ہماری دمی ہو۔ ہمارے گھر کی عزت اور رونق ہو۔ میں تمہارے دولہا کی ماں ہوں اور تمہاری بھی ماں جیسی ہی ہوں۔“

اس کے بعد میری خندیں، دھوپانیاں، جھانپانیاں اور دوسری سرسالی خواتین باری باری آئیں اور مجھے تحائف اور سلامیاں دیں۔

اتنے میں دولہا صاحب بھی اپنے.... دوستوں کے ہمراہ تحریف لے آئے اور میرا سر شرم کے مارے جھک گیا۔ دولہا میرے ساتھ ہی صوفے پر براجمان ہو گیا جب کہ ہم دونوں کے دائیں بائیں دولہا کے دوست بیٹھ گئے اور پھر دودھ پلائی کی رسم شروع ہو گئی۔ آپلی اور میری فریڈ ز ایک محض گلاس میں دودھ لے کر آئیں اور قہوڑی سی تھکرا کر کے بعد دولہا کے ایک دوست نے بیس ہزار روپے دودھ پلائی کے ٹیک کے طور پر آپلی کے حوالے کیے پھر دیگر مہمان اور

تھیں کہ مجھے سرال میں بھی ایسی ہی توجہ اور پیار ملے۔ مگر وہ میری پسند و ناپسند سے اچھی طرح آگاہ نہیں تھیں۔ کیونکہ میں ایسی باتیں اپنی قریبی فریڈ ز کے علاوہ کسی سے بھی شہرتیں کرتی تھی۔ دراصل میرا داغ کالج میں پہنچ کر ہی زیادہ خراب ہوا تھا جہاں مجھے ایسی سہیلیاں ملیں جو فیشن، فلموں اور ٹی وی ڈراموں کی دلداد تھیں اور ان کی صحبت میں مجھے بھی ایسے ہی مشاغل کی لت پڑ گئی۔ میری سہیلیاں ہر وقت میری خوب صورتی کی تعریفیں کرتی رہتی تھیں چونکہ میں کم عمر اور نادان تھی اس لیے اپنی شکل کی تعریفیں سن سن کر میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ میری سہیلیاں کبھی کسی فلمی اداکارہ سے میری شکل ملاتیں اور کبھی کسی ٹی وی ڈرامے کی ہیروئن سے اور میں خود کو ویسے ہی سمجھنے لگی۔ فلمیں اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر میں کسی پرستان کے حسین شہزادے کے پسندیدہ بنتی۔

ایک مرتبہ میری سہیلی نے مجھے امجد اسلام امجد کی ایک نظم پڑھنے کو دی جس میں شاعر نے لکھا تھا کہ ایک روز دور دیس سے ماتھے پر کھٹ سجائے ایک خوب صورت شہزادہ گھوڑے پر سوار آئے گا اور مجھے جیسی حسین لڑکی کو دور دیس لے جائے گا تو میں ایسے ہی کسی شہزادے کی آمد کی منتظر تھی۔ تبھی تو ایف اے کے فوراً بعد محض اٹھارہ سال کی عمر میں میرا رشتہ طے ہو گیا تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا مگر حقیقت حال سے بے خبر تھی کہ وہ شہزادے کی بجائے ایک اومیر عمر کا سیاہ جامن قاتل جس نے کم سن شہزادی کو دولت کے بل بوتے پر اپنی شاد عروسی میں متید کر لیا تھا۔

جس روز میری برأت آئی میں پارلر سے تیار ہو کر اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ میری سہیلیاں مجھ سے پھینچ چھاڑ کر رہی تھیں مگر جب برأت کے آنے کی اطلاع آئی تو وہ سب مجھے کمرے میں ایک چھوڑ کر برأت کے استقبال کے لیے باہر چلی گئیں۔ برأت اور مہمانوں کے لیے گھر کے سامنے وسیع و عریض میدان میں انتظام کیا گیا تھا چونکہ دسمبر کے ابتدائی ایام تھے، فضا میں خلی تھی۔ اس لیے شامیانے لگا کر کراؤنڈ ہی میں انتظامات کیے گئے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے حصے الگ الگ تھے۔

کچھ دیر بعد میری سہیلیاں میرے پاس آئیں تو وہ بھی بھیجی سی تھیں اور ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے سمجھا کہ شاید میری جدائی کے خیال سے پریشان لگ رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد قاری صاحب نکاح ٹا سے پر دستخط

ہمارے رشتے دار ایلچ پر آکر دولہا کو اور مجھے سلامیاں دینے لگے۔ چونکہ کمانہ تو برأت کو پہلے ہی کھلا دیا گیا تھا، میں نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے کمرے ہی میں تھوڑا بہت کھا لیا تھا۔ ایک تو اپنے والدین، بھائیوں اور شہر کو چھوڑ کر اتنی دور جانے کے غم میں بہری بہوک پیاس اڑی تھی پھر فریجہ اور شائستہ بھی مجھے زیادہ کھانے سے منع کر رہی تھیں اس طرح میرا میک اپ ٹراب ہو جائے گا۔

جیسے ہی ساری رسمیں پوری ہوئیں تو برأت کی رواجی کا شور مچ گیا۔ ابو اور بھائی مجھے لے کر شامیانے سے باہر کھڑی تھی ہوئی مرشد بن گواڑی کی طرف چلتے گئے تو مجھے اختیار میری آنکھوں سے آنکھوں کی برسات رواں ہوئی اور پھر سب ہی رونے لگے۔ میں ابو، بھائیوں، آبی اور آبی سے لپٹ کر دھواں دھار رونے لگی۔ کہاں کا میک اپ اور کہاں کی احتیاطیں۔ وہ لمحہ ہی ایسا تھا کہ ضبط کے بند باندھنے مشکل ہو گئے۔

کئی گھنٹوں کے تھا وینے والے ستر کے بعد میں اپنے سرال میں پہنچی۔ میرا دولہا میرے دائیں طرف گواڑی کی کچلی سیٹ پر بیٹھا تھا جب کہ بائیں طرف آبی تھیں۔ اگلی سیٹ پر میرے شیف سرور ایلچور کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سارا سطر خاموشی ہی میں کٹا تھا۔ سرال ایلچ کر بھی کئی رسمیں ہوئیں اور پھر آدمی رات کو مجھے میرے نقاست اور خوب صورتی سے سجے ہوئے چاندی عروسی میں پہنا دیا گیا۔ آبی نے میرا شب خرابی کا سادہ ماسوٹ بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر رکھا اور پھر میرا میک اپ درست کر کے اور مجھے چادر کر کے کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے کمرے سے جانے کے فوراً بعد ایک دو سالانہ قہ اور مولے محمد سے جسم کا مالک شخص گولڈن شیر دانی میں لمبوس کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دھیرے دھیرے چٹا ہوا بیلے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

”السلام علیکم! آپ کا بیٹا تمک جلی ہوں گی بہتر یہ ہے کہ لباس تبدیل کر لیجئے۔ رات کا بیٹا گزر چکا ہے۔“ اس شخص نے شائستگی سے کہا تو میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ میرا دل کرکٹ کرکٹ ہو گیا اور میرے الٹک اندر ہی اندر مگر نے لگے۔ میرے پہنوں کے حسین فہرہ اے کی بجائے ایک بھدا سا اور کرخت چہرے کا مالک شخص میرے سامنے میرے دولہا کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اس کی سیاہ رنگت اور معمولی سے چہرے کے نقوش

اسے کچھ زیادہ ہی بد صورت بنا رہے تھے یا پھر میرے ذوق حسن کو مجھیں کچھنے کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ میں ایک منٹ کے بیڑے سے اٹھی کرسی پر پڑا شب خرابی کا کاشن کا شلوار سوٹ اٹھایا اور ہاتھ روم میں چلی گئی۔ وہاں پہلے اپنی بد نصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر روئی رہی پھر سارے زیورات اتارے۔ چہرے کو گرگر گرگر دھو یا اور لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی دروازہ کھول کر اس میں زیورات ڈالے اور پھر بیڈ پر آکر اپنے جھیل کر سرخ دلیٹ کی رضائی چہرے پر اوڑھ کر سوئی بین کی اور سارے دن کی نکلان کی وجہ سے کچھ دیر بعد ہی گہری نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ دو دن بعد ویکس ہوا اور پھر میں اپنے والدین، بھائیوں اور نام نہاد دولہا کے ہمراہ اپنے بچے آ گئی۔ والدین اور بھائی میرے شوہر کے آگے مجھے چاہ رہے تھے۔ اس کی خوب خاطر مدارت ہو رہی تھی مگر میں تاہوا چہرہ لیے کچھ دیر تک اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اور پھر اپنے کمرے میں آکر کھڑے بچ کر کھولی۔

میرا روتہ اپنے سنے نو لے دولہا کے ساتھ انتہائی تنگ اور چمک آمیز تھا۔ میرے گھر والے تو اسے میری شرم پر معمول کر رہے تھے مگر میرا شوہر ایک ڈیون شخص تھا۔ وہ کچھ سمجھا تھا کہ وہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا اس لیے میں اس سے کئی کئی دفعی ہوں، نہ میں اس سے نفس کربات کرتی تھی نہ ہی اس کے محبت بھرے جملوں پر میرے چہرے پر حیا کی لانی بکھرتی اور نہ ہی میں لپا کر سر جھکا لیتی بلکہ منہ بتائے چہرے پر پھٹکتیں لیے اس کے قرب کو ہا دل خواستہ برداشت کرتی۔

ایک ہفتے بعد میں شوہر کے ہمراہ اس کے گاؤں واپس آ گئی۔ اس کی بیوی سی حویلی میں نوکرانوں کی فوج تھی مگر کا سارا انتظام اس کی والدہ کے ہاتھ میں تھا مگر وہ بیوی شلیق خاتون تھیں۔ اس عمر میں بھی خاصی خوش حال تھیں۔ چہرے کی رنگت بہت گوری تو زندگی البتہ گریز کش گندی رنگ تھا۔ نین نصیب بھی اچھے تھے۔ دونوں ندریں بھی خوب صورت تھیں مگر راض اور اس کے دونوں بھائی خالہ اپنے والد پر گئے تھے۔ کم صورتی کے علاوہ راض میں کوئی محب نہیں تھا۔ مجھ سے والہانہ محبت کرتا۔ میرے نانا اٹھاتا۔ میری بے انتہائی اور کچھ سمجھنے دو بچے کے باوجود مجھ پر فشار ہوا جاتا۔ یہی رویتہ ہاتی گھر کے اٹھارہ کابھی تھا مگر میری موت باری تھی میں خود کو انتہائی بد قسمت سمجھتی تھی جو ایک بد صورت دیوی کی قد میں جھس

گئی تھی اور کہانیوں والے شہزادے کی منتظر تھی جو کہ ایک دن مجھے اس دیو کی قید سے نجات دلانے والا تھا۔

اور وہ شہزادہ کوئی اور نہیں میرا ایک کزن تھا جو امریکا میں رہتا تھا۔ وہ میری شادی سے تین سال پہلے آیا تھا اور اس نے مجھے کہا تھا کہ جلدی سے بڑی ہو جاؤ پھر میں تم سے شادی کر لوں گا اور تمہیں اپنے ساتھ امریکا لے جاؤں گا۔ تب میری عمر صرف پندرہ سال تھی اور میں اچانک ہی میں اس کی راہ چلی رہی تھی۔ وہ تو نہ آیا البتہ مجھ سے کئی مہینے پہلے میں نے اپنی بدصورتی کے باوجود میرے بہلے حقوق اپنے نام کر کے مجھے اپنی دولت کے شہری جال میں جکڑ لیا مگر میں بھی ماہ نور تھی۔ خود پسند اور مغرور وہ بھی بھی میرے دل تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ میں جب بھی کچھ دنوں کے لیے نیکے آتی تو میرے امریکی کزن وجدان کا فون آتا۔ وہ میری اتنی کم عمری میں شادی پر حیرت کا اظہار کرتا اور بار بار کہتا کہ میں تو اس کی بیوی نہیں بن سکی مگر وہ کسی میرے بھئی لڑکی ہی سے شادی کرے گا۔ وہ مجھے کہتا کہ میں اپنی سہیلیوں میں سے کوئی اچھی سی لڑکی اس کے لیے منتخب کروں تاکہ جب وہ پاکستان آئے تو اس سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے جا سکے اور میں اس کی باتیں نہں کر ٹال دیتی۔ شادی کے ایک سال بعد میرے ہاں بیٹی پیدا ہوئی اور جب وہ دو ماہ کی ہوئی تو میں اپنے میکے آئی اور واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اسی البوہا میں آئی اور آپا نے مجھے بہت سچا یا مگر میری نہ کہ وہاں میں نہ بدل سکے۔ میں نے یہ ایک سال بھی وہاں اس لیے گزارا تھا کہ شادی کے چند ماہ بعد ہی بچے کی آمد پیدا ہوئی تھی اور میں نے مجبوراً اتنا عرصہ مجھ سے بچے کی پیدائش کے انتظار میں اس گھر میں گزارا تھا جو کہ اپنی تمام تر سہیلیوں اور آسائشوں کے باوجود میرے لیے زندگان کی حیثیت رکھتا تھا۔ کہاں میرا شہر جہاں سہیلیوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور کہاں یہ وقتا نوی پھونسا سا کہ وہاں جہاں کی زندگی محض حولی کی گھنٹیں دیواروں کے اندر تک ہی محدود تھی۔ اگرچہ گھر میں کئی گاڑیاں تھیں۔ کام کاج کے لیے نوکر چاکر۔ میرا شوہر اکثر مجھے سیر و سیاحت کے لیے ملتان، بہاول پور، کراچی، لاہور اور عمری وغیرہ بھی لے جاتا تھا مگر جب وہ مجھے پسند ہی نہیں تھا تو اس کے ہمراہ سیر و سیاحت سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ خیریت سے بچہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ مجھے عمرہ کروانے بھی لے جائے گا اور یورپ کی سیر کروانے کا بھی کہتا رہتا تھا مگر میں

اس کی کسی بات پر بھی دھیان نہیں دیتی تھی۔ میں تو ایک ایک بل کن کر کر اور رہی تھی چونکہ پہلے دن ہی وہ میرے دل سے اتر گیا تھا اس لیے میں نے اسے بھی بھی خوشی سے قبول نہیں کیا تھا۔ میرے دل و دماغ کو تو وجدان کا خوب صورت تصور ہر وقت اپنے حصار میں لیے رکھتا اور میں سوچتی کہ کب مجھے اس شخص سے نجات ملے گی اور کب میں وجدان کے ہمراہ امریکا کی حسین فضاؤں میں اپنی زندگی کے شاعر اور دور کا آغاز کروں گی۔ مجھے اپنے والدین پر بھی غصہ تھا جنہوں نے آپا کے کہنے میں اسے آکر بغیر سوچے مجھے اور مجھ سے پوچھے بنا اپنے شخص کے ساتھ رخصت کر دیا جو کسی بھی صورت میرے آئیڈیل کے مطابق نہیں تھا۔

مجھے اپنی بچی سے بھی کوئی خاص لگاؤ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ناں تھی اس لیے اس کی دیکھ بھال تو کرنی تھی۔ شکر ہے کہ میری بیٹی باپ پر نہیں لگی تھی بلکہ وہ میرے جیسی ہی پیاری تھی اس لیے مجھے بھی بھی اس پر پیار بھی آتا تھا مگر ساتھ ہی وہ مجھے اپنی آزادی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بھی محسوس ہوتی تھی۔ میں اتنی کم عمری میں ماں بن گئی تھی۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ وجدان چونکہ مجھ سے محبت کرتا ہے اس لیے اگر میں اپنے شوہر سے طلاق لے لوں گی تو وہ خوشی سے مجھے تو اپنا لے گا مگر میری بیٹی کو کسی بھی صورت قبول نہیں کرے گا تو پھر میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں بچی کو اپنے شوہر کے حوالے کر دوں تاکہ کم از کم باپ کی شفقت سے تو وہ مردم ندر ہے۔ دو سال تک میرے شوہر اور سرال والوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میں کسی طرح واپس ان کے پاس چلی جاؤں مگر میں بھی اپنی ضد کی کچی تھی۔ جب ایک فیصلہ کر لیا تھا تو اس پر مضبوطی سے قائم رہی۔ باپوں ہو کر ان لوگوں نے بچی کو جس کا نام میں نے رشار رکھا تھا۔ منگو الیا اور میری خواہش پر عدالتوں کے پکر لگانے کی بجائے طلاق نامہ بھجوا دیا۔ اس دن مجھے یوں محسوس ہوا کہ پیچھے میرے سر پر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اب میں آزاد تھی۔ میرے اور وجدان کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ اپنی تین سالہ شادی شدہ زندگی کو میں نے ایک بھولی بھری کہاں کی سمجھ کر فراموش کر دیا تھا اور اپنی نئی زندگی کی شروعات کی تیاریاں کر رہی تھی۔ وجدان کو میں نے طلاق کے فوراً بعد فون کر کے اپنی آزادی کی خوش خبری سنائی تھی۔ وہ بے حد خوش ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد آکر مجھ سے شادی کر لے گا پھر کچھ ماہ بعد اس نے

رہے تھے اس کے اعزاز میں ایئر پورٹ پر بھی میں نے کوئی خاص مگر جو شے محسوس نہیں کی تھی تو کیا اسے میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟ میں سوچ رہی تھی۔

پھر میں نے خود ہی ذہن سے یہ خیالات جھٹک دیے کہ شاید وہ سیدھا اپنے کام سے آیا تھا، تھا ہوا تھا اور پھر میں بھی تو اتنا طویل سفر کر کے وہاں پہنچی تھی۔ میری تصورات کا بھی اسے احساس تھا اس لیے مجھے وہ سڑب کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ میں کچھ دیر تک پوہنی صوفے پر بیٹھی رہی پھر پاؤں میں کارپٹ سلیر پہن کر اٹھی اور سامنے واقع میز چھوٹی کی جانب بڑھی جو کہ اوپر واقع بیئر روم کی جانب جاری تھیں کیونکہ نیچے تو چکن، اسٹور، لاؤنج کے علاوہ اور کوئی کمر انہیں تھا جب کہ وہ جانے مجھے بتایا تھا کہ ابارٹمنٹ میں دو بیئر روم ہیں۔ میں میز یہاں چڑھ کر اوپر گئی تو ایک مختصر سائنج تھا جس میں دو کمر دل کے دروازے کھل رہے تھے۔ دروازے

دونوں بند تھے۔ میں نے ایک دروازے پر ہولے سے دستک دی جب دروازہ نہ کھلا تو ہینڈل گھمایا مگر وہ لاڈ تھا۔ پھر میں دوسرے دروازے کی جانب بڑھی اور ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی سی روشنی تھی جو کہ کھڑکی سے چمن کرا رہی تھی۔ میں نے اس روشنی میں سوچ کر بورڈ تلاش کیا اور کئی ہینڈل کو دیا تو بالآخر کمرہ تیز سوپ لائٹ کی روشنی میں نہا گیا۔ کمرے میں ایک ڈبل بیئر اور دو سائنج ٹیبل تھے۔ ایک طرف صوفہ سیٹ تھا ایک دیوار کے ساتھ الماری تھی جب کہ بیڈ کے سامنے دیوار گیر شیشہ لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک ٹیبل تھی جس پر لیپ رکھا تھا۔

الماری کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ تھا۔ میں اس دروازے کی جانب بڑھی اور اسے کھولا تو میری توقع کے مطابق وہ ہاتھ روم ہی تھا۔ ایک ہاتھ روم نیچے لیونگ روم کے ساتھ بھی تھا جہاں میں نے دوپہر کو آنے کے بعد اپنے بیک سے گھر میں پہننے والے کان کے کپڑے اور سلیر نکال کر پہنے تھے۔ ہاتھ روم سے باہر آ کر کچھ دیر میں خالی خالی نظروں سے گھڑکی سے باہر دیکھی رہی جہاں اسٹریٹ لائٹ جل رہی تھی اور چونکہ رات کافی گزر چکی تھی اس لیے اس چھوٹے سے قصبے میں سناٹا چھایا ہوا تھا چونکہ لوگوں نے صبح صبح دور درواز کے علاقوں میں اپنے کام پر جانا ہوتا ہے اس لیے وہ جلدی سوچتے تھے۔

کھڑکی سے بہت کمرش بیڈ کے پاس آئی اور اس کے کنارے پر بیٹھ کر وہ جان کے رویے کے بارے میں سوچنے

کہا کہ فی الحال اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ نہیں آسکتا۔ البتہ اس نے تجویز پیش کی کہ ہم ٹیلی فون پر نکاح کر لیتے ہیں تاکہ وہ میرا ویزا اور دوسرے کاغذات بنوا سکے۔

چنانچہ ایک روز وہ جان کے والدین میرے اور وہ جان کے رشتے کی بات کرنے کے لیے گھر آئے۔ میرے والدین کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی جو اپنی ضد اور غمگینی کی وجہ سے اپنا گھر جاڑی تھی ہے کوئی اسے باعزت طریقے سے اپنالے۔ کیونکہ ہمارے محاشرے میں لڑکی لاکھ خوب صورت اور کم عمر ہو مگر جب اس پر طلاق یافتہ کا ٹیبل لگ جاتا ہے تو پھر اس کا دوبارہ رشتہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہاں تو ایک خوب صورت کنوارے، اعلیٰ تعلیم یافتہ، امریکی شہری کا رشتہ اتنی آسانی سے آگیا تھا۔

جلدی میرا اور وہ جان کا ٹیبل فون پر نکاح ہو گیا۔ نکاح کے کچھ عرصے بعد وہ جان نے میرا ویزا منجھ دیا اور میں ایک بار پھر اپنے پیاروں سے چھڑ کر دور دیس کے لیے روانہ ہوئی مگر چونکہ اس مرتبہ میری مرضی اور خواہش کے مطابق نکاح ہوا تھا اور دو لہجہ میرا محبوب اور پسندوں کا شہزادہ تھا اس لیے انہوں نے وہاں کا قتل تو تھا مگر ساتھ ہی اپنے پسندیدہ جیون سامی کو پالنے کی خوشی بھی تھی۔ ایئر پورٹ پر وہ جان نے میرا استقبال کیا چونکہ ابھی دن کے دو بجے تھے اس لیے وہ مجھے دانشن کے فوای علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے خوب صورت قصبے کے ایک دو بیئر روم کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر واپس اپنے اسٹور میں چلا گیا کہ ابھی اسے وہاں کچھ ضروری کام نہانے تھے۔ اس کا اسٹور دانشن میں تھا۔

میں خوب صورتی سے بے اپارٹمنٹ میں اکیلی رہ گئی۔ بہر حال فریش ہو کر کچا کھانا کھانا پینا۔ چکن میں فریق پڑا تھا۔ اس میں سے بریڈ اور اٹلے نکال کر سینڈویچ بنائے کافی کا بڑا سا گلاس بنا کر کھج کیا۔ کچھ دیر تک صوفے پر نیم دراز ہو کر ٹی وی پر خبریں دیکھی رہی اور پھر گہری نیند میں ڈوب گئی۔

مجھے نہیں پتا کہ میں کتنی دیر تک سوئی رہی، کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں، جب بیدار ہوئی تو کمرے میں ٹیبل سی روشنی والا لیپ جل رہا تھا۔ ٹی وی آف تھا جو کہ میں چلا ہوا ہی چھوڑ کر سوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جان آچکا تھا مگر اس نے مجھے جگایا کیوں نہیں، اتنے عرصے بعد ہم مل

لگی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے گھر میں بلکہ اس ملک میں بھی آج میرا پہلا دن تھا۔ اس نے اس قدر سرد مہری کا برتاؤ کیا تھا اور گھر آکر بھی میری خبر نہ لی، نہ پوچھی، نہ یہ خیال کیا کہ میں نے کچھ کمایا یا بھی ہوا کہ نہیں اور آکر اپنے کمرے میں بند ہو کر سو گیا۔

کچھ دیر تک میں یونہی بیٹھی سوچتی رہی کہ میرے بڑے لیٹ کر کبل اوڑھ لیا اور کافی دیر تک سوچوں کے تانے بانے بننے کے بعد دوبارہ سو گئی۔ صبح جب میں بیدار ہوئی تو دن کافی چڑھ چکا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ کمرے میں آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس آئی اور ٹھوڑی دیر تک باہر کے مناظر دیکھتی رہی۔ بلاشبہ یہ ایک صاف سترا، قدرتی مناظر کی دلکشی لیے خوب صورت قصبہ تھا۔ سامنے سے گزرنی سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ صاف شفاف نیلگوں آسمان پر پرندوں کی ٹولیاں محو پرواز تھیں، سڑک کے دونوں جانب گراس پلاٹ تھے، کھارپوں میں خوش رنگ پھول ہوا سے اٹھیلیاں کر رہے تھے۔ کچھ قاصلے پر ایک پارک تھا۔ اس میں رنگ برنگ کے پھول اور پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اونچے اونچے سرسبز درخت ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے پرندوں کی چھپا ہٹ کانٹوں میں دس کھول رہی تھی۔

میں نہایت محویت سے قدرتی مناظر کو انجوائے کرتی رہی۔ کچھ کمرے سے باہر آئی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ ہنوز بند تھا، اپارٹمنٹ میں سائے کا راج تھا۔ میں پوچھل قدمیوں سے پتھر حیاں اتر کر لیوٹک روم میں آ گئی۔ کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی، پھر لیوٹک روم میں ایک طرف رکے اپنے بیک میں سے بلیو جینز، سیاہ مٹی، فرائک اور ہر جگہ اسکاٹف نکالا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ بڑے، جیم، بکمن اور بوٹلاڈ ایک پر مشتمل شامیہ کیا اور اپنا چھوٹا سا پرس کندھے سے ڈال کر اپارٹمنٹ سے باہر آ گئی۔ اپارٹمنٹ کی جالی وچدان نے مجھے کل اتر پورٹ سے آنے کے بعد ہی دے دی تھی۔

طویل کارڈ اور سے گزر کر لفٹ تک پہنچی۔ گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا اور لفٹ کے کھلنے پر لفٹ میں داخل ہو گئی۔ گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر لابی کے ہیرونی کیٹ سے گزر کر باہر آ گئی اور پھر سرسبز درختوں اور پھولوں کی کھارپوں سے گھری ہوئی سڑک عبور کر کے اپنے اپارٹمنٹ سے نظر آنے والے چھوٹے سے باغیچے میں آ گئی۔ وہاں دو تین اکٹائے ہوئے

بوڑھے بچوں پر بیٹھے ادھر رہے تھے۔ کچھ بوڑھی عورتیں آپس میں گپ شپ لگا رہی تھیں، مجھے دیکھ کر انہوں نے تپاک سے ہلکے اور پھر اجنبی باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

میں نے پارک کے چاروں طرف واضح جا ملک ٹریک پر دو تین چکر لگائے اور پھر ایک بیچ پر بیٹھ کر دلچسپی سے درختوں پر چھپاتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔ چونکہ یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے پارک کے تین سائیز زمیں واضح سڑکوں کے ساتھ ساتھ مختلف سائز کے گھر اور اپارٹمنٹ بلڈنگز تھیں۔ ایک جانب مارکیٹ تھی جہاں گھریلو ضروریات کی اشیاء کی دکانیں تھیں۔ ایک دوپرا اسٹور بھی تھے۔ کچھ قاصلے پر درختوں سے گھرا ہوا ایک چرچ بھی نظر آ رہا تھا۔

بے حد پرسکون علاقہ تھا۔ بڑے شہروں کے شور اور ہجوم سے دور۔ صاف و شفاف آسمان اور خوشگوار فضا، ہلکی ہلکی نرم نرم دھوپ میں راحت آ سبز حدت تھی جو سردی کے احساس کو کافی حد تک زائل کر رہی تھی، میں نے بیچ کے پھلے حصے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندھ لیں اور وچدان کے پڑا ہوا اردو بے پروا کر کرنے لگی۔ میں حیران تھی کہ فرائس قدر محبت جتانے والا شخص یہاں مجھے بلا کر شاید بھول ہی گیا تھا۔ کل اتر پورٹ پر پہنچی بڑے روکے پھیلے انداز میں میرا استقبال کیا تھا جسے کہ وہ کسی غیر کوپک کر رہا ہوا اور پھر سارا راستہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ اس نے مجھے فرٹ سیٹ کی بجائے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے کو کہا تھا اور میں حیران رہ گئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا میں اس کے ہی بارے میں سوچ سوچ کر بلکان ہو رہی تھی۔

پھر وہاں سے اٹھی اور ایک پراستور سے کچھ چاکلیٹس، جیمز کے ٹیکس اور جیمز کے ڈبے خریدے۔ میرے پرس میں کچھ ڈالرز تھے جو مجھے کل وچدان نے دیئے تھے۔ پھر میں واپس اپنے اپارٹمنٹ میں آئی اور سونے پر بیٹھ کر چاکلیٹس کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگی۔ ایک دلچسپ مودی آرہی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد اپارٹمنٹ کے ہیرونی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی تو میں نے دیکھا کہ وچدان سیاہ اور کوٹ پہنے، سر پر براؤن اونٹنی ٹوپی اور گردن کے گرد سیاہ ہی مٹلر لپٹے گھر میں داخل ہوا۔ وہ اپنے حلیے سے کسی انگریزی یا جاسوسی فلم کا جاسوس لگ رہا تھا۔ سیاہ بریف کیس اس نے دامن ہاتھ میں تھا رکھا تھا۔

”ہیلو گڈ اننگز، ہاؤ آر یو؟“ اس نے کہا اور میرے

پاس کرنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔
 پھر سات بجے ڈر کیا جو اس نے خود ہی بتایا تھا۔ ڈر
 نو ڈر، چکن، سلاوا اور بریل پر مشتمل تھا، ساتھ میں سوپ تھا۔
 "آپ آگیا نہیں جاتے ہر روز اس طرح کے کھانے
 کھا کھا کر۔" میں نے ان کو رکھنا ان کو کچھ کرنا سنا کر کیا۔
 "اب تو عادت ہو گئی ہے۔ شروع میں اپنے روایتی
 کھانے بہت یاد آتے تھے مگر ان میں نام بھی بہت لگتا ہے
 اور پھر تیز مزہ میں اور مصالحے بھی برداشت نہیں ہوتے۔"
 اس نے سوپ اپنے باؤل میں نکالے ہوئے کہا۔
 "تو یہ سب کب اتنی آسانی سے بن جاتا ہے۔" میں
 نے کہا۔

"یہ تو ہے مگر چونکہ ان میں سے بہت سے بنے بنائے
 بھی مل جاتے ہیں۔ ہمیں صرف گرم کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو
 پاکستانی اور انڈین ڈشز بھی کچا کپائی پکٹیوں میں مل جاتی
 ہیں پھر پاکستانی اور انڈین کھانوں پر مشتمل ہوئی بھی ہیں،
 عموماً بچے میں دیں سے کرتا ہوں۔ خیر اب تم آگئی ہو کل
 ضروری کو ضروری خرید لیں گے پھر تم اپنی مرضی کے کھانے کمر
 میں بنالیا کرنا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے چکن کا ایک ٹکڑا اپنی
 پلیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔

اسی قسم کی باتوں کے دوران کھانا کھایا گیا۔ پھر
 وجدان اپنی جاب پر جانے کی غرض سے تیار ہونے اور
 اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں نے بچل سے برتن اٹھا کر
 چکن میں رکھے۔

جب تک وہ تیار ہو کر مجھے آیا میں برتن دھو چکی تھی۔
 اب اس نے گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر ادنی ٹوپی اور
 گلے کے گرد ادنی منظر لپیٹ رکھا تھا۔

"آپ کی یہ جاب بھی واقعتاً ہی میں ہے؟" میں
 نے دروازے تک اس کے ساتھ جاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یہ قریب ہی ہے ایک کپیوٹر سائنس ہے، جہاں
 پروگرامنگ کرتا ہوں۔ اچھا تم اپنے کمرے میں جا کر سو جانا،
 میرا انتظار نہ کرنا اور ہاں اپنا سامان بھی اپنے کمرے میں
 سیٹ کر لینا۔ میرے کمرے میں تو بمشکل میری ہی چیزیں
 آسکتی ہیں۔ دراصل پہلے اس اپارٹمنٹ میں میرا ایک
 دوست بھی رہتا تھا۔ پھر تمہارے آنے سے پہلے اس نے
 کہیں اور سٹنگل بیڈروم پر مشتمل اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔ تمہیں
 اپنے الگ بیڈروم میں سکون ملے گا اور یوں میرے وقت

پاس سے گزرتا ہوا بیڑیوں کی جانب بڑھ گیا۔ میرے
 جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور میں حیرت سے اسے بیڑیاں
 چڑھتے ہوئے دیکھتے ہوئے اس کے سر دروپیے کے بارے
 میں سوچ رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ اوپر سے نیچے آیا اب اس
 نے ہلکا جھلکا شرٹ اور پاجامے پر مشتمل سوٹ پہن رکھا تھا۔
 پاؤں میں کارپٹ سلپرز تھے۔ ہائی نیک جرسی اور سر پر ادنی
 ٹوپی تھی۔ حالانکہ بیڑی کے درجے سے کمر خاصا گرم تھا۔ میں نے
 کندھوں پر گرم شال لے رکھی تھی۔ شاید وہ باہر سے آیا تھا
 اور پھر غسل کیا تھا اس لیے اسے زیادہ سردی محسوس ہو رہی
 تھی۔ نیچے آ کر وہ سیدھا چکن میں چلا گیا اور کافی ٹیکر آن
 کر دیا۔ پھر دیر بعد بلیک کالی کا بڑا ساگ لے کر دوسرے
 صوفے پر بیٹھ گیا۔

"سوری میں نے تمہارے لیے کافی نہیں بنائی۔ تم تو
 شاید پی جکی ہو۔ یوں بھی بلیک کالی..... تمہیں کہاں پسند
 آئے گی۔" اس نے کافی کا ایک لیساپ لے کر کہا۔
 "نہن..... نہیں میں نے تو ابھی کافی نہیں پی اور آپ
 صبح کہتے ہیں کہ مجھے بلیک کالی کی قسم کی کافی پسند نہیں
 ہے۔ میں صرف چائے پتی ہوں مگر یہاں مجھے چائے کے
 لوازمات ہی نظر نہیں آئے اس لیے مجبوراً صبح ناشتے میں
 کافی پی ہی گئی۔" میں نے کہا۔

"ارے ہاں، میں چائے پیتا نہیں اور نہ ہی کبھی لایا
 ہوں خرید کر۔ البتہ کل لے آؤں گا بلکہ تم خود کل جا کر قریبی
 اسٹور سے لے آنا۔" اس نے کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے
 کہا۔

"ہاں یہاں بڑے بڑے اسٹور ہیں، میں آج کی قسم
 وہاں، بلکہ کچھ دیر کے لیے پارک میں بھی ٹی گئی۔" میں نے
 اپنے سارے دن کی سرگرمیوں کے بارے میں اسے بتایا۔

"گنڈا اچھا ہے۔ اس طرح تمہیں پوری رات بھی نہیں ہو
 گی۔ میں تو یوں بھی ہے حد صرف رہتا ہوں۔ دن کے

وقت اپنے اسٹور پر کام کرتا ہوں اور رات کو ایک جگہ کام کرتا
 ہوں اور ہمیں بارہ بجے میری دکانی ہوتی ہے۔ دراصل
 یہاں اس قدر رہنمائی ہے کہ دن رات کام کر دے جا کر گزارا
 ہوتا ہے۔ آج تو ویسے بھی ویک اینڈ ہے کل دو دن کی
 چھٹیوں میں خوب انجوائے کریں گے۔ تم اگر پوری رات محسوس
 کرتی ہو تو میں صبح تمہیں اپنے ساتھ اسٹور پر لے جایا کروں
 گا وہاں تمہارا نام اچھا پاس ہو جایا کرے گا۔"

"ہاں یہ اچھا آئیڈیا ہے کیونکہ سارا دن تو میرے

بے وقت آنے میں تم ڈسٹرب نہیں ہوگی اوکے خدا حافظ۔“
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں دوبارہ بیڈ کرتی دی دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ بیگ اور
بڑا سا دو لیز والا انچھیٹھتے ہوئے اوپر اپنے کمرے میں لے
گئی اور الماری میں اپنے پکڑے بیٹ کر دیے۔ ڈریسنگ
ایریا میں ایک سائیل پر بڑا سا آئینہ لگا تھا اور سامنے درواز
میں ان میں، میں نے اپنی کاسٹیکس، جیلری اور دوسری
چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ لیں۔ کپڑوں والی الماری کے نیچے
خانے میں جوتے رکھ لیے اور پھر ٹائٹ سوٹ پہن کر بیڈ پر
لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک وجدان کے اس عجیب و غریب رویے
پر غور کرتی رہی اور پھر یہی سوچتے سوچتے سو گئی۔

اگلے روز ہفتہ تھا۔ میری آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ سادہ
سادوں شلوار سوٹ اور جرسی پہن کر بیچے آئی تو وجدان کچن
میں ناشتا تیار کر رہا تھا۔

”ہیلو ماہ نور، گڈ مارننگ۔“ مجھے دیکھ کر وجدان نے
کہا اور پھر چھوٹی سی ڈانٹنگ ٹیبل پر ناشتے کے برتن لاکر رکھ
دیے۔

”آج میں نے تمہارے لیے خصوصی ناشتا تیار کیا
ہے۔“ وجدان نے ایپن سے اچھے صاف کرتے ہوئے
کہا۔

”آپ نے کیوں ناشتا بنایا، میں بنا لیتی۔“ میں نے
پکچن سے ہاٹ پاٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں، بھئی، یہ پاکستان نہیں ہے جہاں گھر کے
کام کاج کی ذمہ داری مکمل طور پر عورت پر ہوتی ہے۔ یہاں
سب مل جل کر گھر اور باہر کے کام کرتے ہیں۔“ اس نے دو
بڑے گلوں میں کافی ڈالتے ہوئے کہا۔

کافی کے ٹک ایک ٹرے میں رکھ کر ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھ
دیئے، پھر پکچن میں جا کر امیرن اتار کر کھوٹی برلکا لایا اور آکر
ایک گری حسیت کر بیٹھ گیا۔ مجھے بھی اپنے سامنے والی کرسی
پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر اس نے ہاٹ پاٹ کھولا تو پرائیوٹوں کی اشتہا آمیز
خوشبو نے بھوک اور بھی چکا دی۔ اس نے ایک درمیانے
سائز کا براٹھا ایک پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیا۔ براٹھا بہت اچھا
بنا ہوا تھا۔ ایک ڈسک میں آلو تھے کا سالن تھا ساتھ کچپ
اور دہی کی چٹنی بھی تھی۔

”یہ اتنا کچھ آپ نے کیسے کر لیا ہے؟“ میں نے
حیرت سے پوچھا۔

جناح کچہ یادیں، کچہ باتیں

برصغیر کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بین
الاقوامی تناظر میں کچھ مختلف نظر آتی ہے۔

مضلوں کے زوال کے بعد East India
Company حکمران بن گئی۔ 1857ء

کی جنگ آزادی کے نتیجے میں ہندوستان
براہ راست تاج برطانیہ کے زیر اثر آ گیا
جس کے بعد برطانوی قوانین کا نفاذ ہوا۔

ہندو ہر میدان میں انگریزوں کے ساتھ
ساتھ تھے جب کہ مسلمان 1857ء کی
جنگ آزادی کے بعد زیرِ عتاب تھے۔

سر سید احمد خان کی کوششوں سے مسلمانوں کو
عام معافی ملی لیکن عملی طور پر مسلمان سیاست
سے دور رہے۔ یہ وقت کی ضرورت تھی اور

سر سید احمد خان کی حکمت عملی بھی۔ 1914ء
سے 1919ء جنگ عظیم اول اور 1939ء

سے 1945ء تک جنگ عظیم دوم میں انگریز
حکمرانوں کو مسلمان فوجیوں کی شجاعت اور

وفاداری کا شدت سے احساس تھا اور وہ
مسلمانوں کو باورِ اس کرنے کے موڈ میں نہ

تھے۔ خلافت تحریک کے بھی دور رس
اثرات ہوئے۔ مسلمانوں کو مومن داس

گاندھی کی سیاسی قلابازی کا اس وقت خمیازہ
بھگتنا پڑا جب تحریک اپنے عروج پر تھی، علی

برادران پورے ملک میں متحرک تھے کہ
گاندھی اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ مسٹر

جناح کی حکمت عملی انتہائی کامیاب تھی،
انہوں نے گاندھی اور کانگریس کے کسی بھی

غیر قانونی اقدام کی حمایت نہیں کی اور قانونی
ذرائع پر عمل کرتے رہے۔

اقتباس: ”جناح کچہ یادیں کچہ باتیں“ از:
پروفیسر محمد فیضی چاندانہ

مرسلہ: احمد جاوید۔ ملتان

گڈھے تھے اور نہ کہیں سے ادھر ہی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک ریسٹوران سے کافی پی۔

رات گئے گھر واپس آکر دوپہر کی بجی ہوئی بریانی اودن میں گرم کر کے کھائی اور پھر اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔ اگلے روز اتوار تھا۔ صبح ناشتا وجدان کے اسی دوست کے گھر تھا جو پہلے اس کے ساتھ رہتا تھا۔ گل زمان کا تعلق پشاور سے تھا۔ اس نے ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ پشاور ہی میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کی تھی۔ اس کے بعد اسی کمپنی کی ایک رانچ میں ٹرانسفر ہو کر واشنگٹن آگیا اور اب کئی برسوں سے یہاں مقیم تھا۔ اس کی شادی اپنی کزن سے ہو چکی تھی جو فی الحال پشاور ہی میں رہتی تھی۔ ابھی اس کی انٹرویو نہیں ہو سکی تھی مگر گل زمان نے ناشتے پر خاصا اچھا اہتمام کیا ہوا تھا۔ حلوا، پرائے، آلیٹ اور آلوی بھجیا۔ ساتھ خصوصاً پشاوری قبوہ تھا۔ ناشتے کے بعد کچھ دیر وجدان اور گل زمان آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

میں فیسر پر کھڑی ہو کر باہر کے مناظر خوبیت سے دیکھنے لگی۔ میں کمرے میں آئی تو وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی زیادہ توہین نہیں دی کہ مردوں کی آپس کی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ جاتیں اور ان کا کام۔

واپسی پڑھنا شروع کیا۔ اس دور سے وجدان نے میرے لیے کچھ جینز، جریاں، کوٹ، ٹیکسٹ، اور کوٹ اور رین کوٹ لیے اور پھر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ گھر واپس آکر گل زمان اور وجدان نے روٹ چکن بنایا اور دریاں لگائیں۔ ساتھ کسٹرز بنایا اور ہم تینوں نے حے دار کھانا کھایا۔ پھر وجدان، گل زمان کو اس کے گھر چھوڑنے چلا گیا اور مجھے کہہ گیا کہ وہاں سے اس نے ایک دوست کی طرف جانا ہے اس لیے دیر سے آئے گا۔ اس کی اس بات پر گل زمان نے مستی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا مگر میں نے نظر انداز کر دیا۔

اگلے روز صبحی الصباح وجدان نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر مجھے بیدار کیا اور کہا کہ میں جلدی جلدی تیار ہو جاؤں کیونکہ مجھے اس کے ساتھ واشنگٹن اس کے اسٹور میں کام کے لیے جانا تھا۔ میں تیار ہو کر نیچے آئی تو وجدان ناشتا ٹیبل پر لگاے میرا منتظر تھا۔ جلدی جلدی ناشتا کر کے ہم لوگ لفٹ کے ذریعے نیچے آئے۔ بلڈنگ کی

”ارے ابھی اتنے سال سے امریکا میں اکیلا رہا ہوں تو یہاں پرائے بنا کر دینے والی نہ مال بھی نہ بہن اور نہ ہی بیوی، سو خود ہی سیکھنا پڑا کھانا پکانا اور اب تو میں اس کام میں ایک مہارت ہو چکا ہوں جس ٹائم کی کمی ہے۔ ویک اینڈ پر تو ہم عموماً پاکستانی کھانے ہی کھاتے ہیں خود بنا کر۔ کیونکہ پورا ہفتہ تو بڑے، اٹھے اور بکر وغیرہ ہی سے کام چلایا جاتا ہے۔“ وجدان نے پرائے کو لوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میرے دیکھتے ہی دیکھتے کسی سکھ گھر کی عورت کی مانند وجدان نے جلدی جلدی ٹیبل سے برتن اٹھائے پھر برتنوں کو ڈش واشر میں لگا کر اسے آن کر دیا۔ ڈائنگ ٹیبل کو صاف کیا۔ اس اثنا میں برتن دھل چکے تھے۔ انہیں مختلف شیلوں میں سجا کر کچن کے فلیٹ صاف کر کے ہاتھ دھو کر اپرین اتار کر یوں صوفے پر بیٹھ کر بیوی دیکھنے لگا جیسے کہ یہ سب کام کسی اور نے کیے ہوں۔ میں نے بہت جاہل کہ اس کا ہاتھ بٹاؤں مگر اس نے کہا۔ ”ارے ابھی نئی ٹولی دہن ہو، ابھی کچھ عرصہ کوئی کام دام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تمہاری ساس تو ہے نہیں جو تم سے کھیر پکوا کر گھر واری کا آقا نہ کر دوائے۔“ البتہ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ کچھ روز تک تم سے کام نہ کر دواؤں۔“

کچھ دیر بعد اس نے سارے گھر کی صفائی کی۔ ہر چیز کو قرینے سے اپنی جگہ پر رکھا۔ دونوں بیڈروم کے ہاتھ روم تک خود صاف کیے۔ اس کے بعد ہم دونوں قرینے مارکیٹ میں گھر واری اور بیزیاں پھل وغیرہ خریدنے چلے گئے۔ گھر آکر سارا سامان اپنی مخصوص جگہوں پر رکھا۔ بڑے سے فریج کو جاتے ہوئے صاف کر گیا۔ اس میں پیڑیاں، پھل، گوشت، چکن، بڑے، اٹھے اور دیگر چیزیں رکھیں۔ گوشت اور چکن ایک یہودی کی دکان سے مل گیا تھا جو کہ حلال تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ صرف یہودی ہی ذبح شدہ گوشت استعمال کرتے ہیں جسے وہ کوشش کرتے ہیں وہ نہ تو اس علاقے میں کوئی بھی مسلم گوشت کی دکان نہیں ملے۔ کچھ دیر ریست کرنے کے بعد وجدان نے مزید ارچن بریانی بنائی، ساتھ رائیڈ اور سلا دہی تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے شام ہو گئی تھی۔ پھر ہم دونوں سیر پر نکل کھڑے ہوئے۔ وجدان کی ایم بی ڈیو میں مصافقاتی علاقے کی سیر نے بے حد خوشوار احساس بخشا۔ سرسبز درختوں اور کیتوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی غل کھائی سڑک بے حد ہموار اور صاف ستھری تھی۔ نہ ہی

ہسٹ میں پارکنگ تھی۔ وجدان گاڑی پارکنگ سے باہر لے آیا۔ میں اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی واشنگٹن کی جانب رواں دواں ہوئی۔
واشنگٹن میں ایک بڑی مارکیٹ میں وجدان کا اسٹور تھا جو خاصا بڑا تھا جس میں ضرورت کی ہر چیز میٹلوں میں بھی ہوئی تھی۔

وجدان نے اسٹور میں کام کرنے والے عملے سے میرا تعارف کروایا۔ ان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، دو لڑکے پاکستانی تھے جب کہ ایک بنگلہ دیش سے آیا تھا۔ ایک لڑکی فلپائن سے تھی جب کہ دوسری پولینڈ کی رہنے والی تھی۔ سبھی اسٹور ڈس تھے اور صبح کے وقت اسٹور میں کام کرتے تھے۔ جب کہ رات کو مختلف اداروں میں زیر تعلیم تھے۔ اسٹور میں سارا دن میرا بہت اچھا وقت گزارا۔ صبح بریک پر میں اور وجدان ایک قریبی ریستوران چلے گئے جہاں چکن سینڈویچ اور جوس سے بچ کیا اور یوں سارا دن بے انتہا مصروف گزار کر شام کو گھر آئے شام کی چائے پی کر کچھ دیر آرام کیا پھر وجدان نے ڈیو بند کھانا گرم کیا جو کہ میکسڈو، ڈیجی ٹیلو، سوپ اور میکرونی پر مشتمل تھا۔ ساتھ بڑے کے سلاز تھے۔

پھر وجدان اپنی جاب کے لیے چلا گیا اور میں کچھ دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد کمرے میں جا کر سو گئی تھی۔ عجیب سی مشق زندگی تھی وہاں کی۔ پورا ہفتہ دو روز کے علاقوں سے کام کی جگہ پر جاؤ۔ اتھک محنت کرو اور گھر آکر لیے سڑکی ٹھکان کی وجہ سے جلدی سوجاؤ البتہ ہفتہ اور اتوار کے دن بھی کسی شہر میں تو سبھی کسی علاقے میں سر و سیاحت کے لیے نکل جاتے۔ بھی وجدان کے کچھ دوست گھر پر کھانے کے لیے آ جاتے سب مل کر کھانا بناتے۔ ٹی وی پر کوئی نئی انڈین مووی دیکھتے۔ کب شپ لگاتے پھر آؤنگ کے لیے نکل جاتے اور رات گئے وہاں آکر سو جاتے۔ وجدان کے سارے دوست ہی چمڑے تھے۔ یا تو غیر شادی شدہ تھے یا پھر بیوی بچے پاکستان یا انڈیا میں تھے۔ مجھے سب بھائی کہتے تھے اور بھائی کہتے ہوئے ان کا انداز عجیب سا سخرا نہ ہوتا جسے میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ میں معمولی پڑھی لکھی تھی۔ کم عمر بھی تھی۔ صرف شادی شدہ زندگی کا ایک سال ہی سسرال میں گزارا تھا۔ چونکہ شوہر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے بھی اس سے میں نے مکمل کربات کی ہی نہ تھی۔ اگرچہ وہ تو میرے آگے پیچھے پروانے کی طرح منڈلاتا رہتا۔ میرے

جاؤ چو نکلے کرتا مگر میں اسے لپٹ ہی نہیں کرواتی تھی اس کی موجودگی میں چپ چاپ منہ بنا کر بیٹھی رہتی تھی اس لیے مجھے مردوں کی عادات کا علم ہی نہ تھا اور اب جب کہ مجھے میرا پسندیدہ شوہر ملا تھا تو یہ مجھے منہ ہی نہیں لگتا تھا۔ کوئی بات کرنی تو ہوں ہاں میں جواب دیتا۔ نہ بھی میری پسندنا پسند پوچھی نہ میری حریف کی نہ ہی مجھے کسی کام کو کرنے کا کہا۔ عجیب سا روایت مگر کم کا محض تھا۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ میری اس شادی ہی نہیں ہوئی، کیونکہ جب سے میں یہاں آئی تھی اس نے مجھے بڑی کا درجہ دیا تھا، نہ ہی شوہر والے حقوق ادا کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں ایک عورت تھی اگرچہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی مگر پھر بھی مجھ میں عجیب طرح کی شرم اور جھجک سی تھی۔ میں نے بھی سمجھی اسے احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ اس نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ مجھے اتنی دور رس لیے بلایا تھا فون پر تو ڈیویروں ڈھیر بائیں کرتا تھا اور اب جب میں اس کے پاس آگئی تھی تو اس نے مجھے یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے کہ میں اس کے گھر میں موجود دوسرے ساز و سامان کی طرح ہی ہوں جس کے جذبات نہ احساسات مگر یہ بات اسے کہا کون جب کہ وہ مجھ سے کسی بھی موضوع پر بھی بات ہی نہیں کرتا تھا ہر وقت اپنی مصروفیات کا رونا ہی روتا رہتا۔

یونہی چہ باہ کا عرصہ گزر گیا میں وہاں کی روشنی اور لمبے لائف سے تنگ آ چکی تھی۔ میں سمجھ چکی تھی کہ وجدان نے مجھ سے شادی محض اس لیے کی تھی کہ اسے اپنے کاروبار میں ایک مددگار اور گھر کے کام کاج کے لیے مفت کی نوکرائی چاہیے تھی۔ پہلے دو ہفتے کے بعد گھر کے تمام کام میری ذمہ داری تھے کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی سمرانی یہاں تک خریداری تک اب میں ہی کرتی تھی۔

اس روز ہفتہ تھا۔ وجدان ایک ہفتے کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ کیلی فورنیا گیا ہوا تھا۔ میں اکیلی ہی تھی پر اسٹور جاتی تھی۔ میں نے اپنے لیے ناشتا بنایا پھر گھر کی صفائی کی اور گھر دوسری کرنے کے لیے جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ڈور بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ... کھولا تو گل زبان سانسے کھڑا تھا۔ ”ارے گل زبان بھائی آپ کیلی فورنیا نہیں گئے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے میں آکر موٹے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد کل زمان بھائی چلے گئے اور میری آنکھیں کل گئیں اور اب مجھے وجدان کی سردہری اور لافعلی کی وجہ سمجھ آگئی تھی۔ مجھے استور میں کام کرنے والیاں یاد آنے لگیں جو مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھیں پھر سر جھکا کر ایک دوسرے کو اشارہ کرتیں۔ مجھے اب اس فلفلی لڑکی کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو مسکرا مسکرا کر مجھ سے حال احوال پوچھا کرتی اور میں اس کی کمزور انگلیں کی خامی سمجھ کر چپ رہ جاتی تھی۔ ان سب باتوں نے مجھے ہلا دیا تھا۔

اور اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں ایک لمحے کے لیے بھی اس گھٹا کردار کے شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی اور پھر جب ایک ہفتے بعد وجدان واپس آیا تو میں نے اسے کہا کہ میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے میں کچھ دنوں کے لیے پاکستان واپس جانا چاہتی ہوں۔

امی کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی، انہیں دوسرے ہارٹ ایک ہو چکا تھا اور جب بھی میں انہیں فون کرتی تھی تو وہ بڑی باؤسایتہ باتیں کرتی تھیں اور مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی تھیں۔

”ٹھیک ہے جب مرضی چلی جانا۔“ وجدان نے کہا تو میں نے واپس کی تیاری شروع کر دی۔ میر کو دا انگشتن گئی تو اپنے سسرال والوں اور بہن بھائیوں کے لیے تحائف خریدے۔ میں تقریباً چار ماہ بعد واپس جا رہی تھی اس لیے یوں ظاہر کر رہی تھی کہ جیسے واقعی میں سب سے ملنے جا رہی ہوں۔ میں نے اپنے رویے سے وجدان کو کسی قسم کا شک کا موقع نہیں دیا۔

پورے ساڑھے چھ ماہ بعد میں واپس اپنے گھر آئی تو امی کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بے حد کمزور ہو چکی تھیں۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضے تو پہلے ہی تھے مگر پھر بے در پے ہونے والے ہارٹ ایک نے انہیں بالکل ہی بڑھال کر دیا تھا۔ وہ زیادہ تر تیز پر ہی بڑی رہتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی اٹھ کر ہاتھ روم تک جاتیں تو سانس پھول جاتی، سینے اور بازو میں درد شروع ہو جاتا۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر میں بے حد پریشان ہو گئی اور جی جان سے ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ یوں ماں کی پیاری کا بہانہ کر کے میں نے امریکا واپس جانے سے انکار کر دیا۔ وجدان نے ایک آدھ ہارٹون کر کے امی کی خیریت دریافت کی اور پھر چپ سا دھلی۔ میں نے بھی پروا نہیں کی جو بڑا ڈالنے میرے ساتھ روار کھا تھا اس کے بعد اگر میرے دل

”آپ کیا لیں گے کافی یا چائے؟“ میں نے کچن کی جانب جاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں شکریہ بھائی میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔ میں آپ سے ضروری بات کرنے کی غرض سے آیا تھا پلیز آپ میری بات غور سے لیں۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ایک کم عمر اور شریف خاتون ہیں اور پتا نہیں کیسے وجدان نے آپ کو اپنی اصلیت بتائے بغیر اپنے چال میں پھاس لیا۔“

”کھ... کیا مطلب؟“ میں بے حد حیران تھی کیونکہ کل زمان اور وجدان گھر سے دوست تھے مگر آج وہ اس کا ذریعہ عجز و انکار سے کمر ہاتھا۔

”مطلب یہ کہ بھائی! ایسی بہت سی باتیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں ناپسندیدہ ہیں لیکن مغربی ممالک میں انہیں برا نہیں کہتے۔ مثلاً Gay بن جانا۔ وجدان بھی Gay ہے۔ آپ اس کا مطلب سمجھتی ہوں گی۔“ کل زمان نے گویا دھماکا کیا۔ میں دہل گئی۔ وہ اپنی رو میں بتاتا رہا۔ اس جیسے ہی ہیں۔ میں جب یہاں رہتا تھا بھی مجھے اس کی ان حرکتوں کا علم ہوا تھا۔ میں نے اسے بہت منع کیا کہ جو بات یہاں عام ہے اس کی اجازت ہمارا مذہب نہیں دیتا مگر وہ باز نہیں آیا پھر جب آپ سے ٹیلی فون پر نکاح کر کے آپ کو یہاں بلوایا تو میرا خیال تھا کہ اب وہ تاب ہو گیا ہے مگر انہوں نے ایسا نہیں ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ آپ پہلے ہی طلاق لے چکی ہیں اس لیے اب اس کے ساتھ جیسے تیسے زندگی گزارتی رہیں گی۔ اس طرح اس کا بھرم بھی قائم رہے گا اور گھر کے کام کاج بھی ہوتے رہیں گے اور استور میں بھی مدد دہی رہے گی۔ رات کو وہ کہیں جاب وغیرہ نہیں کرتا بلکہ اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے گھر میں انہیں اس لیے نہیں لاتا کہ کہیں آپ کو علم نہ ہو جائے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اس شخص کے ساتھ اپنی زندگی برپا کرنے کی بجائے پاکستان واپس چلی جائیں۔ آپ نوجوان ہیں خوب صورت ہیں کوئی نہ کوئی شریف شخص آپ کو اپنا ہی لے گا۔ جیسے لوگوں کی کمی نہیں۔ اس گناہ سے جتنی جلدی ہو سکے جان چھڑالیں اور ہاں پلیز وجدان کو خبر نہ ہو کہ میں نے آپ کو اصل بات بتائی ہے ورنہ وہ میرا دشمن بن جائے گا۔ آپ کسی بہانے سے پاکستان واپس چلی جائیں اور وہاں جا کر اس سے طلاق کا مطالبہ کر لیجیے گا۔ طلاق کی صحیح وجہ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں نے کوئی کوشش نہیں کی ہو گی۔ بہر حال اب میں اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ میں نے اس سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا ہے میں شادی شدہ ہو کر بھی ایک بیوہ جیسی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔“ میں نے دونوں لہجے میں کہا۔

”اس سے طلاق لے کر تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہیں کوئی اور مل جائے گا۔ تو اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔ بار بار شوہر بدلنے والی عورت کو کوئی بھی نہیں اپناتا۔ یہاں بغیر شادی کے بھی رہو گی تو بہتر ہے کہ وہیں چلی جاؤ۔ کم از کم اس نے تمہیں باعزت طریقے سے گھر میں تو رکھا ہوا تھا۔ تمہاری تمام ضروریات پوری کر رہا تھا کہ یہاں تمہارا کون سا ہاراجے گا۔ امی رہیں نہیں، ابوی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں، بھائی تو ابوی ذریعہ تک ہی وہاں سے پیسے بھیج رہے ہیں ان کے بعد تمہیں کون پوچھے گا۔“

”نہ پوچھے کوئی، میں اپنے بل پر زندگی بسر کر سکتی ہوں کم از کم اس گناہ کی عمری میں رہنے سے بہتر ہے کہ میں تنہا عساری زندگی گزار لوں۔“

”تم ہو ہی خود غرض اور خود پسند۔ اچھے خانے محبت کرنے والے اقلیت شوہر کو اس کی مثل اور زیادہ عمر کی بنیاد بنا کر چھوڑ دیا اچھی معصوم بیٹی کی بھی پروا نہیں کی اور اب اپنے ہاتھوں اپنی خوش قسمتی کا دروازہ بند کر رہی ہو لوگ امریکا جانے کو ترستے ہیں اور تم..... بس کیا کہوں میں تمہیں۔“ آپنی نے زنج ہو کر کہا۔

اور پھر وہ کچھ دنوں بعد واپس چلی گئیں۔ میں نے ان کے جانے کے بعد وجدان کو اس کے گھماؤنے کردار کے بارے میں بتا کر طلاق کا مطالبہ کر دیا تو اس نے کوئی جواب دینے بغیر فون بند کر دیا اور پھر کچھ دنوں بعد مجھے طلاق بھیج دی۔ یوں میری زندگی کا یہ باب بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

میں نے فیشن ڈیزائننگ کے ایک کورس میں داخلہ لے لیا تاکہ ٹریننگ کے بعد اپنی بوتیک محمولوں اور یوں کسی کی دست نگر نہ ہونا پڑے۔ کامیابی سے کورس کی تکمیل کے بعد وجدان نے جو قمقمہ کے طور پر کچھ رقم مجھے بھیجی تھی اس سے میں نے گھر کے ایک کمرے ہی میں کچھ مینشین لے کر رکھ لیں۔ کچھ عورتوں کو لازم رکھ لیا اور یوں میرا کام چل نکلا۔ اگرچہ تینوں بھائی بھی ایک معقول رقم ہر ماہ بھیج دیتے تھے مگر مجھ پر تو خود انحصاری کی دھن سوار تھی میں سہا جاتی تھی کہ

جب تک ہمت ہے خوب محنت کر کے اتنا پیسا کمالوں کہ بڑھا پا سکوں سے کٹ سکے۔ اگرچہ آپ نے بہت کوشش کی کہ میرا دوبارہ رشتہ ہو جائے مگر دودھ ملاؤں کے بعد اچھے رشتے ملنے محال تھے۔ ادھر عمر کے دوسری تیسری شادی والے لگتی ہی بچوں کے باپوں کے رشتے مجھے قبول نہیں تھے۔ اس لیے میں نے اب شادی کا باپ ہی بند کر دیا اور اپنے کاروبار میں شب و روز دلچسپی لینے لگی۔

ایک مرتبہ آپ نے مجھے لاہور بلایا۔ دراصل انعام بھائی کے ایک دوست کی پہلی بیوی کا کسٹری سے انتقال ہو چکا تھا۔ بچے بھی نہیں تھے اور وہ مجھ سے شادی کے خواہش مند تھے۔ میں نے پہلے تو انکار کر دیا مگر پھر آپ کی اصرار پر ان کے گھر چلی گئی اس شخص کی ماں اور نہیں مجھے دیکھنے آئیں مگر میرے چھوٹے قد کو جب بتا کر رشتے سے انکار کر دیا۔ میں آپ کی سے بہت ناراض ہوئی کہ انہوں نے خواہنا میری انسلٹ کر دانی اور انہیں حتیٰ سے منع کر دیا کہ آئندہ سے وہ میری شادی کے سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کریں گی۔ میرے پہلے شوہر کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسری بیوی بہت قصص اور اچھی تھی۔ اس نے میری بیٹی کی پرورش اپنی اولاد کی طرح ہی کی تھی۔ اس کے اپنے بھی تین بچے ہو چکے تھے۔ دو بڑوں لڑکے اور ایک لڑکی، وہ لوگ ایک خوشگوار اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ شاید میرے ٹھکر کر جانے کی وجہ سے اللہ نے میرے پہلے شوہر کو اتنا اچھا صلہ دیا تھا۔ انہیں میرے واپس آنے کی خبر ہو چکی تھی اس لیے ایک مرتبہ لاہور آپ کی گھر میری بیٹی کو بھیج دیا۔ چار پانچ سال کی گھائی گھائی رعیت والی کڑیاں بیچی ہوئے میرا پر تو تھی۔ میں اس سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور پہلی مرتبہ مجھے اچھا لایا ہوا تھا کہ کاش میں بچی کی خاطر ہی اپنا گھر بنا لیتی اور اپنے چاہنے والے فرشتہ سیرت شوہر کو یہ ٹھکرانی تو آج کئی پیسنگ کی مانند اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پھرتی مگر انسان کے مقدّر میں جو کچھ ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ اب تو میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ اپنے بوڑھے والد کی خدمت اور اپنے کاروبار کو سنبھالنا اور یوں زندگی کی شام ہو جائے۔ پھر ایک رات ایسے تو صبح بیدار ہی نہ ہوئے۔ رات کو کسی وقت ان کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ ابو کے انتقال کے بعد میں ناصر تھا ہو گئی بلکہ بے آسرا بھی رہ گئی۔ میرا یونیک کا کام اچھا تھا جس پر تھا مگر اتنا بھی منافع بخش نہ تھا، میں نے سوچا کہ لاہور شفٹ ہو جانی ہوں۔ وہاں زیادہ اچھی طرح میرا کام چل سکے گا۔

مکان ابو میرے نام کر گئے تھے۔ اسے میں نے فروخت کر دیا۔ لاہور آکر میں نے ایک بار وٹق بازار میں اپنی یونیک کھول لی اور کچھ لڑکیاں ملازم رکھ لیں۔ آپ نے مشورہ دیا کہ میں ان کے گھر کے اوپر والے پورشن میں رہائش اختیار کر لوں جو کہ خالی پڑا تھا۔ اوپر ایک بیڈروم اور لاؤنج تھا۔ چھوٹا سا کچن بھی تھا جو کہ میرے لیے کافی تھا۔ دراصل آپ نے یہ پچھلے سال ہی وٹنٹس میں اپنا ایک کتال پر گھر بنوایا تھا۔ اوپر کا پورشن کرائے پر چڑھانے کے لیے بنایا تھا۔ میں نے اس شرط پر وہاں رہنے کے لیے پاپی بھری کہ میں باقاعدہ کرایہ ادا کروں گی کیونکہ میں جانتی تھی کہ انعام بھائی ہم لوگوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ کچھ دنوں کے لیے جب میں یا گھر کے دوسرے افراد کسی کام سے آتے تھے تو وہ ناک بھون چڑھاتے تھے اور انتہائی چٹک آمیز برتاؤ کرتے تھے۔ میرے تیسرے غبر والے بھائی جب تعلیم کے حصول کے لیے لاہور میں ہاسٹل میں رہتے تھے تو جب بھی دیکھ اینڈ پڑا آپ کی گھر جاتے تو انعام بھائی ان سے ایسے کام نہ کرواتے جیسے کہ ان کے ذاتی ملازم ہوں۔ گھر میں تو کر کے ہوتے ہوئے بھی بھائی ہی سے ہر کام کرواتے۔ کبھی انہیں سوئے لینے کے لیے باؤنچا رہے ہیں کبھی گھر کے فرنیچر کو ادھر ادھر بیٹھ کرواتے رہے اس لیے بھائی بھٹا عمر بھی وہاں رہے بہت کم آپ کی طرف جاتے۔ آپ کی اصرار کر کے کھانے پر بلا میں تو کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتے۔

میں اپنے مختصر سامان سمیت آپ کی اوپر کے پورشن میں رہنے لگی۔ اپنا کھانا وغیرہ بھی خود ہی بنالیتی تھی۔ سارا دن تو یونیک ہی میں گزار جاتا تھا۔ رات ہی تو گھر آتی تھی۔ ایک رات کو فز بنانے کے لیے گھر آئی۔ گاڑی کیراج میں پارک کی اور کیراج میں بی بیٹر حیاں چڑھ کر اپنے پورشن میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی دروازے پر دھک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو انعام بھائی تھے۔ ”تمہاری آپنی تو شاید کسی دوست کے گھر دعوت پر آئی ہے۔ میں نے سوچا کہ ماہ نور کے ہاتھ کی جائے ہی ملیں۔“

انعام بھائی نے خوشگوار لہجے میں کہا تو مجھے حیرت سی ہوئی۔ بہر حال میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کیوں نہیں انعام بھائی آئیے۔“ پھر میں نے اپنے اور ان کے لیے چائے بنائی۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ چلے گئے۔

دوسری صبح یونیک جاتے ہوئے میں آپنی سے ملنے چلی

بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”کیا بدلتی رہی ہے انعام بھائی چھوڑ دینے مجھے درد میں ابھی پوچھیں کون کون کرتی ہوں۔“ میں نے غصے سے چلا کر کہا اور پھر خود کو چھڑا کر ہماگ کر کرے سے ٹنگی اور تیز تیز سڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔ دروازہ بند کیا اور سیدھی اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی اور کچھ عرصے میں منہ چھپا کر روتے لگی۔ میری بدلتی اب میری بین کا گھر بھی اجاڑنے پر تھی ہوئی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں نام صرف یہ گھر بلکہ شہر ہی چھوڑ دوں گی۔

اگلے دو تین دنوں تک میں نے بوتیک میں اپنا سارا سامان سمیٹا۔ گھر کی ہی نہیں رات کو ایک لیڈیز ہاسٹل چلی جاتی۔ وہاں میری ایک دوست رہتی تھی۔ اسے میں نے مختصر اپنے عیش بہنوئی کی پیش قدمی کے بارے میں بتایا تھا اور اس نے بھی مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلی جاؤں، آپنی کے واپس آنے پر میں گھر واپس آئی اور آپنی کو بتایا کہ میں واپس سرگودھا جا رہی ہوں، یہاں میرا کاروبار اچھا نہیں جا رہا۔ آپنی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

چنانچہ میں واپس اپنے شہر لوٹ آئی۔ ایک چھوٹا سا ڈیل اسٹوری مکان کرائے پر لیا اور خود ہائٹس اختیار کر لی اور نیچے بوتیک کا کام شروع کر دیا۔ ایک رشتے کی بیوہ بچہ کو اپنے پاس رکھ لیا اور یوں اپنے گھر میں رہنے لگی۔ وقت کا کام گزرتا ہے، سو گزرتا چلا جاتا ہے۔ اب تو بلیوں کے نیچے سے بہت سیانی بہہ چکا ہے۔ میری بیٹی جوان ہو گئی ہے اس نے بی ایس سی کر لیا تو اس کی شادی میرے سابق شوہر کے بھائی کے بیٹے سے ہو گئی۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور اب وہ کبھی بھار اپنے شوہر کے ہمراہ مجھ سے ملنے آ جاتی ہے۔ اس کے دو پیارے پیارے بیٹے ہیں۔ آپنی کے تینوں بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ بھی دو تین بیٹے بعد مجھ سے ملنے آتی رہتی ہیں۔ انعام بھائی کا روتیہ اب ان کے ساتھ اچھا ہو چکا ہے۔ میرے دو حکارنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں مل چکی ہیں اور اب اپنی وفا شعار بیوی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ البتہ میرے گھر بھی نہیں آئے۔ کس منہ سے آسکتے ہیں زندگی گزر رہی تھی ہے جیسے تیسے کہ وقت کب رکا ہے اچھا ہو یا برا گزر رہی جاتا ہے مگر شکر ہے کہ میں نے اپنا وقت باعزت طریقے سے گزارا ہے۔

گئی۔ انعام بھائی آفس چائے تھے اور تینوں بیچے اپنے تعلیمی اداروں میں۔ میں نے علیک سلیک کے بعد انہیں بتایا کہ رات کو انعام بھائی میری طرف آئے تھے۔ آپ شاید بچوں سمیت کسی دوست کے ہاں تھی نہیں۔

”نہیں، نہیں تو..... میں تو گھر ہی پر تھی۔“ آپنی نے کہا تو میں خاموش ہو گئی۔

اب یہ اکثر ہونے لگا کہ انعام بھائی کسی نہ کسی بھانے کبھی میرے پورٹن میں آ جاتے، کبھی آفس سے واپسی پر بوتیک میں آتے اور میری تعریفیں کرتے رہتے۔

ایک مرتبہ آپنی اپنے سرسرا لکھ دوں کے لیے رہنے کے لیے نکلیں تو چھینوں کی وجہ سے بیچے بھی چلے گئے۔ میں کوشش کرتی تھی کہ آپنی کی غیر موجودگی میں انعام بھائی کو کم لفٹ کرواؤں اس غرض کے لیے میں نے بوتیک میں کام کرنے والی لڑکی کو کچھ روز کے لیے اپنے پاس روک لیا تاکہ وہ اوپر نہ آسکیں کیونکہ ان کی ذمہ داری باتوں، آپنی کی برائیوں اور دانستہ ایسی حرکتیں کرتے کہ کبھی میرے ہاتھ کو چھو لیا، کبھی میں بچن میں کھڑی ہوتی تو میرے انتہائی قریب آ کر کھڑے ہو جاتے، کبھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور ایک روز تو اس طریقے سے میرے راستے میں کھڑے ہو گئے کہ میں لڑکھائی نہ کر سکی اور انہوں نے دونوں ہاتھوں سے تمام کر اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی مگر میں جلدی سے علیحدہ ہو گئی۔ ان کی اس قسم کی دست درازیاں اور باتوں کی وجہ سے میں کوشش کرتی کہ بوتیک سے واپسی پر نیچے آپنی کے پاس ہی چلی جاؤں تاکہ انعام بھائی اوپر نہ آسکیں مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے۔

اس دن میں بوتیک سے واپس آئی، گاڑی گیراج میں پارک کی جوڑی کی آج کل میرے ساتھ رہ رہی تھی وہ اوپر چلی گئی۔ اسی وقت انعام بھائی نے دروازہ کھولا اور بولے۔ ”ناہی! یہاں آ جاؤ میں نے مرے کا چکن پلاؤ بنایا ہے ل کر کھاؤ۔“

”نہیں انعام بھائی مجھے بھوک نہیں، میں نے بوتیک ہی میں کھانا کھالیا تھا۔“

”اوہو کم آن ڈیر تکلف کیا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً چھینے ہوئے اندلے گئے۔ دروازہ بند کر دیا اور مجھے لپٹا کر بولے۔ ”ناہی میں تمہارے لیے پاگل ہو چکا ہوں، میں تمہاری آپنی کو طلاق دے کر تم سے شادی کر لوں گا۔ میں اب ایک لمحے کے لیے بھی تمہارے



URDU TUBE
A IMAGE OF ENTERTAINMENT

انتظار

محترمی عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم !

میں نے خود کو رفاعی کاموں میں مصروف کر لیا ہے۔ جہلم و
آس پاس کے علاقوں میں بھی لوگ مجھے پہچانتے ہیں کیونکہ
رفاعی کاموں کی وجہ سے ادھر ادھر کے تمام رفاعی اداروں
اولڈ ہافوس، یقیم خانے میں آنا جانا رہتا ہے۔ اسی ایک دورہ کے
دوران یہ سچ بیانی ملی۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔
سیدہ شاہدہ شاہ

(جہلم)

کے سیاہ بالوں میں چاندی بکھر جایا کرتی ہے۔ مضبوط و توانا
جسم جھک کر کمان بن جاتا ہے۔ تلخ و مٹی اور شاداب
چہرے پر جھریوں کا جال بن جاتا ہے۔ کمزور اور ناتواں
اولاد کو پروان چڑھاتے چڑھاتے اس کا جسم اپنی تمام تر
توانائیاں کھودتا ہے مگر اس کی بھٹیوں، اس کی مٹا کا سنسدر

کا نکات کے سارے جغرافیائی موسم و حالات
بدل جایا کرتے ہیں مگر وہ موسم بھی نہیں بدلا کرتے۔
ایک ماسٹا کا موسم، دوسرا انتظار کا موسم۔ مٹا کا موسم وہ سدا
بہار موسم ہوتا ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ وقت کا
کارواں چلتے چلتے برسوں کی مسافت طے کر جاتا ہے۔ ماں

اپنی اولاد کے لیے عمر کی نقدی قسم ہو جانے تک جولاہوں کے ساتھ موجزن رہتا ہے۔

انتظار کے موسم پر بھی خزاں نہیں آتی۔ اپنے پیاروں کے لوٹ آنے کے دھپ ہمیشہ آنکھوں میں روشن رہتے ہیں۔ کان ان کی واہسی کی چاپ سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ شہر کے وسط میں قائم ایک این جی اوز کی زیر نگرانی چلنے والے دارالامان میں ایک بیسٹھ سالہ بڑھیا سرداراں بھی عرصہ دس سال سے اپنے سنے میں ممتا کا شٹاٹھیں مارتا ہوا سمندر چھپائے تیزی سے بے نور ہوتی آنکھوں میں اپنے جواں سالہ تین بیٹوں کی واہسی کے انتظار کے دھپ جلائے بیٹھی ہے۔ وہ ہر صبح نماز پڑھنے کے بعد غلوں نیت سے اپنے بیٹوں کی واہسی کی دعا مانگتی ہے پھر جب ناشتا کئے گا اعلان ہوتا ہے تو بڑے کمرے میں آتی ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر واہسی اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کوکرن کھول کر اس راہگزر پر نظریں جڑا رہتی ہے، جہاں سے اس کے گھر کو سڑک جاتی ہے۔ اسی راہگزر سے دس سال قبل اس کے تین بیٹے اسے لے کر اس دارالامان میں آئے تھے اور یہ کہہ کر داخل کر دیا گئے تھے کہ وہ دو چار روز کے لیے کہیں جا رہے ہیں۔ واہسی آکر وہ اسے لے جائیں گے۔ جاتے جاتے وہ دارالامان کی منتظم اعلیٰ کو ڈونیشن بھی دے گئے تھے اور منتظم اعلیٰ کو ایک طرف لے جا کر سمجھا گئے تھے کہ اماں اب عمر کی آخری سانسوں تک یہیں رہیں گی۔ اس دارالامان کو براہ ڈونیشن ملتی رہے گی۔ منتظم اعلیٰ کی باجھیں کل گئی تھیں۔ یہ تمام نبیاد این جی

اوز ڈونیشن سے ہی تو چلا کرتی ہیں۔ بس مہینہ دو مہینے بعد ایک بڑا سائنیشن کراؤ۔ سرکاری وغیرہ سرکاری افسران اور شہر کے امراء، خیر حضرات کو بلاؤ۔ اپنی نام نبیاد کارکردگی بڑھا چڑھا کر پیش کرو۔

انکیشن کے سلسلے میں پیراواں جانا ہوا تھا اور وہیں اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ایک ایک کمرے میں جا کر ان عورتوں سے ملی جلی جو عمر کی پونجی قسم ہونے کے انتظار میں وہاں دن گزار رہی تھیں۔ انہی میں ایک سرداراں بھی تھی، اس کا اصل نام سردار بیگم تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ نعیم ایک حادثے کا شکار ہوا تھا اور تین دن اسپتال میں گزار کر مالک حقیقی سے جا ملے، نعیم جو ایک ٹیکسٹائل مل میں بطور مزدور روٹی کی کاٹھیں اٹھا کر

ایک کھاتے سے دوسرے کھاتے میں لے جانے کا کام کرتا تھا۔ اس دن کام پر جانے کے لیے تیار ہوا تو حسب معمول جانے سے پہلے سرداراں کو پیار کیا اور گھر سے باہر آگیا۔ سڑک پر دوسری جانب مل کے حردروں کو لانے لے جانے والی بس کھڑی تھی وہ اس طرف بڑھا۔ ابھی سڑک کے وسط میں ہی پہنچا تھا کہ ایک طرف سے آتی ہوئی تیز رفتار کار کی زد میں آگیا۔ کار ایک امیر زادہ چلا رہا تھا جو اسے خون میں لٹ پت چھوڑ کر موقع واردات سے فرار ہو گیا تھا۔ نیکی کو کار کا ٹبر ٹوٹ کرنے کی توفیق ہوئی اور نہ ہی ڈیوٹی پر کھڑے ٹریفک پولیس کو کار روکنے یا پاس کھڑی سرکاری موٹر بائیک پر اس کا پیچھا کرنے کی ہمت ہوئی۔ بلکہ وہ جانے حادثہ پر ایک سرسری ہی نظر ڈال کر ٹریفک کی روانی کو بدترار رکھنے میں لگ گیا کہ ایک غریب حردروں کا خون ہوا تھا، کسی امیر زادے کا نہیں کہ تمام پولیس حرکت میں آجائی۔

بے چارہ نعیم خون میں لٹ پت سڑک پر تڑپا رہا اگر اس کو بدوقت طبی امداد مل جاتی تو شاید سانس کی ڈوری ٹوٹنے سے بچ جاتی مگر جانے حادثہ پر موجود لوگ صلاح مشورے کرتے اور ایک دوسرے کو اسپتال لے جانے کے مشورے دیتے رہے۔ اسی بحث میں نعیم کے دل کی دھڑکنیں دم توڑ گئیں۔ آنکھیں بے نور اور سانس منجمد ہو گئیں۔ یوں ایک غریب گھرانے کا واحد کفیل اپنی جواں سالہ بیوی شازیہ اور تیرہ سالہ سرداراں کو نسل آدم و حوا کی اس بستی میں اللہ کے آمرے پر چھوڑ کر اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

نبیاد کائنات کبھی رکا نہیں کرتی۔ ہزار آدمیاں آئیں لاکھ طوفان آئیں۔ آن گت غریب گھرانوں کے اکلوتے کفیل مرتے رہیں محروقت کا پھینا نذر کا ہے اور نہ ہی رکے گا۔ روزِ اول سے آج تک بے شمار حادثات ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر کروڑوں وقت ایک لمحہ کو بھی نذر کی کہ حکم ربی یہی ہے۔

سرداراں کی ماں شازیہ کا سہاگ اجڑ جانے سے بھی وقت کا کارواں نذر کا بلکہ اپنی مخصوص رفتار سے دھیرے دھیرے چلتا رہا اور ہر آنے والا دن شازیہ کی مالی مشکلات میں اضافہ کرتا رہا۔ کچھ دن تو خیر حضرات کی میڈیا کی زیر نگرانی سخاوت کا سلسلہ چلا رہا تھا پھر سچائیوں کے رشحات قلم کو اور کئی موضوعات مل گئے۔ اس طرح خیر حضرات کی

تصاویر اور حادثات کی کہانیاں دم توڑنے لگیں تو انہوں نے بھی حادثات سے ہاتھ کھینچ لیا کہ اب ان کی حادثات کے قصے اور وال آنے کی خلیاں وینے کی تصاویر اخبارات کی سرخیاں نہیں بن پاریں اور ان کے نزدیک کیا فائدہ ایسی حادثات کا جس میں ان کے رجعت زدہ چہرے اور مفلس و فاقہ کش لوگوں پر چھائی ہوئی عداوت کی تصاویر اخبارات کی ازیت نہ بنیں۔

اللہ رب العزت اپنی حقوق کو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے اور اپنی اس صفت کا ہلکا سا پرتو ان کو بھی بخش دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد دکھانا فرمان ہو، بدخیز ہواں میں دنیا بھر کے میوب ہوں لیکن ماں کی محبت پھر بھی کم نہیں ہوتی۔ ممتا کے موسم پر بھی خزاں نہیں آتی۔ اس کی محبت کا موسم بھی بدلا نہیں کرتا۔ شازیہ خود بخود کہہ سکتی تھی مگر سردارانِ فاقہ کر لے، یہ اسے گوارا نہ تھا۔

وہ پر بھی لکھی تو قحطی نہیں کہ کہیں ملازمت کر لیتی۔ چار دن چار اس نے لوگوں کے کمروں میں صفائی ستھرائی اور برتن دھونے کا کام شروع کر دیا۔ یوں ان بڑے لوگوں کے بچے بھی کھانے سے ان کے پیٹ کا دوزخ اور ان کی بیگمات کی اترن سے شازیہ اور سرداران کا تَن ڈھینے لگا۔ شازیہ کی محنت اور لگن سے کام کرنے کی بات شہر میں پھیل گئی اور لوگوں کی زبانوں سے ستر کرتے کرتے سینہ خور کے گھرانے تک جا پہنچی۔ چنانچہ انہوں نے ایک بھاری تنخواہ اور رہنے کے لیے خوب صورت سا دو کمروں کے سرونٹ کو ارٹھر کے عوض شازیہ کی خدمات حاصل کر لیں۔ شازیہ جو پہلے ہی گھر کے کرائے اور کام پر جاتے ہوئے نو عمر سرداران کو اکیلے گھر میں چھوڑنے سے پریشان رہتی تھی اس نے یہ پیشکش قبول کر لی اور اگلے ہی مہینے سینہ خور کی کوشی میں قحط ہو گئی۔

سینہ خور جدی پیشی رکھتے تھے۔ شہر میں ان کے کئی ملازے تھے۔ ایک پٹرول پمپ بھی تھا۔ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کے حصہ دار بھی تھے مگر اولاد کے معاملے میں انتہائی بدقسمت تھے، ان کی بیوی جوانی ہی میں کسی حادثے کے باعث مفایج ہو کر ویل جیٹر برزمر کی کاڈری کو کمپنٹ رہی تھیں۔ اتنی بڑی سیج و عریض کوشی میں ان دونوں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ تنہائی کا زہر دونوں کی رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ سینہ خور تو روح کے ستاروں سے گھبرا کر جیج ہی گھر سے نکل جاتے اور اپنے آپ کو کاروبار کے بمیلوں

اور دوست احباب کی محفل میں گم کر دیتے اور رات گئے واپس آتے مگر ان کی بیگم بھگت سارا سارا دن بولا بولا ہی سی ویل جیٹر پر ایک بھگی ہوئی روح کی طرح بھی ایک کمرے میں تو بھی دوسرے کمرے میں چکرنا ہی بھرتیں۔ اگرچہ گھر میں کام کاج کے لیے کئی ملازم تھے مگر بیماری کے باعث ان کے حراج میں ایک چڑچڑاہن اور دلچسپی میں نگر واپٹ سی آگئی تھی جس کی وجہ سے کوئی ملازم یا ملازمہ ان کے پاس آنے سے کتراتے تھے۔ اگر بھی بحالت مجبوری جاتا بھی پڑتا تو پہلی کوشش یہی ہوتی کہ وہ جلد از جلد جان چھڑالے۔

شازیہ کو کسی لیے بھاری تنخواہ اور زائد آسائش رہائش کی آفر دی تھی کہ وہ سوائے رات کے دن بیگم بھگت کے ساتھ رہے گی۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ شازیہ سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ ان سے بھی کئی گنا زیادہ ان کی توقعات پر پورا اترتی تھی اور تو اور خود بیگم بھگت جسے کوئی ملازم یا ملازمہ پسند نہ آتی تھی، شازیہ کے کہن کاغذ نہ کھٹکتے تھے۔ بروقت رفع حاجت، وقت پر کھانا، منہ ہاتھ دھلانا، صاف ستھرے کپڑے پہنانا، ادویات کھلانا، ان کے منظرِ صبح کی باش کرنا، کمرے کی صفائی ستھرائی، لان میں لگے ہوئے تازہ پھولوں سے صبح صبح تازہ گلہ سجادہ کر کے بیگم بھگت اور سینہ خور کے مشترکہ کمرے میں رکھنا، غرض یہ کہ وہ کون سا کام تھا جو اس نے اپنے ذمے نہ لے لیا ہو۔ وہ بیگم بھگت کے میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوئی، خشک کر کے استری کرتی اور انہیں فیکٹری میں لٹکاتی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اور سردارانِ قاریغ ٹائم میں ان کے قریب بیٹھ جاتیں اور دُعا جہان کی باتیں کرتی رہتیں اس طرح بیگم بھگت کا دل بہلا رہا تھا۔

تنہائیوں کی باری بیگم بھگت تو جیسے دوبارہ جی اٹھیں۔ وہ کوشی جس کے درو دیوار ہمہ وقت قبرستان کی سی ویرانی اور خاموشی کا منظر پیش کرتے تھے۔ اب بیگم بھگت کے سر پہ لٹھروں اور شازیہ و سرداران کی ہر اہی میں باتوں سے گونجنے لگے۔ برسوں سے اس وسیع و عریض خزاں رسیدہ کوشی پر گویا بھار اپنے پورے جو بن سے آگئی تھی۔ اگر شازیہ بیگم بھگت کے میلے کپڑے دھو رہی۔ بی بی یا استری کر رہی ہوتی تو سرداران بیگم بھگت کو ویل جیٹر پر بٹھاتی اور ان کی ویل جیٹر دھکیلے ہوئے انہیں پوری کوشی تمنا کی، لان میں لاتی۔

یتیم گھت نے اس کی محبت اور خدمت گزاری سے متاثر ہو کر سیٹھ خیر سے کہہ کر اس کے لیے گھر میں ہی لیڈی ٹیچر کا انتظام کر دیا۔ یوں سرداراں نے عمر کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی مدارج بھی عبور کرنا شروع کر دیے۔ یوں اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے اس نے میٹرک کر لیا۔

من کی سچائیاں تن کو خوب صورت بنا دیا کرتی ہیں۔ دل اور کردار پاک صاف اور سچے ہوں تو ان کی پرچائیاں چہروں پر ایک پاکیزگی کی ایک کشش انگیز خوب صورتی عطا کر دیا کرتی ہیں۔ یہ حیا آلود حسن اتنا سحر انگیز ہوتا ہے کہ بڑے بڑے عابد و زاہد کی برسوں کی ریاضت و عبادت کو ان واحد میں تار و عنکبوت بنا دیا کرتے ہیں۔

سرداراں کی زندگی غربت و افلاس کی چلی میں بہتے ہوئے گزری تھی۔ ع۔ طور پر غریب گھرانوں کے بچے اکثر بے راہ روی کا شکار ہو جایا کرتے ہیں مگر سرداراں اس لحاظ سے منفرد تھے کہ نہ تو غربت و افلاس کے اندھا دلوں میں اس کا کردار ڈھنگا یا اور نہ ہی سیٹھ خیر اور یتیم گھت کی محبت اور امداد سے اعتماد نے اسے بھگایا۔ کردار پاکیزگی اور حسن کی سچائی نے چڑھتی جوانی میں اس کے چہرے، اس کے خدو خال میں سحر انگیز حسن پیدا کر دیا تھا۔

سیٹھ خیر پچاس کے لیے میں تھے۔ بیوی کی بیماری نے انہیں جذباتی لحاظ سے وقت سے پہلے پورے حاکم کر دیا تھا کیونکہ وہ بیوی سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اس لیے ادھر ادھر جھانکنے اور منہ مارنے کی بھی کوشش نہ کی مگر ایک روز سرداراں کو بغیر روپے اور گردو پیش سے بے نیاز یتیم گھت کی دہلی چیمبر تھا سے لان میں کھینچے ہوئے دیکھا تو برسوں سے جذبول پر لگائے گئے مضبوط نفل گویا آن واحد میں ٹوٹ کر زمین بوس ہو گئے۔ برسوں سے رومان پرور احساسات سے عاری مردہ دل کیف آگئیں جذبات سے دھڑکنے لگا مگر خاندانی آدمی تھے۔ سمجھ رہا تھا کہ ان کی سرشت میں نہ تھا اس لیے تجزی سے نظریں جھکا کر باہر نکل گئے مگر دل تھا کہ ایک نئے نئے بچے کی طرح سرداراں جیسے خوب صورت کھلونے کو بار بار دیکھنے کے لیے چل رہا تھا۔

سیٹھ خیر کا سارا دن اکثر باہر ہی گزرتا تھا۔ رات کو بھی دیر گئے واپس ہوتی تھی۔ یتیم گھت کی معذوری نے انہیں اپ سب کچھ کر دیا تھا مگر اس روز کے بعد نہ گھر سے باہر دوست احباب میں دل لگانا نہ کاروبار وغیرہ میں دلچسپی

محسوس ہوتی۔ بس بن پانی کی پھلی کی طرح بے تاب دے قرار سے پھر رہے تھے۔ سرداراں کا خوب صورت سراپا انہیں کسی متناہی کی طرح اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ دوست احباب سے سیٹھ خیر کی بے پے تالی دے قرار ہی چھٹی نہ رہ سکی مگر استفادہ اس لیے نہ کیا کہ وہ یتیم گھت کی بیماری اور معذوری سے بخوبی واقف تھے۔ اب وہ وقت سے پہلے ہی گھر آنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنے جذبول پر پھر سے بٹھانے کی اذ حد کوشش کی مگر جذبات بھی پابند سلاسل نہیں ہوا کرتے۔ لاکھ مصلحتوں کی زنجیریں پھٹاؤ، ہزاروں تاویلوں کے مضبوط بندھان کے تیز دھماکوں کے آگے باندھ دو، یہ اپنے اظہار کے لیے نہیں نہ نہیں سے کسی بھی طریقے سے اپنے اظہار کا چور راستہ نکال ہی لیا کرتے ہیں۔ سیٹھ خیر نے بھی اپنی آنکھوں، اپنے جذبول اور اپنے دل کی تسکین کے لیے چور راستہ ڈھونڈ لیا۔

سیٹھ خیر اور یتیم گھت کی خوابگاہ شادی والے دن سے لے کر اب تک ایک ہی تھی۔ باوجود یتیم گھت کی بیماری کے انہوں نے اپنی خواب گاہ نہیں بدلی تھی۔ انہیں یتیم گھت سے بے حد محبت تھی اس لیے رات کو اگر یتیم گھت کو کسی چیز، کسی میڈیسن وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو وہ خود ہی اٹھ کر ہر ضرورت پوری کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ گھر سے باہر کم اور گھر میں یتیم گھت کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے اور بھانے بھانے سے سرداراں کو بلا کر یتیم گھت کے بارے میں یونہی ہدایات دینے لگتے۔ سرداراں، یتیم صاحبہ کے لیے سوپ لادو۔ سرداراں، یتیم صاحبہ کے سر کا مساج کر دو۔ سرداراں، یہ کر دو، سرداراں وہ کر دو۔

اپنے بارے میں اتنی قدرتی دیکھ کر یتیم گھت خوشی سے نہال ہو جاتیں۔ وقت کا کارواں خوشنور ہا۔ سیٹھ خیر مکمل طور پر سرداراں کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے مگر یہ محبت یک طرفہ اور خاموش تھی۔ سرداراں ہر طرف سے بے خبر پوری دل جمعی سے یتیم گھت کی خدمت اور بیمار داری کر رہی تھی۔ شاز یہ بھی بڑی تندی سے یتیم گھت کا خیال رکھ رہی تھی مگر یہ خدمت اب صرف اور صرف کپڑے دھونے اور یتیم گھت کی صفائی سترائی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ برسوں سے معذوری کی زندگی گزارنے والی یتیم گھت کا بیچام اجل آیا۔ رات کو ان کی آنکھ کھلی تو پھر بھی نہ کھلی۔ بائیس سالہ رفاقت آن واحد میں

نوٹ گئی۔

سیٹھ خوبر کو اپنی محبوب شریک سزیم گھٹ سے کتنی شدید محبت تھی۔ کسی کو تو کیا ان کو خود بھی اور اک نہ تھا۔ باوجود اس کے کہ آخری دنوں میں ان کے دل کے سنگساں پر سرداراں چپکے چپکے براہجان ہوئی تھی مگر بیوی کی دائمی جدائی پر وہ یوں بچوں کی طرح بھوٹ بھوٹ کر روئے کہ ہر کس و نا کس کو رلا کر رکھ دیا۔ ان کو تسلیاں دلا سے دینے والے اس کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگتے۔

سیٹھ خوبر کا منہ بھر انتہائی محنتی اور اپنے مالک کا مکمل وفادار تھا۔ اس نے مکمل طور پر ان کے تمام کاروبار اور دیگر ذرائع آمدنی کے تمام معاملات انتہائی ایمانداری اور دیانت داری سے نبھائے اور جب سیٹھ خوبر پر سے غم کا بوجھ ہٹا تو تمام کا تمام حساب کتاب اور ان کی تفصیل سیٹھ خوبر کے سپرد کر دیں۔

شاز یہ کو تنگ گھٹ کے لیے رکھا گیا تھا۔ اب وہ رہی نہیں اس لیے ایک روز مناسب سا موقع دیکھ کر شاز یہ نے سیٹھ خوبر سے جانے کی اجازت مانگی تو ایک دم جیسے سرداراں کا خوب صورت سراپا ان کے ذہن کی اسکرین پر پوری دھانیوں سے رقص کرنے لگا اور وقتی طور پر بھولی بری سرداراں کی فتنہ محبت پوری شدت سے ان کی کس کس میں لہو بن کر دوڑنے لگی۔

”مگر آپ کیوں یہ ملازمت چھوڑنا چاہتی ہیں؟“ سیٹھ خوبر نے انتہائی شائستگی سے استفسار کیا۔

شاز یہ نے سر جھکا کر اس لہجے میں جواب دیا۔
”مالک ہمیں اللہ بخشے بیگم صاحبہ کی خدمت کے لیے ملازم رکھا گیا تھا اب جب کہ وہ نہیں رہیں تو کچھ مناسب سائیں لگنا کر ہم یہاں پڑے رہیں۔“

سیٹھ خوبر کچھ دیر تک پریشان نظروں سے سر جھکائے کڑی شاز یہ کو دیکھتے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں پھر جیسے ایک نتیجے پر پہنچے ہوئے ایک طویل سانس لے کر بولے۔ ”آپ نے اور سرداراں نے تنگ گھٹ کی بہت خدمت کی۔ نہ صرف میں بلکہ وہ خود بھی آپ سے بہت خوش تھیں اس لیے آپ کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی سابقہ نواہ اور دردی کئی تمام مراعات برقرار ہیں گی اور آپ کی تمام تر خدمات بیگم صاحبہ کے مرنے کے بعد بھی انہی کے لیے وقف رہیں گی۔ مثلاً قبرستان جا کر ان کی قبر

سید آل رضا کے خاندانی حالات

سید آل رضا کے بزرگ ایران سے برصغیر آئے تھے۔ ان کا خاندان بادشاہ قادار محزون تھا۔ علم و دانش کی وجہ سے اس خاندان کے تمام افراد احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مرزا غالب کی طرح آل رضا کے آباد اجداد کا پیشہ بھی ہشما پشت سے سپرہی تھا۔ سید آل رضا کا سلسلہ نسب حضرت امام علی رضاؑ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید محمود رضوی نیشاپور سے ہجرت کر کے داروہندوستان ہوئے تھے۔ شیر شاہ سوری نے جب غلی بادشاہ ہمایوں کو قوچ کے مقام پر شکست دلائی تو اس موقع پر ہمایوں کے بھائی کامران نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ مارواڑ کے راجا مال دیو نے بھی مدد دینے سے انکار کر دیا، چنانچہ ہمایوں نے ایران کی راہ لی۔ ایران جانے کی وجہ یہ تھی کہ مغول اور ایرانی حکمرانوں کے درمیان ہمیشہ خوفناک رہے تھے۔ اس زمانے میں شاہ ملہا سب دہاں کا بادشاہ تھا۔ ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں اس سے فوجی مدد کی درخواست کی، چنانچہ ملہا سب نے دس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر ہمایوں کے سپرد کر دیا۔ انہی لوگوں میں سید آل رضا کے جید اجداد سید محمود رضوی بھی تھے جو ہمایوں کے ساتھ نیشاپور سے ہندوستان آئے۔ سید محمود رضوی یہاں آنے کے بعد مختلف شہروں میں قیام پذیر رہنے کے بعد بالآخر ضلع اناؤ کے مردم نگر شہر موہان میں مستحکم آباد ہو گئے۔

مرسلہ: قائم مہدی۔ کراچی
ولی محمد طوقان نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء اردو شاعری سے کی۔ انہوں نے اردو شاعری کی ابتداء کب کی اور کب تک نظم یا غزل کو اپنی ہی اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی شوق شہادہ تو نہیں البتہ ان کا شروع کرنا جاسکتا ہے کہ وہ 1934ء سے پہلے اردو میں شعر کہنا شروع کر چکے تھے۔ اس لیے کہ اسی سال انہوں نے مولانا ظفر علی خان کے اخبار ”زمیندار“ میں اشاعت کے لیے ایک نظم بھیجی تھی جو راستے ہی میں سی آئی ڈی کے اہلکاروں نے روک دی تھی۔ اس نظم کے بارے میں ذہین العابدین عابد نے لکھا ہے کہ طوقان مرحوم نے یہ نظم ڈاکٹر خان صاحب کے بیٹے عبید اللہ خان کی بھوک ہڑتال پر لکھی تھی۔

مرسلہ: سلمان اچکزئی۔ پشاور

جس سے ڈر کر اور گھبرا کر شازبہ نے سرداراں کا رشتہ چھپاس سالہ سیٹھ خویر کے لیے منظور کر لیا۔ اس طرح زندگی بھر بیگم بخت سے محبت کا دم بھرنے والے سیٹھ خویر نے بیگم بخت کے مرنے کے چھ ماہ بعد ہی سرداراں سے شادی کر لی۔

شازبہ شاید سرداراں کے ڈولی میں ہی بیٹنے کی منتظر تھی اس لیے بیٹی کی شادی کے محض چھ ماہ بعد ہی وہ بھی بیگم بخت آرا کے پہلو میں جاسوئی۔

☆.....☆

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ سیٹھ خویر جدی پشتی رئیس تھے شہر بھر میں ان کے کئی ملازے تھے۔ ایک پیڑول پپ بھی تھا مگر اولاد کے معاملے میں انتہائی بد قسمت تھے۔ بیگم بخت آرا کی بیماری اور محذوری کے باعث ابھی تک لاولد تھے۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی اس وسیع و عریض کوٹھی اور اتنے بڑے کاروبار جایداد کا کوئی وارث نہ ہونے کے باعث دولت جایداد اغیار کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔

مگر اللہ رب العزت کا ایک اپنا نظام ہے۔ وہ جب کسی کام کے لیے لفظ ”کن“ (ہو جا) فرماتا ہے تو کائنات کی ہر شے اس حکم رکنی کے اس کن کو ٹیکھ کر (اور ہو جاتا ہے) کرنے کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ متحرک ہو کر ٹیکھ کر بچا لاتی ہے۔ سیٹھ خویر نے بھی رات کی تنہائیوں میں، دن کے اجالوں میں کبھی اولاد کی سچے دل سے دعا مانگی ہوگی۔ اولاد جو بیگم بخت آرا کی گود کا حصہ تو نہ تھی مگر وہی اولاد دوسرے سرداراں کی گود میں ڈال دی اور اولاد کی محرومی بھی یوں دور ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے تین بیٹے سرداراں کی گود میں ڈال دیئے۔

مالک کے کھیل مالک ہی جانتا ہے۔ کہاں سیٹھ خویر جو عہد شباب میں اولاد کے لیے ترستے رہے مگر باپ نہ بن سکے اور اب جب کہ وہ چھاس سال کے لیٹے میں تھے اور اولاد سے تقریباً پانچ سو چھ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نہیں، دو نہیں بلکہ تین تین صحت مند بچوں سے نوازا۔

سیٹھ خویر کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دن رات خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھے۔ انہوں نے غرباء کے لیے اپنی تجوری کا منہ کھول دیا۔ دل کھول کر مستحقین اور غریب غرباء میں خیر خیرات تقسیم کی۔ سرداراں سے انہیں محبت تو پہلے ہی تھی مگر اب یہ محبت شدید ترین ہو گئی۔ انہوں نے اپنی زندگی

بیکر جمہرات کو دیا جانا، ان کی قبر اور ان کے کمرے کی صفائی سہرائی کرنا وغیرہ۔ آپ دونوں کی موجودگی مجھے بیگم صاحبہ کی یاد دلانی رہے گی۔“ اتنا کہہ کر سیٹھ خویر خاموش ہو گئے۔ ان کے دل میں دراصل سرداراں کی محبت کا چور تھا کہ شازبہ ان کی باتوں سے ان کے دل کا چور نہ چلا لے مگر بھولی بھالی شازبہ ان کے دل کی حالت سے بے خبران کی اس نفاضانہ پیشکش سے انتہائی متاثر ہوئی اور خوشی وہاں رہنے کی ہامی بھری۔

مرد کتنا ہی شریف انفس اور اپنی بیوی کا وفا دار ہو اس سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا ہی کیوں نہ ہو مگر اپنے جیون سماجی کے مرتے ہی اس کے اندر کا خفتہ ہر جاتی پن بھر پور اٹھرائی لے کر یوں بیدار ہو جاتا ہے کہ بیوی کی زندگی میں اس سے کیے گئے سارے قول و قرار، سارے عہد و پیمان، سارے وعدے و وعید بھول جاتا کرتا ہے اور اگر محو نظر سرداراں جیسی نوجنر اور شاداب کلی ہو تو انسان برسوں پرانی رفاقتیں بھی بھول جاتا ہے۔

سیٹھ خویر بھی کہتے ہی اپنی مرحومہ بیوی سے محبت کرنے والے ہی کیوں نہ ہوں مگر اب وہ ان سے تمام رشتے، تمام رفاقتیں تو ذکر منوں مٹی تلے جاسوئی تھیں۔ سیٹھ خویر سمجھتا تھا کہ شریف انفس تھے۔ سرداراں سے وقتی وصل کی بجائے اس سے دائمی، قانونی اور شرعی رشتہ جوڑنا چاہتے تھے اس لیے ایک دن انہوں نے شازبہ سے سرداراں کا رشتہ مانگ لیا۔

مجبوریوں کے بوجھ بہت بھاری اور بسا اوقات بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ بے بس اور مجبور لوگ بسا اوقات مجبوریوں کے ہاتھوں اس حد تک بے بس اور لاچار ہو جاتے ہیں کہ وہ فیصلے بھی کر لیتے ہیں جن کے بارے میں وہ عام طور پر سوچ بھی نہیں سکتے۔ شازبہ کے سر پر اپنی جوان بیٹی سرداراں کا بوجھ تھا اور ابھی تک اس خوب صورت ہیری پر نہیں سے بھی رشتہ کا پتہ نہیں آیا تھا اور آنے کا دور دور تک کوئی امکان بھی نہ تھا۔ بھلا جس جوان سالہ لڑکی کی ماں گھر میں کام کرنے والی ماسی ہو۔ جس کے نصیبوں کا لیکھ مالکان کا جھمونا اور بچا کھچا کھانا اور جن کا نصیب دوسروں کی اترن اور پرانے کپڑے ہوں۔ اس افلاس زدہ گھر کے میں ایک خوب صورت ہیری بھی ہو تو وہاں رشتوں کے چتر کم اور ہوس کے انگارے زیادہ برسا کرتے ہیں۔ یہی وہ مجبوری تھی

نئے سال کا تحفہ خوب صورت اور پراثر تحریروں سے مرصع جنوری 2019ء کا دلکش شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لئے

افتتاح سراج

کے خوب صورت انماز و بیان کا عکاس سلسلے دار ناول

پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

کادل نہیں اٹھتا

پاکیزہ

افسان آفریدی اور سحر ساجد کے نئے سلسلے دار ناول ایک نئے انداز میں

ہوا بخاری..... محبت لفظ ہے لیکن کی کہانیاں سمیٹے ہوئے

دردانہ نوشین خان..... کا چھوٹے موضوع پر لکھا ناول..... صنفہ

عقلمند حق اور شبینہ گل کے دلچسپ ناول

شمع ہدایت میں پڑے اختر شجاعت کا ایک اور پراثر تحقیقی مضمون پردہ پوشی..... صفت الہی

پاکیزہ کے مہمان میں

شائستہ زریں لائی ہیں اداکار

وہاج علی اور بیگم ثنا وہاج کی

زندگی کے حسین راز

اس کاغذ پر

شمیم فضل خالق، نزہت جبین ضیا،

اسما طاہر و دیگر رائٹرز کی حسین کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ مثبت معلومات و تفریحی عناصر سے مزین و مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

میں ہی اپنی ساری جائیداد، پیٹروئل پمپ پلازے اور دولت وغیرہ سرداراں کے نام کر دی۔ سرداراں جو اس وسیع و عریض کوٹھی میں ایک گھریلو کام کاج کرنے والی ماسی کی بیٹی کی حیثیت سے آئی تھی۔ اب اس کو بھی اور صاحب جائیداد ہو کر بھی ذرا سانسہ بدلی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ منکسر الموائج بن گئی۔

☆.....☆

بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ ماہ و سال کا کارواں بھی جو سفر رہا۔ سیٹھ خوبرو عمر کی بیڑیاں طے کرتے کرتے بڑھاپے کی ان ٹنگ وادیوں تک آن پہنچے۔ جہاں موت کا گھورا غمیرا ہوتا ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ تینوں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن تینوں کی دلچسپی تعلیم میں ذرہ برابر بھی نہیں تھیں۔ مارے مارے میزگر کر کے کالج تک پہنچے ضرور لیکن دلچسپی کی کمی نے انہیں تعلیم سے مزید دور کر دیا۔ بڑھاپے کی اولاد کی اس لیے باپ جتنی سے کر بڑاں رہا۔ ماں کے اندھے پیار اور دولت کی ریل تیل نے بھی اثر دکھایا نتیجتاً ان کے کردار میں بہت حد تک بگاڑ پیدا ہو گیا۔ بدہنرمیزی کی حد تک خصوص ہو چکے تھے۔ سیٹھ خوبرو اگر کبھی کسی وجہ سے ان پر جتنی کرنا چاہتے تو سرداراں و سرداران میں آجانی اور درد خاموش ہو جاتے۔ انہوں نے تینوں کے جب خرچ باندھ رکھے تھے لیکن ماں چپکے چپکے گڈیوں پر گڈیاں دے دیتی۔ جب میں پیدا ہوا تو اندھے راستے فوراً اپنی طرف مٹچ لیتے ہیں۔

سیٹھ خوبرو ایک روز اپنے آفس میں اپنے معمول کے کام سرانجام دے رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا۔ یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ جب تک ان کو اسپتال لے جایا جاتا سانسوں نے بے وفا کی کر دی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ سیٹھ صاحب کے مرتے ہی تینوں کی بے راہ روئی بڑھ گئی۔ کالج کے فضاؤں نے توان کی جوانی کے پردوں کو وہ قوت پرداز عطا کی تھی کہ انہیں کتنا آلود جہالوں کی سیر اچھی لگنے لگی۔ روپے کی کمی تھی نہیں اس لیے وہ تیزی سے اندھے راستے پر دوڑنے لگے۔

سیٹھ خوبرو اپنی جائیداد، کاروبار اور بینک میں جمع شدہ رقم سرداراں کے نام کر گئے تھے۔ تینوں نے بار و محبت اور دیگر حیلے پھالوں سے کاروبار و جائیداد اپنے نام کر دیا پھر ماں باپ کے قابل مہر و مہر و فادادوں کو نکال باہر کیا اور خود سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔

ممتا کی ماری ماں سب کچھ بیٹوں کے نام کر کے بے حد مطمئن تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اس کے مرنے کے بعد بھی تو یہ سب کچھ اس کے بیٹوں کا ہی تھا کیا ہوا جو اس نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی میں ہی ان کے نام کر دیا۔ اب اس کی ساری دنیا صرف اس خواب گاہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کے خوب صورت ایام اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے۔

ہوس، دولت کی ہو، شہرت کی ہو یا جنس مخالف کی یہ وہ خونخوار عفریت ہوتی ہے جس کی آنتیں کبھی سرد نہیں ہوا کرتیں۔ شرجیل، راجیل اور کبیر بھی ہوس کے بھوکے عفریت تھے انہوں نے چپکے چپکے جائیداد کو بیچنا شروع کر دیا کیونکہ بینک اکاؤنٹ خالی ہو چکا تھا۔ بیٹوں کی بیویاں بھی اسی روش پر چل رہی تھیں۔ فیشن، کپڑے، پارٹیاں اسی کے گرد ان کی زندگی گھوم رہی تھی۔ آنے والے کل کا سوچے بغیر وہ سب خرچ کر دیتے تھے۔ آمدن کے نام پر فیکٹری سے جو کچھ آتا وہ کم ہونے لگا تھا تینوں نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ فیکٹری کو بھی بیچ دیا جائے۔ فیکٹری بیچ کر تینوں بھائی خوش تھے۔ ایک ہی سال میں جب سب کے لیے ختم ہوئے تو انہیں غلطی کا احساس ہوا لیکن اب کوئی راستہ بچا نہیں تھا مجبوراً انہیں بنگلہ بھی بیچنا پڑا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ تینوں اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ الگ ہو جائیں گے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ سرداراں کہاں رہے گی۔ اس مسئلے کا حل یہ نکلا کہ انہیں اولڈ ہاؤس منتقل کر دیا جائے۔ انہوں نے سرداراں سے کہا آپ اس کیلئے کیسے رہیں گی، نوکروں پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے اس لیے سوچا ہے کہ آپ کو اپنے ایک دوست کے پاس چندہ دنوں کے لیے چھوڑ جاؤں وہاں آکر لے آؤں گا۔“

ممتا کی ماری اولاد کی غریب کاری سمجھ نہ سکی اور ان کے ساتھ نکل پڑی۔ جائیداد کے لالچ میں وہ ماں کو اس دارالامان میں لے آئے۔ وہاں داخل کردانے کے بعد اس دارالامان کو ایک بڑی رقم بطور صلہ بھی دی۔ ساتھ ہی اس ادارے کی ختم اعلیٰ کو یہ سمجھا گئے تھے کہ ان کی ماں زندگی کی آخری سانسوں تک یہیں رہے گی۔

جب سے سرداراں کھڑکی پر نظر جمائے بیٹوں کا انتظار کر رہی ہے۔

۷۷



URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdutube.com

بھول

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!

یہ دنیا واقعی ایک اسٹیج ہے، ڈرامے کا اسٹیج اور یہاں جتنے بھی لوگ ہیں، بس اداکاری کیے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر روز ایک نیا ڈراما نظر آتا ہے۔ زندگی کے اسٹیج پر نادیہ اور فضل دین نے بھی ایک عجیب و غریب کردار ادا کیا۔ نوید تو حقیقی اداکار تھا اس کا کردار بھی ملاحظہ کریں۔

محمد فاروق انجم
(فیصل آباد)

انداز کر دیا لیکن انہیں پھر لگا جیسے کسی نے واقعی دروازے پر ہلکی دھک دی ہے۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر کے سب افراد جھٹ پر سو رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے دروازے تک پہنچے، پہلے انہوں نے دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی پھر

تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد فضل الدین جامہ ہمارے براجمان سٹیج میں مشغول تھے کہ ان کو لگا جیسے کسی نے دروازے پر ہلکی سی دھک دی ہے۔ تجربہ کامیاب تھا اور گری ہونے کی وجہ سے وہ گھر کے صحن میں ہی عبادت کر رہے تھے۔ فضل الدین نے اسے اپنا وہم خیال کرتے ہوئے نظر

باہر سے گھبرائی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ ”مم..... میں ہوں نا دوسرے.....“

تھی۔“ نادیدہ نے دھیمے لہجے میں انکٹے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”دو سنی آگے بڑھی اور ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ میں جانتی تھی کہ میرے گھر والے اس سے میری شادی کے لیے نہیں مانیں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ میری معنی میرے ماموں زاد کے ساتھ ہو چکی ہے۔ ہم نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا اور جب سارے گھر والے سو گئے تو میں بیٹھک کا دروازہ کھول کر کچھ سامان لے کر گھر سے نکل پڑی۔ جس جگہ ہم نے ملنے کا فیصلہ کیا تھا میں وہاں پہنچ کر نوپے کا انتظار کرنے لگی۔ دو گھنٹے گزر گئے اور وہ نہیں آتا۔“

نادیہ کہہ کر چپ ہوئی۔ فضل الدین اس کی بات سننے
 ہوئے بے چین ہی نہیں بلکہ رنجیدہ بھی ہو رہے تھے۔ ان
 کے چہرے سے صاف عیاں تھا جیسے وہ بتا چکے کہہ کر رہے
 ہوں کہ یہ تم نے کیا کیا۔ نادیہ پھر اسی انداز میں
 بولی۔ ”انتظار کے بعد میں نے واپس گھر جانے کا فیصلہ
 کیا۔ میں چپ چاپ بیٹھک کے کلمے دروازے سے اندر
 جا کر اپنے بستر پر لیٹ جانا چاہتی تھی تاکہ کسی کو میرے جانے
 کا علم ہی نہ ہو لیکن جب میں دروازے کے پاس پہنچی تو
 دروازہ بند تھا۔ ابابھی تہجد کے لیے اٹھے ہیں شاید انہوں نے
 دروازہ کھلا دیا کہہ کیا تھا۔ میں دروازہ کھٹکھٹا نہیں سکتی تھی اس
 لیے میں آپ کے پاس آ گئی۔ مجھے معلوم تھا آپ اس وقت
 تہجدی نماز کے لیے جاگ رہے ہوتے ہیں۔“

”یہ تم نے کیا کرو یا میری بچی..... یہ کیا کرو یا..... یہ
 کیا کرو یا.....؟“ فضل الدین کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ
 بھی رودیں گے۔

”تایا جی مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ دلہن سے نکلا رات کے اندر میرے میں میرا قدم میرے گھر والوں کی عزت پر سیاہی پھیر دے گا مجھے اس کا احساس بعد میں ہوا..... تایا جی میرے گھر والے میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں مجھے نہیں معلوم..... لیکن میں اپنے کیے کی معافی مانگ کر رات کے اندر میرے میں اپنے اٹھے ہوئے قدم کو رات کی سیاہی میں مٹا کر چپ چاپ اپنے مگیترے شادی کرلوں گی۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں وہ آپ کا کہا رو نہیں کرتے۔“ نادیہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھ فضل الدین کے سامنے جوڑ دیئے تھے۔

فضل الدین کی اپنی حالت خراب ہو رہی تھی۔ نادیر کا

فضل الدین رات کے اس پہر اور سکوت میں نادیدہ کی آواز فوراً پہچان گئے۔ انہوں نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر دیکھا تو سامنے چادر پہلے نادیدہ کھڑی تھی۔ اس کے پیروں میں جھونپٹیاں بڑا ہوا تھا۔ فضل الدین نے نادیدہ کے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ ایک سیلی ہی کھڑی تھی۔

”نادیدہ بیٹی..... تم اس وقت..... ایک سیلی..... خیر تو ہے؟“ فضل الدین نے پریشان آواز میں پوچھا۔

”چچا جی اندر آ جاؤں۔“ تاویہ نے اجازت چاہی۔
فضل الدین نے فوراً دروازہ چھوڑ دیا۔ ”ہاں ہاں
اندر آ جاؤ۔“

نادیہ نے اپنا بیگ پکڑا اور اندر چلی گئی۔ فضل الدین نے دروازہ بند کر دیا۔ ان کی سوالیہ نگاہیں نادیہ پر مرکوز تھیں۔ وہ پریشان تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ نادیہ اس وقت کئی کبھی آئی ہے۔

”مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ تم اس وقت اکیلی کیوں آئی ہو۔ مگر میں سب خیریت ہے؟“ فضل الدین مضطرب تھے۔

نادیہ ان کے سامنے سر اور نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کچھ کہنے کے لیے شاید ہمت کو یکجا کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر بولنے کی سخت محدود ہو گئی ہے۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔ ”میں کمر..... بغیر بتائے آئی ہوں۔“

”کیوں.....؟ کمر سے اس وقت بغیر بتائے آئی ہو..... مگر کیوں؟“ فضل الدین کی حیرت دوچند ہو گئی۔

نادیہ بھرچپ ہوئی اور مجھ کو کہنے کے لیے الفاظ کا چناؤ کرنے لگی اور ہمت کر کے بمشکل بولی۔ "میں..... بیٹسٹا چاہتی ہوں۔"

”ہاں تم ادھر بیٹھا جاؤ۔“ فضل الدین کمرے کی طرف بڑھے۔ اندر جا کر انہوں نے پہلے کمر روشن کیا اور پھر پھر بکھا بیٹھ گیا۔ نادیہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور فضل الدین اس کے پاس بیٹھ کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ وہ سننے کے لیے مضطرب تھے جبکہ نادیہ اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے مل رہی تھی۔

”میری دوستی کالج آتے جاتے نوید سے ہو گئی

لے چلی گئیں۔ فضل الدین نے نادیر سے کہا کہ وہ بھی نماز پڑھے اور خدا سادہ مانا گئے..... اللہ بہتر سننے والا ہے۔

فضل الدین مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ واپسی پر وہ سید معراج احمد کے گھر چلے گئے۔ وہ بہت پریشان ہو گئے تھے کیونکہ معراج احمد مسجد میں دھکائی نہیں دیتے تھے۔

فضل الدین..... معراج احمد کے گھر پہنچے تو پورے گھر میں سناٹا اور اداسی نے اپنے منہ کاڑھے ہوئے تھے، ہر چہرہ اترا ہوا تھا اور کوئی بھی فضل الدین سے نظر نہیں ملتا رہا تھا۔

فضل الدین نے معراج اور اس کی بیوی کو الگ کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تینوں الگ کمرے میں بیٹھ گئے۔

فضل الدین نے پہلے دونوں کے اداس اور مہمائے چہروں کی طرف دیکھا اور بھر تایا۔ ”نادیر میرے گھر میں ہے۔“

فضل الدین کی بات سن کر دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور معراج نے پوچھا۔ ”وہ تمہارے گھر میں کیا کر رہی ہے؟“

فضل الدین نے وہ ساری بات دونوں کے گوش گزار کر دی جو نادیر نے انہیں بتائی تھی۔ دونوں میاں بیوی سننے رہے اور جب فضل الدین چپ ہوئے تو معراج بولا۔ ”میں نماز کے لیے اٹھا تو میری عادت ہے، دروازے بھی چیک کرتا ہوں۔ بیشک کا دروازہ کھلا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پورے گھر میں دیکھا کہ نادیر نہیں ہے۔ اس کی ماں نے مجھے بتایا کہ اس کا بیک اور کپڑے بھی نہیں ہیں۔ جب بیروں سے زے زمین کھلی تھی۔“

”معراج کچھ نہیں بکرا۔ کسی کے کانوں کان خبر نہیں ہے۔ وہ میرے گھر میں ہے اور میرے گھر میں تم سب کا آنا جانا ہے۔ تمہاری دیر کے بعد بھابی جی آئیں اور نادیر کو لے آئیں۔“

”نادیر کو ہم گھر لے آئیں؟“ معراج نے فضل الدین کی طرف دیکھا۔

”اور کہاں لے کر جاؤ گے۔ میں گھر کی ہی بات کر رہا ہوں۔“ فضل الدین بولے۔

”اب وہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔“ معراج نے دو ٹوک کہا۔

ابا معراج احمد اس کے بچپن کا دوست تھا۔ خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود دونوں خاندانوں میں اتنے گہرے مراسم تھے کہ بعض اوقات خونی رشتے بھی ان کے سامنے نام ہو جاتے تھے۔ دونوں کے گھر ایک محلے میں دو گلیاں چھوڑ کر تھے۔ معراج کے بچے فضل الدین کو تپائی اور فضل الدین کے بچے معراج کو چچائی کہتے تھے۔

”میری بیٹی تم نے بہت بڑی بھول کر دی..... میں تمہارے باپ کو تم سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔ ایک بار جب اس کے ہونٹوں پر لٹاکا کا تالا لگا جاتا ہے تو پھر کسی معافی اور منت کی جا ہی اس کی شدہ آگے کام نہیں کرتی..... اور تمہارا بھائی وہ تو جلا دینے میں دیر نہیں لگا تا۔ ساری زندگی اس بندے نے صرف عزت کمائی ہے..... تم کو گھر میں نہ پا کر جانے اس کی سانس چل بھی رہی ہو گی کہ دلہن سے تمہارے باہر جاتے سیاہ بیروں کے نشان کو دیکھ کر ایک ہنگام کی نظر ہو گی ہو گی۔“

فضل الدین کی بات سن کر نادیر کرب سے بڑبڑا اٹھی۔ ”آپ ایسا نہ کہیں.....“

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی تو دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں فضل الدین کی بیوی ہاجرا ان کھڑی تھیں۔ فجر کی اذان مسجد میں ہو رہی تھی اور ہاجرا اٹھ کر نیچے آئیں تو انہیں لگے کہ کمرے میں ہاتھ ہو رہی ہیں۔ وہ دبے پاؤں دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ ہاجرا نے نادیر اور فضل الدین کے مابین ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی۔

”آؤ ہاجرا۔ دیکھو یہ احمق کیا کر آئی ہے۔“ فضل الدین نے کہا۔

”میں نے سب سن لیا ہے۔“ ہاجرا کا لہجہ خشک تھا۔

”اب بتاؤ میں کیا کروں؟“

”آپ اسے ابھی اس کے گھر چھوڑ آئیں۔“ ہاجرا نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”نہیں نہیں میں اسے ایسے نہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ فجر کی نماز کے بعد میں مسجد سے سیدھا اس کے گھر جاؤں گا اور معراج سے بات کروں گا۔ ان کا غصہ بخشتا کرنے کے بعد نادیر کو گھر چھوڑنے جاؤں گا۔“ فضل الدین نے سوچنے کے بعد کہا۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“ ہاجرا ان کہہ کر وضو کے

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ کیوں نہیں آئے گی۔“ فضل الدین جلدی سے بولے۔

”جو ہماری عزت روند کر رات کے اندھیرے میں چلی گئی وہ اب اس گھر کی دلیز میں نہیں آئے گی۔“ معراج کو غصہ آ گیا تھا۔

”معراج میری بات سمجھنے کی کوشش کرو ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ کسی کو کچھ نہیں پتا۔“ فضل الدین نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ سب کچھ ٹھیک ہے؟“ معراج نے فضل الدین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ فضل الدین بولے۔

”تمہاری نظر میں سب ٹھیک ہے تو پھر تم اسے اپنی بہو بنا کر اپنے گھر رکھ لو، یا اس کے نوے کر دو۔“ معراج کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ فضل الدین دم بخود اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ انہیں امید بھی نہیں تھی کہ معراج ایسی بات کہہ دے گا۔ فضل الدین نے معراج کی بیوی کی طرف دیکھا تو وہ بولیں؟

”انہوں نے جو کہہ دیا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کو جو بہتر لگتا ہے آپ کریں ورنہ مجھے ہمتاں میں خود اس کا گلا دبا دوں گی۔“

”بھابی آپ دل کو اتنا سخت نہ کریں۔“ فضل الدین بولے۔

”جس نے ہماری عزت کی پروا نہیں کی، ہم اس کی زندگی کی کیوں پروا کریں؟“ معراج کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس سے پہلے کہ فضل الدین کچھ اور کہتے معراج کمرے میں آیا اور صاف سے بولا:

”فضل الدین..... مجھے جلدی فیصلہ کر کے بتا دو کہ کیا کرنا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ کچھ نہیں بگڑا تو اسے اپنی بہو بنا لو..... اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اسے میرے سامنے لے آؤ، خدا کی قسم اگر اس کا گلا نہ دبا دوں تو میں اپنے باپ کی اولاد دوں گی۔“

بات بہت آگے چلی گئی تھی۔ دونوں مہاں بیوی اسے گھرانے کے لیے راضی نہیں تھے، اسے مارنے کے لیے معراج نے بہت بیوی قسم کھائی تھی اور فضل الدین کا پتہ کر رہ گئے تھے۔

تھوڑی دیر فضل الدین ساکت براجمان رہے اور پھر

اٹھ کر جانے لگے تو معراج نے پوچھا۔ ”فضل الدین..... آپ پر کوئی بوجھ نہیں ہے، آپ نے کہا تھا ابھی کچھ نہیں بگڑا تو میں نے کہا تھا پھر آپ اسے اپنی بہو بنا لیں ورنہ یہ میری خواہش نہیں ہے اور نہ میں ایسا چاہتا ہوں، آپ اسے میرے حوالے کر دیں میں اس کا گلا دبا کر اپنی قسم پوری کروں گا۔“

معراج کا بیٹا بھی کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ بھی کر کر رہے گا۔ فضل الدین کچھ نہیں بولے اور چپ چاپ گھر سے چلے گئے۔

☆.....☆

فضل الدین مرجھائے چہرے کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ہاجراں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ نادیاہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ فضل الدین کی آمد پر وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کڑی ہو گئی تھی۔ فضل الدین موڑے پر بیٹھ گئے۔ ہاجراں ان کی طرف دیکھتی رہی۔ جب وہ کچھ نہ بولے تو ہاجراں نے پوچھا۔

”کیا ہوا.....؟“ فضل الدین چمکے۔ ”وہ نادیاہ کو معاف کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔“

”ماں باپ کا دل دکھا ہے۔ ان کی بیٹی نے ان کی عزت پر ہیر رکھ کر گھر سے باہر ہیر رکھا ہے، وہ ایک دم کیسے معاف کر سکتے ہیں۔ ان کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ ہاجراں نے کہا۔

”نادیاہ کے باپ نے قسم کھائی ہے، وہ نادیاہ کو جان سے نہ ماریں تو وہ..... اس نے سخت قسم کھائی ہے۔“ فضل الدین معراج کے الفاظ و ہر باتیں سکا۔

”بھابی معراج اپنی بات کے بہت کہے ہیں۔ ایک بات جو کہہ دیں اس سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے۔ ماضی میں ان کی بہت سی باتیں ہمارے سامنے ہیں۔“ ہاجراں بولی۔

”معراج نادیاہ کو جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ وہ قسم کھا چکا ہے۔ قسم بھی ایسی کہ..... نادیاہ کا اب اس گھر میں جانا ناممکن ہے۔“ فضل الدین سوچوں میں متفرق تھے۔

”پھر اب کیا کرنا ہے؟“

”میں نادیاہ کو در بدر نہیں کر سکتا۔ میں اسے معراج کے حوالے بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسے جان سے مار کر خود چیل چلا جائے۔“

”توبہ ہم کیا کریں؟“

”اس کا ایک ہی حل ہے۔“

”کیا صل ہے؟“

فضل الدین کچھ کہنے سے پہلے سوچتا رہا جیسے وہ الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ وہ اپنی بیوی کو بھی خوب جانتا تھا اس لیے وہ معراج کے الفاظ دہرانے کی بجائے اپنی طرف سے حل پیش کرنا چاہتا تھا۔ ہا جراں مسلسل ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ان کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”معراج کا گھر بار دھوئے سے بچ جائے گا ورنہ وہ اپنی کئی بات کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد سے گزر جائے گا۔ ہم نادیہ کو اپنے گھر رکھ لیتے ہیں۔“ کچھ وقت کے بعد فضل الدین نے پھر کہا۔ ”ہم نادیہ کی اپنے بیٹے قیصر سے شادی کر دیتے ہیں۔“

ہا جراں نے سنا تو اپنی نظریں فضل الدین کے چہرے پر جمادیں۔ ہا جراں کی نظروں میں شدید احتجاج تھا، لیکن زبان چپ تھی۔ اسی اثنا میں قیصر آگیا۔ اس کے کان میں شادی کی بات پڑ گئی تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”کس کی شادی کی بات ہو رہی ہے؟“

”تیری شادی کی بات کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں معراج کی بیٹی نادیہ کا سیاہو تجھ سے کر دیں۔“ فضل الدین کے بولنے سے مل ہا جراں کو بولنے کا موقع مل گیا۔

”اباجی..... یہ خیال اچانک کیسے آپ کے دل میں آگیا۔“ قیصر نے پوچھا۔

”تیرے اباجی کے دل میں اچانک خیال نہیں آیا۔ نادیہ رات سے اس گھر میں ہے۔ گھر سے بھاگ کر کہیں جا رہی تھی۔ جس کے ساتھ بھاگ رہی تھی اس نے دھوکا دیا اور وہ یہاں آگئی۔“ ہا جراں نے آٹھ کر قیصر کو حقیقت بتادی تاکہ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے خبردار ہو جائے۔

قیصر نے فضل الدین کی طرف تھم رنگہوں سے دیکھا اور فضل الدین عجیب نظروں سے ہا جراں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قیصر کے آگے نادیہ کی حقیقت کھولی جائے۔ وہ رازداری کے ساتھ ہی قیصر کا نکاح نادیہ سے کر دینا چاہتے تھے تاکہ ان کے عزیز دوست کی عزت محفوظ رہ سکے۔

”کیا واقعی ایسا ہوا ہے اباجی؟ اگر نادیہ کو اس نے دھوکا دے دیا تھا تو وہ یہاں کیا کرنے آئی؟“ قیصر نے کہا۔

”اس لیے آگئی تاکہ تیرے ابا سے گھر چھوڑ آئیں۔“

اکیلی جانے سے ڈرتی تھی۔“ ہا جراں پھر بولی۔

”تم چپ بھی رہ لیا کرو۔ جو بات نہیں کرنی ہوتی وہ بھی کر دیتی ہوں۔“ قیصر سے مجھے بات کرنے دو اور تم ناشتا تیار کرو۔“ فضل الدین نے یکسوخت لہجے میں ہا جراں سے کہا۔ سبھی گھر والے فضل الدین کے غصے اور ان کے کیے ہوئے فیصلوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہا جراں چپ چاپ باورچی خانے میں چلی تو مٹی لیکن اس کے کان باہر تھے اور زبان احتجاج کے لیے مضطرب تھی لیکن فضل الدین کے سامنے بات کرنا مشکل تھا۔

”میرے ساتھ آؤ قیصر تم کو سمجھاتا ہوں۔“ فضل الدین اسے دوسرے کمرے میں لے گئے جبکہ نادیہ دروازے کے ساتھ کڑی آنسو بہاتی رہی۔

دوسرے کمرے میں لے جا کر فضل الدین نے بولے۔ ”نادیہ کی یہ نادانی تھی اور اس بھول کو اگر ہم معاف نہیں کریں گے تو اس کی زندگی تو خراب ہوگی ہی، اس کے گھر والوں کی دہلیز پر بھی طعنے کا سیاہ دھما پوری زندگی کے لیے لگ جائے گا۔“

”اباجی! نادیہ کی بھول کو اس کے گھر والے معاف نہیں کرنا چاہتے، وہ اس کی بھول کو نظر انداز کر کے پھر سے اپنے گھر میں لانا نہیں چاہتے تو ہم کیوں اس کی بھول کو معاف کر کے ڈھول نگے میں ڈالیں؟“ قیصر بولا۔

”معراج جذباتی آدمی ہے، وہ غصے کا تیز ہے اور اس کا غصہ اس سے کوئی بھی عافیت کر سکتا ہے۔ تم سے نکاح ہو جائے گا تو رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فضل الدین نے سمجھایا۔

”اباجی! میں ایسی لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا جو بد چلن ہو۔“ قیصر نے سمجھتے اور رکتے ہوئے اپنا فقرہ مکمل کر ہی لیا۔

فضل الدین نے سنا تو ان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے اپنا غصہ دبا کر کہا۔ ”تم نے اچھا لفظ استعمال نہیں کیا۔ نادیہ نے بھگ کر قدم اٹھا لیا، اس کے ساتھ دھوکا ہوا تو وہ کہیں اور جانے کے میرے گھر میں آگئی، اسے اپنی غلطی کو احساس ہو گیا تھا، اس نے روتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف مجھ سے کیا تھا۔ نادیہ اچھی بچی ہے، تم اس کی اس بھول کو اپنے دماغ سے نکال دو اور جیسا میں کہہ رہا ہوں دیا کرو۔“

”اباجی آپ زبردستی کر رہے ہیں۔“ قیصر اپنے باپ

کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سعادت مند بیٹا تھا لیکن یہ بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود باپ کا گستاخ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تربیت میں فضل الدین نے محاش نہیں چھوڑی تھی کہ وہ ماں باپ کے فیصلوں پر اپنے فیصلے کو اہمیت دے۔

”تم اسے زبردستی کہو، میرا حکم سمجھ لو مگر تم کو انکار نہیں کرنا ہے۔ میں نادبہ اور معراج کی عزت بچانا چاہتا ہوں اور یہی میرا فیصلہ ہے۔“ فضل الدین اپنا فیصلہ سن کر اس جگہ سے اٹھ گئے۔ قیصر اسی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ فضل الدین نہانے کے لیے ہاتھ روم میں گئے تو ہاجراں بھاگتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔

”میرے باپ نے اپنے فیصلے کا ہتھوڑا حیرے سر پر مار دیا ہے؟ میں جانتی تھی ایسا ہی ہوگا۔ اب ہٹا دیا کرتا ہے؟“

”آپ بتائیں کیا کروں؟ انکار کروں باپ کو؟“ قیصر نے رائے مانگ لی۔

”تم بالغ ہو اپنا فیصلہ خود کر سکتے ہو، انکار کرو۔“ ہاجراں نے اسکیا۔ ”مگر سے بھاگی ہوئی لڑکی میرے مگر کی بھونچیں بن سکتی۔“

”ابا جی کے سامنے انکار کرنا آسان نہیں ہے۔“ قیصر نے دھیرے سے کہا۔ اسی وقت فضل الدین بھی آگئے۔ ان کے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ انہوں نے آتے ہی ہاجراں کی طرف دیکھتے ہوئے حسانت سے کہا۔

”ہاجراں..... جا کر ناشتا تیار کرو اور میرے فیصلے کو بدلنے کے لیے اسے اسکاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو میں نے کہہ دیا ہے وہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

قیصر اندر ہی اندر تھکتا رہا اور ہاجراں ذریعہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

☆.....☆

نادبہ اس مگر میں کسی قیدی کی طرح تھی۔ وہ اسی کمرے تک محدود تھی جس کمرے میں فضل الدین نے اسے صبح سویرے بیٹھا تھا۔ کمرے میں ہی کھانا پینا ملا تھا اور اسی کمرے میں بیٹھی وہ پورے مگردالوں کی کڑوی باتیں بھی سن رہی تھی۔ کیونکہ فضل الدین کے جانے کے بعد جب قیصر کی بہن اور چھوٹے بھائی کو نادبہ کے بارے میں اباجی کے کیے فیصلے کا علم ہوا تھا انہیں شدید حیرانی بھی ہوئی اور انہوں نے غریب دل کی جڑ اسی جگہ نکالی۔

ہاجراں کے ساتھ اس کی اولاد نے ایسی ایسی باتیں بھی کر دیں جنہیں سن کر نادبہ کا دل خون کے آنسو رونے لگا اور اس کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت اپنے کمر چل جائے اور اس اذیت سے بہتر ہے وہ اپنے باپ اور بھائی کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکی اور دن بھر ان کی باتیں، نظروں اور فشر نما ہاتھیں سن رہی۔

سب سے پہلے کے بعد مگر میں خاموشی ہوئی۔ نادبہ سوچنے لگی نکاح سے قبل اس کا یہ حال پھر اگر نکاح ہو گیا تو اس کا کیا ہے گا؟ یہ بات تو وہ جان لیتی تھی کہ فضل الدین کے فیصلے کے آگے انکار کی کو جرات نہیں تھی۔

شام تک نادبہ نے فیصلہ کر لیا وہ نکاح سے انکار کر دے گی۔ وہ فضل الدین سے کہے کی کہ وہ اسے مگر چھوڑ آئیں، جو اس کی قسمت میں ہو گا وہ اس پر شکر ہو جائے گی۔ اس نے رات کے اندر میرے میں باپ کی دلہیز بار کر کے کوئی چھوٹا ٹم نہیں کیا تھا۔ اس نے نوید کے پیچھے لگ کر بہت بڑی بھول کر دی تھی۔

جس کالج میں نادبہ پڑھتی تھی اسی کالج کے سامنے نوید کی کتابوں اور کاپیوں کی دکان تھی۔ وہ خوبصورت اور پڑکھش ہو جانا تھا۔ نادبہ اس کی دکان پر پہن لینے لگی تھی۔ نوید نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیری اور نادبہ اسی مسکراہٹ کے حصار میں قید ہو گئی تھی۔ اس کے بعد دونوں میں آتے جاتے اشاروں میں باتیں ہونے لگیں اور ایک دن جب وہ کسی بھانے سے اس کی دکان پر گئی تو نوید کا چھوٹا بھائی وہاں نہیں تھا۔ نوید نے اسے چائے کی پیشکش کر دی۔ نادبہ نے چائے کی پیشکش قبول کر لی۔ نوید نے ایک گھنٹے کے بعد نادبہ سے چوک میں ملنے کے لیے کہا کیونکہ نوید کے بھائی کو ایک گھنٹے کے بعد آنا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد نادبہ اس چوک میں کھڑی تھی کہ نوید بائیک لے کر آ گیا۔ دونوں چائے پینے چلے گئے، خوب باتیں ہوئیں اور اس کے بعد ان کی ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ نوید باتیں کرنے کا بہتر تھا۔ وہ اپنی باتوں سے نادبہ کو ششے میں اتار چکا تھا۔ نادبہ اس کے حصار میں پوری طرح قید ہو گئی۔

نوید نے اسے بتایا کہ اسلام آباد جیسے شہر میں اس کے باپ کی بہت جایداد ہے اور ابھی چند دن قبل اس کے باپ

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدا را۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی پی منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت (رضرؤ)

(دہلی قلمی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون 10 بجے تا 8 بجے تک

نے جایہ ادبی تقسیم کی ہے اور اس کے حصے میں پوش علاقے میں موجود کوئی آئی ہے۔ اس کو نقد چھپا بھی ملا ہے اور وہ اسلام آباد منتقل ہو رہا ہے۔

نوید نے یہ بھی بتایا کیونکہ یہ سب کچھ صلح منگانی اور باپ کی چاہت کے مطابق ہوا ہے اس لیے اب وہ چاہتے ہیں کہ اس کی شادی خاندان کی کسی لڑکی سے ہو جائے۔ جایہ ادب نام ہونے پر خاندان کی کئی لڑکیاں اس سے شادی کے لیے تیار ہیں۔ نوید نے کچھ تصویریں بھی دکھائیں جو ایک خوبصورت لڑکی کی تھیں اور اس کے کشادہ اور خوبصورت کمرے تھے۔ وہ حسب تصویریں نوید کے موبائل میں محفوظ تھیں۔

نادیہ ان تصویروں کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھی اور اس خواہش جیسے گھر کی مالک بننے کے لیے مضطرب بھی ہو گئی تھی۔ ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اس کا بڑا سا گھر ہو اور وہ اس گھر کی ایکلی مالک ہو یا نادیہ بھی سوچتی تھی۔

ان ہی دنوں نادیہ کا رشتہ آگیا۔ رشتہ خاندان میں سے تھا اس لیے اس کے ماں باپ اور گھر والوں کو بالکل اعتراض نہیں تھا۔ لڑکا خوبصورت تھا لیکن وہ پرائیویٹ سٹی میں ملازم تھا اور اپنے والدین کے ساتھ کمرے کے گھر میں رہتا تھا۔

نادیہ نے باتوں باتوں میں ماں کو شائد شروع کیا کہ وہ اس رشتے کو ناپسند کرتی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ کسی بڑے گھر میں بیاہ کر جائے۔ اس کی ماں نے ایک دن نادیہ کو صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنی فضول سوچوں کو دماغ سے نکال دے اور چپ چاپ اس لڑکے کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لے۔

ماں نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔ انکار اور مزید کچھ بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نادیہ چپ ہو گئی۔

اگلے دن نادیہ نے نوید سے بات کی تو وہ بولا۔ "نادیہ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اس عالی شان گھر میں تم ہی میری بیوی بن کر رہو گی اور کوئی وہاں نہیں جائے گا اس لیے میرے ساتھ اس گھر میں چلو اور اپنا وہ گھر سنجال لو۔"

نادیہ نے سنا تو جیسے اس کا حوصلہ بڑھ گیا ہو۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کیا اور نوید کے ساتھ بھاگ کر شادی کرنے کی ضمان لی۔ نوید بھی رضا مند ہو گیا۔ دونوں نے رات کو گھر سے جانے کا پروگرام بنالیا۔ نادیہ نے ایک بیک

مہنامہ مسرگوشٹ

گلی سے بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔

قیصر کی بہن جو باہر کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی جب اس نے سنا کہ اب کوئی راستہ نہیں بچا اور نادیہ کو اس کی بھابی بننا ہی ہے تو وہ مایوس سی ہو کر ماں کے پاس چلی گئی اور ساری بات بتا دی۔ اس کی بات سن کر ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

☆.....☆

فضل الدین نے چند قریبی لوگوں کی موجودگی میں قیصر اور نادیہ کا نکاح کر دیا۔ اس نکاح کے لیے سوائے فضل الدین کے کوئی بھی راضی نہیں تھا۔ مگر والے مجبوری میں فضل الدین کے فیصلے کو اپنے اپنے گلے میں لٹکائے بیٹھے تھے۔ قریبی لوگ جو اس نکاح میں شریک تھے ان کے اندر کئی سوال جنم لے رہے تھے اور وہ آپس میں سرگوشیاں بھی کر رہے تھے لیکن فضل الدین کو نہ کسی کے حیران ہونے کی پروا تھی اور نہ اس بات کی کہ کوئی کیا سوچ رہا ہے۔ ان کا رعب دہ بد ہی ایسا تھا کہ کسی کے اندر جرأت بھی نہیں تھی کہ کوئی ان سے سوال کر لیتا۔

نکاح ہو گیا تو فضل الدین سیدھا نادیہ کے گھر چلے گئے۔ معراج ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی دانست میں تھا کہ فضل الدین ایک بار پھر ان سے استعفا کرنے آیا ہے کہ وہ نادیہ کو واپس لے لیں۔

فضل الدین بولے۔ ”میں نے نادیہ کا اپنے بیٹے قیصر سے نکاح کر دیا ہے۔“

یہ سنا تھا کہ معراج اور اس کے کھروالوں کے چہروں پر حیرت چمکنے لگی تھی۔ وہ سب ان کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ معراج کو یقین نہیں آ رہا تھا اس کے بھائی جیسے دوست نے اس کی عزت بچانے کے لیے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ خُصے میں پاگل ہو کر بہرہ بن گیا تھا اور اس نے فضل الدین کی ایک نہیں کی تھی۔

”میں نے نادیہ کی زندگی اور اپنے دوست کی عزت برباد نہیں ہونے دی۔ اب چاہو تو بیٹی کے گھر لے آ جانا، چاہو تو اپنے خُصے کو اپنی اپنی گود میں لیے اس سے لاڈ کرتے رہنا اور اس لاڈ میں اپنے خُصے کو بگھارتے رہنا۔“ فضل الدین کہہ کر واپس چلے آئے۔ جبکہ نادیہ کے گھر والے پریشان، حیران اور اپنی اپنی سوچ میں متفرق کھڑے رہ گئے تھے۔

میں اپنا ضروری سامان رکھا اور رات کے اندھیرے میں وہ گھر کی دلیز پار کر گئی۔ نوید نے جس جگہ پہنچنے کے لیے کہا تھا نادیہ اس جگہ کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔

رات دن کے اجالے کی طرف بڑھ رہی تھی تب نادیہ نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس گھر چلی جائے اور جس دروازے سے چپ چاپ لگی تھی اسی دروازے سے اندر جا کر راز کورات کے اندھیرے کی سیاہی میں لیٹ کر پھینک دے۔ اس کی دانست میں تھا کہ نوید نے اس سے دھوکا کیا ہے۔

جب نادیہ اپنے گھر پہنچی تو وہ دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا مجبوراً وہ فضل الدین کے گھر آ گئی۔ ایک فضل الدین ہی تھا جو اس کے باپ کو سمجھا سکتا تھا اور اسے دوبارہ گھر کے اندر داخل کر سکتا تھا لیکن نادیہ کے باپ نے تو ایسا فیصلہ سنا دیا تھا جس کی اسے بھی امید نہیں تھی۔

☆.....☆

رات کو جب فضل الدین گھر واپس آئے تو گھر کا ماحول ایسا تھا جیسے اس کی بیوی اور بچوں نے نادیہ اور فضل الدین کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا ہو۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب فضل الدین اپنے کمرے میں گئے تو نادیہ بھی ان کے پیچھے چلی گئی۔ سارے گھر والوں کی نظریں ان دونوں پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ قیصر کی چھوٹی بہن تو دروازے کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو گئی۔

نادیہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔“

”ہاں بولو بیٹی۔“

”میں چاہتی ہوں۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔“ نادیہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

فضل الدین نے اس کی بات سن کر طویل سانس خارج کی اور بولے۔ ”آج میں نے ایک اور کوشش کی تھی۔ تمہارے ابو اور بھائی سے بات کی تو وہ دونوں اسی بات پر قائم ہیں۔ تمہارا بھائی اپنے پاس پتول بھی رکھا ہوا ہے کہ وہ تجھے دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔“ نادیہ سن کر خوفزدہ ہو گئی۔ فضل الدین پھر بولے۔ ”اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ تم قیصر کی بیوی بن کر زندہ رہ سکو ورنہ ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے تو کچھ نہیں آ رہی کہ وہ اتنے پاگل اور جنونی کیوں ہو گئے ہیں۔“

فضل الدین کہہ کر چپ ہو گئے اور نادیہ مزید کچھ نہیں بولی۔ وہ بند گلی میں کھڑی تھی اور مزید کچھ ایسا کہہ کر اس بند

برداشت نہیں ہوتا۔ باہمی نے جو مجھے حکم دیا میں نے مانا اب
میں اس سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔“

”دیر کس بات کی ہے۔ اسے طلاق دے اور گھر سے
باہر کر۔“ ہاجرا اس تو پہلے ہی بڑے تو نے بیٹھی تھی ایک دم سے اپنا
فیصلہ سنایا۔

”میں کل ہی طلاق کے کاغذات تیار کرنا
ہوں۔“ قیصر نے کہا۔

”بھائی ایک بات کہوں۔“ اچانک اس کی بہن کچھ
سوچنے کے بعد بولی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”آپ اسے اس طرح سے طلاق نہ دیں۔“

”تو مجھے کیسے طلاق دوں؟“

”کیسے بھائی..... نادیہ کے گھر والوں کا اس سے

کوئی تعلق نہیں ہے۔ طلاق دے کر گھر سے باہر کر دے تو یہ
کہاں جائے گی۔ کل کو اس کے گھر والے ہماری طرف

آجائیں اور اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھیں اور ایک نیا
مسئلہ کھڑا ہو جائے اس لیے میرا ایک مشورہ ہے۔“

”کیا مشورہ ہے؟“ قیصر اس کی طرف متوجہ
ہو گیا۔ سبھی کے کان اسی کی طرف تھے۔

اس کی بہن نے کہا۔ ”نادیہ کی ایک بہن راولپنڈی
میں رہتی ہے جس کے ساتھ اس کی باتیں ہوتی رہتی

ہیں۔ آپ ایسا کریں نادیہ کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں شروع
کر دیں اور پھر اسے اس کی بہن سے ملوانے راولپنڈی لے

جائیں۔ اسے وہاں چھ بیٹیں اور پھر طلاق کے کاغذ
بجوائیں۔“

اس کی بات سن کر قیصر کے ساتھ ساتھ اس کی ماں
نے بھی اتفاق کیا۔ قیصر کی بہن کی بات میں دم تھا۔

”مشورہ تو تمہارا بہت اچھا ہے۔“ قیصر نے سر ہلایا۔
”تم اسی پر عمل کرو۔ طلاق کے بعد جانے یہ کہاں

چلی جائے اور ہم اور عی مصیبت میں پھنس جائیں۔“ ماں
نے کہا۔

”میں ایسا ہی کرتا ہوں۔“ قیصر تیار ہو گیا۔

”ہم بھی نادیہ کے ساتھ اچھا رہنا چاہتے ہیں تاکہ
اسے کوئی شک نہ ہو۔“ قیصر کی بہن نے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں تم اسے بلاؤ اور میرے پاس بیٹھاؤ
میں بھی اس سے کچھ باتیں کرتی ہوں۔“ قیصر کی ماں بولی۔

گھر والوں نے جو سازش تیار کی تھی اس پر عمل شروع

قیصر اور اس کے گھر والوں نے نادیہ کو دل سے قبول
نہیں کیا تھا۔ پہلی رات قیصر بیڈ پر سویا ہی نہیں تھا۔ اس نے
نادیہ سے ایک بھی بات نہیں کی تھی۔ قیصر کے گھر والوں نے
پہلے تو نادیہ کو بالکل بھی نہیں بلایا اور پھر رفتہ رفتہ وہ اس سے
کوئی نہ کوئی بات کر لیتے تھے لیکن قیصر اس کو بالکل بھی منہ
نہیں لگاتا تھا۔

نادیہ کے گھر والوں میں اس کے والدین اب چاہتے
تھے کہ وہ اپنا خسر پس پشت ڈال کر فضل الدین کے گھر چلے
جائیں لیکن نادیہ کے بھائی نے اسی وقت پستول نکال لیا
اور غصے سے کہا:

”اس گھر سے اگر کوئی اس گھر میں گیا تو میں اپنے
آپ کو گولی مار لوں گا۔“

نادیہ کے بھائی کا خسر آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کے
ماں باپ چہرہ پر گھنے اور کچھ وقت گزر گیا۔ نادیہ کے گھر
سے اس گھر تک کوئی نہیں آیا حالانکہ فضل الدین کو آمدنی کی کہ
معراج اور اس کی بیوی ضرور آئیں گے۔ ہر روز وہ امید کی
کرن اپنے دل میں بسا لیتے تھے اور سورج غروب ہونے
کے ساتھ وہ کرن بھی مرجھا جاتی تھی۔

نادیہ کو قیصر ابھی تک نہیں بلایا تھا۔ نادیہ نے کئی بار
کوشش کی کہ وہ اس سے کوئی بات کرے لیکن قیصر نے اس
طرف توجہ ہی نہیں دی۔ فضل الدین اس بات سے لاعلم تھے
کہ دونوں میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے کیونکہ وہ
میچ دکان پر چلے جاتے تھے۔ رات کو واپس آتے۔ رات کا
کھانا کھاتے، عشا کی نماز پڑھتے اور کسی سے کلام کیے بغیر
اپنے بستر پر چلے جاتے تھے پھر فجر کی نماز کے لیے اٹھتے
تھے۔

ایک رات وہ تھک کے لیے اٹھے اور گر گئے۔ گھر
والے سبھی سوئے ہوئے تھے کسی کو خبر نہیں ہو سکی۔ جب
ہاجرا اٹھی تو اس نے فضل الدین کو فرش پر گرا ہوا دیکھا اور
شور مچا دیا۔ سبھی جاگ گئے فضل الدین کو اسپتال میں لے
گئے لیکن دیر ہو چکی تھی۔ فضل الدین اپنے خالق حقیقی سے
جاملے تھے۔

فضل الدین کے انتقال کو کئی مہینے گزر گئے تھے۔
گھر سے نادیہ کے علاوہ سبھی ماں کے پاس بیٹھے
تھے۔ قیصر نے دھیمے لہجے میں کہا:

”ماں جی..... اب مجھ سے یہ زبردستی کا رشتہ

ہو گیا تھا۔ نادیہ ان کے احسا میں آگئی تھی۔ قیصر بھی اس سے بات کرنے لگا تھا۔ باجراں کا رویہ ایسا ہو گیا جیسے نادیہ کے لیے اس کے دل میں کوئی بات ہی نہ ہو۔

چند دنوں میں سب کے رویوں میں تغیر دیکھ کر نادیہ بھی خوش ہو گئی اور ایک دن قیصر دو گت لے آیا اور نادیہ سے بولا۔ ”تیار ہو جاؤ ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔ وہاں تمہاری بہن کے گھر بھی جائیں گے اور آگے مری بھی چلیں گے۔“ قیصر نے مسکرا کر کہا تو نادیہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔

سامان کی پینک شروع ہوئی اور مقررہ وقت پر وہ بذریعہ ٹرین روانہ ہو گئے۔ نادیہ خوش تھی کہ قیصر کا دل اس کی طرف مائل ہو گیا۔ قیصر بھی راستے میں اس سے کوئی نہ کوئی بات کرتا رہا تا کہ اسے کوئی شک نہ ہو۔

رات ہو چکی تھی ٹرین کا سفر جاری تھا۔ رفتہ رفتہ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی اور پھر وہ بیابان جگہ پر رک گئی جہاں دور تک اندھیرا تھا۔ سب مسافر کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے اور ہر کوئی جانے کو خستہ تھا کہ ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ کچھ وقت گزر رہا تو مسافر باہر نکل گئے۔

قیصر بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے ہی ایک دم ایک طرف سے نوید نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ نادیہ نے اچانک نوید کو دیکھا تو اس کی خیرہ نگاہیں اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ نوید کا وہی خوبصورت چہرہ تھا لیکن اس کے ماتھے پر دم گزشتہ نشان تھا جسے دیکھ کر نکلنا کراہ دیا۔

”نویڈ تم؟“ نادیہ نے پہلے ایک نظر باہر کھڑے قیصر کی طرف دیکھا اور پھر اس سے سوال کیا۔

”میں اسی ٹرین میں ہوں۔ مجھے لگتا ہے تم نے شادی کر لی ہے۔“ نوید بولا۔

”تم اس رات نہیں آئے تھے اور مجھے یہ فیصلہ قبول کرنا پڑا۔“ نادیہ نے بتایا۔

”مجھے لگتا ہے تم اس سے خوش نہیں ہو۔ بہر حال میں اس رات آ رہا تھا لیکن میرا الٹی ڈیف ہو گیا۔ مجھے شدید چوٹیں آئیں اور میں کئی دن تک اسپتال میں رہا ہوں۔ میں اب بھی لنگڑا کر چلتا ہوں۔“

”ایسا ہوا تھا کیا؟“ نادیہ ایک دم سے چوکی۔ ”تم میں کوئی بات نہیں سکتا کہ میں نے کس اذیت میں بستر پر وقت گزارا تھا۔ تم سے کوئی رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں اپنے اس ویران گھر میں جا رہا ہوں لیکن تم کو اس کے

ساتھ دیکھ کر میری آس ٹوٹ گئی ہے اور میرا دل چاہتا ہے میں واپس ہو جاؤں۔“

”نہیں نہیں تم کو واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری شادی ضرور ہوئی ہے لیکن یہ رشتہ محض ایک رشتہ ہے جس کے بیچ میں کوئی تعلق نہیں ہے البتہ ایک طویل دیوار ضرور ہے۔“ نادیہ ایک دم سے بولی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہی گھٹی آگئی تھی جو اسے نوید نے اپنے موبائل فون میں موجود تصاویر سے دکھائی تھیں۔ ویسے بھی قیصر کے محض وہ نکاح میں تھی، میاں بیوی والا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ گھر میں اسے سب کی باتیں سننے کو ملتی تھیں اور نوید کے پاس اس کا بہترین مستقبل تھا۔

نوید کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ”ایسی بات ہے..... پھر تم جبر سے اس ویران مکان میں آکر اسے گھر کیسے بنا پاؤ گی۔“

”میں اپنی بہن کے گھر جا رہی ہوں۔ میں قیصر سے طلاق لے لوں گی۔“ نادیہ بولی۔

”کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟“

”ہاں بالکل کر سکتی ہوں۔“

”یقین کرو نادیہ میں تمہارے پیچھے اس گھر میں کسی اور کو لانے کا بھی تصور بھی نہیں کیا ہے اور نہ کر سکتا ہوں۔ تم کچھ بھی کرو اور اس کے ساتھ اسی جگہ فیصلہ کر لو اور اپنی بہن کے گھر جانے کی بجائے میرے ساتھ چلو..... اسی گھر میں رہو جب تک تم اس سے پوری طرح چھٹکارا نہیں پا لیتی۔ تم عزت کے ساتھ وہاں رہو گئی ہو۔ میں اسی دن اس گھر میں آؤں گا جب ہمارا نکاح ہوگا۔“ نوید کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ جیسے اس کی منت مانت کر رہا ہو۔

”تم جاؤ قیصر آ رہا ہے۔“ نادیہ نے ایک نظر باہر دیکھ کر کہا۔

”میں اسی ٹرین میں ہوں۔ تم اگر اس کے ساتھ خوش نہیں ہو تو اسی جگہ اس سے دو ٹوک بات کر لو۔“

”میں ایسا ہی کرتی ہوں۔“

”میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔“ نوید اٹھ کر ایک طرف چل پڑا۔ وہ وہی نظر اتارنا ہوا چل رہا تھا۔

نادیہ کے دل میں ایک دم سے نوید بھر سے آ گیا۔ وہ بھول جو اس نے اس رات کی تھی اور جس حقیقت کا اسے سامنا کرنا پڑا تھا، وہ دماغ سے نکل گیا تھا۔ اسے نوید کا وہ گھر نظر آنے لگا تھا جہاں وہ شہات

سے رہ کر اپنے گھر والوں کو اسی طرح بھلا سکتی تھی جس طرح اس کے گھر والوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

قیصر واپس آیا تو اس نے بتایا۔ ”ٹرین کا کراس تھا۔ جانے اتنی دیر پہلے ٹرین کیوں روک دی گئی۔“

قیصر اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین رینگنے لگی تھی۔ ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا تھا۔ جب ٹرین نے رفتار پکڑ لی تو ایک بار پھر نوید اس طرف آیا اور نادیہ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آگے چلا گیا۔

نادیہ نے بات کا آغاز کیا۔ ”میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا بات کرنا چاہتی ہو؟“ قیصر نے پوچھا۔

”آپ نے میرے ساتھ نکاح محض اس لیے کیا تھا کیونکہ یہ آپ کے اہلی کا حکم تھا۔“

”بالکل ایسا ہی تھا۔“ قیصر نے کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ مجبور ہیں اور شاید مجھ سے

چھٹکارا چاہتے ہیں۔“ نادیہ بولی تو قیصر نے اس کی طرف

تعمیر نگاہوں سے دیکھا جسے وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ نادیہ کو اس

کے دل کی بات کا کیسے پتا چلا۔

”سچ ہے۔“ قیصر نے کہہ دیا۔

”اگر آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی

اعتراض نہیں ہے۔ میں آپ کا فیصلہ خوشی سے قبول کرنے کو

تیار ہوں۔“ نادیہ نے کہا۔

”سچ ہے کہ میں تم کو تنہا ہی بہن کے گھر چھوڑ کر

طلاق کے کاغذات بھجوانا چاہتا تھا۔“ قیصر نے سچ بتا دیا۔

”آپ مجھے طلاق دے دیں۔۔۔ اس طرح دھڑکی

گزارنے سے بھر ہے اپنی مرضی کی زندگی

گزاروں۔“ نادیہ بولی۔

”شہر قریب آ رہا ہے۔ ابھی ایک چھوٹا اسٹیشن آئے گا

وہاں کچھ دیر ٹرین روکے گی اور اس کے بعد شہر آجائے

گا۔ میں تم کو تنہا ہی بہن کے گھر چھوڑ کر واپس چلا جاؤں

گا۔“ قیصر نے کہا۔

”آپ مجھے اسی اسٹیشن پر چھوڑ دیں میں آگے چلی

جاؤں گی۔“ نادیہ بولی۔

”رات ہے تم آگے کیسے جاؤ گی؟“

”میری بہن کا گھر ریلوے اسٹیشن سے دور نہیں

ہے۔ ان کو اطلاع ہے اور وہ مجھے لینے آ جائیں گے۔ ویسے

مجی آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں۔ میری فکر نہ کریں۔“ نادیہ

نے کہا۔

قیصر جب ہو گیا۔ ٹرین بھاگتی رہی۔ نادیہ اس گھر کے

خیالوں میں گھومنے اور قیصر متانت سے کچھ سوچتا رہا۔ جیسے

جیسے ٹرین آگے بڑھ رہی تھی قیصر کے اندر بے چینی بڑھ رہی

تھی۔

”نادیہ۔۔۔۔۔“ قیصر نے پہلی بار اسے مخاطب کرنے

کے لیے اس کا نام لیا تو نادیہ ایک دم سے چوگی۔

”مجی۔۔۔۔۔“

”میں تم کو تنہا ہی بہن کے گھر تک چھوڑ کر آؤں

گا۔ رات ہے اور میں نہیں چاہتا کہ۔۔۔۔۔“

”آپ کو میری فکر ہے کہ مجھ پر ترس آ رہا

ہے؟“ نادیہ نے طنز سے نگاہوں سے دیکھا۔

”تمہارا اکیلے جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

”آپ میری فکر نہ کریں اور نہ مجھ پر ترس

کھائیں۔ مجھے اگلے اسٹیشن پر چھوڑ دیں۔ میں چلی جاؤں

گی۔ اس اسٹیشن سے باہر نکلیں گے تو بس اسٹیشن قریب ہی

ہوگا آپ بس پکڑ کر واپس جاسکتے ہیں اور مجھے طلاق کے

کاغذات بھجوا دیں۔“ نادیہ کہہ کر باہر دیکھنے لگی۔

قیصر کے اندر جانے کیوں بے چینی جنم لینے لگی

تھی۔ پتا نہیں ایسا کیا تھا کہ وہ بار بار پیلو بدل رہا

تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی لگی بار تیز ہوئی تھی۔ تھوڑی

خاموشی کے بعد قیصر پھر بولا۔ ”کیا تم واقعی چاہتی ہو کہ

میں طلاق دے دوں۔“

”جب نام کا رشتہ ہے تو پھر اسے بھرا کر اپنی اپنی زندگی

کا کھاکو بنوائیں۔“ نادیہ بولی۔

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔“ قیصر دیر سے

بولا۔ ”جی کے اپنے ارمان ہوتے ہیں۔“

”میں بتائی گی کا احسان بھی نہیں بھول سکوں گی جنہوں

نے میری اور میرے گھر والوں کی عزت کا مان رکھا۔ مجھے

اپنے گھر کی بھو بنا لیا۔ وہ بہت بڑے دل کے مالک

تھے۔“ نادیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

قیصر کو فضل الدین یاد آ گئے۔ ان کا چہرہ آنکھوں کے

سامنے آ گیا اور وہ الفاظ کانوں میں سنائی دینے لگے جب

انہوں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا کہ وہ معراج کی

عزت پامال ہونے نہیں دینا چاہتے اس لیے اس رشتے کو

بھٹاتا ہوں گا۔

ٹرین کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی پھر وہ چھوٹے

باپ کے بتائے اس رشتے کو ساری زندگی بھانا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ واپس چلو۔“ قیصر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”نادیہ ضد نہ کرو۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں نہیں جاؤں گی۔“ نادیہ دو ٹوک ہوئی۔

قیصر چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر اس نے کہا۔ ”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“

”ہاں..... آپ جاسکتے ہیں۔“

قیصر نے کچھ سوچا اور پھر آٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے چلا گیا۔ قیصر کے جانے کے بعد نادیہ پھر نوید کو حلاشی لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ ٹرین سے باہر آگئی۔ اچانک اسے ایک طرف نوید تیزی سے اس طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اپنی انگڑائی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بھٹک اور تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ نادیہ خوش ہوئی۔ اچانک اس کے پیچھے ایک اچھلی سی ہوئی۔ کسی نے چلا کر کہا۔ ”وہ ہے جس نے میری جیب کاٹی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی بھاگ دوڑ ہوئی اور کچھ لوگوں نے نوید کو پکڑ کر دو بوج لیا۔ نادیہ پاس ہی کھڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ نوید سے بڑا بڑا ہوا گیا تھا۔ نادیہ کے پاس ایک نوجوان کھڑا تھا اور کسی دوسرے کو کھد رہا تھا۔

”اسے میں جانتا ہوں میرے شہر کا ہے۔ عزت دار گھرانے کا ہے لیکن شروع سے آوارہ ہے۔ بھائی نے اپنی کتابوں کی دکان پر بھی اسے بیٹھایا تھا۔ وہاں بھی چوری کرتا۔ سوٹر سائیکل چوری کرتے پکڑا گیا اور جیل چلا گیا تھا۔ یہ انگڑائی ٹانگ تھانے کی مار کا تھقہ ہے۔ فراڈ ہے۔ یہ۔“

نادیہ نے سنا تو اس کے تن بدن میں بے چینی دوڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نوید کی حقیقت اس کے سامنے مل گئی تھی۔ نادیہ بچی اور حلاشی لگا ہوں سے قیصر کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ اس جانب بھاگی جس طرف قیصر گیا تھا۔ وہ کسی دیوانی کی طرح قیصر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ قیصر اور مسکرا رہی تھی۔ یہی اسے قیصر نظر آ گیا اور وہ اس سے لپٹ کر سکتے گئی۔

ریلوے اسٹیشن پر رک گئی۔ مسافر اترنے اور چڑھنے لگے۔ قیصر پتھر بنا بیٹھا رہا اور پھر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور بولا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

نادیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قیصر بچے اترتا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ اسے اپنے والد کی یاد آنے لگی جنہوں نے اس رشتے کو اس کے ساتھ جوڑا تھا۔ قیصر نے سوچا نادیہ گھر سے باہر ضرور گئی تھی لیکن اس کی عزت محفوظ تھی۔ نادیہ سے اگر بھول ہوئی تھی تو وہ بھی اسے معاف کر سکتا تھا۔ سب کچھ نظر انداز کر کے اسے اپنی بیوی کا حق دے کر زندگی گزار سکتا تھا۔ باقی پر گھر پھر کر وہ اپنے باپ کے بتائے اس رشتے کو ساری زندگی بھاسکتا تھا۔ قیصر کے قدم رک گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نادیہ کو واپس لے جائے گا اور اسے معاف کر دے گا۔

قیصر واپس ٹرین کی طرف چل پڑا۔ اس کے قدم تیز تھے۔ جو بھی وہ ٹرین کے ڈبے میں پہنچا نادیہ کی حلاشی لگا ہوں نوید کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک دم قیصر کو کچھ کہہ دو چوگی۔ قیصر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ”نادیہ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں میں باقی کو بھول کر حال سنو اور اس اور تم کو آخری سانس تک اپنی بیوی بنا کر رکھوں۔“ قیصر نے اپنا فیصلہ سنایا تو نادیہ ایک دم سے چوگی۔ ایک لمحے میں اسے قیصر کی ماں اور بیٹیوں کی نظر نما زبانیں یاد آئیں، پھر یہ خیال آیا کہ جب شوہر اس کے ساتھ ہوگا تو کوئی اس کا کچھ نہیں سمجھاؤ سکے گا۔ اسی اثنا میں اس کے سامنے سے نوید تیزی سے گزر کر ایک طرف چلا گیا۔ نوید، قیصر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا کھڑا تھا جہاں کوئی ساس اور نند نہیں تھی۔ اس گھر میں اس کی حکمرانی ہوگی۔

”مجھے آپ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی ہے۔ مجھے طلاق دے دیں۔“ نادیہ نے سوچنے کے بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

”میرا یقین کرو میں بالکل سچیدہ ہوں۔ ہم سب خوش و غم رہیں گے اور یہی باقی کی بات کسی کی زبان پر نہیں آئے گی یہ میرا وعدہ ہے۔“ قیصر نے میم لہجے میں یقین دلانے کی کوشش کی۔

”میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی جہاں جانے مجھے کسی بات میں شکی پڑیں۔“

”میرا یقین کرو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ دیکھو میں اپنے

Digitized by Google

شرمندہ کر دیتے تھے۔ میں زیادہ کسی سے میل ملاپ نہیں رکھتی تھی جس کی وجہ سے کوئی میرے ہاں بھی نہیں آتا تھا جس پر میں خوش تھی۔

مجھے یہ شک رہتا کہ کہیں کوئی میرے خلاف میرے شوہر کو بھڑکا کر مجھ سے دور نہ کر دے۔ میں کوئی کم عمر ملازمہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ مجھے یہ خوف لاحق رہتا کہ کوئی مجھ سے میرے شوہر کو نہ چھین لے۔

ہماری شادی کو دس سال بیت گئے تھے۔ دہاج کی شکست میں ان دس سالوں کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ ان دس سالوں میں ہمارے آگن میں اب تک کوئی پھول نہیں کھلا تھا جس کا مجھے شکست سے احساس تھا مگر دہاج مجھے تسلی دینے کہ جب حکم ہوگا اللہ کا اولاد بھی ہو جائے گی۔

آج چھٹی کا دن تھا صبح سے ہی موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا کسی وقت بھی تیز بارش شروع ہو جائے گی۔ میں لان میں بھولے پریشانی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”ارے سارے گھر میں ڈھونڈ لیا آپ یہاں بیٹھیں موسم کے حرے لے رہی ہیں۔“ دہاج میرے برابر بیٹھے ہوئے بولے۔

”یہاں نہ آئی تو اور کیا کرتی آپ خود تو کمرے میں بند اخبار میں کم تھے۔“ میں نے گھوہ کرتے ہوئے کہا جس پر وہ ہنس پڑے۔

”آج اخبار میں ایک خبر پڑھ رہا تھا۔“ وہ اپنی لمبی دہاتے ہوئے بولے۔

”کیسی خبر؟“ میں پوچھنے لگی۔

”بیوی نے شوہر کو شک کی بنیاد پر قتل کر ڈالا۔“

”جیسی؟“ میں نے بیوی تو بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔“ دہاج کی شرارت میں سمجھ چکی تھی۔

”ایسے ہی بیویوں کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔ دور نہ ایسا بھی نہیں ہے۔“ میں دہاج کی بات کی تردید کرتے ہوئے بولی۔

”جیسی صاف بات ہے میں تو ڈر گیا آخر کو میری بیگم بھی اچھی خاصی شکی طبیعت کی مالک ہیں۔“ وہ خمیدگی سے بولے مگر ان کی آنکھوں سے چمکتی شرارت مجھے صاف نظر آرہی تھی۔

”دہاج! میں شک نہیں کرتی آپ پر، بس مجھے ایک عجیب سا ڈر سنا ہے آپ سے دوری کا۔ میں نہیں جانتی

گئی۔ خواب میں آج پھر دہاج کو دیکھا تھا۔ اے خواب میں دیکھنے کے بعد میری ایسی ہی حالت ہو جاتی تھی۔

بچے پر سر رکھے میں آنکھیں مضبوطی سے بند کی ہوئی اپنے بائیں کوسوئے لگی۔

میں آج بھی اسی وقت کے ان لمحوں اور ان لمحوں میں مجھ پر اپنی حماقت کو سوچ کے پچھتاتی ہوں۔ میرے پاس اب پچھتائے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ احساس غمات مجھے کچھ لگتا ہے کہ میں نے خود اپنے شک کے ہاتھوں اپنے ہنسنے بے آشیانے کو آگ لگا کر خود کو زندان میں دھکیل دیا ہے۔ میرے شک نے مجھے جو عمر بھر کا نقصان دیا اس کا ازالہ اب ممکن نہ تھا۔

میری کہانی میرے قارئین کے لیے سبق ہے اور خاص کر ان عورتوں کے لیے جو اپنی شکی فطرت کی وجہ سے اپنی زندگی سے کھیل جاتی ہیں۔

میری کہانی سے کیا پتا کسی کو سبق مل جائے اور پچھتاوے کی اس اذیت سے بچ جائے جس کا انجام بس عمر بھر خود کو کسانا ہوتا ہے۔

میرا نام میوند ہے۔ اچھے کھاتے پیچے گھرانے سے تعلق تھا۔ میری شادی دہاج سے ہاں باپ کی پسند سے ہوئی تھی۔ اس میں وہ ساری خصوصیات موجود تھیں جو ایک اچھے شوہر میں ہوتی ہیں۔ وہ میرا بے حد خیال رکھنے۔ منہ سے لکلی ہر فرمائش کو پورا کرتا ان کا اولین فرض تھا۔ ان کی محبت پر میں جتنا ناز کرتی تھی۔ میری محبت بھی دہاج کے لیے دن بے دن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس محبت کو جنون کا نام دیا جائے تو غلط نہ تھا مگر میری ایک عادت ایسی تھی جس پر میں بھی اکثر شرمندہ سی ہو جاتی تھی وہ تھی، شک کی عادت۔ شادی سے پہلے بھی مجھے گھر والوں پر شک رہتا تھا جس پر مجھے اکثر گھر والوں سے اور خاص کر اپنی ماں سے ڈانٹ پڑتی رہتی تھی۔ وہ مجھے اکثر سمجھاتیں کہ شک انسان کو برباد کر دیتا ہے۔ میں بہت حد تک اپنی اس عادت پر قابو پانے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ دہاج نے شادی کے بعد میری یہ فطرت بھر دوائی۔

میں دہاج کی محبت میں بہت جنونی تھی۔ ان کو اپنے گھر والوں سے بھی زیادہ بات کرنے نہیں دیتی تھی۔ یہ نہیں کہ لڑائی جھگڑا کر کے میں دہاج کی ذمہ داری اچھن کر دوں مگر میری کوشش ہوتی کہ میں ہر طرح سے اپنے شوہر کو سب سے دور رکھوں بعض اوقات میرے ٹھہرے ٹھہرے بھی دہاج کو

کیوں۔“ میں اپنی صفائی دیتی ہوئی بے بسی سے بولی۔
 ”بس مجھے ڈر لگتا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی تیسرا
 وجود نہ آجائے جو ہمارے تعلقات میں دراڑ ڈال دے۔“
 میں اپنے اندر کا غم خدشوں پر لاتے ہوئے بولی۔

”میں تو چاہتا ہوں تیسرا وجود آئے ہمارے
 درمیان۔“ وہاب کی بات پر میں چوکی۔ ”جو تم کو مال اور
 مجھے بابا بولے۔“ وہاب کی بات پر میری رکی ہوئی سانس
 بحال ہوئی اور میں ہنس دی۔

”میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ اپنی محبت پر
 بھروسہ رکھو اور اس شک کو دل سے نکال دیکھو۔“ وہاب میرا
 ہاتھ پکڑ کر مجھے ہمیشہ کی طرح یقین دلاتے ہوئے بولے۔
 ان دس سالوں میں کوئی دن ایسا نہ تھا جب وہاب نے مجھے یہ
 جملہ بول کے یقین نہ دلایا ہو۔

”تانیہ آ رہی ہے۔“ میں باورچی خانے میں کھڑی
 رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب وہاب نے مجھے
 آ کر بتایا تو میرے ہاتھ میں گھبرائی طرح سے لرز اٹھا تھا۔
 تانیہ وہاب کی نہ صرف کزن تھی بلکہ بچپن کی سنگیت بھی
 تھی اور میں جانتی تھی وہ اور وہاب آپس میں بے انتہا محبت
 بھی کرتے تھے مگر دونوں خاندانوں میں کچھ جھگڑا ہوا تھا
 جس کی وجہ سے ان کے بڑوں نے سنگتی توڑ دی تھی اور پھر
 تانیہ اپنی چھٹی کے ساتھ امریکا چلی گئی تھی اور وہاب کے والد
 جو میرے والد کے دوست تھے انہوں نے وہاب کے لیے
 مجھے مانگ لیا۔ میرے والد کو تو وہاب دیے ہی بہت پسند
 تھے۔ ان کو کوئی اعتراض نہ تھا اور یوں میری وہاب سے شادی
 ہو گئی۔ شادی کے بعد میں نے کسی وہاب کے یوں سے تانیہ کا
 نام نہیں سنا تھا مگر آج اسے برس بعد یہ خبر سن کر کہ وہ
 پاکستان آ رہی ہے۔ مجھے بے چین کر دیا تھا۔

”کیا ہوا کیا سوچ رہی ہو۔“ وہاب کی آواز نے مجھے
 سوچوں کے غمگینوں سے نکالا۔
 ”کچھ نہیں میں سوچ رہی تھی کہ کس کے ساتھ آ رہی
 ہے۔“ میں زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

”ارے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آ رہی ہے اور
 کس کے ساتھ آئے گی، دراصل آج صبح ہی اس کی کال آئی
 تھی کہ وہ آ رہی ہے کل تک پہنچ جائے گی۔“ وہاب فرح سے
 سب نکالتے ہوئے بولے۔

”اوہ کال بھی میرے مہان کو ہی کرنی تھی۔ رقابت کا
 جذبہ میرے اندر جاگا جس کو میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے

چھپایا۔

”کدھر رہیں گے؟“ میرے سوال پر وہاب مجھے
 حیرانگی سے دیکھنے لگے۔

”اپنے گھر میں اور کہاں؟“ وہاب حیرانگی سے بولے۔

”نہیں میرا مطلب کس گھر میں؟“ میں گڑبڑاتے
 ہوئے بولی۔

”کیا ہو گیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہاب
 میری پیشانی چھوتے ہوئے بولے۔ ”کیسی عجیب باتیں کر
 رہی ہو۔“ مجھی یہاں ان کا اپنا گھر ہے وہ وہیں رہے
 گی۔ ”وہاب کی اس بات پر میں اندر تک بے سکون ہو گئی
 یعنی وہ میرے گھر کے قریب آ رہی تھی۔

تانیہ کا سسرال میرے گھر سے دو گلی چھوڑ کے تھا
 ساس سسر کا انتقال ہو گیا تھا تو عرصے سے اس گھر کے
 دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا مگر اب اس گھر کا تالا کھلنے والا
 تھا۔ تالا کھلنے ہی میری نیندیں غائب ہونے والی تھیں۔

میں خاموشی سے ہنسیا پکارتے ہوئے بولی۔ ”سو بیٹو نہ ایسا کچھ
 بھی مت سوچنا پلیز!“ وہاب میرے پاس آتے ہوئے
 بولے۔

”کیا سوچا میں نے؟“ میں نے انہماں بننے ہوئے
 پوچھا۔

”تانیہ میرا نانی تھی اور تم سے میرا حال مستقبل سب
 بڑا ہوا ہے، اس لیے تانیہ کو لے کر کوئی سوچ مت پانا۔“
 وہاب میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولے۔

میں اگرچہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی مگر وہ میرے
 چہرے کے تاثرات دیکھ کے سمجھ گئے تھے کہ میرے ذہن میں
 کیا چل رہا ہے۔

ان لوگوں کے آنے کے ایک ہفتے بعد میں اور وہاب
 تانیہ کے گھر گئے جہاں پر تانیہ اور اس کے شوہر سھانے میں
 زبردستی رات کے کھانے پر روک لیا تھا۔ میں نے تانیہ کو
 تصویروں میں دیکھا ہوا تھا مگر وہ اب پہلی بار مل رہی تھی۔
 میرے دل نے چپکے سے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ واقعی
 بے تحاشہ حسین تھی۔

”مہمت! اچھا کیا وہاب تم میمونہ کو بھی لے آئے میں تو
 خود اس سے ملنا چاہ رہی تھی۔“ کھانے کے بعد ہم لان میں
 چائے پی رہے تھے جب تانیہ بولی۔

”ہاں اچھا کیا لے آئے ورنہ یہ محترمہ تمہارے گھر

اپنے لباس پر ڈالی جو صاف سترا لگ رہا تھا مطمئن ہو کر باہر آگئی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سامنے ہی گلابی لباس میں بھی سنوری خوشبوؤں میں مچکتی تانیہ بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں طرف اس کا سات سالہ بیٹا عثمان اور بائیں طرف چار سالہ بیٹی ایمان بیٹھی تھی۔ وہ ان کے درمیان محل کی لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔

”سوری تم کو ڈسٹرب کیا۔“ تانیہ کہتی ہوئی میرے گلے لگ گئی۔ ”دراصل یہ دونوں ضد کر رہے تھے آنے کی۔“ وہ بچوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ارے تو اچھا کیا نا آگئی ان کو لے کر۔“ میں بچوں کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

”آئی ہم آپ کو لینے آئے ہیں، آپ ہمارے ساتھ لے چکے ہیں۔“ عثمان بولا۔

”ارے نہیں نہیں آپ لوگ جائیں۔“ میں مسکراتے ہوئے اس کی بات پر بولی۔

”ہاں میونہ ہم تم کو لینے آئے ہیں۔ اچھا ہے نزل کے چلے ہیں۔ بچوں نے بولا کہ میونہ آگئی کو بھی لے لیتے ہیں۔“

”مگر میں کیا کروں گی تم لوگ جاؤ انجوائے کرو۔“ مجھے ان لوگوں کے ساتھ جاتے ہوئے جھک محسوس ہو رہی تھی۔

”کل آپ بول کے آئی تھیں کراہ آتے جاتے رہتا اب ہم آگئے تو آپ راضی نہیں۔ چلو بچوں مگر چلو تمہاری آغوش خوش نہیں ہوئی تھیں دیکھ کے۔“ تانیہ بچوں کو کھڑے ہونے کا اشارہ کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

”ارے ارے کیا کر رہی ہو چل رہی ہوں میں۔“ اس کی بات پر میں گھبراتے ہوئے بولی۔

وہ ہنسی ہوئی میرے گلے لگ گئی۔ اس کے اس طرح سے گلے لگنے پر میں جھنجھکی گئی۔ میں کہاں لے دیئے حراج کی بندی اور وہ اتنی ہی عبت جانتے والی۔ کچا پرے حد حرہ آیا۔ بچے بھی میری وجہ سے بہت خوش تھے خود مجھے بھی ان سب کے ساتھ بہت حرہ آ رہا تھا۔

”تاہم میری کوئی بہن نہیں ہے اور اس کی کو میں ہمیشہ محسوس کرتی تھی۔“ ڈائپسی میں کارڈرائیج کرتی ہوئی تانیہ بولی۔ میں جو کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی اس بات پر اس کی جانب متوجہ ہو گئی مگر اب مجھے تم کو دیکھ کے لگتا ہے

خود آ جاتیں۔“ تانیہ کے شہزادہ سمجھتے ہوئے اپنی بیگم کو دیکھ کر بولے۔

”ہاں تو اچھا ہے نا تانیہ آ جاتی اب تو مگر قریب ہے آتے جاتے رہیں گے آپ لوگ میں خوش دلی سے بولی میرے بولنے پر وہاں نے مجھے کافی خوشگوار سے دیکھا۔ رات دیر گئے ہم ان کے ہاں سے واپس آئے تھے۔ ”اچھے منسا لوگ ہیں۔“ میں ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی چوڑی اتارنی ہوئی بولی میری بات پر بیڈ پر نیم دراز کتاب کا مطالعہ کرتے وہاں اثبات میں سر ہلانے لگے۔

تانیہ کے بچے بھی بہت تمیز دار تھے بہت محبت سے ملے، خود تانیہ اور سعد بھائی بھی گلے دل سے ملے۔ میرے دل میں تانیہ کو لے کر جو غمشات اور شک تھا خود بہ خود دور ہو گیا تھا۔ تانیہ کے گھر میں باتوں کے دوران کئی بار چپکے چپکے میں نے وہاں کی نظروں کو ٹوٹنے کی کوشش کی مگر وہ متشعل سعد بھائی سے باتوں میں لگے رہے۔ تانیہ سے بات کرتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کو میں پڑھتی رہی مگر مجھے ڈھونڈنے سے بھی محبت کا شائبہ نظر نہ آیا بلکہ ان کی نظروں میں سادگی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ جو چمک ان کی آنکھوں میں آتی تھی وہ خالص مجھ سے متعلق ہوتے ہوئے آتی تھی اور میں چاہتی تھی عمر بھر وہ چمک بس میرے لیے ہی مخصوص رہے، سوچے سوچے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح معمول کے مطابق ناشی اٹھنے کے بعد وہاں کے لیے ناشتا بنایا اور پھر وہاں کو اغایا۔ ناشتے کے بعد وہاں آتش کے لیے نکل گئے۔ میں ملازمہ سے کمر کا کام کرا کے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آکر ٹی وی دیکھنے لگی مگر ٹی وی پر بعد بیزار ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔ مجھے بے ساختہ تانیہ کے دونوں بچے یاد آ گئے کتنے پیارے تھے۔ کیسے ماں باپ سے لگے ہوئے تھے۔ میرے سینے سے ایک ہوک سی اٹھی، کاش میرے بھی بچے ہوں جو اسی طرح ہمارے ارد گرد منڈ لائیں۔ میں آرزو کی سے سوچنے لگی۔

”تانیہ بی بی آئی ہیں۔“ ملازمہ میرے کمرے میں آکر بتانے لگی۔

”اچھا تم ان کو بلاؤ میں آتی ہوں۔ ملازمہ کو ہدایت دے کے میں دانش روم کی جانب بڑھ گئی اور منہ ہاتھ دھو کر آئینے کے سامنے آکر پ اسٹک لگانے لگی۔ ملازمہ نگاہ

میری وہ کی آج پوری ہوگئی۔ اللہ نے مجھے بہت پیاری سی بہن دے دی۔“ وہ بہت محبت سے بولی۔ اس کی اتنی محبت پر سن شرمندہ ہی ہوگئی۔

تانیہ سراپا محبت تھی اور اس محبت سے اس نے میرے دل میں اپنا مقام بنالیا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے کا گھر آنا جانا ہونے لگا تھا۔ وہاں کی بھی سہ سے کافی کھری دوستی ہوگئی تھی اور بچے دو تھے۔ وہ بھی فریڈک ہو گئے تھے۔

چھٹی کے دن ہم دونوں کی فیملی چھک کی غرض سے ساحل سمندر پر آئے ہوئے تھے۔ سہ بھائی کی کام سے گاڑی تک گئے تھے۔ میں ایمان اور عثمان کا ہاتھ پکڑے ہوئی ساحل کا نظارہ کر رہی تھی کہ ساحل کے کنارے کھڑی تانیہ جس کا اچانک سر پھسلا تو پاس کھڑے وہاں نے گر لی تانیہ کو جھڑی سے پکڑ لیا تھا میں جتنی بڑی سے تانیہ کو پکڑنے اس کی سمت دوڑی تھی اب پیر سے قدم سست پڑ گئے تھے میں آہستہ سے چلتے ہوئے ان دونوں تک پہنچی تھی۔

”تم بھی مت سدر مٹا دو بچوں کی ماں بن گئی ہو مگر آج بھی تمہارا کھٹنڈا راپن نہیں گیا۔ دھیان سے چلا کرو۔“ وہاں اسے دپٹے ہوئے بولے اور وہ پاس کھڑی اپنے بچے پر انداز میں ہنسے جا رہی تھی۔

تانیہ مجھے دیکھ کر شوخی سے بولی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی۔ سہ بھائی وہیں چلے آئے۔

”اپنی بیگم کو سنبھال بچوں کی طرح گدگدے لگاتی پھرتی ہے۔“ وہاں پہنچے ہوئے انہیں بتاتے گئے۔

”ارے بھائی بچپن چلا گیا پر بچپن میں بچپن نہیں جاتا۔“ سہ بھائی کی بات پر وہاں اور تانیہ قہقہہ لگا کے ہنس دیے۔ میں زبردستی ان کے ساتھ ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

واپسی میں صحن سے برا حال تھا۔ وہاں آتے ہی سو گئے مگر بستر پر لیٹی میں نیند سے کوسوں دور تھی۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے وہی صخرہ کوم کے آجاتا کرتی ہوئی تانیہ کو وہاں کا قہمانا اتنی صحن کے باوجود بھی میں سو نہیں پا رہی تھی۔

دوسری صبح چھٹی تھی۔ وہاں دیر سے سو کر اٹھے۔ میں باہر لان میں کیاریوں میں پانی دے رہی تھی وہ وہیں چلے آئے۔

”کیا کر رہی ہو بیگم؟“

”کچھ نہیں پانی دے رہی ہوں۔ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”کل صبح آیا تھا نا۔“ وہاں کی بات پر میں چپ سی ہوگئی۔

”کیا پوچھ رہا ہوں؟“ کیاری کا معائنہ کرتے ہوئے وہاں بولے۔

”جی بہت آیا۔ میں ناشتا بنا کے لے آؤں۔“ میں جلدی سے بچن کی جانب بڑھ گئی۔

ناشتا بناتے ہوئے میرے دماغ میں پتا نہیں کیا کیا چل رہا تھا جسے میں کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔ آج شام میں سہ بھائی نے بولا تھا اپنے گھر آنے کا مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ کوئی بہانہ کر دوں گی اور شام میں جب وہاں نے مجھ سے ملنے کا کہا تو میں نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر دیا جس پر وہ کافی کراہتا ہوا رہے تھے اور مستقبل مجھے اپنا خیال نہ رکھنے پر زور دے رہے تھے۔ مجھے ان کا یہ انداز بدو مصنوعی سا لگ رہا تھا۔ میں صحن سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

ہماری شادی کی سالگرہ آ رہی تھی ہم دونوں ہی اپنی شادی کی سالگرہ اکیلے مناتے تھے۔۔۔۔۔ جس دن شادی کی سالگرہ تھی میں پکا پکا تیار ہو کر بیڈروم سے باہر تھی کہ سامنے سے آئی۔ تانیہ نظر آگئی۔ اس نے آسانی رنگ کی ساڑی زیب تن کی ہوئی تھی۔ وہ بلاشبہ پھر الگ رہی تھی۔

”شادی کی سالگرہ مبارک ہو بہنا۔“ میرے گلے سے لگتے ہوئے مجھے پیار کر کے وہ بولی۔

”کیسا لگا سر پر اتنا وہاں!“ سہ بھائی داخل ہوتے ہوئے بولے۔

”بہت اچھا۔“ میں زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

آج مجھے اداکاری کے مطلب سمجھا رہے تھے۔

”ہم تو آتے ہوئے بھگ رہے تھے پر وہاں کا اصرار تھا کہ ہم بھی آپ کی خوشی میں شامل ہوں کھانے کے بعد بیوی لادیں میں بیٹھے باتوں کے دوران سہ بھائی بولے۔

”اچھا کیا نا آگئے۔“ میں میرے مرے انداز میں بولی۔ میرے لہجے میں گرم جوش منظور تھی۔

”جب وہاں نے بولا آئے گا تو ہماری بیگم تو بس تیار چلنے کے لیے۔“ سہ بھائی پہنچے ہوئے تانیہ کو دیکھ کر بولے۔

”جی ایسا لگ رہا ہے تانیہ کی شادی کی سالگرہ ہے۔“ پہنچے ہوئے میرے لبوں سے نکلا جس پر پاس بیٹھے وہاں نے

”میں نے کیا دل دکھایا ہے؟“ میرے سوال پر وہ مجھے دیکھنے لگے۔

”یہ تم خود سے پوچھو شک تعلقات کو کھاجاتا ہے، یہ بات میں ابھی سے نہیں کب سے سمجھاتا آرہا ہوں۔“ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ میں خاموشی آستان پر پھیلی سیاعی کو دیکھنے لگی۔ مجھے وہ سیاہی تانیہ لگ رہی تھی جو میری جتنی ہستی زندگی پر چھاری تھی۔

میں خود بہ خود تانیہ سے کھینچنے لگی تھی۔ میں نے اس کے ہاں آنا جانا کم کر دیا تھا میں چاہتی تھی وہ بھی میرے ہاں آنا کم کر دے مگر وہ اسی تسلسل سے آئی اور ہر بار میرے نہ آنے کا شکوہ کرتی۔

سردیاں آرہی تھیں اور میرے لاکھ بھانے بھانے کے باوجود وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کے شاپنگ پر لے گئی تھی۔ مجھے اس کی من مانی پر غصہ بھی آرہا تھا مگر میں ضبط کی ہوئی تھی۔ شاپنگ کے بعد وہ مجھے لے کر فوڈ کورٹ آگئی حالانکہ میرا دل قصاب مگر جاؤں۔ آئس کریم کھاتے ہوئے وہ ہلاکتان بول رہی تھی۔ اس کے اس طرح سے بولنے پر مجھے کوفت ہو رہی تھی۔

”ایک بات پوچھوں تانیہ؟“ میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی جو پہلے رنگ کا سوٹ پہنی ہوئی بہت فریٹ لگ رہی تھی۔

”ہاں پوچھو تم کو کب سے اجازت کی ضرورت پڑ گئی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا تم دونوں بہت محبت کرتے تھے ایک دوسرے سے میرا مطلب وہاں اور تم؟“ میں کچھ مجھکتے ہوئے بولی۔

میرے سوال پر ایک لمحے کے لیے تانیہ کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی مگر پھر وہ میری بات پر خوب ہنسنے لگی۔

مجھے اس کی ہنسی سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میری بے بسی کے حشرے لے رہی ہو۔

”ہاں بہت تھی۔“ وہ صاف گئی سے بولی۔ اس کی بات پر میں عجیب دھشت زدہ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”جب ہمارے بدوں نے اس رشتے کو ختم کیا تھا، میں بھی بہت افسردہ تھی اور وہاں بھی بہت دھکی تھا مگر میں امریکا چلی گئی اور کچھ عرصے بعد سحر سے میری شادی ہوگئی اور وہ جو دکھ تھا تکلیف اس لمحے ختم ہوگئی تھی جب میں نے قبول ہے کہا تھا، اللہ پاک نے نکاح کے بولوں میں بڑی

مجھے چونک کے دیکھا مگر تانیہ اور سحر بھائی میری بات پر خوب ہنسے۔

”دیکھا میں نے بولا تھا تانیہ بھائی بولیں گی تمہاری شادی کی سالگرہ ہے جتنی تم تیار ہو کر آ رہی ہو۔“ سحر بھائی تانیہ کو جھپٹنے لگے۔

”مجھے مزہ آتا ہے دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشیوں کی طرح سیلیٹرٹ کرنے کا۔ اپنی خوشی پر تو ہر کوئی خوش ہو لیتا ہے مزہ تو دوسرے کی خوشی کو بھی محسوس کرنے کا ہے اور یہاں بات تو میری بہن کی خوشی کی ہے۔“ تانیہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی بعض اوقات تو مجھے لگتا تھا کہ اس نے کسی کو نہ مسکراہٹ کو چپکا لیا ہے۔

”تم نے تانیہ اور سحر بھائی کا گفت نہیں دیکھا؟“ ان کے جانے کے بعد جب میں بیچ کر کے ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو بیڈ پر بیٹھے وہاں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

”دیکھ لوں گی۔“ میں بے دلی سے بولتی ہوئی بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

”کیا ہوا میونہ۔“ وہاں حیرانگی سے بولے۔

”کچھ نہیں۔“ میں جھجھلاتے ہوئے بولی۔

”ایسے کیوں بول رہی ہو کوئی بات ہے کیا؟“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولے۔

”کیا ضرورت تھی تانیہ سحر بھائی کو بلانے کی، اور وہ تانیہ، ایسے بن نہیں کے آگئی جیسے اس کی شادی کی سالگرہ ہو۔“ تانیہ کا سراپا میری نظروں میں گھوما تو میرا داغ محسوس کیا۔

وہاں افسوس سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”بہت افسوس کی بات ہے تم بے سوچ رہ گئی ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ وہاں ملال سے بولے اور خاموشی سے لیٹ کر دوسری جانب کروٹ لے لی۔

میں بھی جلتی جھنپتی سرنے کی کوشش کرنے لگی۔ صبح وہاں بغیر ناشتے کے چلے گئے۔ مجھے بے تحاشہ تانیہ پر غصہ آیا جس کی وجہ سے میرا شوہر مجھ سے ناراض ہوا تھا۔

شام کو واپس آئے مگر مجھے بالکل نظر انداز کر دیا۔

”وہ اتنی اہم ہے کہ اس کی وجہ سے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔“ میں سکتی ہوئی ٹیڑس میں چلی آئی۔

”وہ اہم نہیں ہے میرے لیے جو اہم ہے اس کی بات نے دل دکھایا ہے میرا۔“ وہاں سنجیدگی سے بولے۔

تھی۔ مجھے تانیہ اس چتر کی مانند لگی تھی جو ہماری پرسکون جمیل میں ارتعاش لے لے کر تھی۔

سعد بھائی کسی کام سے امریکا گئے ہوئے تھے۔ میں چاہتی تھی تانیہ بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی خود کو گھر میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

”میں کل شہر سے باہر جا رہا ہوں دو دن کے لیے آفس کا کام ہے۔“ وہاں بولے۔
”میں اکیلی ہو جاؤں گی۔“

”ای کے ہاں چلی جانا یا ان کو بلا لیتا۔“ انہوں نے جان کے تانیہ کا نام نہیں لیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے میں بھڑک جاؤں گی۔

”جی ان کی بات پر میں اثبات میں سر ہلانے لگی اور اگلے دن وہاں چلے گئے۔ ان کے بغیر میرا وقت گزر کے نہ دے رہا تھا۔“

وقت لگ رہا تھا ختم سا گیا تھا۔ اگلی شام میں سلسلہ بندی سے بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کل صبح وہاں آجائیں گے۔ تانیہ کا وقت کیسے گزرتا ہوگا مجھے تو دو دن میں ہی ایسا محسوس ہو رہا ہے میں تانیہ کی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ اچانک مجھے تانیہ کا خیال آیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گئی اور دو چاہت ٹائم ہو گیا اس سے لے ہوئے کیوں نہ جا کر تھوڑی دیر کپ شگ لالوں۔ میں تیار ہو کر اس کے گھر کی جانب چل دی۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا مگر کارپورج پر نظر پڑتے ہی میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ وہاں کی گاڑی دیکھ کے مجھے بہت زور سے چکر آیا۔ دل نے کہا میں اندر جا کر وہاں اور تانیہ کو کہیں نہیں کر ڈالوں مگر میں لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چلی۔

وہ رات میں نے انگڑوں پر گزاری تھی اپنے دل کا خون ہوتے دیکھ کر میں پوری رات سستی رہی۔

اگلی صبح وہاں واپس آ گئے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے کام میں لگی رہی۔ کسی کام سے میں بیڈروم میں داخل ہوئی کہ وہاں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کیا ہو گیا، جب سے آیا ہوں تب سے مصروف ہو شوہر کو بھی دیکھ لو۔“ وہ فکھوہ کرتے ہوئے بولے۔ ”دیکھو میں کیا لایا ہوں تمہارے لیے۔“ وہ سائینڈیکل پر سے ڈبہ اٹھاتے ہوئے بولے۔

”بدنامی۔ داغ۔ دھوکا۔“ میں چپاچپا کے بولی۔
وہاں کے ہاتھ سے ڈبہ گر گیا۔ ”کیا مطلب؟“ وہاں کے ماتھے پر تل آ گئے۔

طاقت رکھی ہے۔ درحقیقت میرا جوڑ ہی اللہ نے سعد کے ساتھ بنایا تھا اس لیے میری شادی وہاں سے کیے ہوئی۔ وہاں سے محبت اس محبت کا ایک حصہ بھی نہیں تھی جتنی مجھے سعد سے شادی کے بعد ہوئی۔ کہتے ہیں تاہم کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ مصلحت یہی تھی کہ وہاں سے شادی ٹوٹی تو مجھے بہن بھی اپنی تمہارے روپ میں اتنی پیاری۔“ وہ سادگی سے بولتی ہوئی آخر میں شوخ ہوئی۔ میں اس کی بات پر لاجواب سی ہوئی مگر وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ضرورت تھی تانیہ سے ایسے سوال کی۔“ میں الماری صاف کر رہی تھی کہ وہاں کمرے میں آتے ہوئے بولے۔

”کیا سوال میں سمجھ نہیں؟“

”بھئی کہ ہمارے درمیان کتنی محبت تھی۔“ وہاں کی بات پر مجھے تانیہ کی چالاکی پر غصہ آیا۔ ”اس نے آپ سے لگا بھی دی۔“ میرے سامنے کیسے بن کے بول رہی تھی مجھے سوچ کے ہی اس کے میسے پن پر غصہ آ رہا تھا۔

”اس نے کچھ نہیں لگائی۔“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں خیال کیوں نہیں رکھتا کیونکہ اس کے بقول اس نے تمہاری آنکھوں میں اداسی دیکھی ہے۔ میں نے پوچھا تو وہ مجھے بتانے لگی کہ تم یہ سوال کرتے ہوئے بہت اداس تھی۔ اس نے مجھے صرف ڈانٹا ہے کہ تمہارا خیال رکھوں اور کچھ بھی نہیں۔“ وہاں اس کی صفائی میں بولے۔

”ہاں بہت ایسے سے خیال رکھنے کو کہا۔ لگا بھی دی اور ساتھ ساتھ اچھی بھی بن گئی تڑم!“ میں تنک کے بولی۔
”اس نے مجھے تم سے کہنے سے منع کیا تھا مگر تم میری بیوی ہو میں صرف تم سے یہ بول رہا ہوں کہ ایسے سوال کرنا مناسب نہیں ہوتا۔“ وہاں نرمی سے بولے۔

ان کی بات پر میں کپڑے ہنچتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

کس قدر شاطر عورت ہے میرے سامنے کیسی بن رہی تھی اور وہاں سے میری باتیں بھی لگاؤں مکار فرہی میں نے نفرت سے زیر لب کہا۔
آہستہ آہستہ میں سمجھتی چلی گئی۔ میرا سمجھنا تانیہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ شروع میں تو وہ خود ہی آتی رہی پھر آہستہ آہستہ وہ بھی پیچھے ہٹنے لگی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

وہاں کے انداز میں مجھے اب وہ بات نظر نہیں آتی

”مجھے طلاق چاہیے میں ایک بدکردار بھولے آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ میں منہ پر ہاتھ رکھے غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

”میں بدکردار ہوں۔“ وہاں صدمے کی کیفیت میں بولے۔

”ہاں ہاں آپ بدکردار ہیں۔“ میں غریبانی انداز میں چیخی۔ میری بات پر لب بلیجی کے وہاں نے آنکھیں بند کر لیں اور جب بولے تو ان کی آواز کی گونج میرے دل پر ہتھوڑے کی مانند برسی۔

”میں وہاں احمد بھائی ہوش و حواس تم کو طلاق دیتا ہوں۔“ تین بار کہنے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول کے ایک نظر مجھے دیکھا اس ایک نظر میں زمانے بھر کی اجنبیت تھی۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کے تیزی سے نکل گئے اور میں خاموشی سے وہیں قالین پر گھٹنوں کے بل گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

کمرے میں اب بس خاموشی تھی۔ طوفان گزر چکا تھا اور میرے ارد گرد سوائے خاموشی کے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے اس پوزیشن میں بیٹھے بچانے کتنے گھنٹے بیت گئے تھے کہ اس خاموشی کو بل فون پر آنے والی کال نے توڑا۔ میں نے نمبر دیکھے بنا کال اٹھائی۔

”ہیلو میونہ میں ڈرائیور کو بھیج رہی ہوں وہاں کی گاڑی لے کر اور اپنی منگوا رہی ہوں۔ دراصل ہمارے گھر کے پاس وہاں کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور اس میں کچھ کام بھی تھا تو میں نے وہاں کو بولا میری گاڑی لے جاؤ میں ملکیٹک سے ٹھیک کروالوں کی کل شام علی ٹھیک ہو کر آئی تھی۔“ تانیہ اور بھی بچانے کیا کیا بول رہی تھی میرے ہاتھ سے بل فون نیچے کر آ اور میں نے کچھ باہر کی جانب بھاگی تھی۔ گلی میں سوائے رات کے سنائے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ دور دور تک بس اندھیرا تھا۔ میں تجھے ہارے قدموں سے واپس گھر کی جانب پٹی۔ میرا حال اس ہارے ہوئے جواری جیسا تھا جو اپنی ذمہ داری ہار گیا تھا۔ اپنے شک کے ہاتھوں۔ میری ذمہ داری میں اب ملال اور پچھتاوے کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میری نظر کھلے ڈبے پر پڑی جس میں سونے کے دو ٹکڑن جگمگا رہے تھے میں وہیں بیٹھ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”مسٹر وہاں آپ کی اصلیت کھل کے سامنے آگئی ہے۔“ میں سر دلچے میں بولی۔

”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“ وہاں کے انجان بننے پر میرے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”کہاں تھے آپ پچھلے دو دن سے۔“ میں مٹھر سے بولی۔

”کہاں تھا، کیا شہر سے باہر تھا۔“ وہاں حیرانگی سے بولے۔ ان کی اس اداکاری پر میرا خون کھول گیا۔

”ماننا پڑے گا بلکہ داد دینی چاہیے آپ کی اداکاری کو اور اس تانیہ پر شاباش ہے۔ شوہر گئے جاتے ہی پھوٹ ل گئی۔“

میرے بولنے پر وہاں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ”تم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں نے خود اس کے گھر کل شام آپ کی گاڑی کھڑی دیکھی ہے۔ پچھلے دو دن سے کون سے شہر تھے مجھے پتا چل گیا ہے۔“ میں غصے میں وہاں کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو میری سنو تو۔“ وہاں چیخنے ہوئے بولے

”میں جو کہہ چکی ہوں اس کے بعد سننے کی محنتیں نہیں وہاں صاحب!“ میں نفرت سے بولی۔

”بعض اوقات جو آنکھوں کو نظر آتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی تب ہی بول رہا ہوں۔ کل سے سن کو رو نہ بعد میں پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”میں نے جتنا پچھتاوا تھا پچھتا ہی اب اس سے زیادہ کی محنتیں نہیں میں ایک بدکردار مرد کے ساتھ نہیں رہوں گی۔“

”بس ایک لفظ نہیں!“ میری بات پر وہاں غصے سے چبچے۔

”کیوں برا لگ رہا ہے آپ بھی بدکار اور آپ کی تانیہ بھی بدکار۔“ میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولی۔

میرے صبر کا پیمانہ گریز بہر ہو رہا تھا۔ میری بات پر وہاں نے میرے منہ پر کھچ کر تھپڑ مارا۔

”تھپڑ مجھے بہت پہلے مار دینا چاہیے تھا مجھے انہوں نے پچھتاوا کیا نہیں ہے، تم جیسی عورت سے میری شادی ہوئی جس کی رگوں میں زہر کی طرح شک دوڑتا ہے وہاں نفرت سے بولے۔



URDU TUBE

www.urdutube.com

پدلہ

محترم معراج رسول

السلام علیکم!

میں نے اپنی زندگی کی کتاب کھول دی ہے لیکن انداز تحریر میں تھوڑی سی جدت پیدا کی ہے۔ بجائے آپ بیٹی کے کہانیوں والا انداز اختیار کیا ہے۔ امید ہے قارئین پسند کریں گے۔

ڈاکٹر ساجدہ

(ملتان)

روٹی کی بھوک ہڑتال کو چھوٹیں کہنے ہو چکے تھے۔ اس نے کمر انداز سے بند کیا ہوا تھا اور کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ ساجدہ مسلسل دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ریحان بھی اپنی سی کوشش کر چکے تھے۔ آیا جس نے روٹی کو گود میں کھلایا اور ابھی تک وہی اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اس نے بھی منت سماجت کر کے دیکھ لی لیکن روٹی پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ ساجدہ کا خیال تھا کہ اس کا غصہ وقتی ہے جب بھوک ناقابل برداشت ہو جائے گی تو اسے مجبوراً کمرے سے باہر آنا پڑے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بھوک پیاسی کرا

بند کیے بیٹھی تھی۔ اب تو ساجدہ کو بھی تشویش ہونے لگی کہ کہیں اس کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی جسے انہوں نے بڑے ناز و رحم سے پالا تھا۔ ماں باپ کے بے جا لاڈ و پیار نے اسے ضدی اور خود سر بنادیا تھا، جس بات پر اڑ جاتی وہ اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی لیکن اس مرتبہ اس نے جو ضد کی اسے پورا کرنا ساجدہ کے بس میں نہیں تھا۔ اسی پر ماں بیٹی میں ٹھن گئی اور روبی نے احتجاجاً کھانا پینا چھوڑ دیا۔

روبی میڈیکل کالج میں آخری سال کی طالبہ تھی اور اپنے ایک کلاس فیلو اسد میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اسد کے والد انگلینڈ میں ڈاکٹر تھے اور وہ یہاں اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس رہ رہا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا کہ اس کے والدین میں غصہ کی ہو گئی۔ اسد کے والد اس واقعے کے بعد دل برداشتہ ہو کر انگلینڈ چلے گئے اور انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اسد کو مری کے اسکول میں داخل کرادیا گیا لیکن اسے پوری بات نہیں بتائی گئی۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے والد سال میں ایک مرتبہ پاکستان آتے اور اس کے ساتھ ایک مہینہ گزار کر چلے جاتے، باقی وقت چھوٹی اس کی دیکھ بھال کرتیں۔

اسد کا ارادہ ایم بی بی ایس کے بعد انگلینڈ جا کر ایف آری ایس کرنے کا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے روبی سے اس کی شادی ہو جائے تاکہ وہ بھی اس کے ساتھ انگلینڈ جا سکے۔ روبی نے جب اپنی ماں سے اسد کا ذکر کیا تو وہ شش پونچ میں پڑ گئی۔ وہ دراصل بیٹی کو اتنی دور نہیں بھیجنا چاہتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ شادی کے بعد بھی روبی اسی شہر میں اس کی نظروں کے سامنے رہے جب کہ روبی دل سے چاہتی تھی کہ وہ اسد کے ساتھ انگلینڈ چلی جائے تاکہ اس کی ایف آری ایس کرنے کی دیرینہ خواہش پوری ہو سکے۔

بالآخر روبی کے بے حد اصرار پر ساجدہ نے اس سے ملنے پر رضامندی ظاہر کر دی اور روبی سے کہا کہ وہ کسی دن اسد کو جانے پر بلا لے۔ ساجدہ اور اس کا شوہر احسن دونوں ہی اسپیشلسٹ تھے اور ان کی بھی خواہش تھی کہ روبی ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اسپیشلائز کرے۔ اگر اسد کے ساتھ اس کی شادی ہو جاتی ہے تو روبی کے لیے اس منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

اسد ہر لحاظ سے ایک موزوں امیدوار تھا۔ ساجدہ اور احسن اس سے مل کر مطمئن ہو گئے۔ انہیں روبی کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ساجدہ نے بیٹی سے کہہ دیا کہ وہ مطمئن ہو کر اپنی بڑھائی پر توجہ دے۔ جب اسد کے ڈیڈی انگلینڈ سے آئیں گے تو ان کا رشتہ طے کر دیا جائے گا۔ روبی نے یہ خبر اسد کو سنائی تو وہ بھی یکے سو ہو گیا۔ بھلا ہر اب ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اسد نے اپنی چھوٹی کوری کے بارے میں بتایا تو انہوں نے اسے یہی شہرہ دیا کہ فی الوقت وہ امتحان کی تیاری کرے۔ باقی باتیں اس کے باپ کے آئے پر ہوں گی۔ حالانکہ ان کی اپنی لڑکی بھی اسد کی ہم عمر تھی اور ان کی ولی خواہش تھی کہ بھتیجا ان کا داماد بن جائے لیکن جب انہوں نے اسد کا رجحان روبی کی طرف دیکھا تو خاموش ہو گئیں۔

اسد کے ڈیڈی چینیوں میں پاکستان آئے تو چھوٹی نے انہیں اسد کی پسند کے بارے میں بتایا جب انہوں نے لڑکی کے والدین کے بارے میں پوچھا تو ساجدہ کا نام سن کر چونک گئے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھی ڈاکٹر ہے تو انہیں کوئی شہر نہیں رہا۔ ڈاکٹر ساجدہ ان کے لیے اچھی نہیں تھی اس لیے وہ خوشی اس کے گھر جانے پر تیار ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ ڈاکٹر ساجدہ پرانے تعلقات کے پیش نظر انہیں مایوس نہیں کرے گی۔

اسد نے روبی کو بتا دیا کہ اس کے ڈیڈی انگلینڈ سے آگئے ہیں اور وہ اس کے والدین سے ملنے اس کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ روبی نے ساجدہ کو یہ بات بتائی تو اس نے انہیں اتوار کی شام جانے پر بلا لیا۔ وقت مقررہ پر اسد کے ڈیڈی ندیم احمد اور اسد ان کے یہاں پہنچے تو ساجدہ انہیں دیکھ کر چونک گئی۔ ماضی اور اس سے جڑی ہر یاد اس کے سامنے آ گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ندیم۔ یہ تم ہو۔“

”ہاں ساجدہ۔ میں ندیم ہی ہوں دیکھ لو قسمت نے ہمیں کس موڑ پر ملا یا ہے۔“

”ہاں۔ ساجدہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”تقدیر ہمیشہ ایسا ہی مذاق کرتی ہے۔“

روبی اور اسد حیران تھے کہ ساجدہ کو اچانک کیا ہو گیا اگر وہ ندیم کو پہلے سے جانتی تھی تو یہ بے چینی کیسی؟ اسد نے ماحول کو خوش گواری بنانے کی خاطر کہا۔ ”آپ

ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“
”ہاں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔“ ساجدہ نے تنگی سے کہا۔

ندیم سمجھ گیا کہ وہ ابھی تک برائی باتوں کو دل سے لگائے بیٹھی ہے لیکن وہ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر اس کی ہر بات سننے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔ ساجدہ نے رکھائی سے جواب دیا۔
”اس عزت افزائی کا شکریہ۔ میں احسن سے مشورہ کر کے تمہیں جواب دوں گی۔“

ان لوگوں کے جانے کے بعد احسن نے ساجدہ سے پوچھا۔ ”تم نے انہیں کیوں ٹال دیا۔ لڑکے کو تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں اور اب یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ندیم کا بیٹا ہے۔ مزید مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کاش وہ ندیم کا بیٹا نہ ہوتا۔“ ساجدہ نے شخصہ کی سانس لیتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات کافی گزر چکی تھی لیکن ساجدہ کی آنکھوں میں نیند کا کہیں چٹائیں نہیں تھا۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے کروٹیں بدل رہی تھی اور اس کے ذہن کی اسکرین پر ماضی کے واقعات کی فلم چل رہی تھی۔ یہ ماضی اس سے جو بک کی طرح چٹ گیا تھا وہ جتنا اسے بھلانے کی کوشش کرتی تو وہ اسی شدت سے اس کے دماغ کی اسکرین پر ابھر رہا تھا۔

اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ میڈیکل کالج میں داخلہ ملنے کے بعد پہلے روز کلاس اینڈ کرنے پہنچی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فرسٹ ایئر کی کلاس کس کمرے میں ہو رہی ہے۔ اس نے دو تین لڑکوں سے پوچھا لیکن وہ اسے مس کاغیذ کرتے رہے۔ ایک لڑکے نے تو اسے ٹو اٹکٹ کا راستہ بتا دیا۔ وہ پریشان صورت بنا کر گیلری میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑی کی کہ اسے ندیم مراد نے ٹو اٹکٹ سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ساجدہ کے چہرے پر اڑائی ہوئی ہوائیاں دیکھ کر وہ رک گیا اور اس کے قریب آ کر بولا۔ ”کیا بات ہے مس۔ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“

”وہ..... وہ..... دراصل مجھے فرسٹ ایئر کی کلاس میں جانا ہے لیکن کوئی بتا ہی نہیں رہا کہ کون سا کمرہ ہے۔ سب ادھر ادھر بیٹھا ہے۔“

”آپ کو شاید معلوم نہیں کہ پہلے روز اسی طرح کا مذاق کیا جاتا ہے۔ اسے فرسٹ ایئر ٹول کہتے ہیں۔“

آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“
ساجدہ کو اس کے چہرے پر شرافت اور تنجید کی نظر آئی اس لیے وہ اعتبار کر کے اس کے ہمراہ چل دی۔
کلاس روم کے دروازے پر پہنچ کر اس نے سر کوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”آج دن بھر یہی ہوتا رہے گا اس لیے مزید پریشانی سے بچنے کے لیے آپ میرے ساتھ ہی رہیں۔“
اگلا ہی ریزہ خالی تھا۔ وہ ساجدہ کو کینٹین لے کر آیا اور چائے سموسوں سے اس کی تواضع کی۔ اس طرح پہلے دن ہی ان کے درمیان دوستی ہو گئی۔ ساجدہ نے گزرا کاغذ سے اٹھ کر کیا تھا اس لیے کسی لڑکے کے ساتھ دوستی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ گوکہ بعد میں اس کی دوسری لڑکیوں سے بھی دوستی ہو گئی لیکن ان سے صرف ہائے پہلو کا ہی تعلق رہا جب کہ ندیم سے اسے بہت پھوٹ ملتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ لائبریری میں بیٹھ کر نوٹس بنواتا۔ اسے اپنے نوٹس کاپی کرنے کے لیے دیتا اور جب وہ گھر جانے کے لیے پوائنٹ کی بس کا رخ کرتی تو وہ کچھ قاصر رکھ کر اس کے ساتھ چلتا رہتا اور اسے بس میں سوار کرانے کے بعد اپنی بس پر جاتا۔

ان بائیس سالوں کے درمیان کئی لڑکوں نے ساجدہ کے قریب آنے کی کوشش کی لیکن اس نے کسی کو منہ نہیں لگایا۔ یہ بات نہیں کہ اسے لڑکوں سے کوئی الگ تھی مگر وہ غیر روحانی اور غیر جذباتی لڑکی تھی، چاہے جانے کی خواہش اسے بھی تھی لیکن وہ اپنا بولی بھلی پر نہیں لے پھر رہی تھی۔ وہ کالج میں بڑے آئی تھی، دوستیاں اور فلرٹ کرنے نہیں۔ البتہ ندیم کے ساتھ اس کا خلوص کا رشتہ تھا۔ وہ اس کا دوست، مددگار اور محافظ سب کچھ تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی حالانکہ ندیم اسے پسند تھا اور اگر وہ اسے پروپوز کرتا تو شاید وہ اس کا ہاتھ تھام لیتی لیکن شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا اور ندیم نے بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان دونوں کو ایک ساتھ ہاؤس چاہ کرنے کا موقع ملا۔ اس ایک سال کے دوران وہ دونوں مزید قریب آ گئے۔ بعض اوقات مریضوں کی بہتات، چیخ و نکار اور بحث مباحثہ سے وہ تنگ آ جاتی تو ندیم بھی اس کی مدد کرتا۔ خاص طور پر ایمر جنسی وارڈ میں تو صورت حال بہت زیادہ خراب تھی۔ مریض سے زیادہ ان کے لواحقین تنگ کرتے تھے۔ ہر

یوں سمجھو کہ انہوں نے اپنی زندگی میرے لیے وقف کر دی ہے۔“

”اوہ“ ساجدہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”پھر تو والدہ سے اچھی انٹرا سٹینڈنگ ہوگی۔“

”ظاہر ہے، میرے لیے وہی سب کچھ ہیں اور ان کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔“

”مدر بوائے“ ساجدہ نے دل میں کہا پھر منافقانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ”میں اسپیشلائزیشن کر رہی ہوں، تم نے اس بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”خواہش تو میری بھی ہے لیکن میں ماں پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ پہلے کچھ پیسے جمع کر لوں پھر اس بارے میں سوچوں گا۔“

اس دن کے بعد ساجدہ نے سائے کی طرح ندیم کا چھٹا کرنا شروع کر دیا۔ وہ اسپتال میں پورے وقت اس کے ساتھ رہتی۔ اکثر وہ اسے چمک کے لیے اپنے ساتھ کسی ریسٹوران میں لے جاتی۔ اس کے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بناتی۔ دوسرے ڈاکٹرز سے اس کی یہ سرگرمیاں چھپی نہ رہ سکیں اور وہ دبے دبے لفظوں میں اس کے بارے میں چیمبرگیاں کرنے لگے۔ جب ساجھی ڈاکٹرز اسے ندیم کا نام لے کر چیمبر میں تو اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو جاتا۔ اس نے بھی یہ نہیں کہا کہ ندیم سے اس کا کوئی انجیر نہیں ہے بلکہ وہ ان کی چیمبر چھاؤں کر خوش ہوئی اور اس کا دل چاہتا کہ وہ ایسی باتیں ندیم سے بھی کریں۔

ایک دن ڈاکٹر احسن نے اسے بچ پر مدعو کیا تو وہ ندیم کو جملانے کے لیے جان بوجھ کر ان کے ساتھ چلی گئی تاکہ اس کے اندر رقابت کا جذبہ پیدا ہو اور وہ خطرے کی بو سن گھٹتے ہوئے اسے پرو پوز کر دے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ندیم نے اس کا کوئی ٹوئس نہ لیا جیسے اس کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ادھر ڈاکٹر احسن نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کھانے کے دوران کچھ ایسی باتیں شروع کر دیں جو اسے ناگوار کر دیں۔ انہوں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا۔

”ڈاکٹر ساجدہ! آپ نے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

ایک یہی چاہتا تھا کہ اس کے مریض کو پہلے دیکھا جائے۔ اپنے میں وہ ندیم کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتی تو وہ آگے بڑھ کر معاملہ سنہال لیتا۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ اگر ندیم اس کے ساتھ نہ ہوتا تو اس کے لیے یہ ڈیوٹی کرنا مشکل ہو جاتا۔

ہاؤس جاب ختم ہونے کے بعد اتفاق سے دونوں کو ایک ہی اسپتال میں ملازمت مل گئی۔ ان کی ڈیوٹی بھی ایک ہی وارڈ میں تھی۔ ڈاکٹر زروم میں بیٹھ کر وہ دونوں ایک ساتھ چائے پیتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات دوسرے ڈاکٹرز بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ ان میں ڈاکٹر احسن بھی تھا۔ ساجدہ نے اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک دیکھی تو وہ جھٹکا ہوئی کیونکہ اس نے تو اپنی آنکھوں میں ندیم کے خواب سجا رکھے تھے اور وہ اچھے بیٹھے اسی کے بارے میں سوچا کرتی لیکن ندیم کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔

ادھر گھر والوں کی طرف سے اس پر شادی کے لیے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کے کئی اچھے رشتے آچکے تھے لیکن وہ بہانے بہانے سب کو ٹال رہی تھی۔ جب گھر والوں کا اصرار حد سے بڑھا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد شادی کرے گی۔ صرف ایم بی بی ایس کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اماں نے یہ سن کر سر پیٹ لیا اور اس دن کو کوٹنے لگیں جب اسے میڈیکل میں داخلہ دلایا تھا۔

اسپیشلائزیشن تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ ڈاکٹر ندیم کے پرو پوزل کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک دن کھانے کے وقت میں وہ اور ڈاکٹر ندیم اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہ ساجدہ نے محض اسے کریدنے کی خاطر اس سے پوچھا۔ ”ندیم! تم نے آج تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ ”کیا جانا چاہتی ہو؟“ ندیم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ گھر میں تمہارے علاوہ اور کون کون ہے۔ تم کتنے بہن بھائی ہو، والد کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔“ ”اوہ تم نے تو ایک سانس میں کتنے سوال پوچھ لیے تو سنو۔ میں اپنے والدین کی اگلی اولاد ہوں۔ والد کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ نے ہی پال پوس کر مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ وہ ایک کان میں پھر رہی ہیں۔

وہ اس سوال کی تہہ میں چھپا ہوا اشارہ سمجھ گئی اور بڑی خوب صورتی سے بات کو لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”سارا اسپتال جانتا ہے کہ میں اسپتال ٹرینیشن کر رہی ہوں۔ کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں؟“

”اوتو، میرا مطلب ہے کہ شادی کے بارے میں۔“

”ظاہر ہے کہ شادی تو اس کے بعد ہی ہوگی۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”اور ویسے بھی یہ سوچنا والدین کا کام ہے، میرا نہیں۔“

اس کے بعد ڈاکٹر احسن نے کوئی بات نہیں کی اور وہ دونوں کھانا کھانے کے بعد اسپتال واپس آ گئے۔ ساجدہ کا خیال تھا کہ شاید ندیم پر اس بات کا کوئی اثر ہو اور وہ ڈاکٹر احسن کو بچاؤ کھانے کے لیے پہل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ روز اس امید پر ندیم سے ملنے کی شاید وہ دل کی بات زبان پر لے آئے لیکن وہ تو شاید ہونٹوں پر قفل لگائے بیٹھا تھا۔ وہ اس سے دنیا بھر کی باتیں کرتا لیکن جو وہ سننا چاہتی تھی۔ وہی لفظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ پھر کا روز تھا۔ ندیم اتوار کی چھٹی گزرنے کے بعد اسپتال پہنچا تو کافی خوش اور ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ اسی وقت ساجدہ کو اچانک وارڈ میں جانا پڑ گیا۔ دو گھنٹے بعد واپس آئی تو ندیم دوسرے ڈاکٹر ز کے ساتھ بیٹھا جانے لگا رہا تھا۔ وہ جیسے ہی ڈاکٹر ز روم کے دروازے پر پہنچی تو اپنا نام نہن ٹھیک لگی۔ ڈاکٹر ارشد کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری گھنٹی کی خبر سن کر حیرت ہوئی۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم ڈاکٹر ساجدہ سے شادی کرو گے۔“

”ہاں ہم سب کا یہی خیال تھا۔“ ڈاکٹر روژینہ بولی۔ ”ہم ایک دوسرے کے بہت قریب بھی تو ہو۔“

”ساجدہ بہت اچھی دوست ہے اور میں اس کی رفاقت میں خوشی محسوس کرتا ہوں لیکن اس سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”جہ آخر ساجدہ میں ایسی کیا برائی ہے؟“ ڈاکٹر ارشد نے کہا۔

”تو یہ کہ۔ میں اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس سے اچھی لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔“

”کمال ہے۔ اس کی تعریفیں بھی کر رہے ہو اور اس سے شادی بھی نہیں کرتا چاہتے۔ یہ کیسا اختیار ہے؟“ ڈاکٹر ندیم بولا۔ ”میری والدہ میں چاہتیں کہ میں کسی ڈاکٹر سے شادی کروں کیونکہ وہ اپنی ڈے وار یوں کی وجہ سے گھر اور بچوں کو پوری طرح وقت نہیں دے سکے گی۔ ڈاکٹر ساجدہ کے سامنے ایک شاندار کیریئر ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری خاطر وہ اپنے کیریئر کی قربانی دے اسی لیے میری والدہ نے ایک گھریلو لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔ وہ صرف بی اے پاس ہے۔ میں بھی اس معاملے میں والدہ کا ہم خیال ہوں اور میرا خیال ہے کہ عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا چاہیے۔“

ڈاکٹر روژینہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بولی۔ ”اگر ساری عورتیں مردوں میں بیٹھ جائیں تو دنیا کا کام کیسے چلے گا۔ کیا تم یہ گوارہ کرو گے کہ تمہاری بیوی کی ڈیپوری مرد ڈاکٹر کے ہاتھوں ہو۔“

”میں عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہیں۔“ ندیم نے حسبِ عادت بڑے سکون سے کہا۔ ”صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری بیوی گھر میں رہے۔“

اس سے زیادہ سننے کی ساجدہ میں تاب نہ تھی۔ غصے سے اس کی تشنایاں سلگنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی اندر کمرے میں جا کر ندیم کے سر پر اتنے جوئے برسائے کہ اس کا ایک بال بھی باقی نہ رہے، اسے یوں لگا کہ ندیم نے صرف اس کی نہیں بلکہ اس کی ڈگری اور پروفیشن کی بھی تو چین کی ہے۔ اسے اسی ماں کا تو بڑا خیال ہے لیکن میری پروا نہیں۔ اس نے کس بے دردی سے میرے ارمانوں کا خون کر دیا۔ میں تو ایک عرصہ سے اسے اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھائے اس کی بوجا کر رہی تھی لیکن اس نے ایک ہی جھٹکے میں میرے خوابوں کا محل مسمار کر دیا۔

وہ ڈاکٹر ز روم میں جانے کی بجائے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت وہ تہائی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے واش روم میں جا کر منہ دھویا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لب اسٹک لگائی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے آپ کو نرسکون رخصتے کی کوشش کرنے لگی۔ جب اس کا دماغ اعتدال پر آیا تو وہ سوچنے لگی کہ ندیم کا اس میں کیا قصور ہے۔ صرف یہی کہ ماں کی خواہش کے احترام میں وہ ایک گھریلو لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ ہر شخص کو اپنے

”وہ کیا؟“

”ای جی ہاں ہیں کہ انگلینڈ جانے سے پہلے میری شادی ہو جائے تاکہ میں وہاں کسی گوری سے دل نہ لگا سکوں۔ نہ جانے مائیں یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ وہاں ہر لڑکی انتظار میں بیٹھی ہے۔“

”ٹھیک ہی سمجھتی ہیں۔“ ساجدہ پانی کا کھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ اب یہ ایک ٹریڈ بن گیا ہے۔ زیادہ تر لڑکے ایسا ہی کرتے ہیں۔“

”گو تاہم اے خیال میں مجھے انگلینڈ جانے سے پہلے شادی کر گئی چاہیے۔“

”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔“

”تم بھی تو اسپیشلائزیشن کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اس کا کیا بنا؟“ احسن نے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔

”ابھی ایڈمیشن کی ڈیٹ نہیں آئی۔ اسی کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”میرا تو خیال ہے کہ تم بھی انگلینڈ سے ہی کرو۔ اس کی زیادہ اہمیت ہے۔“

”وہ مر جھکاتے ہوئے بولی۔“ میرے والدین کی اتنی استطاعت نہیں کہ وہ وہاں کے اخراجات برداشت کر سکیں۔“

”اس کی بھی ایک ترکیب ہے اگر تم ناراض نہ ہونے کا وعدہ کر دو بتا دوں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کوئی ایسی بات نہیں کریں جو مجھے ناپسند ہو۔“

”پھر بھی اگر تمہیں میری بات ناگوار گزرے تو اسے نظر انداز کر دینا۔ مجھ لینا کہ میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔“

”اچھا، آپ بتائیں تو کسی وہ کیا ترکیب ہے۔“

”اگر ہم دونوں شادی کر لیں تو تم بھی میرے ساتھ انگلینڈ سے اسپیشلائزیشن کر سکتی ہو۔“

احسن کا خیال تھا کہ یہ سنتے ہی وہ غصے سے آگ بگولا ہو جائے گی اور پھر پھٹتی ہوئی رستوران سے باہر چلی جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ پرسکون انداز میں بیٹھی مسکراتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”آپ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں۔“

بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ہے اور وہ اس پر غصہ کیوں کر رہی ہے۔ کیا اس نے بے وفائی کی، دھوکا دیا، جھوٹا وعدہ کیا۔ اس نے تو سچی ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اسے پسند کرتا ہے یا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر ساجدہ نے خود ہی اپنے طور پر کوئی اُمید باندمی اور وہ پوری نہیں ہوئی تو اس کے لیے ندیم کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

اس نے ندیم کو رسا مبارک باد دی اور اس کے بعد خود ہی ان کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا۔ اب ساجدہ اس کے لیے جانے پتانی اور نہ ہی اس کے ساتھ کھانے پر جاتی۔ ان کے درمیان صرف ایک رسمی سہاقل باقی رہ گیا تھا۔ اس بات کو سبھی لوگوں نے محسوس کیا لیکن احسن کے تو دل کی گرہ کھل گئی۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ساجدہ اور ندیم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور انہوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن جب ندیم نے اپنی منگنی کی خبر سنا لی تو ندیم کو لگا کہ کائنات ٹکڑ ٹکڑ ہو گیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر قسمت آزمائے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے ایک بار پھر ساجدہ کو بچ پر چلنے کی دعوت دی، جسے اس نے بلا چوں چہرا قبول کر لیا۔ دراصل ندیم سے دور ہونے کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے شدت سے ایک ایسے دوست کی تلاش ہی جو ندیم کی جگہ لے سکے۔ ڈاکٹر احسن میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن سے کوئی لڑکی متاثر ہو سکتی ہے۔ وہ قابل، ذہین، شائستہ مزاج اور خوش پوش تھا اور نرم لہجے میں گفتگو کر کے مخاطب کو اپنا نگہ بند بنالیتا تھا۔ ساجدہ بھی اس کی ان خوبیوں کی معترف تھی لیکن ندیم کے مقابلے میں کوئی اس کی نظر میں چٹائی نہیں تھا۔ اب ندیم کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد اس کی نظر میں احسن کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہونے لگے جنہیں وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

کھانے کے دوران ہی احسن نے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی اور بولا۔ ”میں معترب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جا رہا ہوں۔“

”مبارک ہو، یہ خبر سن کر خوشی ہوئی۔“ ساجدہ نے خلوص سے کہا۔

”لیکن اس میں ایک مسئلہ آن پڑا ہے۔“

”بس ایک ہفتہ، اس سے زیادہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ امی کی دوسری جگہ میرا رشتہ طے کر دیں۔“

گھر آنے کے بعد وہ کافی دیر تک اس پر پوزل کے بارے میں سوچتی رہی۔ بظاہر اس میں اسے کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ احسن میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک لڑکی اپنے ہونے والے شوہر میں دیکھنا چاہتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے انگلیڈ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اسے شادی تو کرنا ہی تھی پھر احسن سے کیوں نہیں چنانچہ اس نے تین دن بعد ہی احسن سے کہہ دیا کہ وہ کسی بھی وقت اپنے والدین کو لے کر ان کے یہاں آ سکتا ہے۔

ساجدہ کے والدین احسن سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں وہ ہر لحاظ سے پسند آیا تھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ احسن اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلیڈ جا رہا ہے اور اپنے ساتھ ساجدہ کو بھی لے جانا چاہتا ہے تو انہیں اپنی بیٹی کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ طے پایا کہ فی الحال نکاح ہو گا اور رخصتی چھ ماہ بعد عمل میں آئے گی۔ اس دوران ساجدہ کا ایڈمیشن اور دوسری کارروائیاں بھی مکمل ہو جائیں گی۔

ساجدہ اور احسن کے نکاح کی خبر جب ندیم کو ملی تو وہ دل سسوں کر رہ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ساجدہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کی ولی خواہش تھی کہ ساجدہ اس کی شریک زندگی بن جائے لیکن ماں کا کہا اس کے لیے حرف آخر تھا۔ لہذا اسے اپنی خواہش کا گلا گھونٹنا پڑا یہی نہیں بلکہ اس کی ازدواجی زندگی بھی جہنم بن کر رہ گئی۔

ساجدہ چھ ماہ بعد احسن کے ساتھ انگلیڈ چلی گئی اور ندیم نے بھی شادی کر لی۔ اس کی بیوی شاید انتہائی بد مزاج، پھوپھو اور بدسلوکت عورت تھی۔ اس نے شادی کے ایک ماہ بعد ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ ندیم اور اس کی ماں کا خیال تھا کہ گھر پر عورت بچہ کر لائیں گے تو وہ گھر کو سنبھالے گی لیکن یہاں تو ایسی آستیں گلے پڑ گئیں۔ وہ گھر کیا سنبھالتی۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ شادی سے پہلے ندیم کی ماں اسے ناشتا بنا کر دیتی تھیں۔ شادی کے بعد بھی اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا اور ندیم کو ناشتا دینے کی ذمہ داری اب بھی اس کی ماں کو ہی نبھانی پڑ رہی تھی۔

شاید کو گھر کے کام کاج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بارہ بجے سو کر اٹھتی اور ناشتا کرنے کے بعد ٹیلی فون پر اپنے منگے والوں اور سہیلیوں سے گھنٹوں باتیں کرتی۔ اس سے کچھ وقت ملتا تو ٹیلی ویژن دیکھنے بیٹھ جاتی جب اس کی ساس نے کہا تو اس نے صاف جواب دے دیا کہ اسے کھانا پکانا نہیں آتا۔ ندیم کی ماں ریٹائر ہو چکی تھیں اور اب گھر کا سارا کام انہی کو کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ مجبوراً ایک کھانا پکانے والی کا بندوبست کرنا پڑا۔ اوپر کے کام والی ماسی پہلے سے گلی ہوئی تھی۔ ویسے بھی شاید کے آنے سے گھر کے اخراجات کافی بڑھ گئے تھے۔ اس کے کمرے کا اسی چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔ روزانہ شام کو ندیم کے ساتھ کھونٹے چلی جاتی۔ تقریباً روزانہ ہی گاڑی میں پیٹرول ڈلوانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مہینے میں دو تین مرتبہ شاپنگ کے لیے جانی اور جو چیزیں پسند آجائے وہ خرید سکتی تھی جاے اس کی ضرورت ہو یا نہیں۔ ندیم کی خواہ ان اخراجات کے لیے نا کافی تھی۔ چنانچہ مجبوراً اسے پارٹ ٹائم کلینک کرنا پڑا۔

وہ کلپو کا ٹیل بن کر رہ گیا تھا۔ صبح آٹھ سے چار بجے تک اسپتال میں ڈیوٹی کرنا، دو گھنٹے کے لیے گھر آنا اور پھر بجے کلینک پر چلے جانا جہاں سے اس کی واپسی دس گیارہ بجے تک ہوتی لیکن شاید کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی اسے تو بس اپنے اگلے تعلقوں کے لیے پیسے چاہیے تھے۔ ندیم کی ماں بیٹے کی حالت پر دن رات گڑبڑ رہتی لیکن کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں کیونکہ ذرا سی بات پر شاید ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔ اسے بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں تھا جو نہ میں آتا کہہ دیتی۔

ایک سال بعد اس کا پیدا ہوا۔ ندیم کا خیال تھا کہ بیٹے میں لگ کر اس کا دھیان بٹ جائے گا اور وہ گھر داری پر توجہ دے گی لیکن اس کی یہ امید بھی خاک میں مل گئی۔ شاید بچے کا بھی کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایار کرائی۔ صبح سے شام تک وہ بچے کو دیکھتی۔ اس کے جانے کے بعد یہ ذمہ داری ندیم اور اس کی ماں انجام دیتے۔ اگر بچہ بھی رات میں روتا تو شاید کوئی توجہ نہ دیتی اور ندیم ہی گود میں لے کر اسے ٹھہراتا۔

ندیم کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ بالکل ہی آزاد ہو گئی۔ اسے گھر کے کام کاج سے کوئی غرض تھی اور نہ بچے

کی دیکھ بھال سے واسطہ۔ یہاں تک کہ وہ بچے کو اپنا دودھ بھی نہیں پلاتی تھی اور وہ غریب ڈبے کے دودھ پر پل رہا تھا۔

ندیم کی ماں کے مرنے کے بعد ایک تبدیلی یہ آئی کہ اس کے گھر میں شاہدہ کے بیٹے والوں کی آمدورفت بڑھ گئی۔ اس کی ماں نے تو مستقل ہی ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ وہ بیٹے میں دو تین دن ضرور بیٹی کے پاس گزاریں۔ شاہدہ کا کہنا کہ بہت بڑا تھا اور اسی حساب سے اس کے کزنز کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی چلا آتا اور شاہدہ جی جان سے اس کی خاطر مدارات میں لگ جاتی۔ ندیم کو تو اسپتال اور کلینک سے ہی فرصت نہ تھی جو وہ ان باتوں پر توجہ دیتا لیکن گھر کے نوکروں کو ان بن بلائے مہمانوں کی آمدورفت بہت ناگوار گزرتی تھی خاص طور پر آیا ان سے بہت تنگ تھی کیونکہ ان کے لیے چائے پانی کا بندوبست بھی اسے ہی کرنا پڑتا تھا۔

انہی کزنز میں ایک سلمان بھی تھا۔ ندیم کی ماں کی زندگی میں تو کبھی اسے اس گھر میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن ان کے انتقال کے بعد اس کی آمدورفت بہت بڑھ گئی۔ وہ شاہدہ کا خالہ زاد تھا اور شروع سے ہی اس میں دلچسپی لے رہا تھا بلکہ شاہدہ کی خالہ اس کا رشتہ بھی لے کر آئی تھیں لیکن شاہدہ کے باپ نے انکار کر دیا کیونکہ ایک تو اس کی تعلیم واجبی سی تھی اور دوسرے اس کے کچھن بھی ٹھیک نہیں تھے۔ وہ ہیرو ٹائپ بندہ تھا ہر وقت ٹپ ٹاپ میں رہتا اور اسے یہ عزم تھا کہ ساری دنیا کی لڑکیاں اس پر مرنی ہیں۔

شاہدہ کی شادی سے پہلے ہی وہ دینی چلا گیا لیکن وہاں بھی اس کی دال نہیں گئی اور وہ چھ مہینے بعد ہی واپس آ گیا۔ دینی سے آنے کے بعد وہ شاہدہ سے ملنے آیا تو اس کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ وہ شاہدہ کے لیے ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں تنقہ میں لایا تھا جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہوئی۔ سلمان نے پہلی ہی ملاقات میں مہمان لیا کہ شاہدہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہے۔ اس نے گریڈنے کے لیے ایک دو باتیں پوچھیں تو شاہدہ پھٹ پڑی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا بتاؤں سلمان، میری تو قسمت ہی بھوت تھی۔ اس شخص سے شادی کر کے بچپتا رہی ہوں اسے نہ میری پرواہ ہے اور نہ بچے کی۔ صبح سے رات تک نوٹ چھاپنے میں لگا رہتا ہے اور میں گھر میں

ایکلی پڑی سڑتی رہتی ہوں۔ تفریح کرنا تو دور کی بات ہے پی کے گھر کی کئی مہینوں میں جاتی ہوں۔“

سلمان نے دیکھ لیا کہ لوہا گرم ہے۔ بس چوٹ لگانے کی دیر ہے۔ وہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے حالات سن کر بہت افسوس ہوا۔ حیرت ہے کہ اس نے تم جیسی حسین اور خوب صورت لڑکی کی قدر نہیں کی لیکن تم فکر نہ کرو، میں ہوں ناں، تمہیں جہاں جانا ہو مجھے بتا دیا کرو۔ میں لے جاؤں گا۔“

”اوہ سلمان، تم کتنے اچھے ہو جنہیں میرا کتنا خیال ہے اور ایک وہ ہے ندیم۔ اس نے آج تک جھوٹے منہ بھی میری تحریف نہیں کی۔“

سلمان آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”اپنی اپنی قسمت ہے۔ اگر خالو جان نے انکار نہ کیا ہوتا تو آج تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

شاہدہ جذباتی ہوتے ہوئے بولی۔ ”سچ تو یہ ہے سلمان کہ میں ابھی تک تمہیں نہیں بھول سکی کاش ہماری شادی ہو جاتی مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔“

”ہاں واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔“ سلمان بتاؤٹی انداز میں بولا۔ ”لیکن ام زلم میں تمہارے دکھ تو دور کر سکتا ہوں، خوش رہا کرو شاہدہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس پہلی ہی ملاقات میں سلمان نے اسے پوری طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ کئی روز تک نہیں آیا۔ شاہدہ روزانہ اس کا انتظار کرتی۔ بالآخر اس نے فون کر کے پوچھ ہی لیا۔

”کیا بات ہے سلمان۔ تم بہت دنوں سے نہیں آئے۔“

”اوہ ہاں، شاہدہ کچھ ضروری کاموں میں الجھ گیا تھا۔“

”پھر کب آ رہے ہو؟“

”کہو تو آج آ جاؤں؟“

”ضرور میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

اس روز شاہدہ نے خاصا اہتمام کیا۔ اس روز اس نے سیلوئس بلاؤز کے ساتھ ساڑھی پہنی۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور جرج دجج کر سلمان کا انتظار کرنے لگی۔ سلمان نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ ٹھنکی کی آواز پر شاہدہ نے دروازہ کھولا، سامنے سلمان اتھار میں پھولوں کا گلہ رستہ لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”بیوی فل، تم واقعی دنیا

”فکر نہ کرو۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔ بس تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ آئندہ جب سلمان آئے تو چپکے سے مجھے فون کر دیتا۔“

”جی بہت اچھا۔“

اس واقعے کے دوسرے دن ہی سلمان پھر آگیا۔ آئیے فوراً ہی ندیم کو فون کر دیا، جواب میں ندیم نے کہا کہ وہ گیسٹ اور باہر کا دروازہ کھلا رکھے۔ وہ چندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہے۔ اتفاق سے اس دن ڈرائنگ روم کا اے سی خراب تھا اس لیے شاہدہ اپنے سہبان کو لے کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ آئیے کے ساتھ لاؤنچ میں کھیل رہی تھی۔ ندیم گھر پہنچا تو اس نے اشارے سے بتایا کہ دونوں بیڈروم میں ہیں۔

ندیم بے دھڑک دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شاہدہ اور سلمان بیڈر برابر برابر نیم دراز تھے۔ سلمان نے ایک ہاتھ شاہدہ کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیر رہا تھا۔ ندیم کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں پھلکا گئے۔ سلمان نے اپنے کی گوشش کی تو ندیم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بولا۔ ”کھل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بیڈروم میں میرے علاوہ کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔“

”تم..... تم..... اس وقت کیسے آ گئے؟“ شاہدہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”چپک بک بھول گیا تھا۔ وہی لینے آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے الماری سے چپک بک نکالی اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”او کے کیری آن کرے کرو۔“

اس کے جانے کے بعد شاہدہ بولی۔ ”اب کیا ہوگا سلمان۔ اس نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ سلمان ہنستے ہوئے بولا۔

”شرف آدمی ہے۔ اپنی عزت کے ڈر سے خاموش رہے گا۔“

”وہ مجھے طلاق بھی دے سکتا ہے۔“

”یہ تو اور اچھا ہوگا۔ پھر میں تم سے شادی کر لوں گا۔“

اس روز ندیم کلینک نہیں گیا۔ آیا کے جانے کے بعد اس نے شاہدہ سے پوچھا۔ ”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“

کی حسین ترین عورت ہو۔“

”جھوٹ بولتے ہو۔“ شاہدہ نے سر جھکا کر کہا۔

”تمہاری قسم اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔“ سلمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

شاہدہ کو اچانک ہی ہوش آگیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”آؤ بیڈر کا پس کرتے ہیں۔“

اس ملاقات میں وہ کچھ اور قریب آ گئے۔ سلمان اس کے برابر میں ہی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ کبھی اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیتا۔ وہ کبھی ان محلات سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اگر تو کدوں کا ڈرنہ ہوتا تو شاید تو اسے بیڈروم میں ہی لے جاتی۔

اب سلمان نے باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ شاہدہ پوری طرح اس کے قابو میں آچکی ہے اور وہ کسی وقت بھی اپنا کام نکال سکتا ہے۔

دوسرے نوکر تو اپنا کام کر کے چلے جاتے تھے لیکن آئیے سے شام تک رہتی تھی۔ اس کی نظروں سے یہ کھیل چھپانہ

رہ سکا۔ اس نے سوچا۔۔۔ اس سے پہلے کہ پانی سرے

اونچا ہو جائے۔ اسے ندیم کو بتا دینا چاہیے چنانچہ ایک روز وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر ندیم کے کلینک پہنچ گئی۔

ندیم اسے اپنے کلینک میں دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ”آیا جی خیریت تو ہے۔ تم کیسے آ گئیں۔ اگر کوئی تکلیف کی تو گھر میں ہی بتا دیتیں۔ میں دوا لکھ دیتا۔“

آیا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”صاحب جی وہ

تکلیف ایسی ہے کہ گھر میں نہیں بتا سکتی تھی۔“

”کیا مطلب، میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”صاحب جی، جو کچھ میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں اسے صبر اور سکون سے سنیں۔ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ امید ہے کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے مختصر الفاظ میں شاہدہ اور نعمان کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ندیم نے محل سے اس کی بات سنی اور بولا۔

”آپا، بہت بہت شکریہ کہ تم نے بروقت مجھے بتا دیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”صاحب جی، میرا نام سچ میں نہ آئے۔ ورنہ بیگم صاحبہ مجھے جان سے مار دیں گی۔“

”تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے تو سوال جواب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنا فیصلہ مناؤ۔“
 ”کوئی بھی مرد اتنا بے غیرت نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ رنگ ریاں مناتے دیکھے اور خاموش رہے۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ ابھی اور اسی وقت میکے چلی جاؤ۔ طلاق نامہ تمہیں جلد ہی مل جائے گا۔“
 ”اور بچہ؟“

”وہ میرے پاس رہے گا۔ میں اس پر تم جیسی بدکردار عورت کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔“
 اس طرح شاہدہ اس کی زندگی سے چلی گئی، عدت کے بعد اس نے سلمان سے شادی کر لی اور وہ لوگ وہی چلے گئے۔ ندیم نے اسد کو اپنی بہن کے حوالے کیا اور خود انگلینڈ چلا گیا، وہ سال میں ایک مہینہ اسد کے ساتھ گزارتا جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو اسے مری کے اسکول میں داخل کر دیا گیا اس طرح وقت گزرتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسد نے اپنی مدارج طے کیے اور میڈیکل کالج میں شیفٹی کیا۔ جہاں اس کی ملاقات روہی سے ہوئی اور اس کے فیصل ایک بار پھر ندیم اور ساجدہ کا سامنا ہو گیا۔

☆.....☆

رات بھر جاگنے اور کروٹیں بدلنے کے بعد ساجدہ ایک فیصلہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے صبح اٹتے ہی ندیم کو فون کیا اور بولی۔ ”ندیم مجھے یہ رشید منظور نہیں ہے۔“
 ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جوانی میں ایسی حماقت ہو ہی جاتی ہے۔“
 ”پھر مجھے معلوم تو ہو کہ اس انکار کی وجہ کیا ہے؟“

”وہ یہو ندیم، وہ تمہارا بیٹا ہے اور تمہارا تمہارا ہی نقش قدم پر چلے گا۔ جب تم نے ایک ڈاکٹر سے شادی کرنے کی بجائے گھریلو عورت کو ترجیح دی۔ اسی طرح وہ بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی اس پروفیشن سے وابستہ رہے۔ نہیں ندیم میں اپنی بیٹی کا مستقبل برباد نہیں کر سکتی۔ اسے ابھی بہت آگے جانا ہے۔“
 ”میری بات تو سنو۔“ ندیم نے کہا۔
 ”اب سننے کے لیے کچھ باتیں نہیں رہا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“

ندیم سمجھ گیا کہ ساجدہ اس سے پچیس سال پرانا بدلہ لے رہی ہے۔ اسے سائیکھوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ ساجدہ نے وہ باتیں سن لی تھیں جو اس نے گفٹی کے بعد ڈاکٹر زروم میں اپنے ساتھیوں سے کی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ساجدہ اسے چاہتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھ رہی تھی لیکن ندیم نے اپنی ماں کے کہنے میں آ کر اس کے خواب چکنا چور کر دیے جسے اس نے اپنی توہین سمجھا اور اب اس کا بدلہ وہ اس کی اولاد سے لے رہی ہے۔

ندیم نے اسے مٹانے کی بہت کوشش کی۔ ڈاکٹر احسن نے بھی سمجھایا لیکن وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہیں ہوئی۔ روہی کو جب اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے رورو کر برا حال کر لیا۔ ساجدہ کا خیال تھا کہ وہ دو چار دن روپیٹ کر چپ ہو جائے گی لیکن روہی بھی اسی ماں کی بیٹی تھی اس نے احتجاجا کھانا پینا چھوڑ دیا اور اب اس کی بھوک ہڑتال کو چوبیس گھنٹے ہو چکی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساجدہ کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کرسی چھین کر روہی کے کمرے کے باہر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح روہی کو مٹائے۔ اچانک اس نے اپنے کندھوں پر کرسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ڈاکٹر احسن تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح نرم لہجے میں کہا۔ ”بے جا خند چھوڑ دو ساجدہ، تم ندیم کے کہنے کی سزا اس کے بیٹے کو کیوں دے رہی ہو۔ وہ اپنا باپ تو اپنی اولاد کے لیے خوشیاں ڈھونڈتے ہیں۔ تم کیسی ماں ہو کہ بیٹی سے اس کی خوشیاں چھین رہی ہو۔ میری مانو کہ بچوں کو ان کی خوشیاں لوٹا دو۔ ورنہ پھر مجھے باپ بن کر فیصلہ کرنا پڑے گا۔“

ڈاکٹر احسن کی دھمکی کا اگر ثابت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ روہی کا قصور کیا ہے۔ صرف یہی کہ اس نے اسد سے محبت کی ہے۔ یہ قصور تو میں پچیس سال پہلے کر چکی ہوں۔ اگر مجھے محبت نہیں ملی تو اس کی سزا اپنی بیٹی کو کیوں دوں بلکہ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ اس نے جسے چاہا وہ اسے مل گیا۔ بد نصیب تو میں تھی کہ اپنی محبت کو نہ پا سکی۔ وہ کرسی سے اٹھی اور ندیم کو فون کر کے کہا۔ ”میری بیٹی لے جاؤ اور اپنا بیٹا مجھے دے دو۔“





حفاظتی اقدام

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!

لوگ کہتے ہیں کہ لڑکیاں کمزور ہوتی ہیں اسی لیے صنفِ نازک کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ لڑکی اگر ٹھان لے تو یہ دنیا اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اس کا ثبوت ہے صدف کا اقدام۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ اگر وہ جرأت کا مظاہرہ نہ کرتی تو کیا ہو جاتا؟

راحت و فاراہوت

(لاہور)

کے دن ہیں یہ بہت جلد گزر جائیں گے۔ پھر ایک خوب صورت زندگی ان کی منتظر ہوگی۔ حیرت کی بات تو یہ بھی کہ ارسلان جو ساری یونیورسٹی میں ضدی مشہور تھا وہ صدف کی بات سن بھی لیتا تھا اور گل بھی کر لیتا تھا۔

☆.....☆

آخر کار صدف اور ارسلان کا انتظار ختم ہو گیا۔ چار سال کا طویل عرصہ ان دونوں نے انتظار کیا تھا۔ بہت میرا اور امید کے ساتھ، حالانکہ ارسلان بہت بے صبر اور جلد باز تھا۔ وہ کبھی بھی شک آکر اپنا موڈ خراب کر لیتا تھا مگر صدف عقل مندی سے ارسلان کو پنڈل کر لیتی تھی۔ وہ اسے سمجھاتی کہ یہ جو انتظار

آتے ہوئے اس کے پاس اسے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے کہ وہ ایک سو سو کھالے لے جایا کر ایک کپ پی لے۔ بعض اوقات تو انتہاں بھوک سے اچھٹے لگتیں مگر وہ اپنی پی کر گزارہ کر لیتی۔ صدف یونورسٹی تو بیچ کی بی بی مگر وہاں بیچ کر اسے پتا چلا تھا کہ خواہوں کی تعمیر حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میری نازی نے کہا ہے

ایک اور دریا کا مجھے سامنا تھا منبر میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا ایسا ہی صدف کے ساتھ ہوا۔ یونورسٹی جانے کے چند دن بعد ہی اسے ارسلان نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ارسلان بھی اسی یونورسٹی میں تھا مگر اس کا ڈیپارٹمنٹ الگ تھا۔ اس کے باوجود وہ زیادہ تر اصرار ہی پایا جاتا تھا۔ وہ ایک میگزین اور ایک زادہ تھا۔ وہیں بھی تھا اور خوب صورت بھی پیسے کی فراوانی اور وجاہت۔ یہ وہ تھا کہ ایسے تھے کہ بہت سی لڑکیاں اس پر مریختے کو تیار تھیں بلکہ اس کے ساتھ دوستی پر فخر محسوس کرتی تھیں مگر اسے صدف بھاگتی تھی۔

صدف ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ سادگی میں بھی اس کا حسن نمودار دینے والا تھا۔ اس کا سر لہا، رنگ و روپ دیکھنے والے کو لکھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت سادہ اور کم قیمت کے لباس پہنتی تھی اور بڑی سی چادر میں اپنے آپ کو لپیٹے رکھتی تھی۔ اس کے چہرے کا حسن چمکا تھا۔ ارسلان نے اسے دیکھا اور دیکھا ہی رہ گیا اور پھر حسبِ عادت اس نے صدف سے دوستی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں نے یہاں سے اسے مخاطب کرتا، پڑھائی میں ہر قسم کی مدد کی پیشکش بھی کی مگر صدف نے ٹوٹ ہی نہیں لیا۔ وہ اس کی بات کا بہت کم جواب دیتی تھی بلکہ وہ اس جگہ سے ہی اٹھ جاتی جہاں ارسلان بیٹھا ہوتا۔ اس کا حسیان صرف اپنی پڑھائی پر تھا۔ وہ بہت زیادہ کتابیں نہیں خرید سکتی تھی اس لیے وہ لائبریری چلی جاتی اور وہاں سے مدد لے لیتی۔ ارسلان کو اب غصہ آئے گا تھا۔ اسے انکوری ہونے کی عادت نہیں تھی۔ مگر لڑکیاں تو اس پر شاد ہونے کو تیار رہتی تھیں مگر ہر لڑکی تو ایسی نہیں ہوتی۔ صدف کی بے نیازی اس کا کھانا اسے بھولاہٹ میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ انہی حالات میں ایک سال گزر گیا۔ صدف نے اپنی سادہ روئیں کے مطابق معیار کو قائم رکھا تھا اور بہترین مارکس حاصل کیے تھے۔

صدف بہت پریشان ہوئی تھی۔ ارسلان اب کھل کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔ کافی لڑکے اور لڑکیاں یہ بات جان چکے تھے کہ ارسلان صدف کے گرو بکر لگا رہا ہے۔ کئی لوگ

صدف نے ایک سفید پوش گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ دو بہنیں تھیں، بڑی صدف اور چھوٹی رجو جو اس سے سات سال چھوٹی تھی، بھائی کوئی نہیں تھا۔ اس کے والد جوتے بنانے والے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام کرتے تھے۔ اندرون لاہور میں کئی گلوں کے اندر ایسے چھوٹے چھوٹے کارخانے بہت سے ہیں۔ وہ انہی میں سے ایک میں کام کرتے تھے۔ یہ کام اپنی جوانی سے ہی کر رہے تھے۔ آمدنی محدود ہی تھی۔ صدف کی والدہ ایک قناعت پسند اور شکر گزار عورت تھی۔ کم آمدنی میں بھی خوشی سے گزارہ کر دیتی تھی۔ صدف ایک خوب صورت اور ذہین لڑکی تھی۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میٹرک میں اس نے شاندار نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے والدین خوشی سے پھولے نہ مار رہے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ صدف حریہ پڑھنا چاہتی تھی۔ والدین سوچ میں تھے کہ اخراجات کیسے پورے کریں گے۔ صدف کے والد نے بیٹی کی خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کیا اور زیادہ ٹائم لگانے لگے۔ صدف نے نسبتاً اچھے اور کم فیس والے کالج میں داخلہ لے لیا۔ محلے کے کچھ بچے اس کے پاس پڑھنے کے لیے بھی آئے گے۔ اس کے علاوہ اس کی والدہ گھر بیٹھے اجرت پر کام کرنے لگیں۔ پڑھائی سے جو ٹائم ملتا صدف اور اس کی بہن بھی ملان کا ہاتھ بنا دیتیں۔ شوق اور جذبہ ہوتا مشکل آسان لگنے لگتی ہیں۔ صدف نے ایک بار پھر بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس کی کا امتحان پاس کر لیا۔ اب اس کا عزم اور ہمتی بلند ہو چکا تھا۔ اب وہ حریہ تعلیم حاصل کر کے ایک بہتر ذمہ داری حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ ڈگری اسے اچھی سی جگہ جاب دلا سکے تاکہ وہ اپنے والدین کا سہارا بن سکے۔ اب اس کی اگلی منزل وہ یونورسٹی تھی جہاں پڑھنے کا خواب اس نے بچپن سے ہی دیکھا تھا۔ اس کی خواہش بھی تھی اور جنون بھی۔ والدین کی دعا میں بھی تھیں اور اس کی اپنی محنت سے لیے گئے بہترین نمبر بھی تھے۔

ایک بار پھر والدین نے اپنی بیٹی کی آنکھوں کے خواب پورے کرنے کا عہد کیا، ٹیسٹ ہوا جس دن لسٹ لگی۔ صدف کا نام نمایاں تھا۔ اسے اس کے پسندیدہ ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ مل گیا تھا۔

☆.....☆

چار سال کا طویل عرصہ تھا اس ڈگری کے حصول کی راہ میں جواب صدف کا مقصد حیات تھی، داخلے کے بعد اخراجات میں اضافہ ہوا خرچ میں فیس کے علاوہ روزانہ کا کرایہ بھی تھا۔ بہت تھوڑے سے پیسے لے کر وہ صبح گھر سے نکلتی اور شام کو گھر

میں بہت فرق ہے۔ میں تعلیم حاصل کر کے اپنے گھروالوں کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جب آپ اور میں فارغ ہو جائیں گے تب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

ارسلان کی اس بات پر صدف کو بہت غصہ آیا مگر وہ کوئی تماشہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔

”میں ایک عزت دار لڑکی ہوں، اپنی کوئی کہانی نہیں بنوانا چاہتی۔ خدا کے لیے میرا بچھا چھوڑ دیں۔“ وہ روہا سی گئی۔

”آپ سوچ لیں اگر آپ نے کل مجھے ہاں میں جواب دیا کہ آپ تعلیم سے فارغ ہو کر میرے ساتھ شادی پر راضی ہیں تو میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ ورنہ ساری دنیا کے سامنے خود کو ختم کر لوں گا۔“ ارسلان کی اس بات پر صدف ہل کر رہ گئی۔

ارسلان یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ صدف کم مہم رہ گئی۔ مگر اگر یہی اس نے کہا نہیں کیا۔ آنے والے وقت کا خوف اسے لرزاتا رہا تھا۔ آخر اس نے وضو کیا اور اللہ کے سامنے جھک گئی۔ اللہ سے ساری باتیں کہہ کر اس کا دل پرسکون ہو گیا۔ اگلے دن سارا وقت اسے ارسلان نظری نہیں آیا۔ پھر اگلا پورا ہفتہ وہ غائب رہا۔ وہ سکون سے اپنا کام کرتی رہی اور پھر اس کا سکون لمبے پھر میں رخصت ہو گیا جب اس نے ارسلان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس وقت وہ مگر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔

”جی س صدف! کیا سوچا آپ نے؟“ آتے ہی اس نے پوچھا۔

صدف نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دل میں اعتراف کیے بغیر نہ کہہ سکی کہ وہ کتنا خوب صورت ہے۔

”ٹھیک ہے ارسلان صاحب! مجھے آپ کی بات منظور ہے۔ میں تعلیم سے فارغ ہو کر آپ سے شادی کرنے کے لیے راضی ہوں مگر میری بھی ایک شرط ہے۔“

”کیسے؟“ وہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”اس دوران آپ مجھے ڈسٹرپ نہیں کریں گے۔ تنگ نہیں کریں گے۔ میں سکون سے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“

ارسلان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے س صدف میں آپ کا انتظار کروں گا۔ وعدہ کرتا ہوں آپ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔

صدف نے سکون کا سانس لیا۔ اس کا سارا وجود جیسے ہلکا

ارسلان کو درخلائے تھے۔ اسے اور پیش دلائے تھے کہ ایک عام سی لڑکی کے آگے ہار گیا ہے۔ اسے اٹھوا لے۔ تیری اسلٹ ہو رہی ہے جب کہ صدف اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کرتی تھی بلکہ وہ بہت کم ہی کسی سے مخاطب ہوتی تھی۔ دو چار لڑکیاں تھیں جو کہ بڑے بڑے والی تھیں اور اپنی ڈگری کو لے کر مجیدہ تھیں ان سے بڑھائی کے معاملے میں بات کر لیتی تھی۔ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ وہ اپنے گھروالوں سے بھی ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ماں باپ ڈر جاتے اور بڑھائی چھڑوا کر مگر بٹھا لیتے۔ آخر اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ارسلان سے اس معاملے پر صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن وہ صوفی کی تلاش میں تھی کہ کہیں ارسلان اکیلا نظر آئے تو بات کرے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے ارسلان کے ساتھ دیکھے۔ بجائے اسی صوفی میں بھی کہ ارسلان خود ہی اس کے قریب چلا آیا۔

”کیسی ہیں مس صدف؟“ وہ مسکرا کر پوچھنے لگا۔ صدف پہلے ایسے صوفی پر راستہ ہی بدل لی تھی بغیر کوئی جواب دینے مگر اب اس نے گہرا سانس لیا اور کہنے لگی۔ ”ارسلان صاحب! آپ سے میری ریکوٹ ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی ہوں، میرے گھریلو حالات اس قابل نہیں ہیں کہ میں یہاں تعلیم حاصل کر سکوں۔ آپ کے سامنے بہت لڑکیاں ہیں جو آپ سے دوستی کی خواہش مند ہیں۔ آپ میرا بچھا چھوڑ دیں پلیز۔“ نظریں جھکائے جھکائے اس نے بات مکمل کی۔

ارسلان ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے قریب سے اس نے پہلی بار صدف کو دیکھا تھا۔ اس کا کچھ چہرہ اتنے قریب سے دیکھ کر اس کے دل کی حالت ہی بدل گئی۔ صرف لمبے لمبے بات تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر صدف اسے نہ دے تو وہ شاید زندہ بھی نہ رہ پائے۔ اس نے کہا۔ ”مس صدف! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے بہت سی لڑکیوں سے دوستی کی ہے۔ آپ کو بھی میں انہی لڑکیوں جیسا سمجھتا تھا۔ آپ کے گریڈ نے مجھے ضد دلا دی اور میں غصے میں آ گیا۔ آپ جب مجھے انور کرتی تھیں تو مجھے اپنی توہین محسوس ہوتی تھی مگر آج اس لمحے میں یہ پوری سچائی سے اقرار کرتا ہوں کہ میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ پوری عزت اور احترام سے آپ کو اپنا بنا چاہتا ہوں۔“

صدف ہکا بکا رہ گئی۔ اتنا امیر لڑکا اسے شادی کی آفر دے رہا تھا۔

”دیکھیں ارسلان صاحب! آپ کی اور میری کلاس

چلا ہوا گیا تھا۔

اور پھر ارسلان نے اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔ وہ صدف کو بہت کم مخاطب کرتا تھا۔ کسی دوست کے ساتھ اس کی بات بھی نہیں کرتا تھا اور زبردستی اسے بات کرنے پر مجبور بھی نہیں کرتا تھا مگر اس کے باوجود وہ پوری طرح صدف سے باخبر رہتا تھا۔ اسے دیکھنے روز آتا تھا۔ اب اس کی نظروں میں آداری نہیں اجڑا ہوا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور ایک دن صدف کا خواب پورا ہو گیا۔ چار سال مکمل ہو گئے تھے۔ ارسلان بھی فارغ ہو چکا تھا اور کسی بہت اچھی فرم میں انٹرن شپ کر رہا تھا۔ صدف نے فائنل ایگزام دیا۔ اب اس کا یونیورسٹی آنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

رخصت ہوتے ہوئے آخری دن ارسلان نے بہت جلد اپنے والدین کو رشتے کے لیے بیٹے کا وعدہ کیا۔ اپنی بہت اور وفا کا یقین دلایا۔ صدف کو ایک خوب صورت زندگی کا ایک سنہرے مستقبل کی آس دلا کر چلا گیا۔ صدف گھر رہنے لگی اور رزلٹ کے بعد کسی جاب کی تلاش نہ کرتی رہی۔ اسے امید تھی کہ اسے ڈگری ملنے کے بعد بہت اچھی جگہ جابل جائے گی۔ صدف کا رزلٹ آگیا۔ اس دن ان کے گھر میں جیسے عید کا سا سماں تھا۔ اس نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ اس کے گھر والے خوشی سے پھولے نہ سارے تھے۔

جس دن صدف کا رزلٹ آیا اس سے اگلے دن ارسلان اپنے گھر والوں کے ساتھ اس کے گھر رشتہ لے کر آگیا۔ صدف کے والدین حیران پریشان رہ گئے۔ اتنے امیر لوگ اتنی بڑی گاڑی سے اترے تو محلے والے بھی ششدر رہ گئے۔ ارسلان کے والدین کے علاوہ اس کی چھوٹی بہن بھی ساتھ تھی۔

سادہ سے کمرے میں پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انہوں نے صدف کے ماں باپ کے آگے اپنے بیٹے کا رشتہ رکھا اور بہت عزت سے ان کی بیٹی کا ہاتھ طلب کیا۔

صدف کے والدین حیران تھے۔ صدف باورچی خانے میں تھی۔ وہ بہت پرسکون تھی۔ اس کی ماں اس کے پاس آئی اور اس سے پوچھا۔ ”تم ارسلان کو جانتی ہو۔“

”جی امی۔“ اس نے کہا۔ ”ارسلان بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا میں اسے جانتی ہوں۔“

”تو مجھ وہ رشتہ بھی تمہارے کہنے پر لایا ہو گا۔“ ماں نے طعناؤں پر پوچھا۔

”میں جانتی تھی وہ آئے گا۔ میں نے ہی اسے کہا تھا کہ

جب میرا رزلٹ آجائے تو بہ رشتہ بھیجنا۔“

ماں نے بیٹی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ بیٹی پڑھ لکھ مٹی تھی۔ فطرتاً اُن پڑھ والدین ذرا سا محجوب جاتے ہیں زیادہ پڑھی لکھی اولاد سے بات کرنے میں۔

”تم تو کبھی نہیں میں تو فری کروں گی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ مگر کے حالات بدلوں کی۔“ ماں نے کہا۔

صدف کچھ دیر خاموش رہی۔ ”امی! آپ اندر جائیں اور ارسلان کے والدین سے کہیں کہ ہم غیر برادری میں بیٹی نہیں دیتے اگر وہ زیادہ اصرار کریں تو پھر کیسے گا کہ ہماری بیٹی راضی نہیں ہے۔“

اس کی ماں حیران ی کمرے میں چلی گئی۔ وہاں جا کر اس نے بڑی افسردگی سے کہا۔ ”ہم غیر برادری میں بیٹی نہیں دیتے۔“

انہوں نے بہت اصرار کیا۔ ”صدف کو خوش رکھیں گے۔ کوئی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔“

ارسلان بہت بے چین اور پریشان ہو گیا تھا۔ جب وہ بہت زیادہ اصرار کرنے لگے تو پھر صدف کی ماں نے کہا۔ ”بہن جی! میری بیٹی اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔“

ارسلان پر تو گویا پہاڑ گر پڑا۔ اس کے والدین بھی حیران رہ گئے۔ وہ ساری کہانی جانتے تھے ارسلان نے انہیں سب کچھ بتا رکھا تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ارسلان کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ صدف کے وعدے پر اس نے چار سال انتظار کیا تھا۔ کافی دیر بحث ہوئی رہی۔ جب صدف کے والدین نہ مانے تو ارسلان نے کہا۔ ”آئی! آپ ایک بار صدف کو بلا دیں۔ میرے سامنے وہ انکار کرے جب ہم چلے جائیں گے۔“

صدف کے باپ نے اس کی ماں سے کہا۔ ”صدف کو بلا لائے۔“ تھوڑی دیر بعد صدف ان کے سامنے تھی۔ سادے سے لباس اور چادر سے اپنا وجود سامنے وہ بہت اچھا دے اندر آئی تو ارسلان کے والدین اپنے بیٹے کی پسند کی داد دے بغیر نہ رہ سکے۔ صدف گویا گڈری میں گسل گئی۔ وہ سامنے بیٹھ گئی۔

”بیٹی!“ ارسلان کی والدہ نے اسے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ”تم ارسلان کو جانتی ہو؟“

”جی آئی! یہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں تھے۔“ صدف نے نظریں جکائے جکائے کہا۔ اس نے ایک بار بھی ارسلان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ارسلان کا تو گویا دل آنکھوں میں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک تک صدف کو دیکھ رہا تھا۔

قلم کاروں کے لیے

10,000 روپے

آپ کے بھی ہو سکتے ہیں

انعامی سلسلہ

اگر آپ معاشرتی یا جرم و سزا کی مضبوط و مربوط کہانی سوچ اور لکھ سکتے / سکتی ہیں تو

سپینس ڈائجسٹ اور جاسوسی ڈائجسٹ

کے صفحات حاضر ہیں۔ یہ مستقل قلم کاروں کی صف میں شامل ہونے کی ابتدا ہو سکتی ہے

- کہانی طبع زاد ہونی چاہیے۔
- پلاٹ اور واقعات کسی اور تحریر سے ماخوذ یا ترجمہ نہ ہوں۔
- کہانی رسائل کے تیس سے چالیس صفحات پر مشتمل ہو۔ غیر ضروری یا ضمنی مواد شامل نہ ہو۔
- انعام یافتہ کے علاوہ اس سلسلے میں موصول ہونے والی دوسری قابل اشاعت کہانیاں ادارے کی عمومی شرح سے معاوضے کی ادائیگی پر شائع کی جاسکیں گی۔
- صرف اصل مسودہ یا ہارڈ کاپی قابل قبول ہوگی۔ فوٹو کاپی یا ای میل پر آنے والے مسودے انتخاب میں شامل نہیں ہوں گے۔
- جس پرچے کے لیے کہانی ارسال کریں، اس کا نام ضرور درج کریں۔ اپنا نام، پتا اور رابطے کا نمبر مسودے کی ابتدا میں درج کریں۔

مسودے موصول ہونے کی آخری تاریخ 28 فروری 2019ء ہے

اپنے مسودے اس پتے پر ارسال کریں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63، فیز 11 ایکس ٹیشن، مین کورنگی روڈ، ڈیفنس، کراچی

دوستی پر مجبور کرے اور ان کے انکار کرنے پر انہیں رسوا اور ذلیل کرے۔“

ارسلان اور اس کے والدین کم کم کمزور تھے اور صدف کے والدین دورے تھے۔ ارسلان کی بہن بھی مردی تھی۔ صدف کی بچپان بندھ گئیں۔

”میں نے اپنی عزت بچانے اور اپنی تعلیم پوری کرنے اپنا مقصد حیات حاصل کرنے کے لیے ارسلان سے جھوٹا وعدہ کیا اور اپنی تعلیم مکمل کی۔ آپ بتائیے! آپ کی بیٹی کالج جاتی ہے، اگر لڑکے اس کے پیچھے پڑ جائیں، دوستی پر مجبور کریں تو آپ کا رول کیا ہوگا۔ آپ تو طاقت ور اور امیر ہیں۔ شاید طاقت سے مقابلہ کر لیں۔ میں کمزور اور غریب لڑکی کیا کرتی۔“

کمرے میں سناٹا تھا اور صرف صدف کی بچپان سناٹا دے رہی تھیں۔ ارسلان کے والدین کے سر جھکے ہوئے تھے ان کے پاس صدف کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ آخر ارسلان کی والدہ آگے بڑھیں اور انہوں نے صدف کو گلے لگایا۔ ”ہم سب کو معاف کر دو بیٹی، ہماری تربیت میں کمی تھی جو ارسلان ایسا نکلا کر یہ گھر میں موجود اپنی بہن کا سوچ لیتا تو کسی کی بہن بیٹی کو پریشان نہ کرتا مگر تمہارے کہنے پر میرے بیٹے نے ساری بری عادتیں چھوڑ دیں تو دل بڑا کر کے اسے معاف کر دو۔“

”میں نے معاف کیا آخری مگر تمہارا آپ کے ساتھ نہ کوئی جوڑے اور نہ مقابلہ۔ میرے دل میں ارسلان کے لیے کوئی جذبہ کوئی عزت نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز چلے جائیں اور اپنے جیسے امیر لوگوں میں رشتہ کیجیے۔“ بس صدف کے سختی اور دو ٹوک اعزاز پر ارسلان کے والدین خاموش ہو گئے۔ خود ارسلان نظریں نہ اٹھا سکا۔ وہ لوگ چلے گئے۔ صدف نے اپنے والد سے کہا۔ ”میں نے کوئی غلطی نہیں کی، مگر بھی آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“

اس کے والد نے کہا۔ ”بیٹی میں تم پر فخر ہے۔“

آج صدف بہت اچھی جا ب کر رہی ہے۔ اس کے گھر کے حالات کافی حد تک بدل چکے ہیں۔ ارسلان نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ حدیث تعلیم کے لیے آسٹریلیا چلا چکا ہے۔

صدف نے اپنی شادی کا معاملہ والدین پر چھوڑ رکھا ہے۔ کون کہتا ہے عورت کمزور ہوتی ہے اگر عورت کچھ کرنے کی شان لے لے تو ہر طاقت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ عزت پر بن آئے تو ہر حلقہ کی اقدار ضروری ہیں ناں؟

3

”ہم تمہارا ہاتھ ماتحتے آئے ہیں۔ تمہاری والدہ کا کہنا ہے کہ تم اس رشتے پر راضی نہیں ہو جب کہ ارسلان تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔“ انہوں نے صدف کو پیچھے جتایا کہ مجھے ساری بات کا علم ہے۔

”بی آئی! صدف نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔“

”میں نے ارسلان سے کہا تھا کہ میرے رزلٹ کے بعد اپنا رشتہ بھیجے۔“

صدف کے والدین، بیٹی کی بات سن کر شرمسار ہو گئے اور اپنا سر جھکا کر غریب آدمی کے پاس عزت ہی ایک قیمتی چیز ہوتی ہے۔ آج ان کی بیٹی نے ان کو رسوا کر دیا تھا۔

”تو پھر انکار کی وجہ؟“ ارسلان کی والدہ نے طنز پر پوچھا۔

”بس میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ صدف نے کہا۔

ارسلان کے لب جیسے سل گئے تھے۔ وہ کوئی بات کرنے کے قائل نہیں رہا تھا۔

”تمہارے لیے شادی بیاہ مذاق ہے۔“ ارسلان کے والد کو بھی غصہ آ گیا۔ ایک معمولی سی لڑکی انہیں ڈی کر لے کر رہی تھی۔ وہ بیٹے کی شدید خواہش پر اس معمولی گھر میں آئے تھے اور غریب لڑکی کے حراز ہی نہیں مل رہے تھے۔ ”جب شادی نہیں کرنی تھی تو وعدہ کیوں کیا۔ چار سال تک میرے بیٹے کو..... آس کے سہارے کیوں رکھا۔“

”تو کیا کرتی۔“ صدف ایک دم اونچی آواز میں چلائی۔ سب ہکا بکا آسے دیکھنے لگے۔ ”کیا کرتی میں، یہ آپ کا بیٹا۔“ اس نے ارسلان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”اس نے میرا بیٹا حرام کر رکھا تھا۔ مجھے یونیورسٹی میں ذلیل کر رہا تھا۔ فٹنڈے دوستوں کو مجھے ہراساں کرنے کے لیے میرے پیچھے لگائے ہوئے تھے۔ میں کمزور اور غریب لڑکی اپنی عزت بچانے کے لیے کیا کرتی۔“ صدف رو پڑی۔ ”ادھر دیکھیں، میرے غریب ماں باپ دن رات محنت کر کے مجھے یونیورسٹی بھیج رہے تھے تاکہ میں گھر کے حالات بدل سکوں۔ غربت کی ذلالت سے نکل سکوں۔ یہ خود مجھ کو رہ کر مجھے تسلیم دلا رہے تھے اور میں آنکھوں میں خواب لے کر خالی ہاتھ گھر سے نکل گئی تاکہ اپنے ماں باپ کا سہارا بن سکوں۔ مجھے کسی اور چیز کا ہوش نہیں تھا۔ صرف اور صرف پڑھائی۔ نہ جانے کیسے کیسے جن کر کے میں اپنی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور آپ کا بیٹا جو کہ ایک امیر گھر سے تھا جو پڑھنے نہیں لڑکیوں سے دوستی کرنے اور ذہنی انجمائے کرنے یونیورسٹی آتا تھا۔ اسے کیا حق تھا کہ یہ غریب لڑکیوں کو

قربانی



محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم !

اس بار میں مس منیر کی روداد کے ساتھ حاضر ہوں۔ در نجف منیر کی داستان دکھی کر دینے والی ہے۔ اسے کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے میری آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ خود پر جبر کر کے اس کی داستان لکھی ہے۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

قضاء عادل
(ہری پوری ہزارہ)

نئی اور بننا ہوتے ہوئے بھی بیٹھا تھی۔

مجھ سے چھوٹا ایک بھائی تھا عبداللہ احمد وہ پیدائشی ہیرا لائز تھا۔ جسمانی اور دماغی طور پر مفلوج جبکہ ماں..... ماں عبداللہ کی دلچسپی کے دوران ہی چل گئی تھی۔

اس کے بعد باپ نے دوسری شادی نہ کی تھی اس لیے بھی کیونکہ لڑکیاں سے انہوں نے ساری دنیا سے لڑ جھڑ کر اور رشتے بنائے تھے مگر کایہ رچا تھا اور اس لیے بھی کیونکہ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے بچوں کی پرورش ایک سوتیلی ماں ٹھیک

میرا کالج میں پہلا سال تھا۔ مجھے پڑھائی سے شدید لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں بیٹیوں کی تعلیم کا اتنا رجحان نہ تھا اس کے باوجود میرے باپا عمر میرے بہت محبت سے میرا کالج میں داخلہ کروایا تھا۔ ان کا خواب تھا میں ڈاکٹر بنوں۔

کچھ ان کا خواب تھا کچھ میری محنت کے میں دن رات کتابی کپڑاؤں ہی رہی۔ ہمیشہ بہتر سے بہترین کی لگن نے اسکول کیا کالج میں بھی میری راہ میں کامیابیاں ہی لکھی تھیں۔ باپا کو مجھ پر فخر تھا کیونکہ بیک وقت میں ان کی بیٹی بھی

طرح سے کر بائے گی، خاص کر عبداللہ کی اس لیے بابا نے اسی کے بعد زندگی ہم دونوں کے لیے ہی وقف کر دی مگر شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

بابا نے ہمیں سوتیلی ماں کے شر سے بچانے کے لئے اپنی زندگی تنہائیوں کی نظر کر دی تو قسمت نے ہمیں دنیا کے شر میں دھکیل کر ہمارے بابا کو ہی ہمارے سر سے اٹھایا۔

ہاں! اماں کے جانے کے 14 سال بعد بابا کا ایک کار ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ وہ ہمیں روتا دھوتا چھوڑ کر خود منوں مٹی تلے جا سوئے۔ میں اور عبداللہ اکیلے رہ گئے۔

ہمارے سر پر بابا کے بہت سے دوستوں نے شفقت کا ہاتھ رکھا تھا مگر مستقل سامان کوئی نہ رہا۔

بھلا اس مہنگائی کے دور میں کون پر لیا بوجھ اپنے کندھوں پر لا دے۔

چلم ہو گیا۔ چلم تک تو ہوا ہمارے ساتھ ہی رہیں۔

یوا کو بابا نے عبداللہ کے لیے رکھا تھا۔ وہ بالکل اسی کی طرح عبداللہ کا خیال رکھتی تھیں مگر چلم کمزور تو ہوا کی امتا بھی بابا کے ساتھ ہی کہیں دفن ہو گئی۔ بہت بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ

وہ تو بیسوں کی خاطر اماں بنی پھرتی تھیں۔ اب جب پیسے دینے والا ہی نہیں رہا تھا تو کہاں کی ماں اور بیسی مانتا۔

مجھے یاد ہے چلم کی دھاک کے بعد جب لوگ طے کئے تھے تو وہ گھر کی صفائی سترائی کے بغیر اپنے کوارٹر چلی گئی تھیں۔

عبداللہ نے کھانا کھانے کے بعد اپنے کپڑے کندے کر دیے تھے۔ میں اکیلی اس کے بھاری دھڑو کو نہیں سنبھال سکتی تھی۔

میں یوا کو بلانے ان کے کوارٹر میں گئی تو وہ سامان ہاتھ سے کھڑی تھیں۔ میں نے پہلے حیرت سے سامان کو دیکھا پھر ان سے

کہا۔ ”یوا جانی عبداللہ نے کپڑے کندے کر دیے ہیں۔ اس کو نیند بھی آرہی ہے۔“

وہ بولیں۔ ”ہاں، تو میں کیا کروں کندے کر دیئے تو؟ جاؤ خود بدل لو۔۔۔۔۔ تم جی کا تو ٹھوڑی ہو، جوان ہو بھائی کو سنبھال سکتی ہو۔ میں جاری ہوں۔۔۔۔۔ تمہارا باپ مر گیا تو میرا بھی دانہ پانی اٹھ گیا۔ تم لوگ اپنا بندوبست خود کر لو۔“

وہ یہ سب کچھ بہت حقارت سے کہتی وہاں رکی نہیں تھیں۔ وہ اپنا سامان ہاتھ چلی تھیں اس لیے چلی گئیں۔

مجھے ان کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ آ چکی تھیں۔ میں واپس آ گئی۔ بہت مشکل سے مگر میں نے عبداللہ کو صاف کر دیا تھا۔

اس کو ابو کے بعد اب یوا کے ساتھ سونے کی عادت

تھی۔ وہ روتے روتے بہت مشکل سے سو پاتا تھا۔ البتہ میں نے وہ ساری رات جاگتے ہوئے گزار دی تھی۔ بس ایک ہی بات سوال یہ نشان بین کر دماغ کی چار دیواری پر کندہ ہو چکی تھی کہ آگے کیا ہوگا؟

مگر جواب کوئی نڈل رہا تھا۔

صبح ہوئی تو میں نے عبداللہ کو ناشتا بنا کر دیا۔ مگر میں راشن بہت تھا۔ اب تک جس جس نے بھی میرے سر پر

شفقت سے ہاتھ رکھا تھا، وہ چھوڑا تھا مگر بہت کچھ دے گئے تھے۔ جو میرے اور عبداللہ کے لیے کچھ عرصہ بہت تھا مگر پھر بھی سوچ وچیں پرانگی ہوئی تھی کہ آگے کیا ہوگا؟

رفتہ رفتہ میرے اس سوال کے جواب میں آگے وہ سب ہونا شروع ہو گیا جو ہونا تھا۔

ایک روز مالک مکان آچکا۔ بھلا مانس بندہ تھا۔ اس نے یوا کی طرح بات نہیں کی تھی۔ بہت پیار سے وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”بیٹا تمہارے والد اب چلے گئے۔۔۔۔۔ اللہ ان کا وہ جہان اچھا کرے۔ آمین۔ اب میں چاہتا ہوں تم دونوں کو تمہارے ورثہ کے حوالے کر کے میں یہ فرض ادا

کروں۔ میری تو روزی روٹی انہیں گھروں کی آمدنی سے ملتی ہے۔ تم دونوں کو تمہارے ورثہ کے حوالے کر کے میں یہ کمر کی اور کو کرانے پر دے دوں گا۔“

”ورثہ۔۔۔۔۔“ میں یہ لفظ بہت بار پہلے سن چکی تھی مگر اپنے لیے نہیں کیونکہ میرے لیے تو میرا سب کچھ میرے ہی بابا ہی تھے۔

دادا دادی ہوں گے مگر میں نہیں جانتی تھی۔ نانانی بھی ضرور ہوں گے مگر میں نے ان کا ذکر بھی کبھی نہیں سنا تھا۔

کیونکہ میرے ماں باپ نے تو زمانے کی محالیت اور انہوں کی رضامندی کے بغیر شادی کی تھی۔ جب ان کو سب نے چھوڑ دیا تھا تو میرا کون وارث ہو سکتا تھا۔

میر کی ماں کی میت کو میرے بابا نے کندھا دیا تھا مگر میرے بابا کی میت کو ان کے دوستوں نے۔ ان کے دوست ہمارے ہمدرد و ضرور تھے مگر وارث نہیں۔

میں مالک مکان کی بات سن کر چپ چاپ ہونٹوں کی طرح اسے نکتے لگی۔

”تم بتاؤ وہ کہاں رہتے ہیں؟ میں جنہیں ان کے گھر چھوڑ آؤں۔“ وہ دوبارہ بولا۔

”میں نہیں جانتی کسی کو بھی انکل۔۔۔۔۔ میرا کوئی وارث نہیں۔ آپ مجھے اور عبداللہ کو کسی دارالامان یا ایسا میسنر چھوڑ

جنوری 2019ء

آئیں۔“ ساتھ جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا ان کا لٹکانا ایسے ہی چربی ہو جوتے ہیں۔

مالک مکان کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا، پھر چلا گیا۔ میں نے اپنا ضروری سامان سینا شروع کر دیا۔ عبداللہ کو بمشکل نہلا دھلا کر صاف کیا۔ ”ہم گھر بدل رہے ہیں عبداللہ چیرٹی ہوم میں رہیں گے۔“

میں نے عبداللہ کو تیار کر کے لاؤنج میں بٹھایا پھر اس کو چیرٹی ہوم کے بارے میں سمجھانے لگی۔

عبداللہ 15 سال کا ہونے کو تھا مگر اس کا دماغ ابھی بھی بمشکل تین یا چار سال کے بچے جیسا تھا۔ جنہیں کوئی بھی بات مشکل ہی سمجھ آتی ہے۔ میں اس کو سمجھانے کے بعد مالک مکان کا انتظار کرنے لگی۔

دن دو بچے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ مالک مکان اندر آیا۔ اس کے ساتھ کون تھا میں نہیں جانتی تھی۔ مگر وہ بندہ شکل و صورت اور طے سے کافی امیر کی طرح لگتا تھا۔ ”یہ سیٹھ رحمان ہے تمہارے ہا کے پاس۔“

مالک مکان نے میرے قریب رک کا سیٹھ رحمان کا تعارف کرایا۔

یہ بابا کی وفات کے دن بھی آئے تھے مگر میری حالت اس قدر غیر معمولی تھی کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کون آیا کون گیا۔

انہوں نے سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میرے بابا سے عمر میں بڑے ہوں گے میں نے مصافحہ کر کے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ وہ عبداللہ کے پاس ہی چٹک پر بیٹھ گئے۔

”مجھے تمہارے بارے میں ساجد نے بتایا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ چیرٹی ہاؤس اسے Save ہیں کہ تم اپنے بھائی کے ساتھ وہاں رہ سکو؟“

حال احوال پوچھنے کے بعد وہ اصل بات کی طرف آیا۔ مالک مکان نے دیکھا اس کو بتا دیا تھا کہ میں کسی دارالامان میں جانا چاہتی ہوں۔ وہ اسی طے میں آیا تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر سے بولا۔ ”میرے خیال میں چیرٹی ہاؤس اسے سنبھالیں گے تم اپنے بھائی کے ساتھ وہاں رہ سکو تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ یہاں دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو تمہاری رہے ہیں مگر اپنے دل بوئے پر۔ تم بھی جی سکتی ہو کیونکہ تم ہاشا اللہ بھدار ہو۔“

تم دوسروں پر بڑھ چڑھ کرنے کے بجائے اس دنیا میں جینے کے لیے اپنے قدم مضبوط کرنا سیکھو۔ اسی میں تمہاری

بھلائی ہے۔ وہ چہلے رکا پھر بولا۔ ”اگر تم بہتر سمجھو تو میں تم دونوں کو قلیف اور باقی کی ضروریات زندگی سپلا کر سکتا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور مجھ نادان کو سن کر دل ہی دل میں خوشی ہوئی۔ چیرٹی ہوم کے بارے میں زیادہ نہیں تو بہت کم میں ضرور جانتی تھی۔ پھر ایسے حالات میں بابا کے اس پاس کا احسان لینا کوئی بری بات نہ تھی۔ میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی بات ابھی جاری تھی۔ ”تمہارے والد 16 سال ہمارے ادارے کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ اس کو تم احسان یا بیک منت سمجھنا۔ یہ تم دونوں کا حق ہے۔“

اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ یہ کتنا اچھا انسان ہے۔ اس وقت ہمارے لیے اللہ ہی نے اسے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ ہمیں احساس کسری میں مبتلا کیے بغیر کتنی خوبصورتی سے ہماری مدد کر رہا ہے۔ اس لمحے وہ حدیث یاد آئی کہ ”اللہ کے بندوں کی مدد دے کر دوسرے ہاتھ کو خیر بھی نہ ہو۔“

سامان میرا دے بھی بندھا ہوا تھا۔ میں چیرٹی ہوم جانے کی بجائے عبداللہ کو لے کر سیٹھ رحمان کے ساتھ چل دی۔

وہ ہمیں رہائشی کالونی کے ایک قلیف میں لے گیا۔ قلیف بہت خوبصورت تھا۔ آرائش سے آراستہ۔

ہمارے وہاں پہنچنے کے دس منٹ بعد ہی ایک ملازمہ بھی آگئیں۔

ان کا نام بیٹا تھا۔ بیٹا شکل و صورت اور طے سے بالکل بھی ملازم نہیں لگتی تھیں۔ وہ شادی شدہ تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی 6 سالہ بیٹی بھی تھی جس کا نام نعبہ تھا۔ البتہ شوہر سے علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی انہوں نے۔

سیٹھ رحمان ہمیں بیٹا کے حوالے کر کے خود چلا گیا۔ اس رات میں سکون سے سوئی تھی۔ امی بابا ابھی مگر اس وحشی دنیا میں سر چھپانے کو چھت اور پیٹ بھرنے کو کھانا مل گیا تھا۔ اس وقت تک میرے لیے زندگی گزارنے کو بس یہی دو باتیں اہم تھیں..... چھت اور روٹی۔ جو بھیل بھی تھی۔

اگلے روز پھر سیٹھ رحمان آیا۔ اس کے ڈرائیور کے ہاتھ میں بہت سے شاپر تھے۔ جن میں کھانے پینے کی چیزیں اور نئے کپڑے تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ خود چائے لینے کچن میں آگئی۔ چائے بنا کر میں ٹرے میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہ چائے کا پ اٹھا کر بیئرنگھیل پر رکھتے ہوئے بولا ”بیٹھو۔“

ہے۔ میں ناشتی کی میز سے اٹھ کر اسے اس کے کمرے میں دیکھنے لگی۔ وہ سو رہا تھا۔

میں نے اس روز بہت دنوں بعد عبداللہ کو قریب سے دیکھا تو مجھے وہ بہت کدورت لگا۔ کافی دیر میں اس کے قریب بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی میں یہ سب عبداللہ ہی کے لیے تو کر رہی ہوں پھر کیسے میں اس کو نظر انداز کر سکتی ہوں۔ اتنا زیادہ بھلا بیٹھی ہوں اس کو کہ قریب سے اس کی حالت بھی نہ دیکھ پائی۔

میں اس روز آفس نہ جاسکی۔ بس اس کے جانے کا انتظار کرتی رہی۔ میرا ارادہ تھا مجھے ہی وہ جاگے گا میں اس کو خود ناشتا بنا کر کراؤں گی پھر اس کو اس کے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلوں گی۔ وہی ڈاکٹر جس کے پاس ابولے کر جایا کرتے تھے اسے۔

وہ جاگ گیا تو میں نے اس کو نہلا دھلا کر تیار کیا۔ تب تک بیٹھا اس کا ناشتا بنا چکی تھی۔ بہت دنوں بعد میں اس کو اپنے ہاتھ سے ناشتا کروانے لگی۔

اتنے میں دروازے پر تیل بجی۔ بیٹا نے جا کر دروازہ کھولا پھر اپنے ساتھ میسرہ رحمان کو اندر لے کر آئی۔

وہ جب بھی آتا تھا بیٹا کسی تکلف کے پورے گھر میں دھناتارہتا تھا۔ وہ فلیٹ اس کا تھا، شاید اپنا حق جیتا تھا۔ بہر حال اس روز بھی وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی بجائے سیدھا مکن میں آ گیا۔ میں ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھی عبداللہ کو ناشتا کروا رہی تھی۔

عبداللہ کو نہلانے کے بعد میں نے چٹنی نہ کیا تھا۔ میرا دوپٹا بھی ہاتھ روم میں ہی رہ گیا تھا۔

گھر میں میرے بیٹا اور عبداللہ کے سوا تھا ہی کون؟ اس لیے میں نے اتنا دھیان نہ دیا تھا۔ سیٹھ کا چاکا کچا سر پر اٹھا ہوتا مجھے گہری شرمندگی میں مبتلا کر گیا۔ دوپٹا پینے پر پہلے ہی نہ تھا جبکہ اس کو نہلانے کے سبب ان کا سوت جو میں نے پہن رکھا تھا وہ بھی بری طرح جھیک چکا تھا۔ میں نے سیٹھ کو دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو پینے پر بائیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ..... آپ سر، آئیں بیٹھیں۔“ نہ جانے میں نے اسے کیسے بیٹھنے کو کہا۔ بارے شرم کے میری نظر جبک جھکی تھیں۔ میں وہاں سے تجزی سے باہر نکل آئی۔ کمرے میں کچن تک مجھے سیٹھ کی نظر میں اپنا تعاقب کرنی محسوس ہوئیں۔ میری حالت ہی ایسی تھی کہ کوئی بھی مجھے بخور ہی دیکھتا اور بار بار ہی دیکھتا۔ میں گہری شرمندگی کے ٹھونڈ بھرنے کے علاوہ

اٹھانے کے بجائے میرا ہاتھ چھو لینا، دھور پھرا کر ساتھ چلے چلے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا۔

گو میرے لیے یہ سارے تجربے بالکل نئے تھے۔ کزشتہ زندگی اتنی خوبصورت اور معروف گزری تھی کہ ایسی باتوں کا کبھی سامنا ہی نہ کرنا پڑا تھا۔ کرنا بھی کیسے پڑتا جب تو ہر لمحہ میں نے بابا کو اپنے ہمراہ پایا تھا۔ بچے سے بابا حافظ ہوتے ہیں اور اب۔ اب میرا حافظ کوئی نہ تھا۔ میں ایلی تھی اور دنیا کی ٹیڑھی تر بھی لگا ہوں کا مجھے خود سامنا کرنا پڑتا تھا جو تپتے صحرا میں آگ کے شعلوں کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ میں محتاط رہنے کی ہر کرب تک مدد لیتی تھا۔

”تمہیں کسی نے بتایا نہیں تم بہت خوبصورت ہو؟“ میں اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی لیپ ٹاپ کھولے کام کر رہی تھی۔ اس کی اس بات پر میں بیٹھائی۔ وہ مسکرانے لگا پھر دوبارہ بولا۔ ”تمہیں کون بتائے گا تم خوبصورت ہو؟“

میں اس کی بات سمجھ نہ پائی تھی یا بات کا مطلب نہ کچھ رہی تھی یا کچھ بھی تھی مگر انجان بن رہی تھی۔ بہر حال اس وقت میری کیا حالت تھی میں یہ بھی نہ سمجھ سکتی تھی۔ میں بس اسے دیکھ کر وہی گئی اور وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس نے ہنوز مسکراتے ہوئے سامنے رکھی فائل کھول دی۔ وہ اس پر توجہ ہو گیا۔ چہرے میں اسی طرح اسے سمجھتی رہی۔ پھر لیپ ٹاپ کی سیپ نے مجھے اپنی جانب توجہ کر دیا۔

دن پر لگا کر اڑ رہے تھے اور ان اڑتے دنوں کے ساتھ ساتھ میرے دفتری امور میں بھی کافی حد تک اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں سارا دن معروف رہتی۔ پھر رات کو دیر سے تنگی ہاری داپس آتی تو سو جاتی تھی۔ تب تک عبداللہ بھی اپنی آدمی نیند لے کر جاگ چکا ہوتا تھا۔ یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں عبداللہ کو بھول بیٹھی تھی۔ مجھے ہر لمحے اس کا خیال تھا مگر میں مطمئن تھی کیونکہ بیٹا سے وہ بہت زیادہ اونچ ہو چکا تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی اس لیے میں اس کی طرف سے عمل بے فکر تھی مگر یہ بے فکری مجھے بہت تنگی پڑی تھی۔

ہر روز صبح ناشتی کی میز پر بیٹھا مجھے اس کی طبیعت اور حال احوال بتاتی رہتی تھی۔ میں جن جلدی آفس کے لیے نکل جاتی تھی۔ جبکہ عبداللہ نو بجے تک سوتا رہتا تھا۔ نکلنے سے پہلے میں ضرور اس کے کمرے میں جھانک کر اس کو دیکھ لیتی تھی۔ ایک روز مجھے بیٹا نے بتایا کہ عبداللہ کی طبیعت خراب رہنے لگی

اور کچھ نہ کر پائی۔

کچھ ہی دیر میں، میں صبح کر کے دواہل بچن میں آئی۔
بیٹا عبداللہ کو ناشا کر اچھا لگا تھی۔ اب ٹینک سے اس کا
منہ صاف کر رہی تھی۔ بیٹہ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر
بیٹھا تھا۔

میں نے ساس بہن چولہے پر رکھا۔ اس میں چائے کے
لیے پانی اور چینی پی ڈال کر پوچھا جلادیا۔
”تم آج آفس نہیں آئیں تو میں نے سوچا چپسل کر
خود ہی پوچھاؤں کہ کیا وجہ ہے؟“

”بہت شکر یہ آپ کا سر..... اور جلی سوری۔ میں نے
بتائے بغیر جھٹی کر لی۔ وہ عبداللہ کی طبیعت خراب ہے۔ میں
اس کو آج ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے جانا چاہتی
ہوں۔“ میں نے چولہے کی آگ دسمی کرتے ہوئے دائیں
پلٹ کر اسے غیر حاضری کی وجہ بتائی۔

”اچھا..... مجھے پہلے بتادیا ہوتا لگی۔ چلو خیر میں آ گیا
ہوں، لے کر چلتے ہیں ڈاکٹر کے پاس عبداللہ میاں کو۔“
وہ کہہ رہا تھا میں بنا کوئی جواب دیے چائے پر حوجہ ہو
گئی..... نہ جانے کیوں میں اس کے مہربانوں پر گولی بن جاتی
تھی۔ اس سے پوچھ بھی نہ پاتی تھی۔ میں اسے فرشتہ سمجھتی تھی
اس لیے..... یا حقیقت یہ تھی کہ میں اس کی مہربانوں کی عادی
ہو چکی تھی۔

اس نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”جی عبداللہ
میاں..... جانیں گے ڈاکٹر کے پاس؟“
”نہیں..... نہیں..... نہیں! جاؤنگا ڈاکٹر (ڈاکٹر).....
بیٹا لدا تا ہے۔ (ڈکا لگا تا ہے)“ میرے 15 سالہ بھائی نے
چار سالہ بیچے کی طرح جواب دیا۔

”نہیں بیٹا، میں ڈاکٹر سے بولوں گا آپ کو ڈیکا نہیں
لگے گا..... سیرپ دے گا آپ کو..... آپ سیرپ تو پیجے ہو
نا۔“ سیٹھ کسی ننھے بیچے کی طرح اس کو بہلاتے لگا۔
”شاہزی والا شیرپ؟“ (شاہزی والا سیرپ؟)

عبداللہ خوشی سے چپکا۔
”جی ہاں..... شاہزی والا بھی اور نج والا بھی۔“ سیٹھ
نے ہجر سے اسے بہلایا۔

”آپ ننھے اچھے ہو۔ آپ تو دندی ہے..... مجھے بیٹا
لدا داتی ہے۔ (آپ کتنے اچھے ہو..... آپ تو بڑی ہے مجھے ڈیکا
لگوانی ہے۔“ اس نے پہلے خوشی سے سیٹھ کی طرف دیکھا پھر
ناراضگی سے مجھے گھورتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ وہ ٹیکل پر

رکے اسپون اسٹینڈ کے ساتھ کھیلنے لگا۔

میں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے ایک نظر عبداللہ
کو دیکھا۔ آگے بڑھ کر چائے بیٹھ کر تھمائی وہ پینے لگا۔ میں
چپ چاپ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

اس روز وہ عبداللہ کو اور مجھے ایک بہت جگے پر انٹیوٹ
اسپتال میں لے آیا۔ میں نے وہاں آنے سے پہلے اس کو بتایا
بھی تھا کہ عبداللہ کے پرانے ڈاکٹر ارسلان کے پاس لے
چلیں۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

گاڑی پارکنگ میں رکی تو سیٹھ کا ڈرائیور بچے اتر کر
پارکنگ ایریا میں ایک طرف کمزری ویل چیز ڈیم سے ایک
جیڑ لے آیا۔ مگر اس نے خود ہی دروازہ کھول کر عبداللہ کو اٹھایا
اور جیڑ پر بٹھا دیا۔

عبداللہ اتھا جی ٹنگڑا لولا نہیں تھا کہ خود چل نہ سکا۔ مجھے
اجھا نہیں لگا تھا اس کا ویل چیز پر بیٹھا مگر میں خاموش رہی۔
شاید یہ بھی سیٹھ کے احسانوں میں سے ایک احسان تھا جس
کے سامنے میں نے بس ہوجانی تھی۔ مخالفت یا انکار نہیں کر سکتی
تھی۔ پہلے نہیں کی تھی تو اب کیوں کر لیتی۔

بیٹا اس کی ویل چیز دھکیلے ہوئے آگے آگے چل رہی
تھی۔
میں مگم مگ پریشان حال بیٹھ کے ساتھ ساتھ چل رہی
تھی۔

”تم فکرت کرو۔ میں نے جس ڈاکٹر سے عبداللہ کا
ایوانٹ لیا ہے بہت قابل ہے۔ مجھے اُمید ہے عبداللہ بالکل
ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہمارے ڈاکٹر نے ہمیشہ کہا تھا۔ عبداللہ ٹھیک ہو سکا
ہے مگر اس کا علاج پاکستان میں نہیں ہے اسے بیرون ملک
لے جانا پڑے گا۔ وہ بھی قابل ڈاکٹر تھا۔ مجھے اٹھاتا تھا وہ
عبداللہ کو بالکل ٹھیک نہیں کر سکا تھا تو یہ ڈاکٹر کیسے کر سکا ہے۔
اس لیے یہ نسل میرے کسی کام کی نہ تھی۔

”ڈاکٹر عثمان آندری کے ہفتے میں... دوموز پاکستان
میں ہوتے ہیں اور دوموز امریکا میں۔ اگر عبداللہ کا علاج وہ
پاکستان میں نہ کر سکا تو اس کو امریکا بھجوا دیں گے۔“ سیٹھ
دوبارہ بولا۔

اس کی بات پر میں بنا کوئی تاثر دیے تے ہوئے
چہرے کے ساتھ اس کو جھکتے لگی۔ دل میں سوال اٹھا کہ وہ کیوں
اتنی مہربانیاں کرنا چاہتا ہے مجھ پر؟ ہا یا زہد تھے، اس کے ملازم
تھے وہ یہ سب تب بھی تو کر سکتا تھا مگر اب ہمارے مرنے کے

کا ایک اور
معرکہ الارا خاص شمارہ

سرگزشت
ماہنامہ

محمد سارنگ

ان شخصیات کے کھٹے میٹھے تجربات
جن کی جگہ گاتی زندگی میں کبھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا

ان افراد کی سبق بھری سرگزشت
جن کے لیے زندگی کبھی سزا تھی، فاقے ان کا مقدر تھے

ان معروف شخصیات کا احوال
جنہوں نے اپنی زندگی خود تعمیر کی، زندگی کی مشکلات کو زور بازو
سے پرے دھکیلا اور آج لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہے ہیں

بہت جلد یہ خاص شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ایک ایسا شمارہ جسے آپ اپنی لائبریری میں محفوظ رکھیں گے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں

اپنے پیروں پر کھڑا دیکھ رہی تھی۔ میں خوش تھی، اتنی خوش کہ میرے پاس اپنی اس خوشی کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

میں دل ہی دل میں سوچ کر رہ گم یہ سب کہ نہ پائی۔
اس نے نرمی سے میرا گل تپتہ پایا اور بولا۔ ”پریشان
مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے کمال کیوں جستجیا؟ شاید مجھے حوصلہ دینے کے لیے مگر خوف کی ہلکی سی لہر میرے وجود میں سر تاپا دوڑی۔ میں نے نظریں جھکا لیں پھر میں عبد اللہ کو دیکھنے لگی۔ لفٹ رک گئی۔

ہم ڈاکٹر کے کمرے میں آ گئے۔ وہ واقعی شکل و صورت اپنے چلیے اور گھڑری دفتر سے ہی ایک انٹر نیٹل سطح کا ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا۔

وہ بہت دیر تک عبد اللہ کا معائنہ کرتا رہا۔ اس کے ضروری ٹیسٹ ہوئے، رپورٹیں آنے تک ڈاکٹر نے عبد اللہ کے ممکنہ علاج کی نوید سنا دی۔

مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اتنی خوشی کہ شاید آج بابا زندہ ہوتے تو ان کو بھی نہ ہوتی مگر مجھے ہوئی کیونکہ میرا واحد سہارا تھا عبداللہ، وہ کہاں تھا سہارا؟ سہارا تو میں تھی اس کی عمر وہ بن بن سکنا تھا میرا سہارا..... میرا اکلوتا بھائی اپنی اکلوتی بہن کا وہ سائبان جس کا بابا دھڑکڑا کر گریں بیچ چور ہے جس بھی کڑی ہو جاؤں تو کوئی مجھے میلی آنکھ سے نہ دیکھے گا۔ میرے دل میں کسی بات کا کوئی ڈرنہ نہ ہوگا کہ کوئی کسی بھی وقت میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر نے نوید سنائی مگر ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس کے علاج میں چھ سات لاکھ کا خرچ آئے گا۔

سیٹھ نے اتنی بڑی قم کا سننے کے بعد میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ”کیا تم علاج کروانا چاہتی ہو؟“

میں خاموش رہی۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”بولو.....“
پریشان مت ہو۔“

”یہ سب کچھ سن کر وہ بھی ہنس پڑی۔ ”میرے پاس آئیں گے کہاں سے؟“ یہ تہمتی سا تھم میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پہیوں کی گرمی مت کرو۔ داسر صاحب اپ بپے کا علاج شروع کریں۔“

لوگوں نے اسے جھوٹا قرار دیا۔ وہ ہاتھ میں جو گھٹ پکڑے غریبوں کی طرح کھارہا

میں چشم تصور میں اپنے بھائی کو بالکل ٹھیک ٹھاک،

نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں پانی لینے کچن میں آئی۔ اس کو پانی دیا۔ وہ پانی پینے لگا۔

پانی پینے کے بعد اس نے اپنی چائے کا کپ اٹھایا اور چکیاں لے لے کر پینے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ عبداللہ کے بارے میں مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا موبائل فون بجا۔ بیٹا کی کال تھی۔

وہ اس کو تھوڑی دیر میں اسپتال پہنچنے کا کہہ کر کال بند کرنے لگا۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”چائے ختم کر دو جلدی۔ بیٹا نے کہیں کام سے جانا ہے۔ وہ بیمار ہی ہے۔ میں تجھیں دہلی چھوڑ کر پھر ایک دعوت پر جاؤں گا۔“ اس کے کسی بھی قسم کے اعتداز پر مجھے رتی برابر شک نہ ہوا کہ مجھ سے وہ کوئی کھیل بھی کھیل سکتا ہے۔ بہر حال کھیل کو وہ مجھ سے شروع نہ کر سکیں گے۔ کھیل رہا تھا۔ بس اس نے آخری پتہ چیکنا تھا۔

وہ مجھے بیٹا کے بارے بتانے لگا۔ میں نے بھی جلدی سے اپنی چائے کا کپ اٹھایا۔ دل ہی دل میں سوچا کہ شاید اس کو کوئی ایمر جیسی ہے۔ میں جلدی سے چائے ختم کرنے لگی۔

ایک گھنٹہ دو گھنٹہ..... تین گھنٹہ.....

کچھ ہی دیر میں میں نے چائے کا کپ ختم کر دیا۔

میں نے ہاتھ سے کپ ٹھیل پر رکھا۔ میرا سر بھاری ہونے لگا۔

مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا رہا ہے۔ میں کچھ ہی دیر میں مکمل حواس کھو بیٹھی۔

☆.....☆

دروازے کی آواز میری آنکھ مٹی اور میں اٹھ بیٹھی۔ سینہ واں روم سے غسل کر کے نکل رہا تھا۔ تو ایسا بھی اس کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ اپنے بالوں کو خوش کر رہا۔

میں نے پہلے سینہ کو دیکھا پھر اپنی حالت پر غور کیا۔ مجھے کس چیز کی کمزوری لگے۔ سارا سمجھنے میں۔

”غسل کر لو تو.....“ میں اسپتال کے لیے نکلتا ہے۔ وہ شے کے سامنے ٹھہرا کھڑی کر رہا تھا۔

میری آنکھوں سے ندی کی مانند آنسو بہنے لگے۔ زبان پیسے سے ہو گئی۔ میں ایک تک دیوانوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ رور ہی تھی۔ وہ واپس پلٹا۔

”اتھ کر فریض ہو جاؤ خاموشی سے، خاموشی میں ہی تمہارا فائدہ ہے۔“

”فائدہ.....؟“ میں نے کپکپاتے ہوؤں سے کہا۔

”ہاں فائدہ۔“ وہ کہہ کر پلٹا اور صوفے سے اپنا کوٹ اٹھانے لگا۔ میں کسی زنجی شیری کی طرح دھاڑتی ہوئی اس کی جانب لپکی۔ میں اس کو اسی وقت ختم کر دینا چاہتی تھی۔

”کیوں کیا؟ کیوں کیا تم نے؟“ میں نے چیختے ہوئے اسے گریبان سے پکڑا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا البتہ اس کا گریبان ابھی بھی میرے ہاتھ میں تھا۔

”یہ آسان نہیں۔ عیش و عشرت، ذکر، چپسا اور یہاں تک کہ تمہارے اس غم کے پائل بھائی کا علاج؟ تم کیا سمجھ رہی تھی میں صدقہ جاریہ کے طور پر کر رہا تھا؟ جتنا میں نے تمہارے لیے کیا ہے اس کے بدلے میں تو کچھ بھی نہیں..... جب تک میں ہوں..... جب تک تم ہو..... تم میرے احسانوں کا بدلہ چکانا کر ہو گئی۔ نہیں کرو گی تو ایک ایک پانی واپس کرنا پڑے گی۔ اس ایک بیٹے کے اندر اندر.....“ اس نے غصے سے مجھے دھکا دیا۔ پھر دانت بچھنے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سے کاغذ نکال کر میرے منہ پر دے مارے۔

وہ اپنا کوٹ جھانٹا کر سے نکل گیا۔ میں اسی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اتنا روئی..... اتنا روئی..... جتنا مجھ میں سکتی تھی۔

اس روز مجھے شدت سے ای ای اے کی یاد آئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ان دونوں سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میں بس یہ سوچ کر رہ گئی کہ جن کے والدین اپنے خاندان والوں سے چھپ کر شادی کرتے ہیں کیا وہ بچے اسی دن کے لیے پیدا کرتے ہیں؟

کاش میری ای ای اے نے چھپ کر شادی نہ کی ہوتی تو مجھے زندگی کبھی اس جہنم میں نہ جھانکتی۔ میرے ساتھ کبھی یہ سب نہ ہوتا۔

ان دونوں کو تو اپنے خاندان قربان کر کے محبت اور ایک دوسرے کا ساتھ مل گیا تھا مگر اسی محبت کی نشانی کے طور پر وہ مجھے اور عبداللہ کو پیدا کر کے یہ سب کچھ جھیلنے کے لیے چھوڑ گئے۔ خود تو مر گئے مگر ہمیں ہل ہل جینے اور ہل ہل مرنے کے لیے پیدا کر گئے۔

میں نے حریف جرحمت نہیں کی۔ میں کبھی نہیں سکتی تھی میری زندگی ختم ہو چکی تھی مگر مجھے عبداللہ کی زندگی چاہیے تھی۔

میں نے اپنا آپ سینہ کے حوالے کر دیا۔ اب اس کا جب جی چاہتا میرے وجود سے کھیل کر، جی بھلا کر چلا جاتا اور

پہلے میں نے سوچا کہ خود کو ختم کروں۔ لیٹے لیٹے خودکشی

کے لیے طریقہ کار سوچنے لگی۔

مگر میرے اندر اتنا حوصلہ تھا کہ میں خود اپنی موت بھی حرام کر دوں۔ بہت سوچ بچھ کر بالآخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔

اب مجھے اس فیصلے کو حتمی شکل دینا تھی۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام تھا مگر جتنی مشکلات میں کاٹ چکی تھی اس سے زیادہ مشکل کچھ بھی نہ ہو شاید۔

اگلے روز رات آٹھ بجے کے قریب سینٹھ دوبارہ آیا میں اس کے آنے سے پہلے ہی بیٹا کو کچھ سامان لینے بازار بھجوا چکی تھی۔ اس کو میں نے عبد اللہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ سینٹھ نے چائے کا کہا۔ میں فوراً چائے بنا کر دیں لے آئی۔ پہلے میں نے عبد اللہ کے سامنے اس کا کپ رکھا پھر سینٹھ کے سامنے رکھتے ہوئے آنکھوں سے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے خوشی سے چائے کا کپ پکڑا۔ میں عبد اللہ کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

سینٹھ اور عبد اللہ دونوں اپنی اپنی چائے پینے لگے۔

ایک گھنٹہ..... دو گھنٹہ..... تین گھنٹہ۔ اس نے وہ چائے جلد ختم کر دی۔

چائے ختم کر کے اس نے کپ میز پر رکھا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تمہارا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مہر یہاں سے ایک میٹنگ کے لیے نکلوں گا۔“ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”کیوں نہیں سر، آپ اندر چل کر لیں۔ میں اسے سی آن کر دیتی ہوں۔“ میں بھی اپنی چائے اٹھ سے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ میرے کمرے میں چلا گیا۔

عبد اللہ کے سامنے یہ سب پہلی بار ہوا تھا۔ وہ بس ہم دونوں کو اندر جاتا دیکھ رہا تھا۔ چائے پی رہا تھا۔ اندر جا کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔

گوکہ جوان بھائی کے سامنے یہ ایک بے غیرتی سی تھی مگر اس وقت ہر حال میں مجھے کرنی تھی یہ بے غیرتی۔

سینٹھ وہپ سے بند پر دم دراز ہوا۔ میں اسے سی آن کر کے واپس چلی تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دھوٹی میں اپنی

کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

بدلے میں وہ یہ آسائیں دے رہا تھا جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عبد اللہ کا علاج ہو رہا تھا۔ ہاں مجھے اس سے دلچسپی تھی۔ عبد اللہ میں ابرو دشمن آنا شروع ہو گئی تھیں۔ آرپیشن ہو چکا تھا۔ تین ماہ مسلسل علاج چلتا رہا اور میں مسلسل اس کی کھلوتا ہی رہی۔

ایک دن عبد اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو کر گھر واپس آ گیا۔ وہ اپنے پیروں پر چل کر آیا تھا۔ میں بہت خوش تھی وہ عام انسانوں کی طرح بات کر رہا تھا۔

وہ انتہائی کم گو اور عقیدہ مزاج کا مالک تھا جب وہ ایک مکمل انسان بنانا تو کسی شہد او سے کم نہ لگ رہا تھا۔ میں نے بہت بھاری قیمت ادا کی تھی اسے ایک مکمل انسان بنانے کے لیے۔

دو دن میں نے اور اس نے دنیا جہاں کی باتیں کر کے گزارے تھے۔ وہ کم بولتا تھا۔ شاید بھگک بھی اس میں۔

وہ بیٹا سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ گزشتہ زندگی میں وہ کیا تھا، کیا تھا، اسے سب یاد تھا۔

بیٹا کو اتنی کہتا تھا۔ بیٹا بھی اس سے بالکل اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی تھی۔

دو دن بہت خوشی سے گزرے اور تیسرے دن سینٹھ

دوبارہ آٹکا۔ اسے عادت پڑ چکی تھی میری۔ وہ اشعاروں کتابوں میں مجھے کمرے میں جانے کا کہہ رہا تھا۔ میں نہ گئی، عبد اللہ کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ کافی انتظار کرتا رہا پھر مجھ سے اٹھ کر چلا گیا۔ رات کو اس کی کال آئی تھی جس میں اس نے مجھے حکم کھلا دیا کہ جی جی اس کی بات نہیں مانوں گی تو وہ میرے خلاف کوئی بھی ایکشن لے لے گا اور میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکوں گی۔ ”یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا کہ کل وہ دوبارہ آگے۔ دوبارہ اس سے کسی بھی قسم کی کوئی بد مزگی نہیں چاہیے۔

اس رات میں جاگتی رہی۔ نیند آنکھوں سے جیسے روٹھ چکی تھی۔ میری زندگی کا مقصد عبد اللہ کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا جو کہ تقریباً پورا ہو چکا تھا۔

زندگی اب بالکل بے معنی لگ رہی تھی۔ جینے کے لیے یا آگے بڑھنے کے لیے کچھ بھی تو نہ بچا تھا میرے پاس۔

میرے خیال میں عبد اللہ کے علاج کی میں بہت بھاری قیمت ادا کر چکی تھی۔

جانب کھینچا۔

میں اس کے قریب ہی بیٹھ بیٹھ گئی۔ اس میں اپنی ہوس مٹانے کے لیے ہلاکی طاقت ہوتی تھی۔ مگر آج بالکل نہ تھی۔

وہ کرتا کچھ تھا اس سے ہو کچھ رہا تھا۔ پھر وہ بے بس ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ کر اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس کو یقیناً پکڑا رہے۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

”سینئر ریحان یاد رکھو..... تم نے چار ماہ پہلے مجھے بے ہوش کر کے میری عزت لوٹی تھی..... وہ عزت نہیں تھی..... مجھے جیسی ستم اور بے سہارا لڑکی کا کل اثاثہ تھی..... زندگی تھی میری جو تم نے جھین لی تھی مجھ سے۔“

میں نے اس کو ٹھوڑی سے پکڑ کر کہا۔ وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اپنی گردن پر ہاتھ پھرنے لگا، ایسے جیسے کوئی اس کے گلے میں پھندا ڈال کر کھینچ رہا تھا۔ وہ خود کو اس پھندے سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا..... کیا..... ہے تم نے.....؟“ اس کے حلق سے لڑکھرائی آواز برآمد ہوئی۔

”کچھ خاص نہیں بس..... تم نے میری زندگی ختم کی تھی، میں تمہاری کر رہی ہوں۔ حساب برابر کر دیا ہے میں نے۔“ میں نے اس کی ٹھوڑی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے چہرے پر تھوکا۔ وہ اپنے گلے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھندا

لحد بلجھوتہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں دُعا شیرینی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ اپنے ناخنوں اور دانتوں سے اس کا چہرہ توج ڈالا۔ بچانے والا کوئی بھی نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مجھے بچانے والا کوئی نہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں اس کے منہ سے جھاک نکلنے لگی پھر وہ ششما پڑ گیا۔

میں نے بچے اتر کر خود کو جھاڑا۔ جیسے اس نے اپنا کوٹ جھاڑا تھا۔ پھر سائیکل پر کھڑا فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ عبداللہ مجھے کھود رہا تھا۔ اس نے زندگی پاگل بننے میں گزاری تھی۔ مگر آج مجھے اس حال میں اس کمرے سے نکلا دیکھ کر اس کی آنکھیں سرخ لال ہو رہی تھیں۔

مجھے اس کا گھونٹا اچھا لگا۔ مجھے یقین ہو گیا واقعی میرا بھائی ایک مکمل مرد ہے۔ ایک غیرت مند مرد جس کی اتنا اسے اس وقت... جانے کس کرب میں جلا کر رہی تھی۔ میں سہلی

نظر کے بعد اس سے دوسری نظر نہ ملایا۔

”آپنی تم نے یہی سب کچھ کرنا تھا تو مجھے پاگل ہی رہنے دیجتیں۔“ اس نے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ وہ کہہ کر رکنا نہیں تھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس لیے میرے دل پہ ایک گھونسا پڑا مگر اس گھونے میں بھی سکون تھا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس موبائل کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ پولیس کو میں نے خود کال کر کے بلایا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو عبداللہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اسٹیکٹر کچھ سپاہی اور ایڈی کا فٹبیل ڈرائنگ روم میں میرے ارد گرد کھڑے تھے۔ بیٹا بھی آچکی تھی اور حیرت سے سب مجھے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اپنا بیان روکنا شروع کر دیا۔ شروع کر دیا۔ شروع کر دیا۔ شروع کر دیا۔

سینئر کی لاش وہاں سے پوسٹ مارٹم کے لیے چلی گئی۔ مجھے جھوٹاں لگ گئیں۔ عبداللہ سب کچھ سن لینے کے بعد حوا میں بار بار کرونے لگا تھا۔

وہ جوان تھا..... کوکے بے صدمہ بہت بڑا تھا جیسے ساری زندگی اس نے دل میں رکھنا تھا مگر اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اپنی زندگی جی سکتا تھا۔

”بیٹا بھائی..... عبداللہ کا خیال رکھنا۔“ میں نے ایک نظر بڑا کوکے بھرا آخری نظر عبداللہ پر ڈالی۔

شہادہ دسمبر 2018ء کی منتخب جیا نیاں

ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: فرہادی..... تسمیم (کراچی)

☆ دوم: محافظ..... ممتاز سلیمانی (فیصل آباد)

☆ سوم: مکافات..... کینیز زہرا (لاہور)

☆ چوتھ: دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جی منتخب کیجئے

☆ آپ کی لائے کا احراز کریں گے

اپنی جان دے کر اپنی وہ زندگی ختم نہ کی تھی جو میں نے اسے
دینے کے لیے اپنی زندگی قربان کی تھی۔

بیٹا نے اس کو ایک سرکاری اسکول میں داخل کروایا اور
وہ شام کے وقت ایک درکشاپ میں کام کرنے لگا۔

اس کی تعلیم اتنی نہ تھی مگر بہت جلد اس نے گاڑیوں کی
مرمت کا کام سیکھ لیا تھا پھر اس نے اپنی الگ سے ایک چھوٹی
درکشاپ بھی بنائی تھی۔ پہلے وہ درکشاپ ایک چھوٹی دکان پر
بنائی گئی تھی مگر دو سال تک بارکیٹ میں قریب کی دو دکانیں
اور بھی اس نے کرائے پر لے لیں تھیں۔ وہ بہت سختی تھا۔ اس
کی محنت رنگ لارہی تھی۔

اس کا کاروبار جم کھٹا تو بیٹا نے اپنی بیٹی کے ساتھ اس کا
نکاح کروادیا۔ شاید بیٹا نے خود جو زندگی گزارنی تھی وہ نہیں
چاہتی تھی وہ اس کی بیٹی کے ہمسے میں بھی آئے اس لیے
عبداللہ سے شادی اس کی بیٹی کے لیے عزت دار زندگی
گزارنے کا بہترین انتخاب تھا۔

عبداللہ مجھ سے ملاقات کے لیے آتا رہتا تھا۔
شادی کے بعد وہ زینب کو بھی لے کر آیا تھا اور آج جیلر
کے کمرے میں ملاقات کے دوران اس نے اپنا ننھا سا بیٹا
میری گود میں ڈال دیا تھا۔

لوگوں کے وجود میں سکون کی لہریں اترتی ہیں مگر اس
ننھے فرشتے کو گود میں لے کر میرے اندر زندگی میں پہلی بار
سکون کا سمندر اٹھ آیا تھا۔ میری قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں
تھیں۔ خود کو قربان کر دینے کے بعد اب زندگی میں اس مقام
پر جیسے بھی کھڑی تھی، کامیاب کھڑی تھی۔

”آپ اپنے پیچھے کا نام آپ خود رکھیں گی۔“

عبداللہ نے مجھ سے کہا..... میری آنکھوں سے دو آنسو
پہل کر نکلنے کے لیے لی بستر میں جب ہو گئے۔ میں نے نظر
بمگر اس کی معصوم صورت دیکھی۔

”قربان۔“ اس کی صورت دیکھ کر میرے لبوں پر بے
ساختہ پیام اکبر اور میں نے قربان کی پیشانی چوم لی۔

بہت کچھ حکموں میں نے بالا فرسکوں حاصل کر لی۔
میں مطمئن ہوں اپنی زندگی سے۔ میری قسمت میں میرے
رب نے قربانی ہی لکھی تھی۔ جو میں نے دے دی۔

لوگ کہتے ہیں میں قائل ہوں..... خونی ہوں میں مگر
یہ سب کچھ جان لینے کے بعد آپ کیا کہتے ہیں؟ بتائیں
مجھے.....؟

ص

مجھے لہڑی کا فیصلہ ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے گئی۔

عبداللہ چیخے لگا..... رونے لگا..... میں اس وقت تک
اس کی چیخیں سنتی رہی جب تک پولیس موہاں بلائنگ کے
احاطے سے باہر نہ نکل گئی۔

میرا ایمان بچ تھا مگر میں نہیں جانتی تھی پیٹھ کے وارثوں
میں کون کون ہے۔ مجھے اس نے بھی اپنی فطرت کے بارے
میں نہیں بتایا تھا۔ ایک دو بار میں نے جاننے کے لیے سوال
کیے تھے۔ مگر اس نے گول مول جواب دے کر بات بدل دی
تھی۔

میرا اس کے بیٹوں سے عدالت میں پہلی بار سامنا ہوا
تھا۔ وہ بھی بالکل باپ جیسے تھے خود غرض مفاد پرست۔ صاف
نظر آ رہا تھا باپ کے محل پر دو کمرے زیادہ انکس باپ سے ملے
والی دولت پر خوش تھی۔

میری طرف سے وکیل بیٹا نے کروایا تھا۔
ان کا وکیل مجھ سے بیان بدلنے کے لیے کہتا رہا.....

دھمکا تا رہا۔ بلا آخر اس نے مجھے آخر غصے کی کہ وہ میری سزا کم
کر دے گا اگر میں اپنا پرانا بیان بدل کر ان کی مرضی کی کہانی
سنا دوں مگر میں خاموش رہی۔

ان کے وکیل نے مجھ پر یہ الزام عائد کر دیا کہ میں پیٹھ
کی دولت تنھیا بنا چاہتی تھی۔ اس کو بڑی شادی کے لیے اس کا
رہی تھی۔ جب اس نے انکار کیا تو میں نے اس کا گل کر دیا۔ نہ

صرف یہ بلکہ اس سلسلے میں وہ گواہ اور شہوت بھی پیش کر چکا تھا۔
خیر اس معاشرے نے اصل مجرم کو سزا دی ہی تک
ہے۔ میرا جرم تو بس ایک بھڑے کھوسوت کی کھاٹ اتارنا
تھا۔ میرا دل پر مسکون تھا اس لیے مجھے اس بات کی پروا نہ تھی
کہ یہ دنیاوی عدالت میرے حق میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔

جلدی فیصلہ ہو گیا گا ہوں اور جوتوں کی روشنی میں،
مجھے عرق کی سزا سنائی گئی۔

☆.....☆

اب عبداللہ پورے آٹھ سال بعد اپنی بیوی اور چاروں
کے بچے کے ساتھ مجھ سے ملے آیا تھا۔ اس کی بیوی بیٹا کی بیٹی
زینب تھی۔

میری گرفتاری کے بعد بیٹا اس کو اپنے ساتھ مگر لے گئی
تھی۔ گو کہ اس کو سمجھنے میں وقت لگا تھا۔ مگر تعین تسلیم کرنے
کے لیے ہوئی ہیں۔ تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ زندگی میں قدم آگے
بڑھالینا عقلمندی ہوتی ہے۔ میرا ایمان بہت ٹھنڈا تھا۔ اس نے
ہر بات تسلیم کر لی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کوئی روگ لگا کر یا